خلیفہ راشد

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی

تالیف: مولانا علی احمد عباسی رحمہ اللہ

تعلیقات وحواشی: محمد فہد حارث

حارث پبلی کیشنز

مکتبہ الفہیم
مئوناتھ بھنجن یوپی

فہرست



پیش گفتار

مسلمانوں کے چھٹے خلیفہ راشد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل پیدا ہوئے۔ گویا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہم عمر تھے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی قرابتیں تھیں، جن میں سب سے قریب کی رشتے داری یہ تھی کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن سیدہ امِ حبیبہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں تھیں۔

اس لحاظ سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے برادرِ نسبتی ہوتے تھے۔ دوسرا یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہم زلف بھی تھے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ام المومنین سیدہ امِ سلمہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیوی قریبہ صغریٰ آپس میں سگی بہنیں تھیں۔ اسی طرح سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بھانجی لیلیٰ بنت میمونہ بنت ابوسفیان رحمہ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے سیدنا حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کی زوجیت میں تھیں۔ اسی طور سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور بہن سیدہ ہند بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچازاد بھائی کے بیٹے حارث بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کے نکاح میں تھیں۔

الغرض سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خانوادۂ نبوت سے گوناگوں کئی رشتے داریاں تھیں۔ اس کے علاوہ دورِ نبوی، دورِ صدیقی، دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی میں آپ رضی اللہ عنہ قابلِ ذکر حکومتی اور جہادی خدمات ادا کر چکے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو کاتبِ وحی ہونے کا شرف بھی حاصل رہا اور ساتھ ہی آپ ان صحابہ میں سے تھے جو مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے اور فتاویٰ دیا کرتے تھے۔

لیکن افسوس کہ ان بلند مناقب کے ساتھ ہی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تاریخِ اسلامی کی ان

چند شخصیات میں سے ایک ہیں، جن پر غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں نے بھی ظلم ڈھایا ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ شرفِ صحابیت سے متصف ہونے کے باوجود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو وہ سارے حقوق اور تحفظات نہیں دیے گئے جو اہلِ سنت میں عموماً صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیے جاتے ہیں۔ خاص کر ہر وہ شخص جس نے خلافت کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہا، اس نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات کو ہدفِ تنقید بنانا گویا اپنے موضوع کا خاصا سمجھا اور یہ باور کروانا چاہا کہ بس سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے آتے ہی خلافت کا ادارہ منہدم ہو کر زمین بوس ہو گیا اور مذموم ملوکیت سر اٹھائے ظلم کی جگالی کرنا شروع ہو گئی۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''موجودہ دور کے بعض وہ افاضل جنھوں نے قرنِ اوّل کے حالات و واقعات پر خامہ فرسائی کی ہے، ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے اس دور پر بحث کرتے ہوئے ان بزرگ صحابیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بہت حد تک سطحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان میں ایک طرف ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جیسے آزاد خیال محقق (؟) ہیں تو دوسری طرف علامہ رشید رضا مصری، سید قطب اور مولانا مودودی جیسے بالغ النظر افاضل، ان سب کے درمیان قدرِ مشترک ''جمہوریت'' اور بادشاہت کی بحث ہے۔ یہ سب بے چارے اس غم میں ہلکان ہوئے جا رہے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے کچھ ایسا نامناسب طرزِ عمل اختیار کیا جس نے خلافت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے مکمل بادشاہت میں تبدیل کر دیا۔''[1]

یہی نہیں بلکہ ان افاضل اور ان جیسے دوسرے کئی اہلِ علم نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ''گھناؤنے جرائم'' کی ایک پوری فہرست تیار کر رکھی ہے جس کا منبع و مصدر ضعیف و مردود راویوں سے مروی روایات ہیں۔ جب کبھی کسی مصلح نے حبِ صحابہ کے جذبے سے مغلوب

[1] خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت (صفحہ: ۴۰)

ہو کر ان روایات کی تنقیح کر کے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دوسرے صحابہ کا دامن اس غلاظت سے پاک کرنا چاہا تو ''اسلامی تاریخ کے ضائع'' ہونے کا رونا رویا جانے لگا۔

اسلامی تاریخ کے ضائع ہونے کا نامعقول اندیشہ:

یہ انتہائی عجیب بات ہے کہ جو رواۃ، حدیث کے باب میں لائقِ حجت نہیں، ان کو تاریخ میں امام مانا جاتا ہے۔ واقدی اور کلبی اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آج تک نہ آئی کہ جب ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتا، جس بابت کہ جہنم کی وعید بھی موجود ہے تو پھر دوسری شخصیات کی تو اس کی نظروں میں حیثیت ہی کیا ہوگی کہ ان کی بابت غیر صحیح بات کرتے ہوئے وہ کچھ سوچے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو عقلِ سلیم رکھنے والے کسی بھی انسان کے لیے قبول کرنا ناممکن ہوگا۔ بھلا سورۃ الحجرات کی جس آیت سے خبر کی تصدیق کی طرف اشارہ ملتا ہے اور ہمارے سارے متقدمین و متاخرین علما اس سے علم الجرح و التعدیل کی بنیاد نکالتے ہیں، بھلا اس آیت میں یہ کہاں مذکور ہے کہ اس آیت کا اطلاق صرف اس خبر سے متعلق ہوگا جو حدیثِ رسول کہلائی جانے کی مستحق ہے۔ اس آیت میں تو عام لفظ خبر کا استعمال ہوا ہے، سو وہ ہر خبر سے متعلق ہے چاہے وہ حدیثِ رسول ہوں یا پھر اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم اور خیر القرون کے باقی اصحاب کے حالاتِ زندگی کی بابت اخبار۔

دراصل یہ تاریخ کے ضائع ہونے کا نامعقول اندیشہ ہی تھا جس نے ہمارے علما سے اس بابت تساہل کروایا، حالانکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اگر تاریخ کی چھان پھٹک کے اصول مرتب کر دیے جاتے تو تاریخ ضائع تو کبھی نہ ہوتی، البتہ اس کی صورت نکھر کر ضرور سامنے آجاتی اور ''تلك الغرانيق'' سے لے کر سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے نکاحِ ثانی تک اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ سے لے کر یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کی ولی عہدی تک کے تمام عقدے بغیر کسی مشکل کے حل ہو جاتے۔ مگر مسئلہ یہ ہوا کہ ہمارے علما نے ''تاریخ کے ضائع''

ہو جانے کے اندیشے سے اس متعلق تساہل سے کام لیا جس کے اثرات ہم آج تک بھگت رہے ہیں، جبکہ اسلام کا قانونِ شہادت آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ جب کسی مسلمان کی طرف فسق کی نسبت ہو رہی ہو تو اگر اس بابت معروف و معتبر ادلہ موجود ہوں اور مسلمان کی طرف فسق کی نسبت کرنے والے شاہدین کا کردار عدالت کے تقاضوں پر پورا اترتا ہو تو درست، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو فسق کی نسبت غیر معتبر ٹھہرے گی۔ اسی لیے ہمارا یہ ماننا ہے کہ جن روایات سے خیر القرون کے کسی انسان کے کردار سے متعلق کلام پیدا ہوتا ہے تو اس بابت اسلام کا اصولِ شہادت کم از کم یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ایسی روایت کو خبر پرکھنے کے اصولوں پر جانچ لیا جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر خبر کو اس معیار پر جانچا جائے لیکن کم از کم جس خبر سے کسی مسلمان کے کردار پر حرف آتا ہو، اس کی جانچ سورۃ الحجرات کی آیتِ مبارکہ کے تحت ایک لازمی تقاضا ہے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ اپنی کتاب "منهاج السنة" (٤/ ١٠) میں رقم طراز ہیں:

"منقولات (روایات) میں صدق و کذب دونوں کی افراط ہے، ان کے مابین تمیز علمِ حدیث کی رو سے کی جائے گی۔"

غیر عادل راوی کی بات کسی انسان کے خلاف قابلِ قبول نہیں، چہ جائیکہ وہ خیر القرون کے کسی شخص کے بارے میں ہو۔ سو جس طور سے احادیث کی تنقیح کا کام ہوا ہے، اسی طور سے تاریخ کی تنقیح اور تجزیہ کا کام بھی ہونا چاہیے اور کوئی خبر بغیر چھان پھٹک کے قبول نہ کی جائے، خاص کر جب کہ اس سے کسی شخص کا کردار بھی مجروح ہوتا ہو۔ جبکہ تاریخ کی کتب کا یہ حال ہے کہ اکثر روایات بے سند ہوتی ہیں، کسی کو "ذکروا" اور کسی کو "قيل" یا "يقال" یا "روي عن أصحابنا" یا اسی طرح کے اور مبہم سے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور انھیں روایات کو بنیاد بنا کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے اصحابِ بنو امیہ کو مطعون کیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ دورِ بنو عباس میں جب تاریخ کی تدوین کا کام ہوا تو اس وقت جو کتابیں مدون ہوئیں وہ تاریخ نہیں بلکہ "موادِ تاریخ" پر مبنی تھیں۔

ان کتابوں میں مورخین نے صحیح، غیر صحیح، مستند، غیر مستند، قوی، ضعیف ہر طرح کی روایات جمع کرنے کا التزام کیا تھا، تاکہ بعد میں آنے والے مورخین ان روایات کی چھان پھٹک کر کے صحیح تاریخ از خود مرتب کر لیں، لیکن بعد کے مورخین نے بجائے اس کے کہ ان روایات کی تنقیح کر کے صحیح تاریخ مرتب کرتے، انھوں نے ان روایات کو من و عن وقائع نگاری کر کے اپنی کتب میں بغیر کسی تنقیح کے، جمع کر دیا۔ علامہ ابن کثیر اور امام ابن خلدون رحمہما اللہ نے اس بابت تھوڑی بہت کوشش کی اور بعض روایات کی تنقیح کا کام بھی کیا، لیکن امام ابن جریر طبری سے آگے وہ بھی نہ نکل سکے، یہاں تک کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے تو صراحتاً اعتراف بھی کیا:

''جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس میں سے بعض حصہ محلِ نظر ہے۔ اگر ابن جریر طبری اور دوسرے ائمہ حفاظ نے ان روایات کو نقل نہ کیا ہوتا تو ہم بھی ان کو ترک کر دیتے۔''[1]

گویا صحیح و غیر صحیح روایات کو ایسے ہی مکھی پر مکھی مارتے ہوئے آگے بڑھایا جاتا رہا۔ سو جب عموماً تنقیحِ روایات کا کام ہوا ہی نہیں تو ان کی بنا پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے اصحابِ بنوامیہ پر فردِ جرم عائد کر کے ان کو کیونکر مطعون کیا جا سکتا ہے؟!

مشاجراتِ صحابہ اور خطائے اجتہادی:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بابت مزید طرفہ تماشا یہ ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کو لے کر اختلاف ہو گیا جس کے نتیجے میں جنگِ صفین بھی ہوئی اور کچھ باہمی مناقشات بھی، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ان تمام معاملات میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیثیت ہمیشہ دفاعی رہی۔ اب ہمارے بعض احباب جو خانوادۂ نبوت کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر سادہ لوحی میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مدِ مقابل آنے والے ہر انسان میں طعن کا پہلو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور اتفاق سے مجروح راویوں کے طفیل ان کو ایسے موقع بہم مل بھی جاتے ہیں، لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ یہ نہیں سوچتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابلِ صد لحاظ

[1] البداية و النهاية (٨/٢٠٢)

اور واجب الاحترام شے ہے۔ وہ آدمی بدنصیب ہو گا جو آپ ﷺ کی قرابتوں کا لحاظ نہ کرے، لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے اور معصوم محض کا درجہ کسی کو دینا الگ چیز ہے۔

اہلِ تشیع تو بطورِ عقیدہ حضرات فاطمہ، علی، حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو عصمت کے درجے میں فائز کرتے ہیں اور ان کو معصوم عن الخطاء باور کرواتے ہیں، البتہ اہلِ سنت حضرات بطور عقیدہ تو یہ بات نہیں مانتے مگر اقلیت کو چھوڑ کر اہلِ سنت عوام کی اکثریت اسی ذہنی رویے کی شہادت دیتے ہوئے ان حضرات سے کسی خطا کے صدور کو ناممکنات میں تصور کرتی ہے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک تو پھر بھی حضرات اہلِ سنت صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں طعن کرنے سے رکے رہتے ہیں، لیکن جیسے ہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے اختلاف کی کہانی شروع ہوتی ہے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ایک معصوم شبیہ اپنے دل و دماغ میں بنا کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو کٹہرے میں کھڑا کر کے ان پر فردِ جرم عائد کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے لے کر عشرہ مبشرہ سیدنا طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ و سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ تک سب کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں خطائے اجتہادی پر باور کروانے میں ذرا سی جھجک محسوس نہیں کرتے، لیکن اگر کوئی صاحب حضرات عائشہ، معاویہ، طلحہ، زبیر بن العوام، عمرو بن العاص، عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پورے احترام کے ساتھ خطائے اجتہادی پر کہہ دے تو اس پر ناصبیت کے فتوے کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ گویا ذاتِ علی رضی اللہ عنہ میں ذات محمد ﷺ پنہاں ہوں، جو معصوم عن الخطاء تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں محاکمہ کرنے کا اگر کوئی اہل تھا تو وہ خود صحابہ تھے۔ بعد کے لوگ جو نہ اس زمانے میں موجود تھے، جن کو نہ ہی ان حالات کا صد فیصد درست علم ہو سکتا تھا اور نہ ہوا، ان کی اس طرح کی تمام آرا صرف قیاس ہی پر مبنی ہو سکتی ہیں، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ روئے زمین نے بعد از انبیا ان سے بزرگ ہستیاں نہیں دیکھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو نہ صرف

سیرت میں جی رہے تھے، بلکہ سیرت بنا بھی رہے تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک بہت لطیف نکتے کی جانب اشارہ کیا تھا کہ اس دنیا میں ہر نبی کی کامیابی کے پیچھے اللہ کی مدد مختلف اسباب کے ساتھ ہی ہوتی ہے، نبی ﷺ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی شکل میں وہ اسباب مہیا آئے تو قیصر وکسریٰ کی حکومتیں مسلمانوں کی ٹھوکروں میں آ پڑیں، جبکہ موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی شکل میں وہ اسباب مہیا ہوئے تو انھوں نے ایک جنگ میں جانے کے لیے سو حیلے بہانے کیے۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت سے متعلق اہلِ تشیع کا پروپیگنڈہ ہمیشہ سے اہلِ سنت کی کتب میں کسی نہ کسی طرح سے داخل رہا ہے۔ کبھی یہ معتدل شیعوں کی جانب سے تھا جن کا سیاسی میلان سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف تھا تو کبھی غالی شیعوں کی جناب سے جن کا مذہبی میلان سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جانب تھا۔ اس لیے ہر دو طرف سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مقابل آنے والے لوگوں کی کردارکشی کی گئی اور جو لوگ اس بابت معتدل تھے تو انھوں نے اس کردارکشی کو خطائے اجتہادی سے بدل ڈالا۔

اہلِ سنت کی سیرت و تاریخ کی کتب میں ایسے کئی نام موجود ہیں جو احادیث کے جلیل القدر رواۃ تھے، لیکن ان کا سیاسی میلان تشیع کی جانب تھا، سو اپنے ذہنی میلان سے مجبور ہوکر انھوں نے بہت سے ایسے ادراج کیے یا پھر احادیث کو ایسے پیرائے میں نقل کیا کہ جس سے شیعی پروپیگنڈے کو کسی نہ کسی طرح سے تقویت ملتی رہی۔ یقین نہ آئے تو ہر اس راوی کی روایات اٹھا کر جائزہ لے لیا جائے جس پر ادنیٰ درجے میں بھی تشیع کی طرف میلان ہونے پر کلام کیا گیا ہے۔ یہ سب حضرات بلاشبہ ثقہ امام ہیں اور درحقیقت احکام میں ان کی روایات ایسی شاندار ہیں کہ آبِ زر سے لکھنے اور عمل کرنے کے لائق ہیں، لیکن تاریخ یا مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعلق ان لوگوں کی روایات کو اہلِ عدل کے لیے بغیر تاویل اور چھان پھٹک کے قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سو جب ان اصحاب نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی نزاعات کے بارے میں کچھ لکھنا چاہا تو وہاں غیر اختیاری طور پر ہی سہی، لیکن ان

کا میلان سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جانب رہا، سو جب بھی تاریخ لکھی گئی تو اسی طرح سے لکھی گئی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ درست اور ان کے مدِمقابل آنا والا غلط۔

اب چونکہ یہ حضرات بعد میں آنے والے علما و محدثین کی نظروں میں نہ صرف جلالتِ قدر رکھتے تھے، بلکہ حد درجہ لائقِ اتباع بھی تھے، سو ان کی باتوں، محاکموں اور نظریات کو زیادہ تر آنکھیں بند کر کے مان لیا گیا اور پھر آہستہ آہستہ پوری امت اسی بات کی ہمنوا ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ اہلِ سنت کے ہاں خلفائے راشدین کی تعداد کو صرف چار تک ایسے محدود و مقید کر دیا گیا گویا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی حدیث میں فرمایا ہو کہ خلفائے راشدین چار ہی ہوں گے، حالانکہ قرآن تو صریح الفاظ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں صراحت کرتا ہے: ﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ﴾ [الحجرات: ٧] یعنی تمام صحابی راشد ہیں۔ سو ایسی ہر خلافت جس کا سربراہ کوئی صحابی ہوگا اور جس کی برپا کردہ خلافت کے عمال میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی کثرت ہوگی اور جس کی خلافت پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہوگا، وہ خلافت، خلافتِ راشدہ ہوگی اور وہ خلیفہ، خلیفۂ راشد۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ راشد کے منصب سے اتار کر ملک، یعنی بادشاہ بنا دیا گیا اور جن لوگوں نے بہت احسان اور اعتدال بھی دکھایا تو انھوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو ''الملک العادل'' (ایک عادل بادشاہ) قرار دے دیا۔ مقامِ حیرت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خانہ جنگی والا دور جس میں سبائی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے پر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین تلواریں چلیں اور خانہ جنگی کا شکار ہو کر ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے، وہ دور تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذاتی فضلیت کی بنا پر خلافتِ راشدہ کہلاتا ہے، لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور جو امن و امان، صلح و آشتی اور جہاد کا دور تھا، وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے شرفِ صحابیت اور ان تمام اوصاف کے باوجود خلافتِ راشدہ نہ کہلا سکا۔ فیا للعجب!

آخر کوئی تو بتائے کہ صحیح روایات کے تحت وہ کون سی خصوصیات تھیں جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ

کے دور میں تھیں، لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں نہیں تھی، جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خلیفہ راشد کے منصب پر بیٹھنے سے روک رہی تھیں۔ یاد رہے ہم نے یہاں صحیح روایات کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ سو اس فکری تضاد کی وجہ یہی ہوئی ہے کہ ہمارے چند علما نے شروع میں صرف اپنے ذہنی میلان کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو ملزم کے کٹھرے میں کھڑا کر دیا تھا اور چونکہ ان علما کا مقام و مرتبہ بلا شک وشبہہ امت میں متفق علیہ تھا، سو ان علما کی اس اجتہادی غلطی کو بعد کے علما ان کے مقام و مرتبے سے متاثر ہو کر قبول کرتے چلے گئے اور اس طرح سے مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے معاملے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین خطائے اجتہادی کا نظریہ وجود میں آیا جو دراصل خود ایک بڑی خطائے اجتہادی ہے۔

اس نظریے یا طرزِ عمل کا مزید نقصان یہ ہوا کہ جس تعصب کی عینک کو لگا کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حامی ان کے مدمقابل گروہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھتے تھے، اس سے زیادہ نمبر کی عینک لگا کر کچھ لوگوں نے خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھنا شروع کر دیا، سو اس ردِ عمل کی نفسیات نے شیعیت کے مقابلے میں ناصبیت کو جنم دینا شروع کیا۔ یوں ایک غلط طرزِ عمل نے دوسرے غلط طرزِ عمل کو جنم دے ڈالا۔ اگر اس غلط طرزِ عمل کو شروع میں ہی نہ پنپنے دیا جاتا تو ردِ رافضیت کا مخالفانہ بیانیہ کبھی وجود میں نہ آتا اور یوں ناصبیت کی کونپلیں اس امت میں نہ پھوٹتیں۔ یقین جانیے آپ آج اہلِ سنت کی زمین سے شیعیت کی یہ خودرو گھاس اکھاڑ پھینکنا شروع کر دیں تو کچھ ہی دنوں میں ناصبیت دم توڑ دے گی۔ لیکن اس کے لیے ہمیں تحمل اور ایک دوسرے کو سمجھ کر ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے اور یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ بعض معاملات میں ہمارے اکابر سے سہو ہو گیا ہے، سو ان کے سہو پر ہم کو اصرار کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمارے اکابر ہی ہم کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت کا درس دے گئے ہیں، سو حبِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے تحت اگر ہم اپنے اکابر کی کسی بات سے اختلاف کرتے بھی ہیں تو اس سے ان کا مرتبہ کم نہیں ہو جاتا، کیونکہ دوسری جانب ہم ان کی حُبِ صحابہ رضی اللہ عنہم

سے متعلق رائے پر ہی عمل کر کے یہ کام کر رہے ہیں۔ اور ساتھ میں کم از کم اس متعلق کام کرنے والے لوگوں پر ناصبیت کی پھبتیاں کسنا بھی بند کر دیں، کیونکہ یہ ناصبیت کی پھبتیاں دوسرے لوگوں کو آپ پر شیعیت و رافضیت کی تہمت لگانے کا جواز فراہم کرتی ہیں۔

الغرض سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض دراصل سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مقابل آنے کی بنا پر ہوا جس کو مزید تقویت واقعہ کربلا سے مل گئی۔ ابومخنف جیسے کذاب تاریخی رواۃ نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو امیر یزید رحمہ اللہ کا حریف بنا کر پیش کیا تو گویا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے فردِ جرم میں امیر یزید رحمہ اللہ کی جانشینی کا اور اضافہ ہو گیا۔ وہاں سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور سیدہ ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے والدین تھے سو تاریخی روایتوں میں ان کو بھی جی بھر کر مطعون کیا گیا۔ پھر مزید طرفہ یہ ہوا کہ خلافت بنوامیہ میں منتقل ہو گئی اور علوی ان کے خلاف گاہے بگاہے خروج کرتے رہے سو پورا کا پورا خاندان بنوامیہ ہی مطعون ٹھہرا۔ رہی سہی کسر بنوعباس کے دور میں ہونے والی تاریخ نویسی نے پوری کر دی جس میں خاندانِ عبدِمناف کے ان دو فرزندوں کی اولاد کو عہدِ جاہلیت ہی سے ایک دوسرے کا سیاسی حریف اور دشمن بنا کر پیش کیا گیا، جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

بنوامیہ اور بنو ہاشم کے معاشرتی تعلقات:

جب ہم انساب کی مستند کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بنوامیہ اور بنو ہاشم کے درمیان کثرت سے مصاہرت کے رشتے اور معاشرتی تعلقات استوار رہے جو قبل از اسلام سے لے کر جنگِ صفین اور واقعہ کربلا کے بعد تک چلتے رہے۔ دراصل یہ نظریہ ہی سخت غلط فہمی پر مبنی ہے کہ بنوامیہ و بنو ہاشم میں کسی طور کی دشمنی پائی جاتی تھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قریش کے مختلف بطون میں سے یہ دو بطن سب سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب اور ایک دوسرے کے لیے دوسرے قبیلوں اور بطون کی بہ نسبت زیادہ عصبیت رکھتے تھے، کیونکہ یہ دونوں ایک ہی جد، عبدمناف کی اولاد میں سے تھے۔ عبدمناف کے چار بیٹوں کا انساب کی کتب

میں ذکر ملتا ہے: ہاشم، نوفل، مطلب اور عبد شمس۔ ہاشم نبی ﷺ کے پردادا تھے، یعنی ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب، عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ اور عبداللہ کے بیٹے محمد ﷺ۔ جبکہ عبدِ شمس سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے پردادا تھے، یعنی عبد شمس کے بیٹے امیہ، امیہ کے بیٹے حرب اور حرب کے بیٹے ابوسفیان رضی اللہ عنہ تھے۔ قریش کے باقی خاندان بنومخزوم اور بنواسد وغیرہ کی بنو ہاشم سے اس قدر قریبی رشتے داری نہ تھی جتنی کہ بنوامیہ کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان دونوں خاندانوں میں کثرت سے مصاہرت کے رشتے اور معاشرتی تعلقات استوار رہے جن کی تفاصیل درج ذیل ہے:

① عہدِ جاہلیت میں نبی ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے اپنی دو بیٹیاں صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا اور امِ حکم کی شادیاں بنوامیہ میں حارث بن حرب اور کریز بن ربیعہ سے کیں۔ یہ حارث بن حرب سیدنا ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ یوں سیدنا معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی ایک چچی نبی ﷺ کی پھوپھی تھی۔[1]

② اسی طرح عبدالمطلب نے اپنے ایک بیٹے ابولہب بن عبدالمطلب کی شادی بنوامیہ میں اُمِ جمیل بنت حرب سے کی تھی جو سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بہن تھی۔ یہ وہی ابولہب ہاشمی اور امِ جمیل اموی ہیں جن کو سورۃ لہب میں جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔[2] اس ابولہب کے مسلمان پڑپوتے فضل بن عباس بن عتبہ بن ابولہب کو اپنی اس ننھیالی اموی نسبت پر اس قدر فخر تھا کہ انھوں نے باقاعدہ اپنے اشعار میں اپنی اس نسبت کا یہ کہہ کر فخریہ تذکرہ کیا ہے:

عبد شمس أبي، فان كنتِ غضبى
فاملئى وجهك الجميل خموشا[3]

---

① مصعب زبیری (صفحہ: ۱۸۔۱۹)، طبقات ابن سعد (۸/۴۱۔۴۶)، انساب الاشراف (۱/۸۸۔۹۰)

② مصعب زبیری (صفحہ: ۸۹)، طبقات ابن سعد (۴/۵۹)

③ طبقات فحول الشعراء (ص: ٦٢)

③ عربوں میں ایک دستور ندیمی اور دوستی کا ہوتا تھا جس میں دو خاندانوں کے بڑے آپس میں گہرے ندیم و دوست ہوتے تھے۔ ایسی ہی ایک دوستی سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے درمیان بھی تھی، اسی وجہ سے فتح مکہ سے ایک دن قبل سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ سواری پر بٹھا کر بارگاہِ رسالت میں قبولِ اسلام کے لیے لے گئے تھے۔[1]

④ اسی طرح ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کے بھائی حارث بن حرب اور عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے بھائی حارث بن عبدالمطلب بھی آپس میں گہرے دوست اور ندیم تھے۔ حارث بن حرب کے انتقال کے بعد حارث بن عبدالمطلب نے سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کے والد اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عوام بن خویلد اسدی سے رشتۂ منادمت قائم کرلیا تھا۔[2]

⑤ بعینہٖ اسی طور سے سیدنا عثمان بن عفان اموی رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حارث بن عبدالمطلب کے فرزند جناب ربیعہ بن حارث ہاشمی رضی اللہ عنہ سے اسلام سے قبل سے لے کر عہدِ عثمانی تک گہری دوستی اور منادمت تھی۔[3]

⑥ عہدِ جاہلیت میں حارث بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی ایک صاحبزادی ہند بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا تھا۔ یہ ہند رضی اللہ عنہ ام المومنین سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔[4]

⑦ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی سیدہ زینب بنت محمد رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنے اموی خالہ زاد بھائی سیدنا ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ سے قبل از اسلام ہی ہوا تھا جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد بھی برقرار رکھا اور اسی نکاح کے تحت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو

---

[1] كتاب المحبر (ص:١٧٤)

[2] كتاب المحبر (ص: ١٧٧)

[3] أنساب الأشراف (٣٩/٥)

[4] أنساب الاشراف (٤٤/١)

سیدنا ابو العاص رضی اللہ عنہ کے پاس واپس لوٹا دیا تھا۔[1]

⑧ بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیوں سیدہ رقیہ اور سیدہ امِ کلثوم رضی اللہ عنہما کا نکاح یکے بعد دیگرے سیدنا عثمان بن عفان اموی رضی اللہ عنہ سے کیا اور یہاں تک فرمایا کہ اگر میری دس لڑکیاں بھی ہوتیں تو میں ان کو ایک کے بعد عثمان کی زوجیت میں دے دیتا۔[2]

⑨ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے اموی داماد سیدنا ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو انھوں نے سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو اپنا وصی بنایا اور اپنی بیٹی امامہ بنت ابو العاص رضی اللہ عنہا کی بابت ان کو تاکید کی کہ ان کا کسی اچھے خاندان میں رشتہ کر دیں۔ اسی اثنا میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال بھی ہوگیا۔ سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے اپنا حقِ ولایت استعمال کرتے ہوئے امامہ بنت ابو العاص رضی اللہ عنہ اموی کا نکاح سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہاشمی سے کر دیا۔[3]

⑩ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی رملہ بنت علی رحمہ اللہ، مروان رضی اللہ عنہ بن الحکم کے فرزند معاویہ بن مروان رحمہ اللہ کے ساتھ بیاہی گئیں جو خلیفہ عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے حقیقی بھائی تھے۔[4]

⑪ اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دوسری صاحبزادی انھی سیدنا مروان رضی اللہ عنہ بن الحکم کے بیٹے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے ساتھ بیاہی گئی تھیں۔[5]

⑫ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تیسری صاحبزادی خدیجہ بنت علی رضی اللہ عنہا امیر عامر رضی اللہ عنہ بن کریز اموی کے فرزند عبدالرحمٰن بن عامر اموی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیاہی گئی تھیں۔[6]

---

[1] تاريخ طبري (٤٧٢/٢)

[2] طبری وابن سعد۔

[3] مصعب زبیری (ص:٢٢)، طبقات ابن سعد (٢٣٣/٦)، أنساب الاشراف (٤٠٠/١)

[4] جمهرة الأنساب لابن حزم (ص: ٨٠)

[5] البداية والنهاية (٦٩/٩)

[6] جمهرة الأنساب (ص: ٦٨)

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی ایک نہیں، بلکہ چھے پوتیاں اموی خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔

⑬ سیدہ نفیسہ رحمہا اللہ بنت زید بن حسن کی شادی خلیفہ ولید بن عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ سے ہوئی۔[1]

⑭ ان نفیسہ رحمہا اللہ کی چچا زاد بہن زینب بنت حسن مثنیٰ بن حسن کی شادی بھی خلیفہ ولید بن عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ سے ہوئی تھی۔[2]

⑮ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی تیسری پوتی ام قاسم بنت حسن مثنیٰ بن حسن کی شادی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پوتے مروان بن ابان بن عثمان رحمہ اللہ سے ہوئی۔ مروان بن عثمان کے انتقال کے بعد یہ امِ قاسم، علی بن حسین (زین العابدین) کے عقد میں آئیں۔[3]

⑯ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی چوتھی پوتی سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کے ایک فرزند معاویہ رحمہ اللہ بن مروان بن الحکم کے عقد میں آئیں جن کے بطن سے حسن رضی اللہ عنہ کے اموی نواسے ولید بن معاویہ متولد ہوئے۔[4]

⑰ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی پانچویں پوتی حمادہ بنت حسن مثنیٰ مروان رضی اللہ عنہ کے ایک بھتیجے کے فرزند، اسماعیل بن عبدالملک بن الحارث بن الحکم کو بیاہی گئی تھیں۔[5]

⑱ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی چھٹی پوتی خدیجہ بنت الحسین بن حسن بن علی رحمہ اللہ کی شادی بھی اپنی چچیری بہن حمادہ کے نکاح سے پہلے اسماعیل بن عبدالملک بن الحارث بن الحکم سے ہوئی تھی جن کے بطن سے حسن رضی اللہ عنہ کے چار اموی نواسے محمد الاکبر، حسین، اسحٰق

---

[1] عمدة الطالب (ص: ٤٤)

[2] جمهرة الأنساب (ص: ٣٦)

[3] جمهرة الأنساب (ص: ٣٧)

[4] جمهرة الأنساب (ص: ٨٠، ١٠٠)

[5] جمهرة الأنساب (ص: ١٠٠)

اور مسلمہ پیدا ہوئے۔[1]

سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی طرح سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے گھر کی خواتین بھی کثرت سے بنو امیہ میں بیاہی گئی تھیں۔

(۱۹) سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی صاحبزادی سکینہ نے اپنے شوہر مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقتول ہو جانے کے بعد سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کے پوتے الاصبغ بن عبدالعزیز بن مروان سے نکاح کیا جو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بھائی تھے۔ ان الاصبغ کی دوسری بیوی یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کی بیٹی ام یزید رحمہ اللہ تھیں۔[2]

(۲۰) سکینہ بنت حسین رحمہ اللہ کا ایک اور نکاح عثمان بن عفان کے پوتے زید بن عمرو بن عثمان اموی سے ہوا تھا، لیکن بعد میں ان سے علاحدگی ہو گئی تھی۔[3]

(۲۱) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی نواسی ربیحہ بنت سکینہ جو ان کے شوہر عبداللہ بن عثمان بن عبداللہ بن حکیم سے تھیں، مروان رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے العباس بن ولید بن عبدالملک بن مروان کو بیاہی تھیں۔[4]

(۲۲) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی دوسری صاحبزادی سیدہ فاطمہ رحمہ اللہ کا نکاح ثانی اپنے شوہر حسن مثنیٰ کے بعد اموی خاندان میں عبداللہ بن عمرو بن عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ سے ہوا۔[5]

(۲۳) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ایک پڑپوتے حسن بن حسین بن علی بن حسین کی شادی اموی خاندان میں خلیدہ بنت مروان بن عنبسہ بن سعد بن العاص بن امیہ سے ہوئی تھی۔[6]

---

[1] جمهرة الأنساب (ص: ١٠٠)

[2] کتاب نسب قریش (ص:۵۹)، المعارف لابن قتیبہ (ص:۹۴)

[3] المعارف لابن قتيبه (ص: ٩٣)، جمهرة الأنساب (ص: ٧٩)

[4] کتاب نسب قریش، مصعب زبیری (ص:۵۹)

[5] جمهرة الأنساب (ص: ٧٦)

[6] جمهرة الأنساب (ص: ٤٧)

۲۴ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ایک اور پڑپوتے اسحاق بن عبداللہ بن علی بن حسین کی شادی اموی وعثمانی خاندان میں عائشہ بنت عمر بن عاصم بن عثمان ذی النورین سے ہوئی تھی۔[1]

اس کے علاوہ بنو ہاشم و بنوامیہ میں دیگر رشتے داریاں بھی ہوتی رہیں:

۲۵ حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے بھائی عباس بن علی رضی اللہ عنہ کی پوتی نفیسہ بنت عبیداللہ بن عباس بن علی کی شادی خلیفہ یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کے پوتے عبداللہ بن خالد بن یزید سے ہوئی۔[2]

۲۶ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بھتیجے محمد بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی صاحبزادی رملہ کا نکاح مروان رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے سلیمان بن خلیفہ ہشام بن خلیفہ عبدالملک بن خلیفہ مروان سے ہوا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان ہاشمیہ خاتون کا نکاح ثانی ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے ابو القاسم بن ولید بن عتبہ بن ابوسفیان سے ہوا تھا۔ ان ابو القاسم بن ولید کی والدہ لبابہ بنت عبیداللہ بن عباس بن عبدالمطلب یعنی حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی رشتے میں چچیری بہن تھیں اور ان کے اموی شوہر ولید بن عتبہ بن ابوسفیان امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھتیجے تھے۔[3]

۲۷ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بھانجی ام کلثوم بنت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا نکاح، جو زینب بنت علی رضی اللہ عنہما کے بطن سے تھیں، اول اپنے چچا زاد قفی سے ہوا جن سے ایک بیٹی ہوئی، پھر زوجین میں علیحدگی ہوگئی۔ ان کا تیسرا نکاح اموی خاندان میں عثمان رضی اللہ عنہ کے فرزند ابان بن عثمان سے ہوا، یعنی یہ ام کلثوم، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی بہو ہوتی تھیں۔[4]

۲۸ سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے حقیقی چچیرے بھائی اور بہنوئی عبداللہ بن جعفر طیار کی

---

(1) جمهرة الأنساب (ص: ٧٥)

(2) جمهرة الأنساب (ص: ١٠٣) كتاب نسب قریش (ص: ٧٩)

(3) جمهرة الأنساب (ص: ١٠٢)

(4) المعارف لابن قتيبه (ص: ٩٠)، جمهرة الأنساب (ص: ٦١، ١١٤)

دوسری صاحبزادی امِ محمد کا نکاح خلیفہ یزید بن معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ اس حساب سے خلیفہ یزید بن معاویہ، حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے بھتیجے داماد تھے۔سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی بہن زینب بنت علی ان ام محمد کی سوتیلی والدہ تھیں اور اس ناتے سے یزید بن معاویہ سیدہ زینب بنت علی کے داماد تھے۔

۲۹ سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا ایک نکاح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن سیدہ میمونہ بنت ابو سفیان رضی اللہ عنہا کی بیٹی لیلیٰ بنت ابومرہ بن عروہ بن مسعود ثقفی سے ہوا تھا، جن سے جناب علی اکبر متولد ہوئے تھے۔[1]

یہ اور اس طرح کی اور بہت سی رشتے داریاں ہیں جو بنوامیہ و بنو ہاشم میں ہوتی رہیں، ہم طوالت کے خوف سے انھیں یہاں نقل نہیں کر رہے۔ ان رشتے داریوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بنی امیہ اور بنی ہاشم کے مابین دشمنی و عداوت کی حکایتیں سراسر بے سروپا ہیں۔تاہم غور طلب امر یہ ہے کہ کچھ کو چھوڑ کر مذکورہ بالا تمام رشتے داریاں واقعہ صفین و کربلا کے بعد کی ہیں جو ان واقعات کی افسانوی اور عوام میں مشہور کہانیوں پر سوال کھڑا کر دیتی ہیں۔ لہٰذا آگے عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے ۔ یہ تو صرف چند رشتے داریاں اور معاشرتی تعلقات بیان کیے گئے ہیں جو بنوامیہ و بنو ہاشم کے مابین دشمنی و عداوت کی تمام وضعی داستانوں کی قلعی کھولنے کو کافی ہیں۔جن احباب کو اس بابت مزید تفصیل مطلوب ہو ان کو چاہیے کہ ڈائریکٹر علومِ اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کی تالیف ''بنو ہاشم اور بنوامیہ کے معاشرتی تعلقات'' کا مطالعہ فرمائیں۔

بنوامیہ و بنو ہاشم اور سبقتِ اسلام:

پھر بنوامیہ و بنو ہاشم کو باہم دشمن بنانے سے بھی تسلی نہیں ہوئی تو بنوامیہ پر یہ الزام عائد کر دیا گیا کہ کُل کا کُل خاندان بنوامیہ اوائل دعوتِ اسلامی کے دور سے ہی اسلام سے بے خبر،

[1] مصعب زبیری کتاب نسب قریش (۵۷، ۱۲۶)

بلکہ اس کا سخت دشمن تھا اور یہ خاندان فتح مکہ کے بعد سیاسی دباؤ کے تحت اسلام لایا تھا۔ یہاں تک کہ ندوۃ العلماء کے ایک فاضل نگران نظامِ تعلیم نے تو اس بابت یہاں تک خامہ فرسائی فرمائی کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ و سیدہ ہند رضی اللہ عنہا کے اسلام کو استسلام قرار دے کر واقعہ کربلا کو غزوۂ بدر کا انتقام قرار دے ڈالا، شیعی اثرات ہم اہلِ سنت سے جو نہ کروائیں سو تھوڑا ہے۔ جبکہ حقیقت میں یہ اعتراض ہی سخت لغو ہے کہ بنو امیہ و بنو ہاشم میں بنو امیہ نسبتاً اسلام مخالف اور آخری دور میں اسلام قبول کرنے والے تھے جو درست تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے تیرہ سال مکہ معظّمہ میں تبلیغِ دین کی تھی۔ اس عرصے میں ہاشمی خاندان میں صرف تین اشخاص یعنی دو مرد اور ایک خاتون آبائی مذہب ترک کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ان تین اشخاص کے برخلاف بنو امیہ میں سے دس اشخاص نے ابتدائے ظہورِ اسلام میں اسلام قبول کر کے اول ایمان میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

❀ قدیم الاسلام اشخاص بنو ہاشم:

① سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ (جنگِ احد میں شہید ہوئے)۔

② سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (سابقون الاولون اور ہجرتِ حبشہ میں شامل تھے)۔

③ سیدہ ام لفضل رضی اللہ عنہا زوجہ عباس رضی اللہ عنہ (سابقون الاولون میں سے تھیں)۔

اس فہرست میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ یہاں ہم نے اعلانِ نبوت وقبولِ اسلام کے وقت صرف بالغ لوگوں کی فہرست دی ہے، سو اسی لیے مذکورہ اشخاص کا نام داخل فہرست نہیں کیا، کیونکہ مذکورہ افراد اعلانِ نبوت وقبولِ اسلام کے وقت نہ صرف کم سن تھے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ کفالت بھی تھے۔

❀ قدیم الاسلام اشخاص بنو امیہ:

① سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ (سابقون الاولون اور دو ہجرتیں کرنے کا شرف حاصل رہا)۔

② سیدنا ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ بن عتبہ برادر خوشدامن رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہند رضی اللہ عنہا بنت عتبہ (بدری صحابی اور سابقون الاولون میں سے تھے)۔

③ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ بن سعید بن العاص بن امیہ (تیسرے یا چوتھے نمبر پر اسلام قبول کرنے والے موحد تھے)۔

④ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ بن سعید اموی (بدری صحابی تھے)۔

⑤ سیدنا عبداللہ بن الحکم بن سعید اموی رضی اللہ عنہ (بدر میں شہید ہوئے)۔

⑥ سیدنا ابان رضی اللہ عنہ بن سعید اموی (یوم طائف میں شہید ہوئے)۔

⑦ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت ابوسفیان (قدیم الاسلام تھیں اور حبشہ ہجرت کی)۔

⑧ سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ بن حبیب بن عبد شمس (سابقون الاولون میں سے تھے)۔

⑨ ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت عقبہ بن ابی معیط (قدیم الاسلام تھیں، ان کے بھائی ولید فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے)۔

⑩ والدہ عیسیٰ بن کریز اموی رضی اللہ عنہ (قدیم الاسلام تھیں اور اسلام کی خاطر بہت دکھ سہے)۔

سو یہ کہنا تو کسی طور درست نہیں کہ صرف بنو امیہ اوائلِ اسلام میں اسلام دشمن تھے۔ بنو امیہ بھی بالکل ویسے ہی اسلام دشمن تھے جیسا کہ قریش کے اور قبیلے، اور اگر تقابل کیا جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے سبب قدیم الاسلام لوگوں میں اکثریت بنو ہاشم کی ہونی چاہیے تھی لیکن ہمیں ایسا کچھ نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ کُل کا کُل خاندان بنو ہاشم سوائے ابولہب کے خاندانی عصبیت کے تحت شعب بنی ہاشم کی سختیاں تین سال تک برداشت کر لیتا ہے، لیکن پھر بھی اکثریت اسلام قبول نہیں کرتی، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب بھی دینِ شرک پر جان دے دیتے ہیں۔

سو اول تو یہ کہ اوائلِ اسلام میں خاندانوں کے طرزِ عمل کا تقابل کر کے کسی خاندان کو مطعون کرنا قطعی درست طرزِ عمل نہیں، کیونکہ کسی بھی انسان کا آخری عمل اس کے بارے

میں شہادت کے لیے کافی ہے اور چونکہ فتح مکہ کے بعد سارا قریش داخل اسلام ہو چکا تھا سو اس طرح کا ہر الزام وطعن کالعدم ہو جاتا ہے، لیکن اگر پھر بھی کوئی بنو امیہ دشمنی اور بنو ہاشم کی محبت میں اس طرح کے تقابل پر مصر رہتا ہے تو یقین کیجیے کہ یہ تقابل خود اس کے خلاف جائے گا کہ اوائلِ اسلام میں ایمان قبول کرنے والے لوگوں میں بنو امیہ کے لوگوں کی تعداد بنو ہاشم کے لوگوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ اسی لیے تو سورۃ الشوریٰ میں نبی کریم ﷺ کو اپنی قرابت کا واسطہ دے کر قبیلہ قریش سے بالعموم اور خاندان بنو ہاشم سے بالخصوص دین کی مخالفت سے رک جانے کی استدعا کرنی پڑی تھی۔

سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور مخالفتِ اسلام:

اب جب اس محاذ پر پسپائی کا سامنا ہوتا ہے تو فوراً اسلام قبول کرنے سے پہلے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اسلام مخالف کارروائیوں کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ جنگِ احد واحزاب میں کافروں کی سپہ سالاری کرتے اللہ کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف نکلے، لیکن اس طرح کے لغو اعتراض کرتے ہوئے اس تاریخی حقیقت سے آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں یا پھر اس سے دانستہ تغافل برتا جاتا ہے کہ سوچنے کی بات ہے کہ عاص بن وائل کے صاحبزادے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، ولید بن مغیرہ کے صاحبزادے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، امیہ بن خلف کے صاحبزادے صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ، ابوجہل کے صاحبزادے عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل، سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سیدنا یزید و معاویہ رضی اللہ عنہما وغیرہ سب تقریبا ہم عمر اور آپس میں دوست تھے، لیکن کیا وجہ ہوئی کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادوں سیدنا یزید و معاویہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ باقی سارے اصحاب اسلام کے خلاف جنگوں میں نکلتے رہے، حتی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا سگا بڑا بھائی طالب بن عبدِ مناف تک مسلمانوں کے خلاف جنگِ بدر میں شامل ہو کر قتل ہوا۔

نبی کریم ﷺ کے بڑے داماد ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ اور چچا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ تک بدر میں کفار کی جانب سے مسلمانوں سے لڑنے آئے اور گرفتار ہو کر فدیہ لے کر

چھوڑے گئے۔ لیکن صرف سیدنا ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے دونوں صاحبزادے کبھی مسلمانوں کے خلاف نہیں نکلے اور نہ ان کے والد و والدہ کا ان لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف نکلنے کے لیے مجبور کرنے کا کوئی واقعہ ملتا ہے، جب کہ اسی طور کا مجبور کرنے کا واقعہ ولید بن ولید رضی اللہ عنہ کا جنگ بدر سے متعلق ملتا ہے اور سیدنا سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کا اپنے بیٹوں عبداللہ رضی اللہ عنہ اور ابو جندل رضی اللہ عنہ کو بھی مسلمانوں کی مخالفت پر مجبور کرنے کا ذکر ملتا ہے، لیکن پورے دورِ جاہلیت میں ایک واقعہ نہیں ملتا کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور سیدہ ہند رضی اللہ عنہا نے اپنے صاحبزادوں کو اسلام کے خلاف نکلنے پر مجبور کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے کی تاریخ میں ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے دونوں فرزندوں کا کوئی خاص ذکر نہیں ملتا۔

صرف ان نکات پر غور کرنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بنو امیہ کی تنقیص میں وارد روایات کس قدر بے اصل و بے بنیاد ہیں جن میں کہ بنو امیہ و بالخصوص بنو ابوسفیان کو اسلام دشمن ثابت کیا جاتا ہے۔ نہ ہی سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی فتح مکہ سے پہلے کی اسلام مخالفت اس طور کی تھی جس طور کی مخالفت ابوجہل، ابولہب و ولید بن مغیرہ وغیرہ کی تھی اور نہ ہی سیدنا معاویہ و سیدنا یزید رضی اللہ عنہما کسی طور بھی اسلام دشمن رہے تھے جس طور کے اسلام دشمن سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، سیدنا عکرمہ بن ابوجہل رضی اللہ عنہ وغیرہ رہ چکے تھے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کبھی اسلام کی مخالفت میں کوئی قابلِ ذکر اقدام کیا ہی نہیں۔ وہ تو جب جنگِ بدر میں بیشتر سردارانِ مکہ مارے گئے تو لامحالہ مکہ کی سرداری ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر آئی اور پھر ان کے سارے اقدام سردارِ مکہ کی حیثیت سے مقتولینِ بدر کے انتقام کے طور پر تھے۔ گویا اگر سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو جنگِ بدر کے بعد مکہ کی سرداری نہ ملتی تو شاید ان کی اسلام مخالفت بھی اس طور سے سامنے نہیں آتی جیسا کہ سردارِ مکہ کی حیثیت سے بعد میں سامنے آئی۔ اگر سردارِ مکہ ہونے کی حیثیت کے علاوہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو اسلام سے دیگر مشرکین کی طرح کوئی ذاتی عداوت و بغض ہوتا

تو سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ اپنے بیٹوں کو اسلام کے خلاف لڑنے والی جنگوں میں ضرور آگے کرتے، جیسا کہ باقی مشرکین نے عرب کے عام رواج کے مطابق کیا، خاص کر جنگِ احد و احزاب میں جن میں کفار کے لشکر کی کمان سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں تھی۔

مقامِ حیرت ہے کہ ایک شخص خود تو اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑنے آتا ہے لیکن عرب کے عام دستور کے خلاف اپنے بیٹوں کو جنگوں میں شرکت پر مجبور نہیں کرتا۔ یہی بات ثابت کر دیتی ہے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اسلام مخالفت صرف سردارِ مکہ کی حیثیت سے تھی، اس میں کسی ذاتی بغض و عداوت کا دخل نہیں تھا۔ اس کا مزید ثبوت یہ بھی ہے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی طرح ابوجہل کو قریشی قافلے کے بچ نکلنے کے بعد جنگِ بدر کا اقدام کرنے سے منع کیا تھا۔

اسی طرح سے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو جب اپنی بیٹی ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کا پتا چلا تھا تو سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اس پر غصہ کرنے کے بجائے مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم شرف و منزلت والے انسان ہیں۔ اس طرح کی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض اور اسلام سے ذاتی عداوت رکھنے والا شخص تو کہنے سے رہا۔

ایسے ہی فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دارِ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو دار الامن قرار دیا، جس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں جب مشرکینِ مکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا کرتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی رشتے داری اور سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ندیم ہونے کی حیثیت سے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوجہل اور دوسرے دشمنانِ اسلام سے بچا کر اپنے گھر میں چھپا لیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امان دیتے تھے۔ اسی امان کا بدلہ چکانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر کو دار الامن قرار دیا کہ جو گھر زمانۂ جاہلیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دار الامن تھا وہ آج تمام قریش کے لیے دار الامن ہے۔

لیکن یار لوگوں کو یہ فضیلت راس نہ آئی اس لیے انھوں نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے

منہ سے یہ الفاظ کہلوائے کہ اے اللہ کے رسول! ابوسفیان رضی اللہ عنہ جاہ پرست ہے، سو اس کے گھر کو دار الامن قرار دے کر اور اس کے بیٹے معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنا کاتب مقرر کر کے ابوسفیان کا اکرام کریں تو وہ خوش ہو جائے گا۔ اور اسی بات کو ہماری امت آج تک روتی آرہی ہے اور کچھ نے تو آگے بڑھ کر فتح مکہ سے ایک روز پہلے اسلام قبول کرنے والے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو طلقاء میں شامل کر دیا تو اکثر نے اس سے لمبی جست لگائی اور عمرۃ القضاء سے پہلے اسلام لانے والے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو جنھوں نے بخاری کی روایت کے تحت بقول مفتی محمد شفیع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرۃ القضاء میں بال تراشے تھے، ان کا اسلام بھی فتح مکہ کے بعد کا بتا کر ان کو بھی طلقاء میں شامل کر دیا۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رحمہ اللہ کا بنوامیہ کی بابت مبنی بر حقیقت اعتراف:

تاریخ کے اوراق میں بنوامیہ کے ساتھ ہونے والی بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اپنی کتاب ”السنة و مكانتها في التشريع الإسلامی“ میں ”بنوامیہ اور دینِ اسلام“ کی سرخی قائم کر کے لکھتے ہیں:

”بنوامیہ جاہل و مطلق اور اسلامی تعلیمات و آداب سے یکسر بے گانہ تھے۔ یہ تاریخی حقائق پر عظیم افترا ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ جن کتبِ تاریخ میں اموی دور کی یہ تصویر کھینچی گئی ہے وہ سب کی سب خلافتِ عباسیہ میں تصنیف کی گئی ہیں۔ خلفائے بنی عباس کا عصر و عہد بنوامیہ کی عداوت سے بھرپور تھا۔ مورخ اور واقعہ نویس عباسی دور میں من مانی کارروائیاں کرتے رہے تھے۔ عباسی عہد کے مورخین نے بنوامیہ کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا تھا، اس نے اسلامی تاریخ میں ایک خطرناک حصہ ادا کیا۔ تاریخی کتب کے ان مندرجات کو لوگ حقائق تصور کرنے لگے۔ حالانکہ ان کی حیثیت ان بے بنیاد واقعات سے

زیادہ نہ تھی جو زبان زدِ عام ہوتے ہیں۔ یہ من گھڑت واقعات عباسیہ اور غالی شیعہ و روافض کے ساختہ پرداختہ تھے۔ لہٰذا بنوامیہ کے بارے میں نقد وتبصرہ کے بغیر کتبِ تاریخ واخبارات کے مندرجات کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ بنوامیہ کی تاریخ عباسی خلافت میں مرتب کی گئی تھی، تاہم اس میں ابھی تک ایسے دلائل ملتے ہیں جن سے گولڈ زیہر (اور بنوامیہ کے مخالفین) کے ان اتہامات کی تکذیب ہوتی ہے جو اس نے اموی خلفا پر عائد کیے ہیں مثلاً اس کا یہ بہتان کہ خلفائے بنی امیہ اسلام سے منحرف ہو گئے تھے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔

ابن سعد نے طبقات میں عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے زہد وتقویٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مسند آرائے خلافت ہونے سے قبل اس قدر عابد تھا کہ لوگ اس کو ''مسجد کی کبوتری'' کہا کرتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ جب اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب فوت ہو جائیں گے تو ہم دینی مسائل کس سے دریافت کریں؟ آپ نے عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: اس نوجوان سے۔ امام زہری رحمہ اللہ سے متعلق بحث میں آپ پڑھیں گے کہ عبدالملک رحمہ اللہ علما وطلبا کو تلقین کیا کرتے تھے کہ سنن و آثار کو تلاش کرتے رہا کریں۔ جن دنوں امام زہری نوجوان تھے، عبدالملک نے ان سے کہا: انصار کے ہاں جایئے وہاں آپ کو علم ملے گا۔ جب لوگ عبدالملک کی بیعت خلافت کے لیے حاضر ہوئے اس وقت وہ دھندلی سی روشنی میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ ولید بن عبدالملک کا بھی یہی حال تھا۔ ولید کے عہدِ خلافت میں وہ شاندار مساجد تعمیر کی گئیں جو آج بھی موجود ہیں۔ اس کا عہدِ خلافت مسلمانوں کے لیے عمرانی دور تھا۔ یزید

بن معاویہ رحمہ اللہ کو چھوڑ کر کر دیگر اموی خلفا بھی اسی قسم کے تھے۔ البتہ یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کے متعلق کچھ یوں دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں اسلامی اخلاق و آداب سے منحرف رہا کرتا تھا، لیکن بعض عباسی مصنّفین اور شیعہ راویوں نے جو یہ الزامات یزید پر لگائے ہیں وہ تاریخ کی روشنی میں ثابت نہیں ہوتے۔ ولید پر بہتان باندھا گیا کہ اس نے قرآن کریم کو پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ ایک منصف مزاج شخص جب ایسے واقعات پڑھتا ہے تو وہ بول اٹھتا ہے کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔

اسلامی فتوحات کے سلسلے میں بنو امیہ کا نام تاریخِ اسلام میں ہمیشہ تابندہ اور درخشاں رہے گا۔ اموی خلفا نے اسلامی حکومت کو جس قدر وسعت بخشی تھی، عباسی خلافت میں اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کا سہرا اموی خلفا کے سر ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ اور دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بذاتِ خود فوجوں میں شامل ہو کر اعدائے دین سے لڑتے تھے۔ پھر ان سے عداوت کیوں رکھی جائے۔ نیز اس بہتان کی وجہ جواز کیا ہے کہ وہ دینِ اسلام کے فہم و ادراک پر قادر نہ تھے اور اس کی راہ میں جان دینے کے جذبے سے عاری تھے۔ البتہ یہ درست ہے کہ اموی خلفا خوارج اور علویہ کے سخت دشمن تھے اور ان کے درمیان شدید عداوت پائی جاتی تھی (کیونکہ خوارج و علویہ بنو امیہ کے خلاف خروج کرتے رہتے تھے) مگر خوارج اور علویہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حدیثِ نبوی کی جمع و تدوین اور ان کے نقد و نقل کے ضمن میں کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی۔''[1]

ردِ عمل کے نقصانات:

سید مودودی کی بدنامِ زمانہ تالیف ''خلافت و ملوکیت'' کی تصنیف کے بعد، جس

---

[1] ''السنة و مكانتها في التشريع الإسلامی'' (ص: ۳۷۶۔۳۷۸)

میں سیدنا عثمان، سیدہ عائشہ، سیدنا معاویہ اور دیگر اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق نامناسب رویہ اختیار کیا گیا، علمائے اہلِ سنت کے ایک جمِ غفیر نے تحقیق کا قلم سنبھال کر تاریخ کی ورق گردانی شروع کر دی اور یوں سید مودودی کے نقد میں ہی سہی، لیکن تنقیحِ تاریخ کا گرانقدر کام اردو زبان میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوا۔ جہاں اس کام کے بے شمار علمی فوائد مرتب ہوئے وہاں کچھ مضر اثرات بھی برآمد ہونا شروع ہوئے۔ علامہ محمود احمد عباسی، علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی، حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ، بخاری صاحبان، قاضی طاہر علی الہاشمی حفظہ اللہ، مفتی تقی عثمانی اور کفایت اللہ سنابلی حفظہما اللہ کی تحقیقات کے ردِ عمل میں ہمارے بعض علمائے کرام کے قلم سے ایسی تحاریر نکل گئیں جنھوں نے ایک عامی کے ہاتھ میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات کو ایک کھیل تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اٹھ کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی، خاطی، جائر اور بادشاہ ثابت کرنے میں لگا رہتا ہے۔ ان سب کے مآخذ اور آثار انھی کتابوں سے ماخوذ ہیں جو مذکورہ بالا علما کی تحقیقات کے جواب میں لکھی گئی تھیں۔ حد تو یہ ہوئی کہ ماضی قریب کے ایک عالم دین نے تو علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی صاحب کے رد میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو نہ صرف باغی و جائر و خاطی قرار دینے پر پورا زور صرف کر دیا، بلکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے کے ''جرم'' میں صریحاً نصِ قرآنی کی مخالفت کرنے والا تک قرار دے دیا، گویا خطائے اجتہادی اپنے مرتبے سے گر کر نصِ قرآنی کی مخالفت کرنے کی معصیت ٹھہرا دی گئی۔ اسی طرح کی تحاریر کا کرنا ہوا کہ وہ نوجوان طبقہ جس کو فلسفہ تاریخ چھو کر نہیں گزرا، جس نے کبھی طبری اور ابن سعد کی کتب چھوئی بھی نہ ہوں گی، ان علما کی کتب کے آسرے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو عدالتی کٹہرے میں کھڑا کر کے ۱۴۰۰ سال بعد ان کو بغاوت کا مجرم ٹھہرا دیتا ہے۔۔ اسی بابت فضیلۃ الشیخ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ شکوہ کناں ہیں:

''سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اعدائے صحابہ کا دوسرا بڑا ہدف سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں، جو سابقین اولین کے بعد یقیناً ﴿وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ﴾ [التوبۃ: ۱۰۰]

کا مصداق ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کا اعلان فرمایا ہے، فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ اس غزوہ میں شریک ہونے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بالآخر فرمایا ہے:

﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [التوبۃ: ۲۶]

''پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی۔''

اسی طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک میں بھی شریک ہوئے اور اس غزوہ میں شریک ہونے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ ﴾ [التوبۃ: ۱۱۷]

''بے شک اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، نبی کو اور مہاجرین و انصار کو جنھوں نے سخت وقت میں نبی کا ساتھ دیا۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ معافی میں ظاہر ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔''[1]

یہ لہر اب اس قدر زیادہ شدت سے چل پڑی ہے کہ یہاں ہر دوسرا بندہ ابن خلدون بنا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات پر کلام کرنا اپنا استحقاق سمجھتا ہے۔ اور اب تو ماشاء اللہ سے وکیلِ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ حنفی عالم قاضی طاہر علی الہاشمی صاحب کی کتب کے ردِ عمل میں سلسلہ وار مضامین کے تحت احناف کے ایک گروہ میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو خاطی و باغی ثابت کرنے کی مہم بہت زور و شور سے چل رہی ہے، جبکہ دوسری طرف یہ اصحاب اپنے اکابر کی بابت خاطی کیا، خطائے اجتہادی کی نسبت پر بھی چراغ پا ہو جاتے ہیں اور ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور عباراتِ اکابر'' کے نام سے کتاب تصنیف کر کے اکابر کا ہر طور سے دفاع

---

[1] ''مقامِ صحابہ'' از ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (ص: ۱۳۳)

کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ کاش یہ احباب جتنی سعی اکابر کی اخطاء کو اخطاء نہ رہنے پر صرف کر رہے ہیں، اس کی آدھی بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خطائے اجتہادی کے غلط نظریے کی تحقیق پر صرف کرتے تو ضرور کسی صائب نتیجے تک پہنچ جاتے۔

کتاب ہذا کی وجۂ طباعت:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جس طور کا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے، خاص کر ان کی سیاسی زندگی سے متعلق تو اس بابت ہم نے مناسب خیال کیا کہ مولانا علی احمد عباسی کی کتاب ''سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی'' کی از سرِنو طباعت کروا کر اس گراں قدر کتاب کو شائع کروایا جائے۔ کتاب ہذا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی اور مشاجراتِ صحابہ سے متعلق نہایت جامع، مختصر اور معتدل تحقیق ہے۔ عرصۂ دراز سے یہ کتاب ناپید تھی، تاہم اس احقر کے پاس اس کتاب کا ایک پرانا مسودہ پڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ حیاتِ مستعار کا ادھار بند ہو اور یہ کتاب بھی صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے، مناسب خیال کیا کہ اس کتاب کو مختصر حواشی کے ساتھ طبع کروا دیا جائے۔

مولانا علی احمد عباسی مرحوم کی یہ کتاب ۱۹۷۰ء کی دہائی میں لکھی گئی تھی جس میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی سے بحث کی گئی ہے۔ مولف مرحوم کا اندازِ بیان نہایت ہی سلیس اور آسان فہم ہے۔ کتاب شروع سے لے کر آخر تک انتہائی دلچسپ اور اپنے اندر نہایت وقیع معلومات رکھتی ہے۔ اس کتاب کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس میں قاری کو روایتوں کی بھول بھلیوں میں الجھانے کے بجائے سیدھے سادے آسان، عام فہم اور منطقی مباحث کے ذریعے بات سمجھانے کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے کئی ایسے اعتراضات جن کا جواب اس کتاب یا دیگر کتب میں عام قاری کو نہیں مل پاتا، قاری ان اعتراضات کے جوابات کے لیے از خود تیار ہو جاتا ہے۔

مولانا علی احمد عباسی مرحوم نے چونکہ اپنی بحثِ کتاب کا تعلق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی سے رکھا ہے، اس لیے انھوں نے عام تذکرہ نویسوں کی طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ولادت، پیدائش، ازواج و اولاد سے قطعی بحث نہیں کی، بلکہ اپنے مباحث کو اس دور سے متعلق رکھا ہے جن ادوار میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سیاسی طور پر فعال تھے۔ یہ کتاب اور اس کے مباحث اس پائے کے ہیں کہ اس کتاب پر مقدمہ جید حنفی عالم مولانا احتشام الحق تھانوی

صاحب کا لکھا ہوا ہے جن کے قلم نے مولانا علی احمد عباسی صاحب کی تحقیقات کی بھرپور تائید کی ہے۔ ''معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی'' کے علاوہ مولانا علی احمد عباسی دیگر کئی نادر تحقیقات کے بھی مولف رہ چکے ہیں، جن میں ''امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی سیاسی زندگی'' اور ''مقتل الحسین'' (للمؤلف ابومخنف) کا اردو ترجمہ وتعلیقات شامل ہیں۔

چونکہ مولانا علی احمد عباسی مرحوم کا تعلق مسلکِ احناف سے تھا اور یہ احقر منہجِ محدثین کا دم بھرتا ہے، اس لیے کتاب کے چند مباحث میں مولف مرحوم سے اختلاف ہو جانا فطری امر تھا۔ جہاں اختلاف کی نشاندہی ضروری سمجھی گئی وہاں اس پر حاشیہ چڑھا کر تبصرہ کر دیا گیا ہے اور جہاں اختلاف اتنی سخت نوعیت کا محسوس نہ ہوا وہاں کسی تبصرے سے گریز کیا گیا ہے۔ تاہم یہ یاد رہے کہ یہ کتاب ایک حنفی صاحبِ علم کے قلم سے نکلی ہوئی ہے، سو اس میں کئی ایسے اصولی مباحث ہو سکتے ہیں جن سے محدثین کے منہج کے ساتھ بنیادی اختلافات موجود ہوں، لیکن ان سب کے باوجود یہ بات بھی اپنی جگہ حق و مسلم ہے کہ ان اختلافات سے اس کتاب کی افادیت واہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں سب سے پہلے تو اس اللہ عزوجل کے حضور شکر گزار ہوں کہ اس مالک نے اس احقر کو اس قابل بنایا کہ وہ یہ کام کر سکے۔ اگر اس کی مدد شاملِ حال نہ ہو تو کوئی کام ممکن نہیں۔ اسی کے کرم سے یہ کام ہو سکا ہے اور اس کام کی ہر اچھائی صرف اسی ذاتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ہے۔ اس مالکِ کُل کے شکریہ کے بعد اپنے عزیز دوست محمد صہیب نذیر صاحب کا شکریہ ادا کروں گا کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچنا ناممکن تھا۔ ان کی ہمت اور ساتھ رہا کہ یہ کام ہو سکا۔ اللہ اس دوستی اور ساتھ کو ہمیشہ بنائے رکھے۔

ساتھ ہی شفیق الرحمٰن حفظہ اللہ، مکتبہ الفہیم، مئو کے بھی نہایت ممنون ہیں جنھوں نے ہندوستان سے اس کتاب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور اس سلسلے میں ساری ذمہ داریاں کما حقہ ادا کیں۔ وہ ہندوستان سے کتاب کی اشاعت کی فراخدلانہ پیش کش نہ کرتے تو شاید کتاب کا دوسرا ایڈیشن اتنی جلدی کبھی منظر عام پر نہ آ سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس علم دوستی کے لیے انہیں بھرپور جزا سے نوازے اور اس جذبے وسعی کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے نہایت فاضل، محترم اور محبت کرنے والے دوست جناب شہباز عالم انصاری حفظہ اللہ کے بھی نہایت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنے مصروف اوقات میں سے اس کتاب کے لیے وقت نکالا اور نہایت دقت نظری سے کتاب کی نہ

صرف پروف ریڈنگ کی بلکہ پہلی اشاعت میں جو کمپوزنگ کی غلطیاں رہ گئی تھیں، ان کو بھی پوری جانفشانی کے ساتھ درست فرمایا۔ اللہ اس تھکا دینے والے کام کے لیے ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ یہ احقر ہمیشہ ان کا ممنون رہے گا کہ جب بھی اس کو ان سے کسی طور کی مدد و تعاون درکار ہوا، شہباز صاحب ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ موجود رہے۔ اللہ ان کو دین و دنیا میں بہتیرا ترقیاں نصیب کرے اور ان کے لیے دونوں جہانوں میں آرام وسکون کا بندوبست کرے۔

اسی طرح اس کتاب کی اشاعت میں اور بھی چند احباب کی خصوصی مدد شاملِ حال رہی، لیکن کیا کروں ان کی درویشانہ صفت کا کہ انھوں نے اپنے ناموں کا تذکرہ کرنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے، اسی لیے ان کا نام لیے بغیر ہی ان کی جناب میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔ آخر میں اپنی زوجہ اور اپنے گھر والوں کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس کتاب کے لیے فرصت مہیا کی اور عید الاضحیٰ کی ایک ہفتہ کی چھٹیوں میں جب میں پاکستان آیا اور اس کتاب کا مسودہ مجھے موصول ہوا تو ان کی طرف سے دی گئی فرصت کے تحت ہی یہ ممکن ہو سکا کہ سات دن کے قلیل عرصے میں اس کتاب پر حاشیہ نویسی اور مراجعت کا کام مکمل کر سکوں۔ جس کی وجہ سے اس دفعہ عید اور چھٹیاں اپنے پیاروں کے ساتھ پوری فرصت سے نہ گزار سکا۔ اللہ اس کے لیے ان کو اجرِ عظیم سے نوازے۔

کسی بھی کام میں کمال صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو ہی سزاوار ہے، مخلوق کا کام تو غلطیوں سے پُر ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی غلطی اور کمی نہ رہ جائے، اسی لیے بعض تسامحات کی حاشیوں اور مراجعات کے ذریعے تصحیح کرنے کی کوشش بھی کی ہے، تاہم اس کے باوجود اگر کوئی کمی یا غلطی رہ جائے تو قارئین سے التماس ہے کہ اس بابت مطلع فرمائیں، ان شاء اللہ ایجابی طریق سے آئی ہر تنقید کو سر آنکھوں پر رکھا جائے گا۔

محمد فہد حارث

۱۸/جنوری ۲۰۱۹ء

۱۱/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ



مقدمہ

تاریخ نویسی کا فن مسلمانوں نے کسی غیر قوم سے نہیں سیکھا، بلکہ یہ خود ان کی اپنی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس فن کے لیے مبادیات قرآن حکیم سے اخذ کیے گئے اور پھر اس فن کو سائنٹفک بنیادوں پر اس وقت مستحکم کیا گیا جب فنِ حدیث کے بنیادی اصول طے پا گئے۔

''روایت اور درایت'' کے اصولوں نے جہاں ''سنت'' اور ''حدیث'' کے لیے کسوٹی فراہم کر دی تھی، وہاں تاریخ کے لیے بھی ایک معیار عطا کر دیا تھا۔ چنانچہ روایت اور درایت کے اصولوں ہی کو مدِنظر رکھ کر تاریخ نویسی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، اس ضمن میں مسلمانوں نے سب سے پہلے ''مغازی'' لکھنے شروع کیے، اس کے بعد سیرتِ رسول ﷺ پر تحریریں پیش ہوئیں، پھر کہیں جا کر صحیح معنوں میں تاریخ لکھنے کا کام شروع ہوا۔ مسلمان مورخوں نے تاریخی مواد کے لیے حسبِ ذیل چیزیں منتخب کی تھیں:

① قرآن کریم۔ ② حدیثِ رسول۔ ③ مغازی۔

④ اشعار، بالخصوص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کی تدوین کے لیے مواد جمع کرنے کا سب سے بڑا کام علامہ محمد ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے کیا۔ بدقسمتی سے مسلمان اس کتاب کو بجائے کتاب موادِ تاریخ کے تاریخ سمجھ بیٹھے۔ علامہ طبری رحمہ اللہ نے قوی سے قوی تاریخی روایات اور ضعیف سے ضعیف روایات کو بجنسہ نقل کر دیا۔ انھوں نے اپنی تاریخی مواد کی کتاب میں کوئی ایسا معیار مقرر نہیں کیا جس پر کسی روایت کے بارے میں ضعیف اور قوی کا فیصلہ کیا جا سکے۔ دشمنانِ دین کے ہاتھ تو کوئی بات آنی چاہیے، افترا پردازوں کی فوج دوڑ پڑی اور انھوں نے ضعیف ترین روایتوں کا حوالہ دے کر تاریخِ اسلام کو مسخ کرنا شروع کر دیا۔ اصولِ ''درایت اور روایت'' کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور طبری کو مستند قرار دے کر جھوٹی سچی تاریخیں لکھ ماریں۔ یہ انھی کذب و افترا سے بھرپور تواریخ کا کرشمہ ہے کہ ہم اپنے خلفا و ائمہ اور اسلاف سے سوئے ظن رکھتے ہیں۔

جہاں تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور کردار کا تعلق ہے، اس پر سب سے زیادہ تنقید اور تبصرہ کیا جاتا ہے۔ یہ ناقدین کئی قسم کے ہیں:

ایک گروہ تو وہ ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت، کتابتِ وحی، علم و ورع، زہد اور تقویٰ کا نہ

صرف معترف ہے، بلکہ ان خصوصیات کے پیشِ نظر انھیں بے حد قابلِ عزت اور لائقِ احترام بھی سمجھتا ہے، مگر دوسرے ہی سانس میں معترض کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے کہ ''حضرت اسلام ضرور لائے تھے، مگر دراصل تھے ان لوگوں میں سے جنھیں راضی اور سیدھا رکھنے کے لیے روپیہ پیسہ دیا جاتا تھا اور مختلف النوع رعایتیں برتی جاتی تھیں۔'' ایسے لوگوں کو اصطلاح میں ''مولفۃ القلوب'' کہا جاتا ہے۔ الفاظ کے ہیر پھیر سے بات نہیں بدلا کرتی۔ ان لوگوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایمان پر شبہ ہے۔ چنانچہ وہ ڈھکے چھپے الفاظ نہیں، بلکہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ''حضرت معاویہ'' میں خاندانی عصبیت بدرجہ اتم موجود تھی اور اسی لیے انھوں نے اسلامی نظامِ حکومت کے بجائے قیصر و کسریٰ کے طریقے کے مطابق اپنی حیات ہی میں اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا ڈالا، اور اس طرح اسلام میں بادشاہت کی بدعت جاری کر دی، تاکہ حکومت اور اقتدار ان کے خاندان سے باہر نہ جانے پائے۔'' اس خیال کے حامی گروہ میں اکثریت ان حضرات کی ہے جو اپنے آپ کو اہلِ سنت والجماعت کہتے ہیں۔ اس گروہ کے لوگ انتخابِ امیر کے تو قائل ہیں، مگر منتخب کرنے کا حق عوام کو نہیں، بلکہ خواص کو تفویض کرتے ہیں۔ ان خواص کو اس مسلک کے حامی اربابِ حل و عقد کہتے ہیں، جن کے لیے شرط اول یہ ہے کہ وہ دین کے عالم ہوں۔ علمائے دین کے اس اجماع کو یہ حضرات ''اجماعِ امت'' کا نام دیتے ہیں اور اجماعِ عام کو اجماعِ خاص میں تبدیل کر دینے کو ضرورتِ دینی سمجھتے ہیں۔ یہ تصور افلاطون کی جمہوریت سے لیا گیا ہے۔ اسلام میں اس تصور کی کوئی گنجایش ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ آپ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد خود ہی کر سکیں گے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اجماع اور جمہوریت کے سرے سے قائل ہی نہیں، اس مسلک کے حامی ''امام'' کو خدا کی طرف سے ''مامور'' تسلیم کرتے ہیں اور ان کی نظر میں امامت کا دار و مدار نسبی تعلق پر مبنی ہے جو پیدایشی طور پر اولاد میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ یہ مانتے اور منوانا چاہتے ہیں کہ امام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے چھوٹے فرزند یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہونا لازمی ہے۔ یہ لوگ امام کو معصوم نبوت میں شریک اور خدا کے ولی کی حیثیت سے نبی سے افضل کہتے ہیں، ان میں سے بعض لوگ تو اس درجہ غلو کرتے ہیں کہ وحی دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف آنے والی تھی۔ جبریل امین علیہ السلام غلطی سے (نعوذ باللہ) حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا گئے۔ یہ لوگ صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کو نہیں، بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے چند ساتھیوں کے گمراہ اور بے دین سمجھتے ہیں، حتی کہ ان

امہات المومنین کو بھی جن کی نیک نفسی کا ذکر قرآن الحکیم میں موجود ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے بھی یہ لوگ محض اس لیے ''سوئے ظن'' رکھتے ہیں کہ حضرت نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی تھی۔ امامت کا یہ تصور پاپائیت، برہمنیت، وحشی اور غیر متمدن قبائل کی رسوم اور کلیسائی نظام سے کس درجہ مشابہ ہے اور اسلامی تصور کے کس قدر منافی ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہی ہو سکے گا۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو اپنے آپ کو صوفیائے کرام کے القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت کا گمان یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ روحانی علوم سکھا دیے تھے، علاوہ ازیں تزکیۂ نفس اور طہارتِ باطنی کے لیے کچھ طور و طریق بھی بتا دیے تھے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حسینی اولاد میں وراثتاً چلے آتے ہیں۔ یہ علومِ روحانی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مشائخِ طریقت کو حاصل ہوئے ہیں۔ ان علوم کی روشنی میں اور ان طریقوں پر عمل پیرا ہو کر ہر مرید روحانی بلندیاں حاصل کرتا ہے اور معرفتِ اشیا اور معرفتِ باری تعالیٰ حاصل کر سکتا ہے۔ ان حضرات میں بھی ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل ہوتی ہے۔ مگر اس مسلک کے حامی ذرا لوٹ پھیر کر بات کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں، ایک نبی اللہ کی اور دوسری ولی اللہ کی حیثیت۔ چنانچہ جب ولی اللہ کی حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوتی تھی تو رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ خلق سے ہٹ کر خالق کی طرف ہو جاتی تھی، جبکہ نبی کی حیثیت میں حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ خالق سے ہٹ جاتی تھی اور مخلوق کی رشد و ہدایت کی جانب مبذول ہو جاتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ولایتِ کبریٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے افضل تھی۔ یہی وہ ولایتِ کبریٰ تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی اور ان کی حسینی اولاد کے ذریعے اس کا فیضِ باطنی سلسلہ بہ سلسلہ آج تک صوفیہ کے مختلف خانوادوں میں موجود اور جاری ہے، اس ولایت کے حصول کے لیے جو عقائد و اعمال اختیار کیے جاتے ہیں، اسے ''طریقت'' کہتے ہیں اور طریقت شریعت کی جان و روح ہونے کی وجہ سے شریعت سے افضل سمجھی جانی ضروری ہے، ان ریاضتوں اور مجاہدوں کی وجہ سے نفسِ انسانی میں ایسی پاکی اور طہارت داخل ہو جاتی ہے کہ انسان نہ صرف کائنات پر متصرف ہو جاتا ہے، بلکہ اسے خالقِ کائنات سے ایسا وصل حاصل ہو جاتا ہے اور اس کی ایسی معیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دوئی کا تصور یکسر مٹ جاتا ہے۔ صاحبِ طریقت جب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو مریدوں کے لیے اس کو سجدہ کرنا بھی ممنوع باقی نہیں رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس سجدے کو یہ

لوگ ''سجدۂ تعظیمی'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان عقائد کے حامل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا پیرِ طریقت مانتے ہیں اور حضرت معاویہ، طلحہ، زبیر، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کے متعلق گفتگو کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ مگر اپنے دل کی گہرائیوں میں ان حضرات سے راضی نہیں ہیں۔ یہ لوگ دینداری اور دنیا داری میں تفریق کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی حسینی اولاد کو دین کے سردار، اور سیاسی خلفشار اور بیرونی حملوں کے دفاع میں مسلسل جہاد کرنے والوں کو دنیا دار سمجھتے ہیں۔ اس گروہ کے یہ خیالات کس حد تک اسلامی نظریات کے مطابق ہیں، اس کا فیصلہ بھی آپ اس علمی اور تحقیقی کتاب کے مطالعے کے بعد ہی کریں گے۔

چوتھا گروہ ''عقلیت'' کے دعوے دار مورخین کا ہے۔ ان میں عرب و عجم کے مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو مورخین اور مستشرقین شامل ہیں۔ مسلمان مورخین اپنے اپنے عقائد کی روشنی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلافات اور مناقشات پر مختلف زاویوں سے تنقید و تنقیص کرتے ہیں اور بیک وقت ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں ان صحابہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو صحابہ کو فوق الفطرت قوتوں کا حامل بتاتے ہیں اور دوسری طرف قبائلی اور خاندانی تعصّبات میں گرفتار، اقتدار کے خواہش مند قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ شریعت کی بنیادی قدروں کو بدلنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کی عظیم المرتبت ہستیوں کو اپنے من گھڑت کرداروں کا حامل ثابت کر کے قارئین کو دریائے حیرت میں غرق کرنے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں۔

ان گروہوں کے علاوہ اور بھی انواع و اقسام کے لوگ ہیں جو اپنی انفرادیت کے چکر میں تاریخ جیسے عظیم فن سے کھیلتے ہیں۔ ان میں عوام کے جذبات سے کھیلنے والے واعظ، مقررین اور ادبی اور علمی مجالس میں اپنے مزعومات میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے من گھڑت روایتیں بیان کرنے والے اور واہی تباہی بکنے والے شامل ہیں۔

اس کتاب کے مولف سید علی احمد صاحب عباسی نے ان تمام گروہوں سے الگ ہو کر صرف ان حقائق کو رقم کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے جو فنِ تاریخ کی رو سے صحیح تسلیم کیے جانے کے قابل ہیں اور پھر جس عالمانہ انداز میں مولف نے واقعات پر تبصرہ کیا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ تحسین ہے۔

احتشام الحق تھانوی

مہتمم دار العلوم اسلامیہ ٹنڈو اللہ یار

وممبر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف پاکستان

قارئین کرام سے استدعاء

ایک صاحب علم کے لیے کسی مؤلف کی تحریر پر محاکمہ کچھ مشکل نہیں۔ لیکن مشکل پڑتی ہے اس وقت جب صاحب تحریر اپنا دوست اور رفیق کار ہو یا پھر مخالف۔ دوست کے کام کی ثناء کو لوگ رفاقت کے ایفاء پر محمول کرتے ہیں اور مخالفت کی جائے تو حق کوشی کے بجائے اسے رشک وحسد نام دیتے ہیں۔ اسی طرح مخالف کی تحریر کی کمزوریاں پکڑی جائیں تو اسے مخاصمت تصور کیا جائے گا اور حق میں لکھنے کو مجالمت کا نام دیں گے۔ اسی مشکل میں اس وقت میں ہوں۔

پروفیسر سید علی احمد عباسی ایم ایس سی (علیگ) میرے دوست اور رفیق کار ہیں اور ان کی کاوش علمی کی تعریف کر کے میں جانبدار کہلانا نہیں چاہتا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے علمی حیثیت سے ان کی تحریر میں کمزوری بھی نظر نہیں آتی۔ لہٰذا میرا صرف ایک کام رہ جاتا ہے کہ دلی خلوص کے ساتھ قارئین کرام سے اس کتاب کو از اول تا آخر توجہ سے پڑھنے کی درخواست کروں۔

اس کتاب میں انہیں بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں گی کہ چند علماء کے علاوہ اکثر حضرات ان سے ناآشنا ہیں۔ بعض باتیں ایسی ملیں گی کہ لوگ حیرت زدہ ہو کر سوچیں گے کہ دشمنان صحابہ نے انھیں کس طرح گمراہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اموی خاندان کے خلاف تقریباً ایک ہزار برس سے ایک منظّم گروہ بڑے شد ومد سے ہمہ گیر پیمانہ پر پروپیگنڈا کرتا چلا آ رہا ہے یہ گروہ اپنی سعی بلیغ میں اس درجہ کامیابیاں حاصل کر چکا ہے کہ ہمارے لٹریچر میں ہزاروں بے اصل روایات اس طرح شامل ہوگئیں کہ ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے عوام انھیں تاریخ اسلام کے مآخذ سمجھنے لگے ہیں۔

ایسی صورت میں حق کی تلاش مشکل ہے اور تحقیق کا میدان تنگ۔ لیکن اس کے باوجود پروفیسر عباسی نے اس کٹھن منزل کو طے کر کے امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کردار کو اصلی صورت میں کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔

اللہ تعالیٰ ان کو اجر دے اور مسلمانوں کو نسل پرستی اور فرقہ بندی کے بندھنوں سے نجات دے۔ تا کہ جماعت کا شیرازہ مضبوط ہو۔ اسلافِ کرام کی صحیح عظمت دلوں میں بیٹھے۔ مسلمانوں کو اپنی تاریخ کی درخشانی پر فخر ہو اور ان میں وہ ولولہ پیدا ہو جو تعمیر قومی میں ممد ہو سکے اور ملت کی نشأۃ ثانیہ کا سبب بنے۔ آمین

بادشاہ زادہ الازہریؔ

(ڈین آف جہان زیب کالج۔ سیدہ شریف۔ سوات)

عرضِ مولف

بسم اللّٰہ، والسلام علیٰ رسول اللّٰہ، صلی اللّٰہ علیه وعلیٰ آله وصحبه و خلفائه، أما بعد!

ایک قوم کی بقا اور ترقی کا انحصار جہاں اس امر پر ہے کہ وہ مکارمِ اخلاق کی حامل ہو، علوم وفنون میں دستگاہ رکھتی ہو اور اپنی قوت قائم رکھنے کے لیے مادی وسائل اسے میسر ہوں، وہاں سب سے اہم ہے اس کی تاریخ کی تدوین۔ یہ تاریخ واقعات پر مبنی ہونی چاہیے اور خرافات سے مبرا۔ مدون تاریخ کی سب سے زیادہ اہمیت اس قوم کے لیے ہے جس کی تشکیل کسی نظریۂ حیات کے تحت کی گئی ہو، اسے سامنا رہا ہو مخالف نظریات کا اور اس کا ماضی گزرا ہو جہدِ مسلسل میں۔

امتِ مسلمہ آخر الامم ہے اور اقوامِ عالم میں اپنے وجود کے اعتبار سے ممتاز ترین۔ اس کے سپرد اہلِ عالم کی امامت کی گئی ہے۔ یہ فرائض اس امت نے باحسن وجوہ ادا کیے، ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے ارتقائی مآثر، اطراف و اکنافِ عالم میں اس نے موجود پائے، ان کے تحفظ کا انتظام کیا اور مزید ترقی کے ذرائع مہیا کیے۔ حیاتِ اجتماعیہ کے تمام وسائل کی آبیاری کی اور بلاتعصب وتنگدلی حق و میزان کے ساتھ عدل بین الاقوام کے اصول بروئے کار لائی۔

صرف یہ امت ہے جس نے اقوامِ عالم کو اس منہاجِ قویم پر ڈال دیا کہ آج سب اسی کے نظریات و اصول کی روشنی میں اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل تلاش کرنے

کے درپے ہیں اور کسی نہ کسی درجے میں کامیابی بھی ہو رہی ہے۔

لیکن افسوس کہ خود یہ امت اندرونی فتنوں کا شکار ہوگئی اور اس کے اپنے عملی قویٰ میں اضمحلال آ گیا، محض اس لیے کہ اس کے اندرونی دشمنوں نے اس کی تاریخ کو داغدار اور اس کے قائدوں کو فرض ناشناس ثابت کر کے اس کی وحدت کو پاش پاش کر دیا۔ اب یہ اللہ کا فضل ہے کہ مسلسل وپیہم تخریبی کارروائیوں کے باوجود یہ امت زندہ ہے اور زمانے کے موجودہ دور میں اندازہ ہو رہا ہے کہ ایک بار پھر کروٹ لے گی، اگرچہ اس وقت قسم قسم کی مشکلات موجود ہیں اور ہر اسلامی ملک ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔

اس بیسوی صدی کی مادہ پرست اور جغرافیائی قومیت کی متوالی قوموں کی دنیا میں قائد اعظم محمد علی جناح علیہ الرحمۃ والرضوان نے نعرہ بلند کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں، ان کی قومیت کی بنیاد اُن کا دین ہے، جس کی بنا پر وہ مکلّف ہیں کہ اپنے نظریۂ حیات کے مطابق اپنی زندگی اور حکومت کو تشکیل کریں۔ اس دعوت کو اقوامِ عالم سے تسلیم کرا کے مملکتِ پاکستان قائم کر لینا اس کی عملی دلیل ہے کہ دنیا کا مستقبل پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں دیا جا رہا ہے، تاکہ امامتِ عالم کا جو منصب انھوں نے اپنی کوتاہ عملی اور بے راہ روی سے کھو دیا تھا اور اب بھی اس طرف آنے سے ہچکچا رہے ہیں، وہ ایک بار انھیں پھر تفویض کیا جائے گا۔

اس لیے ضرورت ہے کہ چند مخلص لوگ امتِ مسلمہ کی صحیح تاریخ مدوّن کرنے کے درپے ہوں اور واقعات کی تلاش کر کے روایاتِ واہیہ سے امت کو نجات دلائیں، تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، تاریخ کے نام سے خرافات کو لے کر گمراہ نہ کر سکیں اور اس طرح امت کو اس روحانی عذاب سے نجات ملے جس میں آج ہر تعلیم یافتہ شخص مبتلا ہو کر احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا ہے۔

ہر پڑھا لکھا آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا کی قوموں میں اگر کسی قوم کی تاریخ مایوس کن ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ اس احساس کا نتیجہ یہ مرتب ہو رہا ہے کہ اب خود نفسِ دین

میں انھیں خامیاں نظر آنے لگیں۔ ان پریشان کن حالات میں جہاں اس کی ضرورت ہے کہ مخلص لوگ تبلیغ و انذار کے لیے کھڑے ہوں، وہاں ایسے لوگ بھی ہونے چاہئیں جو دلجمعی کے ساتھ بلاخوفِ لومۃ لائم مسلمانوں کی صحیح تاریخ مدون کرنے کے درپے ہوں۔ موجودہ اور آیندہ نسلوں کی ہدایت کے لیے اس کام کو انجام دینا ایسا ہی ضروری ہے جیسے نفسِ دین کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنا۔

یہ جو گمراہ لوگ عوام اور بچوں کے لیے تاریخ کے نام سے خرافات شائع کر رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنا اہم ترین فرض ہے، ان کی زبانیں صحیح تاریخ سے بند ہو جائیں گی اور انھیں یارا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کو اپنے ماضی سے بیزار اور مستقبل سے مایوس کر کے ان کے دل میں یہ جذبہ ابھاریں کہ اب انھیں دین کی راہ چھوڑ کر کوئی اور سبیل اختیار کرنی چاہیے۔

واقعی اگر دین برپا کرنے اور کلمۂ حق کا نعرہ لگانے والے لوگ منافق تھے اور انھوں نے جو کچھ کیا وہ محض جوع الارض کے تحت کیا تو کوئی سنجیدہ اور باوقار شخص ان کے ساتھ انتساب میں فخر محسوس نہیں کر سکتا۔ اللہ اور ملت کے دشمنوں نے خلفا، امرا اور سلاطینِ اسلام کے بارے میں یہی تصور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ فقہا، صوفیہ اور علما کے متعلق بھی۔ گویا نبی کریم ﷺ جس غرض سے تشریف لائے تھے وہ کسی درجے میں پوری نہیں ہوئی۔ مسلمان اس پروپیگنڈے سے ایسے متاثر ہو گئے کہ پناہِ خدا! راقم الحروف نے ایک معمر دیندار شخص کو ایسی باتیں کرتے سنا ہے۔

یہ محض اس لیے ہے کہ سلف صالحین کی جناب میں گستاخ و بے ادب کر دینے کا پورا مسالہ تیار کر دیا گیا ہے اور واقعات کو روایات کے ایسے دبیز پردوں میں دبا دیا گیا ہے کہ تاریخ کی صحیح تدوین اب ایک آدمی کا کام نہیں رہا۔ ایک جماعت کو اس طرف متوجہ ہونا ہوگا، بشرطیکہ وہ جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہو جو نبی کریم ﷺ کی دعوت کے ساتھ وفاداری کو اپنا نصب العین بنا چکے ہوں اور جنھیں احساس ہو کہ کل اللہ تعالیٰ کے حضور انھیں اپنے قول

اور عمل کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ تاریخ سے مراد سیاسی سوانح کی تدوین ہے، حالانکہ یہ محض ایک شعبہ ہے۔ دراصل تاریخ نام ہے حیاتِ ملیہ کے تمام شعبوں کی تدوین اور ارتقا کی روداد کا، یعنی سیاسی، ثقافتی، ادبی، تہذیبی اور تمدنی ترقیوں کے مکمل احصا کا۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ جو دعوتِ محمدیہ کے اولین علمبردار تھے اور پھر بعد میں امت کی زمامِ قیادت جن حضرات کے ہاتھ میں آئی وہ ان ترقیوں سے الگ رہے اور صرف سیاست سے کام رکھا یا ان امور میں بھی انھوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتیں صرف کیں۔

اس کے بعد دیکھنا ہے کہ دعوت کی ترویج میں جو الجھنیں پیدا ہوئیں اور نئے نئے احوال پیش آئے، اُن کی گتھیاں کس طرح سلجھائی گئیں۔ کاروانِ ملت کو رواں دواں رکھنے کے لیے ان قائدوں نے کوششیں کیں یا جان بوجھ کر اس راہ میں رکاوٹ بنے۔ اس انداز میں جب تاریخ مرتب ہوگی اور صرف واقعات سے بحث کی جائے گی نہ کہ خرافات سے، تب اسے تاریخ کہا جا سکے گا۔

سب سے اہم بات ان روایات پر تنقید اور ان کی تنقیح ہے جو تاریخ کے نام سے جمع کر دی گئی ہیں۔ اللہ کے بندے اگر اس طرف متوجہ ہوں اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دیکھیں کہ وہ کس زاویۂ نگاہ سے کام کریں گے تو بہت تھوڑی مدت میں معتد بہ کام ہو سکتا ہے۔ شرط ہے اخلاص اور ایمان۔

﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ﴾ [الشعراء: ٢٢٧]

''اور عنقریب وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا، جان لیں گے کہ وہ لوٹنے کی کون سی جگہ لوٹ کر جائیں گے۔''

مآخذ

اقوامِ عالم میں جس تحریک کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے مراد انفرادی اور

اجتماعی زندگی کا وہ منہاج ہے جو ہدایتِ ربانیہ کے تحت ابتدائے آفرینش سے چار دانگِ عالم میں چلا آ رہا ہے اور جس کی تکمیل سرورِ عالم و عالمیان ﷺ نے کی۔

اس تحریک کی جیتی جاگتی روداد قرآن حکیم ہے۔ اس کے بعد ہیں احادیث و آثار کے وہ مجموعے جو نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفا و اصحاب کے فرمودات، افکار اور اعمال پر مشتمل ہیں۔ پھر آتی ہیں سیرت پاک پر وہ کتابیں جو قریب ترین عہد میں مرتب ہوئیں۔ پھر کہیں ان کتابوں کی باری آتی ہے جنھیں عرفِ عام میں کتبِ تاریخ کہا جاتا ہے۔

جب تک دعوتِ محمدیہ اور امتِ مسلمہ کے بارے میں معلومات کے حصول کے لیے درجہ بدرجہ ان مآخذ کی ترتیب کا خیال نہیں کیا جائے گا، صحیح تاریخ مرتب نہیں ہو سکے گی۔ اس ترتیب سے جائزہ لیتے وقت اس کا بھی اہتمام کرنا ہوگا کہ فروتر درجے کی معلومات کو اعلیٰ درجے پر حجت نہیں بنایا جا سکتا، مثلاً: طبری کی بیان کردہ کسی بات کے خلاف ہمیں احادیث سے کوئی بات ملے گی تو اس وقت طبری کی تاریخ ساقط عن الاعتبار ہوگی۔[1]

لوگ عموماً یہی غلطی کرتے ہیں کہ احادیث پر غور کرنے کے بجائے سیاسی سوانح کے متعلق بلاذری اور طبری ہی کو نہیں، بلکہ مسعودی اور یعقوبی تک کو حجت سمجھ لیتے ہیں۔ اس لیے تاریخ میں الجھنیں ہیں اور مسائل کو لاینحل بنا دیا گیا ہے۔

قرآن حکیم:

قرآن پاک میں محض دعوت کے اصول و احکام ہی نہیں ہیں، اس میں تاریخی لحاظ

---

[1] ہمارے خیال میں اس بات کو ایسے کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ چاہے وہ کتبِ حدیث ہوں یا کتبِ تاریخ، جن کتابوں سے صحیح سند سے کوئی روایت ملے جو دوسرے صحیح قرائن و روایاتِ مشہورہ کے خلاف نہ ہو، اس کو قبولیت کا شرف دینا چاہیے۔ تاہم مولف کی یہ بات غالبًا اس تناظر میں ہے کہ جس طور سے محدثین نے روایات کی صحت کا اہتمام کیا ہے، اس طور سے مورخین نے نہیں کیا۔ سو اسی وجہ سے کتبِ حدیث کو کتبِ تاریخ پر فوقیت حاصل ہے اور باہمی تعارض کی صورت میں کتبِ حدیث کی روایات کتبِ تاریخ کی روایات کے مقابلے میں قبولیت کا زیادہ استحقاق رکھتی ہیں۔

سے بھی امور کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جن میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

① سلسلۂ نبوت کی تاریخ اور اس کے ارتقائی درجات پر تبصرہ۔ ادیانِ عالم کے مشترک خصائص اور ان کی امتیازی کیفیات۔

② دعوتِ محمدیہ کے وہ اصول جن کے تحت عملاً امت کی تشکیل کی گئی اور اقوام وملل کے مابین اتحادِ فکر وعمل پیدا کرنے کے وہ طریقے جن کی عملی افادیت سرورِ عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفا نے کر کے دکھا دی۔

③ نبی کریم ﷺ کے اصحاب کے ذہنی رجحانات، قلبی کوائف، ان کے کمالات اور ان میں سے بعض کی ابتدائی خامیاں اور ان سے نجات پانے کی ہدایات، صحابہ کے طبقات اور ہر طبقے کی خصوصیات۔

⑤ وہ احوال جو امت کو آپ کے زمانے میں پیش آئے، نیز مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی طرف اشارات اور حفاظتی تدبیروں کے متعلق واضح ہدایات۔ بے احتیاطی کے نتائج پر تنبیہات۔

⑥ دعوتِ محمدیہ کا تفصیلی پسِ منظر:

ا۔ دعوت کے وقت عرب کی حالت، ان کے افتادِ طبع رجحانات اور رسم و رواج کی تفصیلات۔

۲۔ یہود و نصاریٰ اور مجوس نے اس دعوت کی پذیرائی کس طرح کی، خود ان کی حالت کیا تھی اور ان کی طرف سے مسلمانوں کو کن کن مشکلات کا خطرہ تھا۔

⑦ اندرونی اور بیرونی مشکلات کو حل کرنے کے عملی طریقے۔

⑧ اقوامِ عالم کی ثقافت کی حفاظت، ارتقا، تنقیح اور انھیں اپنانے کے اصول۔

غرض یہ کہ تاریخ میں عصری اعتبار سے اہم ترین مقام کتاب اللہ کا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ عموماً امت کی تاریخ مرتب کرتے وقت کتابِ مبین کو نظر انداز کر دیا جاتا

ہے اورعوام کے سامنے انہی فرض ناشناس لوگوں کی تحریریں پہنچتی ہیں جنھوں نے تاریخ کو مسخ کر دیا ہے۔

احادیث:

قرآن حکیم کے بعد درجہ ہے کتبِ احادیث و آثار کا۔ ان میں تبع تابعین تک کے احوال اور وقائع درج ہیں۔ ان کے علمی مآثر اور سیاسی مواقف سب کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں صحیح ترین مواد صحاح کا ہے۔ یعنی موطا امام مالک (م ۱۷۹ھ)، صحیح بخاری (م ۲۵۶ھ)، صحیح مسلم (م ۲۶۱ھ)، جامع ترمذی (م ۲۷۹ھ)، سنن ابی داود (م ۲۷۵ھ)، سنن نسائی (م ۲۷۵ھ) اور پھر ہے سنن ابن ماجہ (م ۲۷۳ھ)۔ اگرچہ راقم الحروف کو سنن ابن ماجہ کی یہ حیثیت تسلیم نہیں۔ اس سے بہتر تو سنن دارمی ہے، چنانچہ بعض ائمہ اس طرف گئے ہیں۔ حافظ علائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مناسب یہ ہے کہ اس کی (یعنی سنن ابن ماجہ کی) جگہ دارمی کی کتاب کو پانچوں کے بعد چھٹا بنایا جائے، اس لیے کہ اس میں ضعیف لوگوں کی روایتیں کم ہیں اور منکر و شاذ حدیثیں بہت ہی کم، اگرچہ مرسل اور موقوف حدیثیں پائی جاتی ہیں۔ پھر بھی یہ اس سے (یعنی سنن ابن ماجہ سے) صحاح میں شامل ہونے کی زیادہ حق دار ہے۔"[1]

جامع ترمذی بڑی لذیذ کتاب ہے اور نہایت شاندار۔ مگر راقم الحروف کے نزدیک سب سے زیادہ اشکال بھی اسی میں ہے۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی روایات کے درجات خود ہی متعین فرما دیے ہیں اور اس تعیین میں انہی کی رائے اکثر و بیشتر صائب بھی ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کو سب سے آسان ہونا چاہیے تھا، لیکن من وجوہ یہ آسانی

[1] ملاحظہ ہو مولانا عبدالرشید نعمانی کی تالیف: "امام ابن ماجہ اور علمِ حدیث" (ص: ۲۳۵) طبع نور محمد، اصح المطابع آرام باغ کراچی۔ (مولف)

ہی مشکلات کا اصل سبب ہے۔ مزید کچھ لکھنا خارج از موضوع ہوگا۔

صحاح کے بعد ہیں احادیث کے دوسرے مجموعے، مثلاً: مصنف ابن ابی شیبہ، مستدرک حاکم اور طبرانی کے تینوں مجموعے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں وہ سب روایتیں آ گئی ہیں جن پر تنقید کے مواقع میسر ہیں اور جن پر بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔

علمائے حدیث کا وجود اللہ کی رحمت ہے اور ایسی فضیلت جس نے امتِ محمدیہ کو اقوامِ عالم میں ممتاز ترین درجہ دے دیا ہے۔ کسی قوم کے پاس اپنے نبی اور اس کی دعوت کے بارے میں نہ ایسی تفصیلات موجود ہیں اور نہ تفصیلات میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے ایسے اصول۔

مسند احمد کا ذکر میں نے صحاح میں قصداً نہیں کیا۔ اگرچہ صحت کے اعتبار سے وہ سنن نسائی اور سنن ابی داود سے اقدم ہی نہیں، افضل بھی ہے، یعنی قطیعی اور عبداللہ بن احمد رحمہ اللہ کے زوائد کو چھوڑ کر۔ مگر یہ کتاب استخراجِ مسائل کے لیے چنداں مفید نہیں۔ اس کی افادیت حفاظ کے لیے زیادہ ہے، کیوں کہ اس میں طرقِ حدیث کا استحصار کیا گیا ہے۔ برخلاف صحاح کے کہ ان کی ترتیب مضامین کے اعتبار سے ہے۔ البتہ جسے مسند احمد پر عبور ہو گا وہ جہاں کہیں کوئی حدیث دیکھے گا اس کے طرق اس کے سامنے آ جائیں گے۔ گِب (Gibb) نے مسند کی ترتیب پر اعتراض کیا ہے، لیکن وہ سمجھا نہیں کہ اس ترتیب کی بنیاد کیسی اصیل ہے۔ اسے فقہا کے لیے مرتب نہیں کیا گیا، اس کی تدوین حفاظِ حدیث کے لیے کی گئی ہے کہ ایک روایت کی جتنی سندیں ہیں اور الفاظ میں جو کمی بیشی ہے وہ ان کے سامنے رہیں۔

مگر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ایک حدیث اس لیے صحیح ہے کہ اسے امام بخاری یا امام مسلم رحمہ اللہ نے قبول کر لیا ہے۔ حدیث کی صحت اور بطور مآخذ اس کا درجہ متعین کرنے کے اصول ہیں، جو قرآن حکیم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور فقہا صحابہ کی ہدایت کے تحت ائمۂ حدیث نے مرتب کیے ہیں۔ ان علمائے کرام کی شان یہ ہے اور برکاتِ نبوت سے

مستفیض ہونے کی بنا پر ان کا مرتبہ یہ ہے کہ ان کی تنقید سے کوئی بھی بالا نہیں، اگرچہ صحیح بخاری ہی کیوں نہ ہو۔ احادیث کو رد و قبول کرنے کے اگر وسائل موجود و معتبر نہ ہوتے تو فقہائے اسلام کے اتنے مذاہب کیسے پیدا ہو جاتے۔ جب صحیح احادیث سے مسائل لینے کے طریقے ہیں تو حدیث کے الفاظ اور اسناد سے بحث پر کیا کچھ نہ کیا گیا ہوگا؟!

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

”أن قولنا: رواه البخاري و مسلم علامة لنا على ثبوت صحته، لا أنه كان صحيحا بمجرد رواية البخاري و مسلم، بل أحاديث البخاري و مسلم رواها غيرهما من العلماء و المحدثين من لا يحصي عدده إلا الله، و لم ينفرد واحد منهما بحديث، بل ما من حديث إلا و قد رواه قبل زمانه و في زمانه و بعد زمانه طوائف، و لو لم يخلق البخاري و مسلم لم ينقص من الدين شيء، وكانت تلك الأحاديث موجودة بأسانيد يحصل بها المقصود و فوق المقصود. وإنما قولنا: رواه البخاري و مسلم كقولنا رواه القراء السبعة. والقرآن منقول بالتواتر، لم يختص هؤلاء السبعة بنقل شيء منه، و كذلك التصحيح لم يقلد أئمة الحديث فيه البخاري و مسلما، بل جمهور ما صححاه كان قبلهما عند أئمة الحديث صحيحا متلقى بالقبول، وكذلك في عصرهما، وكذلك بعدهما، قد نظر أئمة هذا الفن في كتابيهما، و وافقوهما على تصحيح ما صححاه، إلا مواضع يسيرة، نحو عشرين حديثا غالبها في مسلم، انتقدها عليهما طائفة من الحفاظ .... الخ“[1]

---

[1] منهاج السنة (٧/٢١٤-٢١٥)

’’ہم جب کہتے ہیں کہ یہ روایت بخاری اور مسلم کی ہے تو ہمارے نزدیک یہ اس کی صحت کی علامت ہوتی ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ اسے بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے، بلکہ بخاری و مسلم کی جو حدیثیں ہیں وہ ان دونوں کے علاوہ بھی علما اور محدثین کے اتنے افراد سے مروی ہیں کہ ان کی تعداد بس اللہ ہی جانتا ہے۔ ان احادیث میں سے ایک بھی ایسی نہیں جسے بکثرت لوگوں نے ان کے زمانے سے پہلے، خود ان کے زمانے میں اور ان کے بعد کے دور میں بیان نہ کیا ہو۔ اگر بخاری و مسلم رحمہما اللہ پیدا نہ ہوتے تب بھی دین میں کوئی کمی نہ رہتی۔ یہ احادیث اپنی سندوں کے ساتھ اسی طرح موجود ہوتیں اور ان سے مقصود حاصل ہو جاتا، بلکہ مقصود سے بھی کچھ زیادہ۔ ہمارا یہ کہنا کہ اسے بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے، ایسا ہی ہے جیسے ہم قرآن کو کہتے ہیں کہ اسے ساتوں قاریوں نے روایت کیا، حالانکہ قرآن تواتر کے ساتھ منقول ہے اور اس کے کسی حصے کی روایت میں ان ساتوں قاریوں کی کچھ خصوصیت نہیں۔ اسی طرح احادیث کی تصحیح ہے۔ اس بارے میں بھی ائمۂ حدیث، بخاری و مسلم کی تقلید نہیں کرتے، بلکہ بخاری و مسلم نے جن احادیث کو صحیح کہا ہے وہ ائمۂ حدیث کے نزدیک پہلے سے صحیح و مقبول تھیں۔ یہ بات اُن کے زمانے میں بھی رہی اور اُن کے بعد بھی۔ بلکہ فنِ حدیث کے علما نے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا اور جن روایتوں کو صحیح پایا اس میں ان کی تصدیق کی، سوائے بیس کے قریب احادیث کے جن میں زیادہ تر صحیح مسلم میں ہیں، بعض حفاظ نے ان پر تنقید کی ہے.... الخ۔‘‘

گویا کتبِ حدیث میں جو سب سے بہتر اور صحیح ترین مجموعہ ہے اس میں بھی ماہرینِ علم حدیث کے نزدیک بعض مرویات محلِ نظر ہیں اور اس تنقید میں انھوں نے امام

بخاری ومسلم تک کی رعایت نہیں کی، پھر دوسری کتبِ حدیث پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں اور جن کا سب مواد موجود ہے اس کا اندازہ لگانا چاہیے۔ یہ حال ہے سب سے بہتر اور معتبر ترین مآخذ کا جو درجے میں کتاب اللہ کے بعد دوسرا ہے۔[1]

[1] محدثینِ سلف نے صحیح بخاری وصحیح مسلم کی صحت کی بابت اجماع کا دعویٰ کیا ہے تو وہ ان کتب کی جمہور احادیث سے متعلق ہے، نہ کہ بلا استثناء ان کے ایک ایک حرف اور جملے سے متعلق، کیونکہ خود علمائے سلف صحیحین کی روایات پر کلام کرتے آئے ہیں، جیسا کہ امام مسلم رحمہ اللہ کے استاد امام ابوزرعہ رازی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کے تین رواۃ پر سخت تنقیدیں کی ہیں اور ان سے روایت لانے پر امام مسلم رحمہ اللہ سے کافی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے امام مسلم رحمہ اللہ کی ان رواۃ سے روایت کی گئی احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔
وہ تین رواۃ اسباط بن نصر، قطن بن نسیر اور احمد بن عیسیٰ مصری ہیں۔ (سير أعلام النبلاء: ۱۲/ ۵۷۱)
اسی طرح علامہ کمال الدین ابن الہمام رحمہ اللہ فتح القدیر کے باب النوافل (۱/ ۴۴۵) میں لکھتے ہیں:
”پھر شیخین (امام بخاری ومسلم رحمہما اللہ) یا ان میں سے کسی ایک کا کسی معین راوی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ وہ شرائط صحت کا جامع ہے، اس بات کو مستلزم نہیں کہ واقع اور نفس الامر میں بھی وہ ایسا ہی ہو، امر واقعہ اس کے برخلاف بھی ہوسکتا ہے چنانچہ امام مسلم نے کتنے ہی ایسے راویوں سے حدیثیں لی ہیں جو جرح کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہیں۔“
امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الإلزامات“ اور ”التتبع“ میں امام بخاری ومسلم رحمہما اللہ کی چند روایات پر کلام کیا ہے۔ اسی طرح ابومسعود الدمشقی رحمہ اللہ نے بھی ان دونوں کتب پر استدراکات لکھے ہیں جبکہ ابوعلی غسانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب میں صحیحین کی بعض روایات پر کلام کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے استاد حافظ عراقی رحمہ اللہ نے اپنے ”الفیہ“ کی شرح میں بخاری ومسلم کی دو روایات پر کلام کیا ہے جن میں سے ایک صحیح مسلم کی وہ روایت ہے جو سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ان کی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے متعلق ہے۔
شیخ احمد محمد شاکر، جنھوں نے مسند احمد کی تخریج اور شرح کی ہے، مسند ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ضمن میں جو ”صحیفہ ہمام بن منبہ“ کے نام سے معروف ہے اور شیخ احمد محمد شاکر کے نسخہ کی ۱۶ ویں جلد میں مرتب ہے، اس صحیفہ کے متعلق مقدمہ میں شیخ احمد شاکر لکھتے ہیں:
”یہ صحیفہ ہمام بن منبہ جس کی چند احادیث بخاری ومسلم نے لی ہیں اور چند احادیث تنہا امام بخاری نے اور چند تنہا امام مسلم نے لی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن کو دونوں میں سے کسی نے نہیں لیا ہے۔ یہ صحیفہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیخین جس حدیث کی تخریج پر متفق ←

انتقاد کی وجہ یہ ہے کہ بعض حضرات محض روایت کی سند اور الفاظ سے بحث کرتے ہیں اور بعض حضرات مسائل نکالنے کے لیے اس کے مضمون سے، لیکن جن کے سامنے دین

ہوں وہ ہمیشہ صحت کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی نہیں ہوتی۔''

اسی طرح ایسے متاخرین علما جو صحیحین کے ایک ایک لفظ کے محفوظ ہونے کے قائل ہیں، ان کی رد میں فضیلۃ الشیخ علامہ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ رقم طراز ہیں:

''بعض اہلِ علم نے ان الفاظ کو صرف اس بنا پر صحیح باور کر لیا ہے کہ یہ صحیح بخاری میں ہیں، مگر یہ صحیح نہیں، جبکہ صحیح بخاری و مسلم میں شیخین ایسی حدیث بھی لائے ہیں جو مقصود کے اعتبار سے تو صحیح ہوتی ہے، یعنی من حیث المجموع، اگرچہ کوئی ٹکڑا اس کا ان کے معیارِ صحت کے مطابق نہیں ہوتا، بلکہ اس میں بعض رواۃ کا وہم ہوتا ہے۔ صحیحین کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے والے حضرات کے لئے یہ بات نئی نہیں۔ (توضیح الکلام، ص: ۱۳۲)

اسی طور پر فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اپنی کتاب ''واقعہ معراج اور اس کے مشاہدات'' (صفحہ: ۷۷) میں معراج سے متعلق صحیح بخاری کی ایک روایت کے راوی پر کلام کرتے ہوئے ''شریک بن عبداللہ کی روایت اور اس کا وہم وتفرد'' کی سرخی قائم کر کے رقم طراز ہیں:

''پس شریک کی یہ (صحیح بخاری کی) روایت ایسی ہے جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے دیگر تمام راویوں سے بہت مختلف ہے اور اس میں اس کے ایسے تفردات ہیں جو کسی روایت میں نہیں ہیں۔ اسی لیے محدثین نے اس کے ان تفردات کو اس کا وہم قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے ایسے دس اوہام بیان کیے ہیں۔''

اسی شریک بن عبداللہ کے بارے میں امام نووی قاضی عیاض کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شریک کی اس حدیثِ معراج کی روایت میں بہت اوہام ہیں جن پر علما نے گرفت کی ہے۔'' (شرح نووی: ۲/ ۲۰۹)

المختصر صحیحین کو اس امت میں جو تلقی بالقبول حاصل ہے تو وہ اس کی اصحیت کی بنیاد پر حاصل ہے یعنی صحیحین کی جمہور احادیث صحت کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتی ہیں اور چند ایک کو چھوڑ کر صحیحین کی تمام احادیث لائقِ حجت ہیں اور صحیحین کے کسی راوی سے خطا یا وہم ہو جانا کوئی ناممکن امر نہیں ہے۔ سو ہم اپنے اس حاشیہ کو محمد خبیب احمد حفظہ اللہ جو ادارہ علوم اثریہ (فیصل آباد) کے فاضل اور مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کے لائق شاگرد ہیں، کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں، جو انھوں نے اپنے مقالہ ''صحیح مسلم پر امام ابو زرعہ کے اعتراضات کا جائزہ'' میں لکھے ہیں:

اپنی کلی حیثیت سے موجود ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ فلاں اعتبار سے خامی رہی اور فلاں حد تک حدیث قابلِ قبول ہے۔[1] یہ باتیں کتبِ فقہ کے مطالعے سے واضح ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذاہب مرتب ہوئے اور اسی کو استحسان کہتے ہیں۔

پھر یہ ہے کہ عموماً احادیث کی تنقید کی جاتی رہی ہے احکام کے استخراج کے سلسلے میں اور جو سندیں معتبر سمجھ لی گئیں ہیں ان کی مرویات کو دوسرے اعتبارات سے بھی قبول کر لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طرقِ حدیث اور مسائلِ فقہی کے علاوہ فکر کی جو دوسری راہیں ہیں، مثلاً: تاریخ، تو ممکن ہے ایک مورخ کو تاریخ کا احصاء کرتے وقت بعض احادیث کے قبول کرنے میں تامل ہو۔[2] اب سوچنا چاہیے کہ جن مآخذ کا درجہ احادیث کے بعد ہے ان سے اخذ میں کتنی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔

کتبِ سِیر:

پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے درجے کی کتبِ حدیث کے بعد سیرت پاک کی

← ''بنا بریں یہ سمجھنا کہ صحیح بخاری و مسلم کا ہر ہر لفظ محفوظ ہے، کسی لفظ، جملے یا حدیث کو کوئی استثناء حاصل نہیں، درست موقف نہیں ہے۔ ملحوظ رہے کہ صحیحین کے قابلِ اعتراض جملوں پر محدثین نقد کرچکے ہیں جن میں امام دارقطنی، حافظ ابن عمار الشہید اور حافظ ابوعلی غسانی الجبانی رحمہم اللہ وغیرہ سرفہرست ہیں، اور ان کا دفاع کرنے والے بھی اپنا حق ادا کرتے رہے ہیں جن میں حافظ ابومسعود الدمشقی، حافظ رشید الدین یحییٰ بن علی عطار، امام نووی اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ پیش پیش ہیں۔'' (الاعتصام، ۲۴ جمادی الاخریٰ، ۱۴۳۸ھ، صفحہ: ۱۶)

[1] کسی حدیث کے رد و قبول کے لیے وہی شرائط معتبر ہیں جو صحابہ و تابعین اور ائمہ دین سے منقول ہیں۔ انھی قوانین وضوابط کی بنیاد پر حدیث کے رد و قبول کا فیصلہ ہوتا ہے اور اگر یہ معیار ہر شخص کی فقہی بصیرت پر چھوڑ دیا جائے تو یہ محض ایک کھلواڑ بن کر رہ جائے گا اور ہر شخص اپنی پسند اور مزاج کے مطابق حدیثِ نبوی کو مردود و مقبول ٹھہرائے گا۔ اس لیے فقہی بصیرت پر احادیث کا رد و قبول موقوف کرنا انکارِ حدیث کا خطرناک دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔

[2] ایسے تعارض کی صورت میں بھی ترجیح وتطبیق کے لیے زیادہ اصح اور معتبر شے کو قبول کیا جائے گا جس کے اصول علمائے حدیث نے بیان کر دیے ہیں۔

ان کتابوں کا درجہ ہے جو تبع تابعین کے زمانے تک مدون ہوگئیں، مثلاً: سیرت ابن اسحاق۔ لیکن علما نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ اس کتاب کو بغیر تنقیح کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ابن ہشام نے یہ تنقیح کی اور وہ سیرت مدون کر لی جو امت میں متداول اور مقبول ہے۔ یا مثلاً مغازی ابن عقبہ ہے جس کے متعلق علما نے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سیرت کی ان کتابوں سے استشہاد کے وقت صحاح کی احادیث سے مدد لی جائے گی۔

کتبِ تاریخ:

پھر آتی ہیں وہ کتابیں جو تاریخ کے نام سے رائج ہیں اور انھی پر لوگ تکیہ کیے ہوئے ہیں، مثلاً: محمد بن جریر طبری کی تاریخ۔ دراصل یہ کتاب تاریخ کی نہیں، بلکہ تاریخی مواد کا مجموعہ ہے اور ان روایتوں پر مشتمل جو اصحابِ حدیث کے معیار پر پوری نہیں اتریں اور ان کے نزدیک تحقیق طلب تھیں، لیکن چونکہ تاریخی حیثیت سے ان میں کچھ جان تھی اور یہ درجہ رکھتی تھیں کہ معلوماتِ حاصلہ کی روشنی میں ان پر غور کر لیا جائے۔ اس سے طبری کا مقام پیدا ہو گیا۔ انھوں نے تمام روایتیں اسناد کے ساتھ جمع کی ہیں اور اس طرح محض مضمون ہی کی نہیں، بلکہ روایتاً بھی ان پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ تاریخ طبری میں بعض روایتیں بغیر اسناد کے بھی مذکور ہیں جو محض شہرت پا جانے کی بنا پر انھوں نے ''قِیلَ'' یا ''یُقَالُ'' کہہ کر لکھ دیا ہے۔

لیکن ایک بات قطعی اور حتمی ہے کہ طبری نے اپنی کسی روایت کو روایت کے اعتبار سے کوئی درجہ نہیں دیا اور نہ اپنی بیان کردہ متضاد روایتوں پر کوئی تنقید کی ہے۔ انھوں نے کسی جگہ یہ بھی اشارہ نہیں کیا کہ روایت قبول کرنے کے لیے ان کے ہاں معیار کیا ہے، بلکہ مجموعی طور پر بھی ان کی کتاب کا درجہ خود ان کے اپنے کسی بیان سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ گویا طبری نے بس اتنا کیا ہے کہ جو روایت انھیں جس طرح پہنچی اسے سلسلہ وار اپنی کتاب میں جگہ دے دی، یعنی انھوں نے موادِ حاصلہ پیش کر دیا ہے جس پر غور کرتے وقت صحیح و سقیم

کا امتیاز قائم کرنے کے لیے دوسرے ذرائع کام میں لانے ضروری ہیں۔

راقم الحروف کو گہرے مطالعے کے بعد ایک اندازہ البتہ ہو سکا ہے کہ کسی واقعے کے متعلق جو بات طبری کو زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے اسے سب سے پہلے لکھتے ہیں اور پھر اسی ترتیب سے لکھتے ہیں، آخر میں وہ بات کہتے ہیں جو ان کے نزدیک حد درجہ ضعیف یا مردود ہوتی ہے، کیوں کہ وہاں وہ عموماً سند بیان نہیں کرتے۔

لیکن یہ ادراک بھی مفید نہیں۔ محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ اپنے سیاسی رجحانات کی بنا پر اس قابل نہیں کہ دوسری شہادتوں کے بغیر ان کی بات کو حجت بنایا جا سکے۔ وہ اپنے تمام فضل و کمال کے باوجود تشیّع میں مبتلا تھے اور بعض جگہ غلو بھی کر گئے۔ یہ تشیّع محض ان کی تاریخ ہی میں نہیں، تفسیر میں بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔[1]

---

[1] مولف مذکور نے علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی شخصیت اور تاریخ کی بابت کافی جامع تبصرہ کیا ہے، خاص کر ان کا یہ ماننا کہ ابن جریر طبری کی کتاب تاریخ نہیں موادِ تاریخ کی کتاب ہے۔ علامہ ابن جریر طبری نے بھی اپنی کتاب کے آغاز میں بعینہٖ اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ناظرینِ کتاب یہ بات سمجھ لیں کہ میں نے جو اخبار و آثار اس کتاب میں نقل کیے ہیں، اس میں میرا اعتماد انھی روایات پر ہے جنھیں میں نے ذکر کیا ہے جن کے ساتھ ان کی سندیں مذکور ہیں، اس میں وہ حصہ بہت ہی کم ہے جنھیں میں نے عقلی دلائل کے ادراک اور وجدانی استنباط کے بعد ذکر کیا ہے۔ کیونکہ گذشتہ واقعات و حوادث کی خبروں کا نہ ذاتی طور پر ہمارا مشاہدہ ہے نہ وہ زمانہ ہی ہم نے پایا ہے، ان کا علم صرف ناقلین اور روات کی بیان کردہ خبروں ہی سے ہوسکتا ہے نہ کہ عقلی دلائل اور وجدانی استنباط سے۔ پس ہماری کتاب میں جو بعض ایسی روایات ہیں، جنھیں ہم نے پچھلے لوگوں سے نقل کیا ہے، جن میں ہماری کتاب کے پڑھنے یا سننے والے اس بنا پر نکارت و شناعت محسوس کریں کہ اس میں انہیں صحت کی کوئی وجہ اور معنی میں کوئی حقیقت نظر نہ آئے، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا اندراج ہم نے خود اپنی طرف سے نہیں کیا بلکہ اس کا منبع وہ ناقل ہیں جنھوں نے وہ روایات ہمیں بیان کیں، ہم نے وہ روایات اسی طرح بیان کر دی ہیں جس طرح ہم تک پہنچیں۔'' (الطبري: ١/ ٨)

راقم الحروف کو ان کی تفسیر کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن استفادے کے لیے احتیاط شرط ہے، یہی احتیاط ان کی تاریخ کے مطالعے کے وقت ضروری ہے، بلکہ تفسیر سے بھی زیادہ، کیوں کہ ان کی تاریخ میں تمام دنیا اور تمام گذشتہ زمانوں کے احوال درج ہیں۔ گویا ان کی گنی چنی سندوں میں جو چند راوی ہیں ان کا علم ایسا ہمہ گیر تھا کہ ساری دنیا پر اور تمام زمانوں پر محیط ہو گیا۔ یہ وہ بات ہے جس نے طبری کو اس قابل نہیں رکھا کہ مآخذ میں ان کی تاریخ کو کچھ بہت بلند درجہ دیا جا سکے۔

طبری ہی کی صف میں بلاذری کی کتابیں ہیں، انھیں ایک شرف البتہ حاصل ہے کہ وہ امیر المومنین المتوکل علی اللہ اور دوسرے عباسی خلفا کے مقربین میں سے تھے۔ اس طرح ان کی کتاب کو نیم سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی۔ پھر بھی ان سے بات اسی وقت لینی چاہیے جب دوسری طرف سے قوی شہادتیں ملیں۔

ابن خلدون:

علامہ ابن خلدون علمِ تاریخ کے علما میں عظیم ترین شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا مقدمہ عجوبۂ روزگار ہے، مگر انھی کے لیے جنھوں نے قرآن حکیم اور ارشاداتِ نبوی کے مطالعے کی سعادت حاصل نہ کی ہو۔ علامہ ابن خلدون نے روایت کے اخذ کے طریقوں پر بھی اچھی بحث کی ہے، مگر بعض جگہ وہ غلطیاں کر گئے، مثلاً: انھوں نے عبیدیوں کے دعوائے فاطمیت کو قبول کر لیا، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اور ان کے نسب کی صحت کا ادنیٰ ترین ثبوت بھی نہیں دیا جا سکتا۔ نسب کے فیصلے کا اختیار ابن خلدون کو نہیں تھا اور نہ اس بارے میں ان کی رائے کوئی قیمت رکھتی ہے۔ نسب کا فیصلہ ہم عصر اہلِ خاندان کیا کرتے ہیں اور انھی کا قول حجت ہوتا ہے۔

عبیدیوں کی فاطمیت کا انکار محض عباسی خلفا ہی نے نہیں کیا، تمام بنو ہاشم، بلکہ سب بنو عبد مناف ان کے مجہول النسب ہونے کے بارے میں متفق ہیں۔ معمولی عقل کی بات ہے کہ فے اور خمس کی تقسیم کے سلسلے میں خلفائے عباسیہ کے دفاتر میں ہر ہاشمی اور مُطلبی

خاندان کے ایک ایک فرد کا نام محفوظ تھا۔ ہر گھرانے میں سرکاری نقیب مقرر ہوتے تھے جو ایک ایک فرد کا حصہ پہنچاتے تھے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ خانوادۂ رسالت کے کسی فرد کا نام غیر معروف رہے۔ بعد میں بھی ہاشمی خاندان کچھ گم نام نہیں ہو گیا۔

حضرت قاضی ابوبکر الباقلانی خاص مستقر خلافت میں موجود تھے۔ خلفائے اسلام کے ہاں ان کی علمی اور سیاسی حیثیت مسلم تھی۔ وہ مقربین بارگاہِ خلافت میں تھے۔ اُن کے پاس علم الانساب کا جتنا مواد تھا وہ ابن خلدون کو ان کے زمانے میں کیسے میسر آ سکتا تھا۔ امام باقلانی نے جب عبیدیوں کا مجہول النسب ہونا بدلائلِ قاطعہ ثابت کر دیا تو پھر گفتگو کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس عصری حجت کے بعد ابن خلدون کی رائے خود بخود بے قیمت ہو جاتی ہے۔

اگر کہا جائے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عباسی خلفا نے چونکہ عبیدیوں کو اپنا سیاسی حریف قرار دے دیا تھا، جنھوں نے اتنی شوکت حاصل کر لی تھی کہ عباسی خلفا ان کے مقابلے سے عاجز تھے، اس لیے عوام میں ان کی اہمیت کم کرنے کے لیے ان کے نسب پر طعن کیا، تو یہ قول سراسر باطل ہے۔ کتنے دوسرے فاطمی سادات تھے جنھوں نے آزاد حکومتیں قائم کر لی تھیں اور ذی شوکت و اقتدار تھے، بلکہ خلافت کے دعوے دار بھی، مگر ان میں سے کسی کا نسب زیرِ بحث نہیں آیا۔ نسب کی بحث تو ادعائے باطل کی صورت میں ہوتی ہے۔

طبری نے ۳۰۲ھ کے احوال کے تحت بتایا ہے کہ امیر المومنین المقتدر باللہ کے زمانے میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ وہ محمد بن حسن بن علی بن موسیٰ بن جعفر ہے۔ خلیفہ نے آلِ ابی طالب کے بزرگوں کو جمع کیا اور ان کے نقیب احمد بن الصمد کو بھی طلب فرمایا جو ابن طومار کے نام سے مشہور تھے۔ وہاں ابن طومار نے بیان دیا کہ حسن (عسکری) بن علی (رضا) بن موسیٰ (الکاظم) بن جعفر (الصادق) لاولد فوت ہوئے تھے، ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ چنانچہ اس شخص کو سخت سزا دی گئی اور حج کے موقع پر اسے اونٹ پر بٹھا کر اس کی خوب تشہیر کی گئی۔ اس زمانے میں اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی شخص ہاشمی بن سکے۔

آلِ عبد مناف جہاں اس بات کو جانتے تھے کہ حسن عسکری کے ہاں کوئی بیٹا پیدا ہی نہیں ہوا، اسی طرح وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عبیدیوں کا مورث عبیداللہ جو اپنے آپ کو مہدی کہتا تھا وہ فاطمی نہیں، بلکہ مجہول النسب ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''تاریخ الخلفاء'' میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ عزیز عبیدی بن معز نے امیر اندلس کو ایک خط بھیجا جو سب وشتم سے مملو تھا۔ اموی امیر نے یہ جامع و مانع جواب دیا جو عربی ادب کا شہ پارہ ہے:

''أما بعد! فإنك قد عرفتنا فهجوتنا ولو عرفناك لأجبناك''

''تم ہمیں پہنچاتے ہو اسی لیے ہماری ہجو کر سکے، ہم بھی تمھیں جانتے ہوتے تو جواب دیتے۔''

اسی طرح علامہ ابن خلدون نے حادثۂ کربلا اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کا صحیح استقصاء نہ کیا اور نہ مواقفِ اہلِ بیت کو دیکھا۔ ان کا تبصرہ (مقدمہ، ص: ۱۲۵) ان کے ذہنی الجھن کی دلیل ہے۔ اسی لیے وہ مسئلہ صاف کرنے کے بجائے اور الجھا گئے۔

جامعین:

پھر ان کے علاوہ ہیں ''اسد الغابۃ'' یا ''طبقات ابن سعد''۔ ان کا احوال جمع کرنے کا طریقہ بھی ایسا ہے کہ محدثین کرام کے اصول پر ان کی روایتیں پرکھی جا سکتی ہیں۔ ابن سعد کے سلسلے میں خامی صرف ایک ہے کہ وہ خود تو معتبر وثقہ ہیں لیکن ان کے استاد محمد بن عمر واقدی مردود الروایت ہیں، لہٰذا ان کی وہی روایتیں قابلِ غور ہیں جو واقدی کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے مروی ہیں۔ بہرحال اس کتاب میں قیمتی مواد ہے، اگرچہ بعض نہایت لغو اور بے اصل روایتیں اس میں پائی جاتی ہیں، مثلاً: یہ کہ سورۃ النجم کی تلاوت کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے بتوں کی تعریف نکل گئی تھی، جس کی وجہ سے کفار نے بھی مسلمانوں کے ساتھ آیتِ سجدہ پر سجدہ کیا تھا، حالانکہ صحاح میں ایسا کوئی واقعہ مذکور نہیں، اور نہ کفار کے سجدے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح ابن سعد کی یہ روایت بھی مردود اور بے اصل

ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس وقت دفن کیا گیا جب جسمِ اطہر پر عام انسانوں کی طرح موت کی علامات طاری ہوگئی تھیں اور جسم میں تغیر ہونے لگا تھا، حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ کے جسدِ پاک میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں ہوا تھا اور آخر وقت تک زندگی کی سی تازگی موجود تھی۔

اس قسم کی کتابوں میں سے زیادہ بہتر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب ''الإصابة في تمییز الصحابة'' ہے۔ اس سے جہاں یہ فائدہ ہے کہ چوتھے درجے تک کے اصحاب کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں، یعنی ان کے بھی جن کا صحابی ہونا مشتبہ ہے، لیکن زمانہ انھوں نے ایسا پایا کہ صحبتِ نبوی کا شرف انھیں مل سکتا تھا، وہاں آپ نے ساتھ ساتھ محدثانہ تنقید بھی کی ہے۔ اس طرح اس کتاب کی افادیت بہت زیادہ ہوگئی۔ اسی ذیل میں حافظ ابن عساکر اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ جیسے ائمہ کی کتابیں ہیں اور ان سے صحیح معنی میں بہت کچھ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن بات کسی کی صحیح نہیں، روایت کسی کی حجت نہیں، جب تک درایتاً قابلِ قبول نہ ہو اور بحث و تمحیص کے بعد اسے دلائل کے ساتھ اختیار نہ کیا گیا ہو۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی کتاب ''الاستیعاب'' بھی مفید بہت ہے۔ اگرچہ اُن کے بعض ایرادات پر ائمہ نے اعتراض کیے ہیں اور تنقیح فرمائی ہے۔[1]

اہلِ کذب:

اب آتے ہیں وہ اصحابِ کذب و افترا جنھوں نے خاص مقاصد کے تحت تصنیف و تالیف کا پیشہ اختیار کیا، مثلاً: مسعودی کہ اس شخص کو نہ روایت سے بحث ہے نہ درایت سے، بلکہ عدل کے ساتھ وہ کوئی بات خوش دلی سے نہیں کہہ سکتا۔ جن چیزوں کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں انھیں تو بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن اس کا مقصد تصنیف و تالیف سے محض یہ نظر آتا

[1] ملاحظہ ہو علامہ سبکی رحمہ اللہ: طبقات الشافعیة الکبریٰ (۶/ ۱۳۴۔ ۱۴۰) زیرِ عنوان عبدالمومن بن خلف حافظ شرف الدین دمیاطی رحمہ اللہ۔ (مولف)

ہے کہ کسی طرح اخلاف کو اسلاف سے برگشتہ کر کے امت کی تاریخ میں ہر ممکن خلا پیدا کر دے۔ پھر بھی عجیب بات ہے کہ اسے کذاب ومفتری سمجھنے کے بجائے لوگوں نے محقق ومورخ سمجھ لیا اور اس کی کتابوں سے استناد کر کے معتبر بننے کی کوشش کی۔

اصحابِ تالیف:

پھر وہ حضرات ہیں جنھوں نے خاص خاص موضوع مقرر کر کے کتابیں لکھیں، جیسے: خطیب بغدادی کی ''تاریخِ بغداد''۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتابوں کی حیثیت بھی تاریخی مواد ہی کی ہے۔ ان کی مستند باتیں وہی سمجھی جائیں گی جو ان کے موضوع پر دوسری جگہ سے حاصل نہ کی جا سکیں۔ خطیب بغدادی بڑے وسیع العلم شخص تھے مگر انھوں نے تاریخ بغداد میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں اور ایسی لغو وفضول باتیں لکھ گئے ہیں جنھیں اہلِ علم نے پسند نہیں کیا، اور نہ ان جیسے صاحبِ نظر شخص کے لیے وہ زیبا تھیں، مثلاً: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو امیر المومنین عبداللہ المنصور رحمہ اللہ کی طرف سے محکمۂ قضا کا عہدہ قبول کرنے کی پیش کش اور قبول نہ کرنے پر انھیں سزائے قید وتازیانہ اور افتا کی ممانعت۔

امت کے ان دونوں پیشواؤں کی وفات سے تین سو برس کے بعد یہ باتیں پہلی مرتبہ خطیب بغدادی کے قلم سے نکلی ہیں۔ اطراف واکنافِ عالم میں حنفی علما پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نے ان سے پہلے اس قسم کی باتیں نہیں کہیں۔ شاگردوں سے زیادہ اپنے استاد کا حال اور کون جان سکتا ہے، لیکن خطیب بغدادی نے خوف نہیں کیا کہ افترا کی کچھ سزا بھی ملتی ہے۔ انھوں نے بغیر تحقیق کے یا عمداً ایسی باتیں لکھ دیں جنھیں مطلب پرست لوگ لے اڑے اور آج دنیا میں اس بے اصل بات کی کتنی شہرت ہے! علامہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں امام اعظم رحمہ اللہ کے احوال کے تحت خطیب کی اس حرکت پر نکتہ چینی کی ہے اور لکھا ہے کہ ان جیسے شخص کے لیے ایسی باتیں لکھنی موزوں نہیں تھیں۔ اس سلسلے میں مناسب ہے کہ سلطان ابوبکر الملک المظفر بن ایوب رحمہ اللہ کا رسالہ ”السهم المصيب في الرد على

الخطیب'' کا مطالعہ کیا جائے جو مصر و ہند سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ تالیف ۶۲۱ ھ کی ہے، یعنی خطیب کے تین سو برس بعد کی۔ اس وقت سلطان نے نابلس کا محاصرہ کر رکھا تھا اور نصاریٰ سے برسرِ پیکار تھے۔ ان کی عظمتِ نفس اور استحضارِ علمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاد میں مشغولیت کے باوجود کتابوں کی عدمِ موجودگی میں یہ رسالہ مرتب فرمایا۔ خود لکھتے ہیں کہ افسوس اس وقت میری کتابیں میرے پاس نہیں۔

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے متعلق طبری رحمہ اللہ نے بھی یہ محکمۂ قضا کی پیشکش کا قضیہ لکھا ہے مگر ان کی روایتوں میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس میں قید و بند یا طرفین کی طرف سے باہمی ہتک حرمت کا شائبہ بھی نظر آئے، لیکن خطیب رحمہ اللہ نے ایک طومار باندھ دیا۔[1]

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ انھیں کسی جگہ کا قاضی یا قاضی القضاۃ بنا کر ان کی صلاحیتوں کو ضائع کیا جاتا۔ امیر المومنین منصور رحمہ اللہ جیسے قدر شناس اور علم پرور خلیفہ نے ان کے سپرد یہ خدمت کی تھی کہ آثار و احادیث کی روشنی میں امت کے لیے ایک دستور فقہی مرتب کریں جو خلافتِ اسلامیہ کا معمول ہو اور سلف کا علم محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ اسلام کا سب سے پہلا فقہی نظام اس طرح مدوّن ہو گیا۔ اسی کو عرف میں ہم حنفی مذہب کہتے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کی اس عجوبۂ روزگار خدمت کے سبب نعمان بن ثابت ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو امام اعظم کہا جاتا ہے۔ اور اسی سبب سے امام اعظم کے شاگردوں کو کاروبارِ مملکت چلانے کے لیے اہم مناصب تفویض ہوئے جس کے نتیجے میں تین چوتھائی عالمِ اسلام فقہ حنفی کا متبع ہے۔[2]

---

1. مولف نے یہاں حافظ خطیب بغدادی کے حوالے سے بلاشبہ عدمِ توازن سے کام لیا ہے اور اپنے مسلکی اختلاف کی بنا پر عدل سے بعید غیر علمی تبصرہ رقم کیا ہے۔ حافظ خطیب بغدادی ایک ثقہ امام اور معتبر عالم تھے۔ انھوں نے جو روایات لکھی ہیں، اسانید کے ساتھ درج کی ہیں جنھیں دیکھ کر صحیح غلط کا فیصلہ تو کیا جا سکتا ہے، لیکن انھیں محض اس بنا پر رد کرنا کوئی علمی طریق نہیں کہ اسے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے۔
2. یہاں شاید مصنف کا اشارہ فقہ حنفی کی تدوین کی خاطر بنائی جانے والی ایک مزعومہ کمیٹی کی طرف ہے جو محض ایک افسانہ اور اغلوطہ ہے جس کی حقیقت کے لیے آپ علامہ رئیس ندوی کی کتاب ''اللمحات'' دیکھ سکتے ہیں۔

صدر الائمہ نے مناقب الامام الاعظم میں ایک واقعہ مَرُو کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہاں عرصۂ دراز سے فقہ حنفی رائج تھی۔ علامہ نضر بن شمیل رحمہ اللہ جب بصرہ سے مرو تشریف لائے تو چونکہ آپ علمائے ظواہر میں تھے، اس لیے فقۂ حنفی کا یہ رواج انھیں ناگوار ہوا اور بعض نوعمر محدثوں کو اپنے ساتھ ملا کر انھوں نے مخالفت شروع کر دی۔ معاملہ اس حد تک بڑھا کہ امام اعظم رحمہ اللہ کی کتابوں کے اوراق کو دھونا شروع کر دیا۔ خالد بن صبیح نے جو مرو کے قاضی تھے، ان لوگوں کی شکایت وزیر فضل بن سہل تک پہنچائی جو امیر المومنین عبداللہ المامون رحمہ اللہ کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے تمام صورتِ حال سے امیر المومنین کو مطلع کیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ دونوں فریق کل صبح حاضر ہوں، تاکہ فیصلہ کروں۔ امیر المومنین جیسے یگانۂ روزگار عالم وفقیہ کے سامنے بولنے کی صلاحیت نضر بن شمیل میں نہیں تھی، اس لیے احمد بن زہیر کو گفتگو کے لیے منتخب کیا گیا۔ اگلے دن جب فریقین اپنے اپنے گروہ کے ساتھ حاضر ہو گئے تو امیر المومنین برآمد ہوئے اور سب کو سلام کیا۔ پھر دریافت کیا کہ آپ حضرات نے امام ابو حنیفہ کی کتابوں کے ساتھ یہ کیا رویہ اختیار کیا ہے؟ نضر تو خاموش رہے، لیکن احمد بن زہیر نے عرض کی: امیر المومنین! اگر اجازت ہو تو میں بولوں؟ فرمایا: اگر بہتر طریق پر گفتگو کر سکتے ہیں تو آپ ہی بولیں۔ وہ کہنے لگے: ہم نے یہ رویہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ ہم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کتابوں کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے خلاف پاتے ہیں۔ امیر المومنین نے فرمایا: کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے خلاف کس طرح؟ اور اتنا کہہ کر خالد بن صبیح سے پوچھا: فلاں مسئلے پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کیا فرماتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا تو احمد بن زہیر نے حنفی فتویٰ کے خلاف حدیث پڑھنی شروع کی۔ مگر امیر المومنین نے اس کی تائید میں متعدد احادیث اپنی سندوں کے ساتھ سنائیں۔ ان حدیثوں کا احمد بن زہیر کو علم بھی نہ تھا۔ غرض یوں ہی علمی بحث چلتی رہی اور غلبہ امیر المومنین ہی کو ہوا۔ پھر آخر میں فرمایا:

"لو وجدناه مخالفاً لکتاب اللّٰہ وسنة رسوله ﷺ ما استعملناه"[1]

''اگر ہم انھیں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے خلاف پاتے تو ہرگز (فقہ مرتب کرنے کا) منصب انھیں سپرد نہ کرتے۔''

کہاں امیر المومنین المامون رحمہ اللہ کا یہ ارشاد اور کہاں خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی بیان کردہ خرافات جو عقلاً ونقلاً لغو محض ہیں، لیکن ان کی سُمِّیّت ایسی ہے کہ ہمارے زمانے ایک بسیار نویس نے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے ''سیاسی مذہب'' پر ایک کتاب لکھ ماری اور بے محابا صحابہ وخلفائے اسلام وائمہ کبار پر بہتان وافترا کو اپنا علمی کارنامہ سمجھ بیٹھے۔[2]

خطیب بغدادی کی ''تاریخ بغداد'' ہی کی صف میں وہ کتابیں آتی ہیں جو مثلاً اصنافِ ادب پر لکھی گئیں، جیسے جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین" یا "اختیار المنظوم والمنشور" یا "عقد الفرید" وغیرہ۔ ان کتابوں سے تاریخی امور میں استشہاد نہیں کیا جا سکتا، ادبی امور میں کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کوئی ادبی لطیفہ لکھا، اور کسی معروف شخص کا نام بھی لیا ہو، یا کچھ اشعار درج کیے ہوں، یا خطبہ نقل کیا ہو۔ ان چیزوں کو

---

[1] ملاحظہ ہو: مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی تالیف امام ابن ماجہ اور علمِ حدیث (ص: ۱۰) طبع نور محمد اصح المطابع، کراچی۔ (مولف)

[2] یہاں ہم مولف سے پورے احترام کے سخت اختلاف کرتے ہوئے کہیں گے کہ انھوں نے امام ابو بکر خطیب البغدادی رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر محدث کی بابت کلام کرتے ہوئے ان کا ادب واحترام ملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی ''تاریخِ بغداد'' کو اس امت کے اسلاف کی نظروں میں جو مقام ومرتبہ حاصل ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مولف مذکور کو پورا حق ہے کہ وہ خطیب بغدادی کی کتاب کے مندرجات پر علمی طور پر جو تنقید کرنا چاہیں مدلل پیرائے میں کریں، لیکن اس کے لیے خطیب بغدادی کی علمی حیثیت کو مجروح کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین سے متعلق محدثین کے تنقیدی اقوال نقل کرنے پر علمائے احناف اکثر خطیب بغدادی رحمہ اللہ سے ناراضی کا اظہار کرتے ہیں۔ مولفِ کتاب چونکہ خود بھی حنفی المذہب ہیں سو ان کا یہ تبصرہ بھی حقائق سے زیادہ مسلکی حمیت کا مظہر معلوم ہوتا ہے جبکہ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے بعد علومِ حدیث کا ماہر امام ابو بکر خطیب بغدادی رحمہ اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوا۔

اس وقت تک مستند نہیں سمجھا جاتا جب تک دوسری طرف سے بھی توثیق نہ ہو۔ کتاب جب تاریخ کی نہیں، بلکہ ادب کی ہے تو پھر صحتِ تاریخی کا ثبوت کیونکر ہوسکتی ہے؟!

اسی طرح طبقاتِ علما کی کتابیں ہیں، مثلاً ''الجواھر المضیئة'' (مولفہ: علامہ عبدالقادر قرشی) جو حنفی علما کے احوال میں ہے۔ اور ''طبقات الشافعیة الکبریٰ'' جو شافعی علما وفقہا کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں میں تاریخی باتیں بھی ہیں اور بعض دوسری قسم کی مرویات بھی۔ ان تمام امور کو محض ان کتابوں میں مرقوم ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ جو بات جس موضوع سے تعلق رکھتی ہے، اسی موضوع کے اصول پر اسے جانچا جائے گا۔ حکایت حکایت، روایت روایت اور واقعہ واقعہ۔ خلطِ مبحث کرنے سے مطلب فوت ہوتا ہے اگر اخذِ مواد میں بے احتیاطی کی جائے گی تو وہی حشر ہوگا جو امام غزالی کی ''احیاء علوم الدین'' کی احادیث کو واقعی حدیث سمجھ لینے سے ہوگیا ہے اور صوفیہ کا طبقہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہے، اس کتاب کی بکثرت احادیث خالص موضوعات ہیں۔ علامہ سبکی نے ان تمام احادیث پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

طبقاتِ علما کی تمام کتابوں میں سب سے افضل و اعلیٰ ''طبقات الشافعیة الکبریٰ'' ہے۔ اس کے مصنف علامہ عبدالوہاب سبکی فخرِ انام ہیں۔ نہایت مجتہدانہ طرزِ تحریر ہے اور امور پر اس روانی سے بحث فرماتے ہیں کہ باید و شاید۔ اور سب سے خشک ''طبقات الحنابلة'' ہے جس کی روایتیں عموماً محلِ نظر ہیں۔ ''الجواھر المضیئة'' کا میں بالاستیعاب مطالعہ نہ کر سکا، اگرچہ اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

دیگر علما:

اسی ذیل میں درجہ بدرجہ وہ لوگ آتے ہیں جنھیں تصنیف و تالیف کا شوق تو تھا مگر بس اتنا کہ فلاں کتاب کے حوالے سے ایک بات لکھ دی اور فلاں کے حوالے سے دوسری۔ تحقیق و تنقیح سے کچھ مطلب نہیں۔ یہ مرض متاخرین میں بہت زیادہ تھا۔ ایسے لوگ عموماً

اس دور کی پیداوار ہیں جب امت ذہنی انحطاط میں مبتلا ہو چکی تھی اور اپنی مستقل تصنیف کے بجائے لوگ دوسروں کی کتابوں پر حاشیہ لکھا کرتے تھے اور پھر حاشیے پر حاشیہ۔

ان لوگوں میں سے ممتاز ہیں علامہ جلال الدین سیوطی۔ بڑے عالم تھے، بڑے محدث تھے، فقیہ تھے، ادب کا شوق تھا اور تقریباً ہر علم وفن سے مس تھا۔ مگر ان میں یہ کمزوری پیدا ہوگئی تھی کہ کسی طرح تالیفات کی تعداد دوسروں سے بڑھ جائے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ کسی کتاب کے حوالے سے بزرگانِ پیشین کے خلاف کوئی جھوٹی بات لکھ دینے کا یہ مطلب نہیں کہ کاتب کی ذمے داری ختم ہوگئی۔ افسوس ہے کہ علامہ سیوطی کی کسی کتاب میں تحقیق کی جھلک نہیں۔ ہر تصنیف خشک و بے جان ہے۔ موضوعات پر کتاب لکھی "اللآلئ المصنوعة في الأحاديث الموضوعة" کتاب دیکھ کر آدمی سمجھے گا کہ شاید اس سے پتا چل جائے گا کہ کون سی حدیث موضوع ہے اور کون سی نہیں؟ لیکن سیوطی صاحب نے یہ کتاب ایسے لکھی ہے کہ اشتباہ کسی طرح رفع نہیں ہوتا اور آدمی کے سامنے کوئی محققانہ بات نہیں آتی۔ ان کی تحریروں میں اگر اتفاقاً کہیں چاشنی نظر آ بھی جاتی ہے تو وہ عموماً بزرگانِ سلف کی تحریروں کی برکت ہوتی ہے۔ ان کی تالیفات میں بدترین کتاب ہے "تاریخ الخلفاء" لیکن افسوس ہے کہ مدارس میں تفسیر جلالین جیسی جامد و یابس کتاب پڑھانے والے لوگ غالباً تحقیق سے مناسبت نہ رکھنے کے سبب "تاریخ الخلفاء" ہی پر تکیہ کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے امت کی تاریخ پر عبور حاصل کر لیا، حالانکہ موجودہ دورِ تحقیق ہی میں نہیں، بلکہ محدثین کرام کے اصول پر بھی اس کا اکثر حصہ سوختنی ہے۔ البتہ ہمیں تسلیم ہے کہ وہ جامع اچھے ہیں اور ان کی تالیفات کا پتا چلتا ہے کہ کون کون سی کتابیں انھوں نے مطالعہ کیں۔ کاش اس کثرتِ مطالعہ سے کوئی مفید تر نتیجہ مرتب ہوتا اور کسی ایک ہی موضوع پر وہ کوئی بلند پایہ تحقیقی کتاب چھوڑ جاتے۔

ابن قتیبہ:

علامہ ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ رحمہ اللہ عالم و بزرگ وفقیہ شخص تھے۔ ان کی متعدد

کتابیں ہیں جو ان کے علم و فضل پر گواہ ہیں، لیکن ان کے نام سے ایک تاریخ رائج ہے: "الإمامة و السياسة" کتاب کیا ہے؟ خرافات کا مجموعہ ہے۔ گمان ہے کہ علامہ ابن قتیبہ نے "الإمامة و السياسة" کے عنوان کے تحت کچھ یادداشتیں مرتب کی ہوں گی، لیکن کوئی دوسرا شخص انھیں لے اڑا یا اس نے اس کتاب کا نام چرا لیا۔ یا خود علامہ ابن قتیبہ کا نام اختیار کر کے اس کتاب کو معتبر بنانا چاہا۔ بہرحال وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر کوئی شخص اپنا وقت ضائع کر کے اس کی بیان کردہ روایات کی تنقیح کرنی شروع کرے تو اس سے دس گنی کتاب ہو جائے۔ لہٰذا اہلِ علم کو اس کے حوالے سے کوئی بات کہنی درست نہیں۔ اسے وقت گزاری کے لیے بھی پڑھنا موجبِ خسران ہوگا، چہ جائیکہ اسے کوئی علمی حیثیت دی جائے۔[1]

---

[1] مولف کا ابن قتیبہ کی کتاب "الامامة والسياسة" کی بابت یہ تجزیہ نہایت صائب ہے، تاہم انھوں نے یہاں اس بابت کچھ زیادہ معلومات نقل نہیں کیں۔ سو اس مقدمہ سے متعلق چند ادلہ ہدیۂ قارئین کیے جاتے ہیں:

① جن علما نے ابن قتیبہ کی کتب کی فہرست سے بحث کی ہے، ان میں سے بیشتر نے "الامامة والسياسة" کا تذکرہ نہیں کیا۔ ابن خلکان، لسان المیزان، تاریخ خطیب بغدادی، شذرات الذہب وغیرہ کسی میں بھی ابن قتیبہ کی کتب کی فہرست میں اس کتاب کا نام موجود نہیں۔

② ابن قتیبہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ ادب میں ان کی کتاب ''ادب الکاتب'' کو ابن خلکان ادب کے اصول و ارکان میں سے مانتے ہیں۔ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ: ۴۸۶) یہی وجہ ہے کہ ابن قتیبہ کی ہر کتاب چاہے وہ غریب القرآن ہو یا غریب الحدیث ان کے ادبی ذوق پر شہادت دیتی نظر آتی ہے۔ لیکن "الامامة والسياسة" کے مطالعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ اس کا مصنف علم و ادب میں کوئی ممتاز درجہ نہیں رکھتا۔ اگر ہم اس کتاب کے فضول و غیر مستند واقعات سے صرف نظر کر کے صرف اس کے ادبی معیار ہی کو دیکھیں تو ذوقِ سلیم صاف فیصلہ کرے گا کہ یہ کتاب ابن قتیبہ جیسے قادر الکلام کی نہیں ہو سکتی۔

③ اس کتاب میں مصر کے علما سے بھی براہِ راست روایتیں موجود ہیں، جب کہ ابن قتیبہ کبھی مصر گئے ہی نہیں۔ اسی طرح اس کتاب میں مولف کتاب کی دمشق میں موجودگی کا ذکر بھی ملتا ہے، جبکہ تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ ابن قتیبہ کبھی دمشق نہیں گئے۔ ←

واقدی:

محمد بن عمر واقدی ایک مشہور داستان گو ہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخی افسانے لکھنے کے موجد بھی ہیں۔ فتوحِ شام اس کا نمونہ ہے۔ اگرچہ اہلِ تحقیق کو آج باور نہیں کہ فتوحِ شام کے نام سے جو کتاب متداول ہے وہ انہی محمد بن عمر واقدی کی ہے، ممکن ہے کہ اسی نام کے کسی دوسرے شخص کی ہو۔ یا کسی ایسے مجہول الاسم کی جس نے واقدی کا نام اختیار کر لیا ہو۔

بہر حال محمد بن عمر کو یہ سلیقہ ہے اور اسے عیب نہیں کہا جا سکتا کہ تاریخی واقعات میں افسانوی تسلسل پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی طرف سے کچھ تفصیلات کا اضافہ کر دیا۔ یہ ایک فن ہے اور اس میں گنجایش ہے کہ اپنی طرف سے وضع کر کے یا کہیں کا واقعہ کہیں چسپاں کر کے داستان مرتب کر لی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں تاریخی واقعات معلوم کیے جاتے ہیں اور افسانے کے کردار جاندار بنانے کے لیے تاریخی ہستیوں کے نام بھی لیے جاتے ہیں، لیکن غضب یہ ہے کہ لوگوں نے محمد بن عمر واقدی کو مورخ باور کر لیا۔ مستشرقین اپنے مطلب کے تحت اس نام کو خصوصیت کے ساتھ اعتبار کا درجہ دیتے ہیں۔ محدثین کرام کے ہاں چونکہ روایت کے صدق و کذب اور مرویات کی قوت وضعف سے بحث ہوتی ہے، پھر فنِ افسانہ نگاری سے انھیں کوئی تعلق نہیں اس لیے لامحالہ انھیں واقدی پر توجہ کی ضرورت ہوئی۔ اگر اس غریب کو داستان گو ہی رہنے دیا جاتا جو واقعی وہ ہے اور لوگ اسے مورخ نہ

← ④ جو واقعات "الامامة والسياسة" میں تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں، ان کا اجمالی تذکرہ ان کی دوسری کتاب ''معارف'' میں بھی ملتا ہے، لیکن دونوں کتابوں کے مباحث اور منطقی نتائج ایک دوسرے سے قطعی متضاد ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں یہ دونوں کتابیں کسی ایک شخصیت کی نہیں، بلکہ دو الگ الگ مختلف الخیال شخصیات کی رقم کردہ ہیں۔

ان دلائل سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "الامامة والسياسة" ابن قتیبہ کی طرف غلط طور پر منسوب ہے۔ اسی لیے اکثر محدثین و مورخین نے اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں کیا اور جنھوں نے کیا بھی ہے تو انھوں نے یقین کے ساتھ اس کی نسبت ابن قتیبہ کی طرف نہیں کی۔

سمجھتے تو اس کی یہ فضیحت نہ ہوتی۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ”اللآلئ المصنوعة في الأحاديث الموضوعة“ میں امام نسائی رحمہ اللہ کا ایک قول لکھا ہے، جس کی تائید دوسری کتابوں سے بھی ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

”قال النسائي: الكذابون المعروفون بوضع الحديث أربعة: ابن أبي يحيٰى بالمدينة، والواقدي ببغداد، ومقاتل بن سليمان بخراسان، ومحمد بن سعيد المصلوب بالشام“

”امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ جھوٹے لوگ جو اپنی طرف سے باتیں بنانے میں مشہور ہوئے چار ہیں: ابن ابی یحییٰ مدینہ میں، واقدی بغداد میں، مقاتل بن سلیمان خراسان میں اور محمد بن سعید، جسے سولی دی گئی تھی، شام میں۔“

مستشرقین:

اس سلسلے میں سب سے اہم مقام ان یہودی، نصرانی اور بے دین لوگوں کا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنی تحقیقی کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ مستشرق کہلائے اور انھوں نے حسبِ دعوائے خود اقوامِ مشرق کے علوم وفنون اور ادیان کے مطالعے کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس گروہ کے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اسلام اور مسلمانوں کی حد تک ان کی اکثریت کی نیت تحقیق کی نہیں، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے استخفاف کی ہے، لہٰذا انھوں نے عمداً مسلمانوں کی بے شعوری کے سبب واقدی اور مسعودی جیسے لوگوں کو معیار بنایا، بلکہ ”ألف ليلة و ليلة“ اور بعد کے افسانوں تک کو۔ اور اسی زاویۂ نگاہ سے انھوں نے مسلمانوں کو سمجھانا چاہا، بلکہ اسی آئینے میں اخلاف کو ان کی اور ان کے اسلاف کی صورت دکھانے کی کوشش کی۔ اور ہماری سادگی بھی دیدنی ہے کہ جو شکل انھوں نے دکھائی اسی کو ہم نے اپنی صورت باور کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ

مستشرقین کی تصانیف سے زیادہ مہلک چیز مسلم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے اور کوئی نہیں۔

افسوس ہے کہ امت کی موجودہ بیداری کے دور میں بھی نشاۃِ ثانیہ کی تڑپ رکھنے کے باوجود ''نئی روشنی'' کے اہلِ علم نے یہ کوشش نہیں کی کہ اصل مآخذ پر متوجہ ہوں اور دوسروں کی آنکھوں کے بجائے خود اپنی نگاہ سے اپنا سراپا دیکھیں۔ انھوں نے فرض کرلیا کہ علم وہی ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف آئے۔ ان کا تکیہ میور، اسمتھ اور ولہاسن پر رہا ہے اور اب ہتی اور گب ان کے استاد ہیں۔ بڑی حمیت پیدا ہوئی تو مسعودی کو لے بیٹھے۔ یہ نہیں جانا کہ جس قوم کی بابت یہ روایتیں ہیں انھیں قبول کرنے یا نہ کرنے کے کچھ آداب بھی ہیں۔ محدثین کرام کے اصول تک اگر ان کی رسائی نہ تھی تو کم از کم اہلِ مغرب ہی کے اصولِ جرح و تعدیل کا لحاظ رکھا ہوتا۔

ان لوگوں کو اتنا تو سوچنا چاہیے کہ جس امت کا دستور اساسی کتاب و سنت ہے اور جس کے اکابر نے اسلام کا نور چار دانگِ عالم میں پھیلا دیا، وہ خود کتاب و سنت کے محافظ اور پیرو ہونے چاہئیں یا اسے رد کرنے اور اس کی فعالیت کم کرنے والے۔ اگر خلفائے اسلام دین کی برکات سے بہرہ ور نہ ہوتے تو دنیا کی ہدایت کا سبب کیسے بنتے؟

اس وقت پاکستان ہی میں نہیں، بلکہ بلادِ عربیہ میں بھی جو کتابیں تاریخ کے نام سے لکھی اور پڑھائی جاتی ہیں، ان سے صرف ایک امر مترشح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس دنیا میں بالکل فضول تشریف لائے۔ آپ میں اتنی بھی صلاحیت نہ تھی کہ اپنے گھر کے لوگوں کی اور اپنے قریب رہنے والوں کی کچھ اصلاح فرماسکیں۔ آپ ﷺ نے دعویٰ تو کیا کہ آپ خاتم النبیین ہیں، آپ کے ذریعے دین کی تکمیل کی گئی اور آپ نے ایسی امت برپا کی جو خیر الامم اور مصطفیٰ ہے، لیکن عالم یہ ہے کہ آپ کے اصحاب یا ان کے متبع جو ایک ہزار برس تک آپ ﷺ کی دعوت کے علمبردار بنے رہے اور آپ کا کلمہ بلند کرتے رہے اور آپ ﷺ کا کلمہ بند کرنے میں کامیاب بھی ہوئے وہ سب معمولی انسانی اخلاق سے بھی

عاری تھے، چہ جائیکہ کمالاتِ ایمانیہ کے آئینہ دار سمجھے جائیں۔

یہ سب جذبات و تصورات ہمیں ان لوگوں کی کتابوں میں ملتے ہیں جو اپنے آپ کو تاریخِ اسلام کا عالم باور کراتے ہیں اور اس بات کے حق دار کہ تاریخ کے نام سے خرافات لکھ کر قوم کے بچوں کے ہاتھ میں دے دیں اور بچپن ہی سے ان کے دماغوں میں وہ زہر بھر دیں کہ سلف صالحین کی طرف سے کبھی ان کے دل صاف ہی نہ ہوں اور دعوتِ محمدیہ کی عظمت کبھی ان کے دلوں میں جگہ ہی نہ پا سکے۔ ان لوگوں میں ایسے ایسے بھی ہیں جن کے ناموں کے ساتھ بڑی بڑی ڈگریاں لکھی جاتی ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے نفیس اور شستہ انگریزی زبان میں کتابیں لکھیں اور ایسی کہ انگریز بھی انھیں لسانی حیثیت سے شہ پارہ کہیں، لیکن یہ تمام طلاقت لسانی اور روانی قلم صرف ہوئی محض اس بات پر کہ امت کی پوری تاریخ ان کے ہاتھوں مسخ ہوگئی۔ ان میں سب سے اہم مقام ہے جسٹس امیر علی کا جنھیں تاریخ کا امام کہا جاتا ہے اور جن کی تصانیف کو حرفِ آخر کا درجہ دے دیا گیا ہے، حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان میں کذب و افترا و تلبیس کے انبار جمع کر دیے ہیں۔

پس چہ باید کرد؟

ان سب معائب و مصائب سے نجات کی واحد سبیل یہ ہے کہ سرکاری طور پر یا بطور خود ایک ایسی جماعت کی تشکیل کی جائے جس میں صحیح العقیدہ اور مخلص اہلِ علم ہوں۔ اہلِ بدعت و زندقہ کو نہایت قوت کے ساتھ اس کی رکنیت سے دور رکھا جائے۔ کسی شخص کو اگر سبائی خیالات سے متاثر پایا جائے تو اسے فوراً جماعت سے نکال دیا جائے۔ جو لوگ عقیدتاً کتاب و سنت سے وفاداری نہیں برت سکتے، انھیں کیا حق ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ گفتگو کریں۔ ایسی جماعت کی اگر تشکیل کر لی گئی اور نہایت احتیاط سے اس کے ارکان کو چنا گیا اور اس کے سپرد یہ کیا گیا کہ تمام تاریخی مواد کی چھان بین کرے

اور اپنے اپنے شعبۂ تحقیق کے تحت لوگ کام کریں، اور پچیس تیس برس میں مسلمانوں کی مستند تاریخ پاکستان میں مرتب ہو جائے تو عالمِ اسلام کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ اسے پیش کیا جا سکے گا۔

اس وقت مصر میں ایک جماعت "لجنة الشباب المسلم" کام کر رہی ہے اور فاضلِ اجل محبّ الدین الخطیب نے اس سلسلے میں بہت اصیل کام کیا ہے۔ مواد تاریخی کی ہرگز کمی نہیں۔ تمام مآخذ تک موجود دور کی متمدن دنیا میں رسائی کے امکانات پیدا ہو چکے ہیں۔ کمی صرف اس کی ہے کہ اجتماعی طور پر کام نہیں ہوا۔ جن افراد نے بطورِ خود کام کیا ہے ان میں اکثریت یا تو ملتِ اسلامیہ کے خفیہ دشمنوں کی ہے یا ایسے لوگوں کی جنھیں تحقیق سے مناسبت نہیں اور محض کتاب شائع کرنے سے مطلب رکھتے ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں کہ ان کے ترکش کے تیروں کا ہدف کون ہے۔

قرآن حکیم نے نہایت بلیغ پیرائے میں تاریخ کی تدوین کے اصول و قواعد پر متنبہ کیا ہے:

① سب سے اہم ہے راوی کا پرکھنا تاکہ اس کی غلط بیانی یا تلبیس سے کسی کو بے وجہ نقصان نہ پہنچے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَٰدِمِينَ﴾ [الحجرات: ٦]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو لاعلمی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو، پھر جو تم نے کیا اس پر پشیمان ہو جاؤ۔"

② واقعات کی ترتیب زمانی ہونی چاہیے۔ یہ درست نہیں کہ کہیں کا واقعہ کہیں، کبھی کا کبھی اور کسی کا کسی دوسرے کے نام چسپاں کر کے ربط کو خبط کر دیا جائے۔ قصص کے معنی

ہی یہ ہیں کہ الٹے پاؤں قدم بہ قدم چلا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ [الکھف: ٦٤]

''سو وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانوں پر پیچھا کرتے ہوئے واپس لوٹے۔''

اسی لیے احوالِ تاریخیہ کو قصص کہتے ہیں کہ زمانی اعتبار سے ترتیب وار واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

③ جو روایت بیان کی جائے اس کی تصدیق واقعات سے ہونی چاہیے اور درایت کی کسوٹی پر اسے پورا اترنا چاہیے۔

④ مآخذ قریب ترین عہد کا ہو جسے بے غل وغش معتبر تسلیم کیا جا سکے اور ماحول کے مطابق قابلِ قبول ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے احوال بیان کر کے مذکورہ بالا تمام اصول کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ ارشادِ حق ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ [یوسف: ١١١]

''بلاشبہ یقیناً ان کے بیان میں عقل والوں کے لیے ہمیشہ سے ایک عبرت ہے، یہ ہرگز ایسی بات نہیں جو گھڑ لی جائے اور لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔''

اس آیت نے وضاحت کر دی کہ تاریخ کا مقصد عبرت و موعظت ہے، تاکہ اخلاف ان غلطیوں کا اعادہ نہ کریں جو اسلاف سے سرزد ہوئیں، لیکن عبرت و موعظت کے یہ معنی نہیں کہ بزرگوں پر سب وشتم اور طعن و تشنیع ہو۔ واقعات کا بیان ہدایت و رحمت کے

لیے ہونا چاہیے نہ کہ ضلالت وبغض ولعنت کے لیے۔

برادرانِ یوسف علیہ السلام کی غلطیاں اللہ تعالیٰ نے سب بیان کر دیں، لیکن اس طرح ان کی محبت وعزت دلوں میں قائم رہتی ہے۔ پیرایۂ بیان سراسر تعمیری نہ ہو، جیسا کہ قرآن حکیم کا ہے تو نتیجہ تخریب نکلتا ہے اور تاریخ کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت کے مخالفوں کا ذکر کیا ہے، لیکن انھی باتوں کا جن کا تعلق دعوت سے ہے۔ کسی کے ذاتی معائب اور نجی کمزوریاں بیان نہیں کیں اور نہ گالیاں دیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ فرعون ونمرود کی حیثیت عرفی کی ہتک نہ ہو، لیکن اکابر امتِ محمدیہ کے خلاف کسی ہرزہ سرائی سے دریغ نہ کیا جائے اور ان پر بہتان طرازی اور افترا کا نام تاریخ قرار دیا جائے، ان ملحدوں اور زندیقوں نے روایات کا جو پشتارہ امت کے لیے ''ورثہ'' میں چھوڑا ہے، اگر اس کی تنقیح نہ کی گئی اور واقعاتِ ثابتہ کی روشنی میں انھیں نہ پرکھا گیا تو ناممکن ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنی تاریخ پر فخر اور اپنے اسلاف سے محبت پیدا ہو سکے جو تعمیر ونشاۃ کے لیے اہم المہمات ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ اسلافِ کرام کے ذکر کے وقت وہ اپنے آپ کو اس صفت سے متصف کریں جو اللہ تعالیٰ نے علم برداران دعوتِ محمدیہ کی بتائی ہے اور وہی دعا وردِ زبان رکھا کریں جس کی خدائے بزرگ و برتر نے تلقین فرمائی ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ [الحشر: ۱۰]

''اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

ہمارے بزرگ ہماری ہی طرح کے آدمی تھے۔ ان میں وہی بشریت تھی جو ہم میں ہے، ان کے اندر خوبیاں بھی تھیں اور ان سے غلطیاں بھی ہوئیں، لیکن جب ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اپنے ذاتی بزرگوں کا تذکرہ گستاخی اور بے ادبی سے ہو اور ان پر جھوٹ بولا جائے تو ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفائے اسلام کے متعلق یہ سب باتیں کس طرح برداشت کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دے اور صراطِ مستقیم پر قائم رکھے اور اس خجالت سے محفوظ رکھے جو کل اپنے بزرگوں کے سامنے کھڑے ہونے پر ان لوگوں کو ہوگی جنھوں نے ان پر بہتان باندھے، ان کی نیتوں پر حملے کیے اور ان کی عزت وحرمت کو پامال کرنے کی کوششیں کیں۔ نعوذ باللّٰه من شر الوسواس الخناس، الذي يوسوس في صدور الناس، من الجنة والناس.

وصلى اللّٰه على سيدنا ومولانا محمد، خاتم النبيين، وسيد المرسلين، وعلىٰ آله وأصحابه، وخلفائه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

علی احمد عباسی

یکم رمضان ۱۳۷۹ھ

جہاں زیب کالج، سیدو شریف، سوات



حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۟ؕ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛ ۖۚ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا﴾ [الفتح: ۲۸، ۲۹]

’’وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اور اللہ گواہ کے طور پر کافی ہے۔ محمد اللہ کا رسول ہے اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں، تو انھیں اس حال میں دیکھے گا کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدے کرنے والے ہیں، اپنے رب کا فضل اور (اس کی) رضا ڈھونڈتے ہیں، ان کی شناخت ان کے چہروں میں (موجود) ہے، سجدے کرنے کے اثر سے۔ یہ ان کا وصف تورات میں ہے اور انجیل میں ان کا وصف اس کھیتی کی طرح ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی، کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے، تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے

اور انھوں نے نیک اعمال کیے بڑی بخشش اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔‘‘

حضرت امیر المومنین امام المسلمین خلیفۃ رسول رب العالمین سید الابدال سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما بھی اسی مبارک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کی صفت مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے، اس پر مستزاد یہ کہ آپ اسی پاک گروہ کے متفق علیہ امام اور نہایت ہی معتمد امیر بھی ہیں۔ صلوات اللّٰہ و سلامه علیهم أجمعین.

اموی خاندان کے اس چشم و چراغ، ملتِ بیضا کے اس امامِ ہدیٰ اور اہلِ عالم کے اس مثالی حکمران پر امتِ مسلمہ کو بجا طور پر ناز ہے اور اس پر فخر، کہ سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خیرِ امت کی تشکیل کی اس کے پشتیبانوں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے مقتدائے جہاں امام پیدا ہوئے اور چالیس برس تک اس خوبی سے امارت و امامت کے فرائض انجام دیے کہ رہتی دنیا تک ان کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی صفحۂ دہر پر جلی حروف میں ثبت رہے گا۔

بچپن کے احوال مستند طریقے پر بیان نہیں کیے جا سکتے۔ لوگوں نے جو باتیں بیان کی ہیں ان اچھی بری روایات کا کوئی حتمی ثبوت نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ اہلِ عرب میں جن امور کو کمالِ رجولت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی شہ سواری، تیر اندازی، شمشیر زنی، خطابت اور نسب دانی وغیرہ ان میں آپ کو امتیازی درجہ حاصل تھا۔ جیسا کہ آپ کی تاریخی زندگی سے ہویدا ہے۔ سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے جو اس وقت اہلِ عرب میں انتہائی کمال سمجھا جاتا تھا۔ قریش میں گنے چنے افراد ہی پڑھے لکھے تھے۔ فصاحت و بلاغت میں آپ کا مقام ہم چشموں میں مثالی سمجھا جاتا تھا۔ کتبِ سیر و ادب میں آپ کا شمار من جملہ ان چند ہستیوں کے کیا گیا ہے جن کی ادبی قابلیت اعلیٰ ترین سمجھی جاتی تھی۔ جاحظ نے ’’البیان والتبیین‘‘ میں حضرت سعید بن میسّب رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے، ان سے پوچھا گیا: سب سے زیادہ فصیح کون ہے؟ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لوگوں نے کہا: ہم یہ نہیں پوچھتے۔ تو

فرمایا: معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند (یعنی امیر المومنین یزید اول)، سعید اور ان کے فرزند (یعنی حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند حضرت عمرو الاشدق)۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما بھی ان سے کم نہیں، لیکن ان کے کلام میں دل پسند شیرینی کم تھی۔"[1]

ان کے علاوہ جو وہبی خصائص ہیں، مثلاً: شرفِ نسب اور اس کے مقتضیات، یعنی شجاعت، سخاوت، علم، متانت، اصابتِ رائے اور عزیمت وغیرہ فضائل بھی آپ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ صورتاً وجیہہ اور بارعب تھے، رنگ سرخ و سفید تھا اور قد بالا۔ وضع قطع اور چال ڈھال پرعظمت تھی۔ دبدبہ اور وقار میں لاثانی تھے، لیکن انتہائی حلم کے سبب بسا اوقات لوگوں کی طرف سے گستاخانہ حرکتیں ہو جاتی تھیں جو اگر آپ کی ذات تک محدود ہوتیں تو چشم پوشی فرماتے اور ملت کے لیے خطرناک ہوتیں تو عبرت ناک سزا دیتے۔ بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے، ہم عمروں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرتے، عمر رسیدہ لوگوں کی تعظیم کرتے اور اہلِ علم کی قدر فرماتے۔ اہلِ کمال کی عزت افزائی آپ کا شعار تھا۔ ہر کہ و مہ کو آپ کے سامنے آزادانہ گفتگو کا حق تھا اور آپ بڑی فراخ دلی سے لوگوں کے اس حق کی پاس داری فرماتے اور حفظِ مراتب کا لحاظ رکھتے تھے۔

سخت سے سخت ابتلاء کے وقت ثابت قدم رہتے اور دیکھنے والا حیران ہوتا کہ اس عالم میں بھی ثباتِ قلب اپنی جگہ ہے۔ عدل کے ساتھ کرم گستری آپ کا شعار تھا۔ ناانصافی کسی کی برداشت نہ تھی۔ حق والے کو کبھی خدشہ نہ ہوتا کہ آپ کی عدالت میں اس کا حق مارا جائے گا۔

چھوٹے بڑے مسئلے میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشِ نظر رکھتے۔ ہم عصر حضرات میں دین کی سمجھ کے اعتبار سے آپ کا درجہ بڑا تسلیم کیا جاتا تھا۔ فقہ و حدیث میں پایہ بلند تھا، استخراجِ مسائل کا خوب ملکہ رکھتے تھے، خود صاحبِ مذہب اور مجتہد ہیں، کتبِ حدیث و فقہ میں آپ کی مروی احادیث اور آپ کے فتاویٰ موجود ہیں جن سے

[1] البیان والتبیین (۱/۲۰۶) للجاحظ

استشہاد کیا جاتا ہے۔

بظاہر نہایت شان و شوکت اور دبدبے کے ساتھ رہتے تھے، لیکن مزاج میں فروتنی تھی اور طبیعت زاہدانہ۔ فقیر کی تمکنت اور امیر کی مسکنت کا عجیب و غریب نمونہ تھے۔ کوہِ علم تھے اور دریائے سخاوت، دونوں صفتیں آپ کی ضرب المثل ہیں۔ بے ریا دوست تھے اور بے کینہ دشمن۔ حضرت قبیصہ بن جابر اسدی فرماتے ہیں:

”صحبت معاوية فما رأيت رجلًا أحب رفيقا، ولا أشبه سريرة بعلانية منه“ (طبري: ٦/١٨٨)

”میں معاویہ کے ساتھ رہا ہوں۔ ان سے زیادہ محبوب ساتھی کسی کو نہ پایا اور نہ ظاہر و باطن میں ایسی یکسانیت دیکھی۔“

جن حضرات نے آپ کا زمانہ پایا وہ آپ کو ہادی و مہدی سمجھتے تھے۔ حضرت ابوبکر الاثرم اور ابن بطہ وغیرہ ائمہ اسلام نے حضرت قتادہ، حضرت اعمش، حضرت عبداللہ بن احمد بن حنبل وغیرہ سے روایت کی ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ اگر لوگ دیکھتے تو کہتے: مہدی یہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت حضرت عبداللہ بن احمد کی روایت کی ہے۔ انھوں نے ابوسعید الاشج سے روایت کی ہے، انھوں نے ابواسامہ ثقفی سے اور انھوں نے ابواسحاق سبیعی کی بابت بتایا:

”أنه ذكر معاوية، فقال: لو أدركتموه أو أدركتم أيامه لقلتم: كان المهدي“(العواصم من القواصم، ص: ٢٠٥)

”انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا اور فرمایا: اگر تم لوگوں نے انھیں دیکھا ہوتا یا ان کا زمانہ پاتے تو کہتے: مہدی یہی ہیں۔“

یہ ابواسحاق سبیعی امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عقیدت مندوں میں سے ہیں اور اگرچہ انھوں نے سبائیہ سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا، کیوں کہ وہ لوگ حضرت صدیقِ اکبر

اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کی جناب میں بے ادب ہو گئے تھے، مگر خود ان میں آخر تک تشیع کی رگ رہی۔[1] اس لیے ان کا بیان حجت ہے۔ یوں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی مقبولیت کا ظہور ہوا جو آپ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں کی تھی:

((اللهم اجعله هادياً ومهدياً واهد به)) (سنن ترمذی)

”اے اللہ! اسے ہدایت دینے والا، ہدایت پر رہنے والا بنا اور اس کے ذریعے مخلوق کی رہنمائی فرما۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو تین برس رہے۔ پیش کارِ رسالت کی حیثیت سے جلوت وخلوت میں ساتھ تھا۔ آپ من جملہ ان چند بزرگواروں کے ہیں جنھیں وحیِ الٰہی کی کتابت کا شرف حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگواروں کو ذی مرتبہ اور پاکباز بتا کر ان پر طعن کرنے والوں کو سخت الفاظ سے یاد کیا ہے:

﴿كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿11﴾ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ ﴿12﴾ فِى صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿13﴾ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿14﴾ بِأَيْدِى سَفَرَةٍ ﴿15﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿16﴾ قُتِلَ ٱلْإِنسَٰنُ مَآ أَكْفَرَهُۥ﴾

[عبس: ۱۱۔۱۷]

”ایسا ہرگز نہیں چاہیے، یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے۔ تو جو چاہے اسے قبول کر لے۔ ایسے صحیفوں میں ہے جن کی عزت کی جاتی ہے۔ جو بلند کیے ہوئے پاک کیے ہوئے ہیں۔ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو معزز ہیں، نیک ہیں۔ مارا جائے انسان! وہ کس قدر ناشکرا ہے۔“

بعض حضرات نے ان کاتبوں سے مراد فرشتے لیے ہیں، حالانکہ اس حصر کی کوئی دلیل نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اصحاب جو مستقل طور پر اس خدمت کے لیے چنے گئے تھے وہ بھی اس صفت سے کیوں نہ متصف سمجھے جائیں۔ انھی کے تو سینوں میں یہ

[1] یہاں تشیع بمعنی سیاسی میلان کے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین مناقشوں میں وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے طرفدار تھے۔

قرآن محفوظ تھا۔ (العنکبوت: ۴۹)

یہی تو زمین پر اللہ کے گواہ اور بہترین امت ہیں، ان کے نزدیک ایمان محبوب ہے اور اسی سے ان کے قلوب کو آراستہ کیا گیا ہے۔ ان کے دلوں میں طبعاً کفر، فسق اور نافرمانی سے نفرت ڈال دی گئی ہے۔ اس مبارک و مقدس گروہ میں صدیقِ اکبر، فاروقِ اعظم، عثمان ذی النورین، علی المرتضیٰ، معاویہ،[1] ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ ہیں۔ ان برگزیدہ اور مقبولِ بارگاہ بندوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کا امین اور مبلغ بنایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرف کا انھیں اہل سمجھا اور یہ خدمات ان کے سپرد فرمائیں تو پھر ان کی عظمت و جلالتِ قدر کے انکار کی جرأت کسی صاحبِ ایمان کو کیسے ہوسکتی ہے؟!

---

[1] علامہ ہیثمی "مجمع الزوائد" (۵۹۶/۹) میں طبرانی کے حوالے سے لکھتے ہیں: "ان معاوية كان يكتب بين يدي رسول الله" (رواه طبراني اسناده حسن) یعنی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھا کرتے تھے، اس کو طبرانی نے روایت کیا اور اس کی سند حسن ہے۔ علامہ ابن کثیر صحیح سند سے ''البدایہ والنہایہ'' (جلد: ۸) تحت فضل سیدنا معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ میں رقمطراز ہیں: "ان معاوية كان يكتب الوحی لرسول الله صلی اللہ علیہ وسلم مع غيره من كتاب الوحي" یعنی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ دیگر کاتبین وحی کی معیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ ''وحی کی کتابت'' کیا کرتے تھے۔ حافظ ابن حزم اندلسی صحیح متصل سند سے جوامع السیرۃ میں لکھتے ہیں: " كان زيد بن ثابت من ألزم الناس لذلك ثم تلاه معاوية بعد الفتح، فكانا ملازمين للكتابة بين يديه صلی اللہ علیہ وسلم في الوحي و غير ذلك، لا عمل لهما غير ذلك" یعنی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کتابت وحی پر سب سے زیادہ ذمہ داری سے لگے رہے، پھر فتح مکہ کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس کام کو لازم اختیار کر لیا، یہ دونوں حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہر وقت موجود رہتے کہ ''کتابت وحی'' ہو یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات، یہ دونوں لکھ لیا کریں، اس کے علاوہ ان کا کوئی اور کام نہ تھا۔ اسی بات کو مشہور مورخ حافظ ابو بکر بن الخطیب بغدادی (المتوفی ۴۶۳ھ) "تاریخ بغداد" (۲۲۴/۱) میں سیدنا معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں لائے ہیں: "معاوية صاحبه و صهره و كاتبه و أمينه على وحی الله عزوجل" یعنی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، سسرالی رشتے دار، کاتب اور ''وحی الٰہی'' پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امین تھے۔ اسی وجہ سے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ''تقریب التہذیب'' میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں صراحت سے لکھا ہے: "معاوية بن أبي سفيان الخليفة صحابي اسلم قبل الفتح و كتب ←

اسلام اور ہجرت:

عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں یا انھیں با مقصد مبتلا کر دیا گیا ہے کہ سیدنا

← الوحي"۔ یعنی ''سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ اور صحابی ہیں'' فتح مکہ سے قبل مشرف باسلام ہوئے اور آپ رضی اللہ عنہ ''کاتبِ وحی'' تھے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کھیل رہے تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا کر کہا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلا لاؤ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ لکھوانا ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ اپنی ''تاریخ الاسلام'' (جلد: ۲) میں سیدنا معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں اس حدیث کی بابت صراحت کرتے ہیں: "قال ادع لی معاوية، و كان يكتب الوحي" یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلاؤ اور معاویہ رضی اللہ عنہ ''وحی'' لکھا کرتے تھے۔

علامہ علی بن برہان الدین الحلبی اپنی "السيرة الحلبيه باب ذکر المشاهير من كتابه ﷺ" (جلد: ۲) میں لکھتے ہیں: " كان معاوية و زيد بن ثابت رضی اللہ عنہما ملازمين للكتابة بين يدى رسول الله ﷺ في الوحي و غيره لا عمل لهما غير ذلك" یعنی ''سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا کام ہی صرف یہ تھا کہ یہ دونوں حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ کر ''وحی'' اور غیر وحی لکھا کرتے تھے، اس کے سوا ان کا کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ حافظ ابن حجر الہیثمی المکی مدائنی کی صحیح سند سے "تطهير الجنان الفضل الثاني في فضائله و مناقبه و خصوصياته' میں لکھتے ہیں: "قال المدائني كان زيد بن ثابت يكتب الوحي و كان معاوية يكتب للنبي ﷺ فيما بينه و بين العرب أي من وحي و غيره فهو أمين رسول الله ﷺ على وحى ربه و ناهيك بهذا المرتبة الرفيعة" یعنی مدائنی کہتے ہیں:

> سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کاتب وحی تھے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ''کتابت وحی'' کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ عرب کے درمیان خطوط بھی لکھا کرتے تھے، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رب کی وحی کے امین ہیں اور یہ اعلیٰ و ارفع مرتبہ ان کے لئے کافی ہے۔
>
> بعینہٖ یہی بات امام ابو اسحاق الشاطبی سے الاعتصام (۱/۳۴۱) میں منقول ہے: "كان رسول الله ﷺ كتاب يكتبون له الوحي و غيره منهم عثمان و على و معاويه والمغيرة بن شعبة و ابى بن كعب و زيد بن ثابت وغيرهم" یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ کاتبین آپ کے لیے وحی اور غیر وحی کی کتابت کیا کرتے تھے اور ان کاتبین میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ وغیرہ شامل ہیں۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا، حالانکہ یہ خیال درست نہیں۔ آپ کا اسلام فتح سے پہلے کا ہے۔ غالباً صلح حدیبیہ کے بعد جو وقفہ ہوا اس زمانے میں مسلمان ہوئے تھے، اگرچہ ہجرت نہیں کی اور اسی لیے فتح سے پہلے آپ کا اسلام مشہور نہ ہو سکا، کیوں کہ ہجرت بہرحال فتح کے بعد کی تھی۔ امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے صلح حدیبیہ اور عمرۂ قضا کے درمیان اسلام قبول کیا تھا۔[1] البتہ وہ قریش کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اسے پوشیدہ رکھتے تھے۔ اپنے بزرگوں کے پاسِ خاطر سے اور حالات کے ناموافق ہونے کی بنا پر فتح مکہ سے پہلے اعلان نہ کر سکے۔ اکثر قریش کے سمجھ دار نوجوانوں کا یہی وتیرہ تھا۔ قرآن حکیم نے سورۃ الفتح (آیت: ۲۵) میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

چونکہ یہ امر مسلم و متواتر ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ کا مستقل قیام مدینہ طیبہ میں رہتا تھا، اس لیے آپ کے اسلام کو فتح سے پہلے کا خود بخود تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک آپ فتح مکہ سے پہلے مسلمان نہ ہو گئے ہوتے تو مدینہ طیبہ میں آپ کے قیام کی کوئی سبیل نہ تھی، کیوں کہ فتح کے بعد ہجرت کا سلسلہ قطعاً بند ہو چکا تھا۔ اعلانِ عام ہے:

"لا هجرة بعد الفتح" "فتح کے بعد ہجرت نہیں۔"

اس اعلان پر نہایت سختی کے ساتھ عمل ہوا۔ حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ نے بحالتِ کفر غزوۂ حنین میں شرکت کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے مہمان کی حیثیت سے کچھ دن مدینہ طیبہ میں رہے تھے، لیکن فتح کے بعد چونکہ اسلام لائے، اس لیے انھیں ہجرت کی اجازت نہیں دی گئی۔ مکہ مکرمہ جا کر کچھ دن کے بعد انھوں نے اسلام کا اعلان کیا اور تمام مال و متاع لے کر بہ نیتِ ہجرت مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] تاریخ دمشق بذیل مادہ معاویۃ، منقول از المنتقیٰ تعلیقہ (ص: ۲۵۷)

نے انھیں مکہ کو واپس کر دیا۔ صرف ایک صاحب کی مثال ہے کہ ان کی ہجرت قبول کرنے پر سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قسم دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''میں محض اپنے چچا کی قسم پوری کر رہا ہوں، ورنہ فتح کے بعد ہجرت نہیں۔''

ایسی صورت میں یہ امر ناگزیر ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ [1] اور ان کے والد ماجد سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو حقیقی معنی میں مہاجر تسلیم کیا جائے، کیوں کہ مدینہ طیبہ میں ان کا قیام مسلمات میں سے ہے۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ تو یقیناً فتح سے ایک دن پہلے مسلمان ہوئے اور اس طرح ان پر ہجرت واجب ہوگئی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا اسلام اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح سے پہلے کا تسلیم کیا، لہٰذا انھوں نے بھی ہجرت کی۔ ان کے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما قدیم الاسلام مہاجر ہیں۔ اب سیدنا ابوسفیان اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما محض یہی نہیں کہ مدینے میں رہتے ہوں، بلکہ مملکتِ اسلامیہ کے اہم ترین مناصب پر بھی فائز تھے۔

---

[1] دورِ جاہلیت میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے بڑے بھائی سیدنا یزید رضی اللہ عنہ کی طرف سے مسلمانوں کی مخالفت میں کسی جہاد میں شرکت یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی مستند واقعہ نہیں ملتا۔ جہاں تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کی بات ہے تو اس بابت مولفِ کتاب کی تحقیق ہی راجح ہے کہ آپ فتح مکہ سے عرصہ دراز پہلے ایمان لے آئے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاصابہ'' میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنا قول نقل فرمایا ہے:

''میں نے عمرۃ القضاء سے پہلے اسلام قبول کرلیا تھا۔'' (الإصابة، تحت ترجمة معاويه بن أبي سفيان)

مفتی محمد شفیع اپنی مشہورِ زمانہ تفسیر ''معارف القرآن'' (۹۰/۸) سورۃ الفتح [۲۷] کے تحت رقمطراز ہیں:

''صحیح بخاری میں ہے کہ اگلے سال عمرۃ القضاء میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک قینچی سے تراشے تھے۔ یہ واقعہ عمرۃ القضاء ہی کا ہے، کیونکہ حجۃ الوداع میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق فرمایا تھا۔''

مولانا عبدالشکور لکھنوی لکھتے ہیں:

''معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ قرشی، اموی، صلح حدیبیہ کے سال اسلام لائے اور ان کے والد فتح مکہ میں مسلمان ہوئے۔'' (ازالة الخفاء: ٤٧٢/١)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو کتابتِ وحی کی خدمت سپرد تھی۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو نجی یا سرکاری مہمان آتے تھے، ان کی مہمان داری کی خدمت بھی آپ ہی کے ذمے تھی۔ سیدنا ابو سفیان رضی اللہ عنہ کو نجران جیسے اہم علاقے کا والی بنایا گیا تھا اور آپ وفاتِ نبوی تک اس منصبِ جلیل پر فائز رہے جو صرف معتمد ترین کارکن ہی کے سپرد کیا جا سکتا تھا۔ نصاریٰ کے سیاسی اور دینی مرکز پر جو والی بنایا جائے گا اس سے زیادہ مخلص اور معتمد کون ہوگا؟!

تعجب ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ان کی مدنی زندگی کے یہ حقائق ہیں جنھیں مسلمات و متواترات کا درجہ حاصل ہے اور دوسری طرف اس واہی غلط العام کو بھی لوگ کتابوں میں لکھ مارتے ہیں کہ سیدنا ابو سفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ پھر مزید حرکت یہ ہے کہ انھیں مولفۃ القلوب (یعنی ان لوگوں میں جنھیں اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے داد و دہش سے کام لیا گیا) میں سمجھا جاتا ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ نوازش علامہ سیوطی رحمہ اللہ جیسے اہلِ قلم نے کی ہے، فرماتے ہیں:

”أسلم هو وأبوه يوم فتح مكة، وشهد حنيناً، وكان من المؤلفة قلوبهم ثم حسن إسلامه“ [1]

اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مولفۃ القلوب میں ہوتے تب تو ان کے پاس دولت کی فراوانی ہونی چاہیے تھی۔ اور اگر مال ہی مطلوب ہوتا یا دکھاوے کو مسلمان ہوئے تھے تو انھیں کوشش کر کے مکہ ہی میں رہنا چاہیے تھا، جہاں کنبہ تھا، جائیداد تھی اور مال و متاع تھا۔ کاش یہ قلم چلانے والے لوگ سلفی کی طیوریات اور مسعودی کی خرافات دیکھنے کے بجائے صحاح کو مآخذ بناتے تو یوں ٹھوکریں نہ کھاتے۔

یہ امر مسلمات میں سے ہے جس کا انکار ایک جاہل ترین دشمنِ امت ہی کر سکتا

[1] تاريخ الخلفاء بذيل عنوان معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنهما (ص: ٧٥) ط مصر.

ہے کہ ساداتِ امویہ کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حیثیت قریش میں بہت اونچی تھی۔ بنومخزوم کے بعد کوئی خاندان ثروت، وجاہت اور عددی قوت میں ان کا سہیم نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوجہل مخزومی کے مارے جانے کے بعد قریش کی قیادت سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی اور ان ہی کو شیخِ قریش مانا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ جہاں تک دنیوی مال و متاع، عزت وحرمت اور شان وشوکت کا تعلق ہے وہ اس خانوادے کو پہلے سے حاصل تھی۔ اگر سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مولفۃ القلوب میں ہوتے تو ان کے مال و متاع میں معتد بہ اضافہ ہوگیا ہوتا۔

اگر بالفرض ہجرت کے معاملے میں انھیں بھی مستثنیٰ کر دیا گیا تھا، جیسے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے اصرار پر ایک صاحب ہو گئے تھے، تب بھی ان کے مال میں کمی کا کوئی سوال نہ تھا، بلکہ مدینہ طیبہ آ جانے سے انھیں توقع ہوتی کہ تالیفِ قلب کے سلسلے میں کچھ اور روپیہ بارگاہِ رسالت سے ملا کرے گا۔ انھیں اس امر سے بھی کوئی چیز مانع نہ تھی کہ جائیداد فروخت کر دیں اور اپنی سب دولت لے کر مدینہ آ جائیں۔ یعنی یہاں بھی وہ اسی شان سے رہتے جیسے مکہ معظّمہ میں رہا کرتے تھے، لیکن صورتِ حال اس کے بالکل خلاف ہے۔

دونوں باپ بیٹے مدینہ طیبہ میں باقی مہاجروں کی طرح عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے، بلکہ خیبر اور بنوقریظہ کے مال سے مہاجروں کی حالت تو کچھ درست ہوگئی تھی اور وہ انصار کے دستِ نگر نہیں رہے تھے، مگر ان کی عسرت بدستور رہی، کیوں کہ ان دونوں نے ہجرت بعد میں کی تھی۔ لہٰذا سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ان دونوں نے جو ہجرت کی تو اللہ کے لیے تمام آبائی اور ذاتی مال ومتاع سے دستبردار ہوکر مدینہ طیبہ آئے تھے اور اپنی کفر کی پچھلی زندگی کا کفارہ ادا کر رہے تھے، حالانکہ کفر کی حالت میں بھی ان کی دشمنی کی وہ کیفیت نہ تھی جو ابوجہل وغیرہ کی بیان کی جاتی ہے۔ لوگوں نے امویوں اور ہاشمیوں کے مابین ازلی وابدی دشمنی ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی روایتیں وضع کی ہیں، لیکن صحاح

کی روشنی میں اور واقعاتِ ثابتہ کی موجودگی میں وہ سب بے اصل اور باطل نظر آتی ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "الإصابة" (۲/ ۱۷۹) میں ''طبقات ابن سعد'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب قریش (کے غیر ذمہ دار لوگ) اذیت پہنچاتے تو آپ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہی کے گھر پناہ لیا کرتے تھے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم، نیز سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے مابین زمانۂ جاہلیت میں برادرانہ تعلقات استوار رہے۔ تحائف بھی ایک دوسرے کے ہاں برابر بھیجے جاتے تھے۔ جنگِ بدر کے لیے جب قریش نکلے ہیں اور مسلمانوں کی امن دوستی کی بنا پر شام سے آنے والا قافلہ بخیر وخوبی نکل جانے کے باوجود ابوجہل نے کہا تھا کہ ہم مدینہ پر حملہ ضرور کریں گے تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کی تھی کہ ایسا کرنا اب موزوں نہیں، لیکن ابوجہل اپنے اصرار پر قائم رہا۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ مدینہ پر ''رعب'' ڈالنا چاہتا تھا، لیکن اسے خبر نہ تھی کہ اس ضد کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے دن سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''دار الامان'' قرار دیا تھا،[1] یہ گھر حرم شریف سے ملحق تھا۔ توسیعِ حرم کے سلسلے میں اسے مسجدِ حرام میں شامل کر دیا گیا۔ علامہ محبّ الدین الخطیب فرماتے ہیں:

> ''میں نے حرم شریف کا وہ حصہ دیکھا ہے جو پہلے دار ابی سفیان تھا۔ وہاں ایک پتھر نصب تھا جس پر نہایت حسین خط میں کندہ تھا: ''من دخل دار أبي سفيان فهو آمن'' ''جو بھی ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا اسے امان ہے۔''[2]

اب تو وہ گھر ویسے ہی حرم ہو گیا ہے جس کے متعلق عام اعلان ہے: ﴿من دخله كان آمنا﴾ ''جو بھی اس میں چلا جائے اسے امان ہے۔''

اس عظیم شرف کو لوگ پوشیدہ نہیں رکھ سکتے تھے، اس لیے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی زبان

---

1. الإصابة، جلد ۲، تحت الترجمة "صخر بن حرب" (تهذيب التهذيب: ٤/ ٤١١) تحت الترجمة صخر بن حرب.
2. المنتقى (ص: ٢٥٣) تعليقه ٢.

سے یہ الفاظ بڑھا دیے گئے: ''یا رسول اللہ! ابوسفیان تفاخر پسند شخص ہیں اس لیے انھیں کوئی امتیاز بخش دیجیے'' تو آپ ﷺ نے مذکورہ بالا الفاظ فرمائے، لیکن روایتوں سے کہیں حقیقتیں چھپائی جا سکتی ہیں؟!

قریش اور نبی اکرم ﷺ کے مابین جو نزاع تھا وہ دین کا تھا اور ایسا کہ درمیانی سمجھوتے کا امکان نہ تھا، اس لیے یہ مخالفت تھی، ورنہ قریش تو چاہتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کچھ نرم پڑ جائیں تو وہ بھی اپنا رویہ بدل دیں۔ (القلم: ۹)

قریش کی مخالفت کو گھرانوں اور خاندانوں کی چشمک بتانا یا ذاتی عناد باور کرانا نہایت ظلم ہے۔ ان پر جب حقیقتیں کھل گئیں تو جس طرح ہاشمی کافر مخلص مومن بن گئے، اسی طرح اموی کافر بھی دین کے بہترین علم بردار ثابت ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کی مخالفت میں ہاشمی کافر بھی اموی کافروں سے کم نہ تھے۔ ویسے منافی عصبیت دونوں میں تھی، یعنی آلِ عبدِ مناف ہونے کی حیثیت سے محمد بن عبداللہ کی پاسداری سب کرتے تھے، اگرچہ محمد رسول اللہ ﷺ سے انھیں بنیادی اختلاف تھا جو حرارتِ دینی کے تحت شدت بھی اختیار کر جاتا تھا۔ چنانچہ ابولہب ہاشمی کے علاوہ سیدنا ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی بھی آپ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ وہ بھی فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے، لیکن تعجب ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ جیسے لوگ انھیں نہ مسلمی الفتح اور طلقاء میں ہونے کو شہرت دیتے ہیں اور نہ مولفۃ القلوب میں ان کا شمار کرتے ہیں۔ ان خطابوں کے لیے امویوں ہی کو خاص کر دیا گیا ہے اور وہ بھی افتراءً۔

سیدنا ابوسفیان اموی رضی اللہ عنہ کا فتح سے ایک دن پہلے مسلمان ہونا مسلمات میں ہے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا مہاجر ہونا بھی۔ گویا ان کا ایمان بھی فتح سے پہلے کا تسلیم کرنا ہوگا اور یہ بھی کہ دونوں باپ بیٹوں نے نہایت رغبت اور خلوص کے ساتھ اسلام قبول کیا اور نہایت درجہ دنیا سے بے رغبتی کے ساتھ للہ فی اللہ ہجرت کی۔

صحیحین میں [1] ہمیں ایک واقعہ ملتا ہے کہ سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا جب طلاق کے بعد اپنی عدت پوری کر چکیں تو دو صاحبوں نے انھیں نکاح کا پیغام بھیجا: ایک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اور دوسرے سیدنا ابوجہم رضی اللہ عنہ نے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا کہ دونوں میں سے کسے قبول کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''معاویہ صُعلوک ہیں اور بے زر، ابو جہم کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ سختی کا ہوتا ہے، تم اسامہ سے نکاح کرلو۔''

صُعلوک کہتے ہیں مفلس شخص کو۔ اب کیا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ جس کا گھرانا مالدار ہو اور اس پر کوئی تباہی بھی نہ آئی ہو، اور جسے مولفۃ القلوب میں بتایا جاتا ہو، وہ مدینہ میں عسرت کی زندگی بسر کرے اور عسرت بھی ایسی کہ اس کی وجہ سے خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح نہ کرنے کا مشورہ دیں۔ اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے ہوتے تو مدینہ طیبہ ہرگز نہ رہ سکتے، اگر مولفۃ القلوب میں تھے تو مفلسی کا کوئی سوال نہ تھا، خوب مالدار ہوتے، اگر رعایتاً انھیں ہجرت کی اجازت دی گئی ہوتی تب بھی مکہ سے اپنا سب مال و متاع منتقل کر لیتے۔

گویا اصل بات جو حقیقت الامر ہے اور جسے ہر دیانت دار آدمی کو تسلیم کرنا چاہیے وہ یہی ہے کہ سیدنا ابوسفیان اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کا ایمان فتح مکہ سے پہلے کا ہے، وہ مولفۃ القلوب میں ہرگز نہیں، بلکہ صحیح معنی میں مومن و مہاجر ہیں، وہ صمیمِ قلب سے ایمان لائے اور خلوص کے ساتھ ہجرت کی۔ اس تبتّل الی اللہ کا انھوں نے عملی ثبوت دیا کہ خاندانی جائیداد اور مال و متاع سے ہاتھ دھوئے۔ محض اللہ کے لیے مدینہ طیبہ میں عسرت کی زندگی بسر کر کے مدارجِ روحانی طے کیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں اپنے ان سچے بندوں میں شامل کر لیا جن کے متعلق وہ فرماتا ہے:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الأنفال: ٤] ''یہی لوگ سچے مومن ہیں۔''

---

[1] صحیح مسلم (١/٦٣٨، ٦٣٩)

ایک نام نہاد صوفی صاحب نے یہ سطحی بات کہی ہے کہ چونکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف بہت کم عرصے نصیب رہا، اس لیے ان کا سلوک پورا نہ ہو سکا اور ان میں وہ کمالات پیدا نہیں ہوئے جو تکمیلِ نفس اور روحانی ریاضتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا آپ اتنے بڑے صاحبِ ادراک ہیں کہ اس بیسویں صدی کی رسمی گدی پر بیٹھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سلوک و معارف پر حرف زن ہونے کی مجال رکھتے ہیں۔ حضرت غوث الاعظم [1] اور حضرت مجدد الف ثانی تو اپنی یہ حیثیت نہیں سمجھتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معاملات میں محاکمہ کریں، لیکن ان صوفی صاحب کو یہ ہمت ہے۔ ان صاحب کا خیال قطعاً بے اصل اور بے دلیل ہے۔ وجدان اور ادراک بھی اس واہی خیال کا منکر ہے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بعد کے تمام اصحابِ جرح و تعدیل سے بلند ہیں اور قطعاً اس کے محتاج نہیں کہ کوئی صاحب ان کے احوالِ قلبی اور مدارجِ سلوک کی تکمیل کا صداقت نامہ انھیں عطا فرمائیں۔

ان صوفی صاحب نے جو یہ لغو اور سفیہانہ بات کہی ہے وہ اصولِ شرعیہ کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ منہاجِ اہلِ طریقت کے بھی خلاف ہے۔ تکمیلِ نفس اور کمالِ سلوک کے لیے مدت کی شرط آج تک کسی نے نہیں لگائی۔ اس کی شرط صرف ایک ہے مربی کی قوتِ تصرف اور مربی کی صلاحیت۔ تحصیلِ علم وفن میں بھی روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ آدمی سالہا سال ایک علم اور ایک فن حاصل کرتا ہے، بڑے بڑے اساتذہ سے فیض اٹھاتا ہے، لیکن صلاحیت و مناسبت کی کمی کے سبب درجہ اجتہاد تک نہیں پہنچتا۔ لیکن دوسرا شخص جودتِ فہم اور سرعتِ ادراک کی بنا پر برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام دنوں میں پورا کر کے

---

[1] غوث الاعظم یعنی سب سے بڑا فریاد رس صرف اللہ کی ذات ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کو غوث الاعظم قرار دینا یا سمجھنا صریح شرک ہے۔ مولف یہاں عبدالقادر جیلانی کے لیے مشہورِ عام بدعی و مشرکانہ اصطلاح کے بجائے شیخ عبدالقادر جیلانی ہی استعمال کرتے تو مناسب رہتا۔

اس علم پر مجتہدانہ کلام کر سکتا ہے اور اس فن پر ماہرانہ عبور حاصل کر لیتا ہے۔ اربابِ طریقت کے ہاں بھی یہ امر مشہود ہے، مثلاً: حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے چند ہفتوں میں سلوک طے کر کے یہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ آپ کے شیخ حضرت خاتم الطریقۃ سیدنا محمد الباقی باللہ نے اپنے برسوں کے مریدوں کو، بلکہ خلفا کو آپ کے حلقے میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ خود بھی کبھی کبھی تشریف رکھتے تھے۔ ایسی ہی سیکڑوں ہزاروں مثالیں ملتی ہیں۔ نبی ﷺ کی قوتِ تصرف[1] اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ ﷺ کے اصحاب کا مصطفیٰ ہونا ایسی بات ہے کہ اس میں زمانے کو قطعاً کوئی دخل نہیں ؎

منزلِ عشق بسے دور دراز است ولے

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی علمی و روحانی رفعت کے ادراک کا موقع صرف ہم عصر صحابہ رضی اللہ عنہم کو تھا۔ ان کے ارشادات آگے آ رہے ہیں۔ کمالِ روحانی میں سب سے اونچا درجہ نماز کا ہے۔ جسے نماز پڑھنی آ گئی اسے سب کچھ آ گیا، کیوں کہ نماز ہی معراج المومنین ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قاضیِ دمشق اور جلیل القدر صحابی سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

"ما رأيت أحدا أشبه صلاة بصلاة رسول الله ﷺ من إمامكم هذا، يعني معاوية"[2]

''میں نے کسی شخص کی نماز میں رسول اللہ ﷺ کی نماز سے ایسی مشابہت نہیں دیکھی جیسی تمھارے اس امام کی (نماز کی) ہوتی ہے۔ آپ کی مراد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے تھی۔''

یہ برخود غلط صوفی صاحب محفلِ سماع میں ہا ہو یا مراقبے میں کچھ درود فیضان کے

---

[1] یہاں قوت تصرف سے مراد آپ ﷺ کی تربیت ہے۔ [2] المنتقی (ص: ۳۸۹)

سبب اپنے آپ کو عارف سمجھ لیں، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سلوک اور ان کے معارف کا ادراک شے دیگر ہے۔ اسے فیضانِ نبوت کہتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے اور جسے ہوتا ہے اسے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام آنے پر اس کی گردن جھک جاتی ہے اور قلم کچھ کہتے لرزتا ہے، یہی معنی ہیں:

﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ﴾ [الواقعة: ۱۳، ۱۴]

''بہت بڑی جماعت پہلوں سے۔ اور تھوڑے سے پچھلوں سے ہوں گے۔''

سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے ممکن ہے یہ صوفی صاحب تعدیلِ ارکان مراد لیں جو ہر کس و ناکس کی دسترس میں ہے۔ جی نہیں! یہاں وہ نماز مراد ہے جو سنتِ نبویہ کے مطابق اور کیفیاتِ رسالت سے استفادے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح صاحبِ ارشاد ہیں جیسے حضرت صدیقِ اکبر، فاروقِ اعظم، عثمان ذوالنورین، علی المرتضیٰ، عباس، انس، جابر، ابو ذر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم جن سے سلاسل چلے ہیں۔ صغار صحابہ اور اکابر تابعین نے آپ سے فیض لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ کا یہ فیض امت میں جاری ہے، ان صوفی صاحب کو معلوم ہو یا نہ ہو۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت و جلالتِ قدر کا حال تو ان اوراق سے معلوم ہو جائے گا، لیکن یہاں ہم سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی قوتِ ایمانیہ کا بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں، کیوں کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ دشمنانِ صحابہ کے ہاں مطعون ہے۔ یہ اس عملی ثبوت کے علاوہ ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے مخلص صحابی تھے کہ نجران جیسے علاقے کا انھیں مستقل والی بنا دیا گیا تھا۔ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی آزمائش اسلام کے بعد ہی کی گئی اور وہ کامیاب آئے۔ منات کا بت توڑنے کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا جو قریش کا نہایت محترم بت تھا۔ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے ہاتھ سے توڑا۔[1]

---

[1] الإصابة، جلد ٢، تحت الترجمة صخر بن حرب (تهذيب التهذيب: ٤/٤١١) تحت ترجمة صخر بن حرب.

پھر غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں شریک ہوئے۔ طائف کے معرکے میں آپ کی ایک آنکھ میں تیر لگا اور وہ ضائع ہوگئی۔ اس کرب کی حالت میں نبی ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''کہو تو میں دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ تمھاری آنکھ صحیح وسالم بنا دے اور چاہو تو صبر کرو جس کے بدلے میں جنت ملے گی۔'' سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جنت اختیار کی۔[1]

پھر جنگِ یرموک میں آپ نے جس جوش اور مجاہدانہ روح کا ثبوت دیا اس کا حال سیدنا مسیّب رضی اللہ عنہ سے سنیے جو اصحابِ شجرہ میں ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ یرموک کے دن میں صرف ایک ہی نعرہ سن رہا تھا، باقی لوگ خاموش تھے، وہ نعرہ تھا: "یا نصر الله اقترب" ''اے اللہ کی مدد جلدی پہنچ'' میں نے جو مڑ کر دیکھا تو وہ آواز سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی تھی جو اپنے فرزند سیدنا یزید رضی اللہ عنہ کے جھنڈے کے نیچے لڑ رہے تھے۔[2]

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اسے کس طرح قبول کر لیا، کیوں کہ اس کا موضوع ہونا بدیہی ہے:

"حدثني عباس بن عبد العظيم العنبري، وأحمد بن جعفر المعقري، قالا حدثنا النضر (وهو اليمامي) حدثنا عكرمة، حدثنا أبو زميل، حدثني ابن عباس، قال: كان المسلمون لا ينظرون إلى أبي سفيان ولا يقاعدونه. فقال للنبي ﷺ: ثلاث أعطيهن، قال: نعم، قال: عندي أحسن العرب وأجمله أم حبيبة بنت أبي سفيان أزوّجكها، قال: نعم، قال: ومعاوية

---

[1] الإصابه، جلد ٢، تحت الترجمة صخر بن حرب، "تاريخ الخميس" (١١٢/٢) للمولف حسين بن محمد بن الحسن الديار البكري، "كتاب المحبر لأبي جعفر البغدادي (ص: ٢٦١)، "فتوح البلدان للبلاذري" (ص: ٦٣).

[2] المنتقى (ص: ٢٥٤، تعليقه)، کتاب نسب قریش (صفحہ: ۲۲) تحت ولد حرب بن امیہ، الإصابة، ج ٢، تحت الترجمة صخر بن حرب، تهذيب التهذيب (٤١١/٤) تحت ترجمة صخر بن حرب.

تجعله كاتباً بين يديك، قال: نعم، قال: وتؤمرني حتى أقاتل الكفار كما كنت أقاتل المسلمين، قال: نعم. قال أبو زميل: ولو لا أنه طلب ذلك من النبي ﷺ ما أعطاه ذلك لأنه لم يكن يسأل شيئا إلا قال: نعم‘‘[1]

’’مجھ سے عباس بن عبدالعظیم عنبری اور احمد بن جعفر معقری نے بیان کیا، دونوں کہتے ہیں: ہم سے نضر نے کہا: (یعنی محمد یمامی کے فرزند نے) کہ ہم سے عکرمہ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں: مجھ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مسلمان ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے اور نہ انھیں اپنے پاس بٹھاتے تھے، لہٰذا انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ میری تین درخواستیں منظور فرما لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر۔ انھوں نے عرض کی: میرے ہاں عرب کی حسین ترین اور جمیل ترین خاتون ہیں، یعنی امِ حبیبہ بنت ابی سفیان، میں ان کا نکاح آپ سے کر دوں۔ فرمایا: بہتر۔ پھر عرض کی: اور معاویہ کو اپنا پیش کار بنا لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر۔ پھر عرض کی: اور مجھے کسی فوج کی کمان دیں، تاکہ میں کفار سے اسی طرح لڑوں جیسے مسلمانوں سے لڑا کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر۔ ابو زمیل کہتے ہیں کہ اگر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ استدعا نہ کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں یہ تینوں عزتیں نہ بخشتے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں اچھا ہی فرماتے۔‘‘

یہ بیان یا تو ابو زمیل کا ہے یا ان سے نیچے کے کسی راوی کا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ خلافِ واقعہ بیان کبھی نہیں دے سکتے تھے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ میں ہوا تھا۔ جب آپ وہاں ہجرت کر گئی تھیں اور آپ کا خاوند

[1] صحيح مسلم، مناقب أبي سفيان رضي الله عنه

عبیداللہ بن جحش[1] وہاں جا کر مرتد ہو گیا تھا۔ نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق خود حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے آپ کا یہ پیغام ام المومنین کے پاس بھیجا، نکاح کر دیا اور اپنی ہی طرف سے

[1] یہاں مولف نے غیر محقق تاریخی روایات سے متاثر ہو کر سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے حالتِ ارتداد میں وفات پا جانے کا ذکر کیا ہے جبکہ سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ پر یہ محض الزام ہے جس کے پیچھے کوئی ٹھوس تاریخی شہادت موجود نہیں۔ سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی پھوپھی سیدہ امیمہ رضی اللہ عنہا بنت عبدالمطلب کے صاحبزادے تھے۔ یہ اور ان کی بہن ام المومنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کے پوپھی زاد تھے۔ ان کا شمار حنفائے مکہ میں ہوتا تھا یعنی وہ لوگ جو نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل بھی توحید پر کاربند تھے اور بتوں کی نذر و نیاز کے سخت مخالف تھے۔ بہت صالح طبیعت اور نیک انسان مشہور تھے اس لیے سردارانِ مکہ میں سے عتبہ بن ربیعہ کی نواسی اور سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی سیدہ رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جیسی عزت و شرف والی خاتون آپ کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ نبی اکرم ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد ان دونوں میاں بیوی نے ابتدائی زمانے میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ سیدہ رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ دونوں اعلیٰ خاندانوں سے تھے اور مکہ میں انھیں تمام عیش و عشرت حاصل تھے لیکن قبولِ اسلام کے بعد ان کے لیے بھی دیگر مسلمانوں کی طرح زندگی تنگ کر دی گئی جس کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کی صحبت و معیت میں تقریباً چھے سال کا عرصہ گزارنے کے بعد حکمِ نبوی ﷺ کے تحت یہ جوڑا سرزمینِ حبشہ کو ہجرت کر گیا۔ حبشہ پہنچ کر ان کے گھر ایک بیٹی حبیبہ کی ولادت ہوئی، جس کے نام پر سیدہ رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی کنیت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا قرار پائی۔

حبشہ میں قیام کے تیرہ سال بعد چھے ہجری میں سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ انتقال کر گئے اور سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا دیارِ غیر میں تنہا رہ گئیں، جس پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابی سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں شاہِ حبش نجاشی کو سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا جس پر سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے مقرر وکیل سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے خطبہ نکاح پڑھا اور سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ میں دے کر آپ کو ام المومنین ہونے کا شرف مختص کر دیا گیا۔

سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقطع اور مجروح روایات کے تحت یہ باور کروایا گیا کہ آپ حبشہ جا کر شراب کے رسیا ہو گئے تھے، اسی لیے شراب کی لت کے تحت آپ نے اسلام ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور اسی حالتِ ارتداد میں آپ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ یہ افسانہ کئی وجوہ کی بنا پر سخت غیر معتبر اور کذب پر مبنی ہے۔ پہلے ہم اس روایت پر علم الروایت کے تحت بحث کریں گے، اس کے بعد علم الدرایۃ کے تحت اس روایت کا غلط ہونا ثابت کریں گے۔ ان شاء اللہ ←

مہر ادا کیا۔ سیدنا ابو سفیان رضی اللہ عنہ اس وقت مسلمان بھی نہیں تھے، چہ جائیکہ ہجرت کر کے مدینے میں آ چکے ہوں اور اپنی ذلت کی تلافی کی یہ ترکیب سوچیں۔

⬅ اس روایت کو ابن ہشام اپنی سیرت میں ابن اسحٰق کی روایت سے لائے ہیں، جس کا سلسلہ سند عروہ بن زبیر رحمہ اللہ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ عروہ تابعی تھے، جن کی پیدائش سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اوائل دور میں ہوئی اور وہ اس روایت کا آگے کا سلسلہ نہیں بتاتے سو یہ روایت منقطع ہوئی اور منقطع روایت کی بنا پر کسی سابقون الاولون شخص کو مرتد و نصرانی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ عروہ کے اس قول کو ایک دوسری سند سے امام بیہقی بھی اپنی دلائل النبوۃ میں لائے ہیں لیکن اس سند میں بھی دو علتیں موجود ہیں۔ پہلی تو یہی کہ یہ منقطع روایت عروہ پر جا کر ختم ہو جاتی ہے، دوم اس میں ابن لہیعہ جیسا مختلف فیہ راوی موجود ہے جس پر تعدیل کے مقابلے میں مفسر جرح موجود ہے جبکہ یہ اپنی آخری عمر میں اختلاط کا شکار بھی ہو گئے تھے۔ (تقریب التہذیب)۔

یہی روایت طبقات ابن سعد میں بھی مروی ہے لیکن اس کی سند میں واقدی جیسا مشہورِ زمانہ کذاب اور وضاع راوی موجود ہے (سیر اعلام النبلاء للذہبی، الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم) سو کسی سابقون الاولون شخص کے ارتداد کے بارے میں واقدی جیسے کذاب راوی کی روایت قطعی لائقِ حجت نہیں ہوسکتی۔ واقدی کی ہی سند سے یہ روایت امام حاکم کی مستدرک میں بھی موجود ہے سو اس سے استدلال بھی ممکن نہیں۔ امام ابن سید الناس نے اسی طور کی روایت اپنی کتاب عیون الاثر میں رقم کی ہے لیکن اس کی کوئی سند بیان نہیں کی، اس لیے بے سند بات کا کوئی اعتبار نہیں۔

عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی بابت اس طرح کی روایات سے متاثر ہو کر بغیر کسی سند کے علامہ ابن عبدالبر نے الاستعیاب میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے الاصابہ میں ان کے عیسائیت قبول کر کے مرتد ہو کر مر جانے کے قصے کو نقل کیا ہے جو بلا سند اور صحیح ثابت نہ ہونے کی بنا پر قطعی معتبر نہیں۔ اور اسی طرح ان حضرات کی اتباع میں بغیر تحقیق کیے علامہ شبلی سے لے کر علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری تک نے اپنی کتب میں اس روایت کو جگہ دی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لغو قصہ صرف دو سندوں سے مروی ہے، جس میں سے پہلی سند عروہ بن زبیر پر جا کر ختم ہو جاتی ہے سو منقطع اور ناقابلِ حجت قرار پائی جبکہ دوسری سند میں واقدی جیسا کذاب و وضاع راوی پایا جاتا ہے جس کی شہادت سابقون الاولون میں سے کسی شخص کے خلاف قطعی لائقِ حجت نہیں ہوسکتی۔

البتہ سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے انتقال اور سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح سے متعلق سنن ابو داود اور نسائی میں ایک روایت آتی ہے جس میں مذکور ہے کہ سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سیدنا ⬅

پھر سوال ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو حقارت و بغض کی نگاہ سے کیسے دیکھ سکتے ہیں، جب کہ اللہ و رسول کے حکم کے مطابق اسلام لانے سے تمام پچھلی

← عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، جو نجاشی کے ملک میں وفات پا گئے اور امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا حبشہ ہی میں تھیں کہ ان کا نکاح نجاشی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا، ان کا مہر چار ہزار درہم نجاشی نے ادا کیا، پھر انھیں سیدنا شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ بھیج دیا گیا۔ اس روایت کو امام ابن مبارک معمر سے، وہ زہری سے، وہ عروہ سے اور وہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نقل کر رہے ہیں۔ البتہ اس روایت میں زہری مدلس ہیں جو کہ عن سے روایت کر رہے ہیں تاہم جمہور محدثین نے عروہ سے زہری کی عن سے روایت کو سماع پر محمول کیا ہے سو اوپر مذکور دونوں سندوں سے یہ سند کافی بہتر ہے اور اس روایت میں سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی وفات اور امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کا واقعہ تو مذکور ہے لیکن سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نصرانی ہو کر مرتد فوت ہو جانے کی کوئی ہفوات درج نہیں۔

المختصر روایتاً سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا اسلام کو چھوڑ کر نصرانیت کو قبول کر لینے کا قصہ ثابت نہیں اور قطعی غیر معتبر ہے۔ پھر درایتاً بھی یہ کہانی سخت لغو ہے جیسا کہ اس کہانی میں باور کروایا گیا کہ سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے شراب کی لت کی وجہ سے اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کی تھی۔ بھلا مکہ کے ابتدائی اور پرفتن ماحول میں ہجرتِ حبشہ سے قبل جس شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں سخت ترین چھے سال گزارے ہوں، جس میں اس کو کفار کے ہاتھوں ہر طرح کی ایذا رسانیاں سہنی پڑی ہوں اور وہ اس وقت ان سب میں ثابت قدم بھی رہا ہو، اس کا ایمان حبشہ جاتے ہی اتنا کمزور پڑ گیا کہ صرف شراب کی عادت سے مجبور ہو کر اس نے اسلام چھوڑ کر نصرانیت قبول کر لی۔ جبکہ اس شخص کا تعلق حنفائے مکہ میں سے تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی توحید پرست تھے۔ اگر سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو عیسائیت اتنی ہی مرغوب نظر آتی، جیسا اس سلسلے میں مروی بعض روایات میں مذکور ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے تمام ادیان کو بغور دیکھا لیکن نصرانیت سے عمدہ کسی کو نہیں پایا، سو نصرانیت قبول کر لی (طبقات ابن سعد، المستدرک الحاکم بسند واقدی)، تو بعثت سے پہلے مکہ میں ورقہ بن نوفل کی صورت میں ایک عیسائی عالم موجود تھے، تب ہدایت کے طالب اس شخص کو توحید کی جگہ عیسائیت قبول کر لینی چاہیے تھی، لیکن اس وقت بھی عیسائی ہو جانے کے بجائے آپ اللہ کے پیغام کا انتظار کرتے رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چند ماہ بعد ہی اسلام قبول کر لیا۔

پھر یہ شراب کا قصہ بھی کافی عجیب ہے، جناب سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو شراب کی عادت کے تحت عیسائیت قبول کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ مسلمان رہ کر بھی شراب پی سکتے تھے کیونکہ ←

باتیں کالعدم ہو جاتی ہیں۔ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اسلام دشمنی سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی اور سیدنا خالد بن ولید اور سیدنا عکرمہ رضی اللہ عنہما اور دوسرے کفارِ قریش سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ ان سب حضرات کے اسلام پر تو مسلمان ناراض نہ ہوئے اور ان سے عزت و محبت کا برتاؤ کیا، تو پھر سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کی پچھلی باتیں اسلام اور ہجرت کے باوجود نہ دھل سکیں۔ یہ امر بھی متفق علیہ ہے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ

← اس وقت تک شراب کی ممانعت تو ہوئی نہیں تھی سو شراب کی عادت کو بنیاد بنا کر اسلام سے نصرانیت قبول کروانا انتہائی لغو حکایت ہے۔ پھر اس بابت سب سے وزنی دلیل صحیح بخاری میں مذکور سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ہرقل کے مابین وہ واقعہ ہے جس میں مذکور ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مختلف ملکوں کے فرمانرواؤں کو خطوط بھیجے تو قیصرِ روم ہرقل کو بھی سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ایک خط بھیجا۔ جب وہ خط قیصرِ روم کے حوالے کیا گیا تو اس نے شام میں تجارت کی غرض سے آئے ہوئے عربوں کے وفد کو دربار میں بلا بھیجا، جس کی سربراہی سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے سسر سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ قیصر نے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے کئی سوالات کیے جن میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ جو لوگ اس دین میں داخل ہو گئے، کیا ان میں سے کوئی اس بنا پر مرتد ہوا کہ اس کو یہ دین پسند نہ آیا ہو؟ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں۔ (صحیح بخاری) جبکہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے خود کے الفاظ ہیں اس روایت میں کہ میں اگر کچھ مخالف کہہ سکتا تو ضرور کہتا۔ اب خود سوچیے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے سسر تھے، اگر سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے مرتد ہو کر سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کو چھوڑا ہوتا تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان فرماتے لیکن اس کے باوجود آپ نے صاف بیان دیا کہ (ان کے علم کی حد تک) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے کوئی شخص مرتد نہیں ہوا۔ کم از کم واقدی اور دوسرے لوگوں کی نسبت سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ارتداد سے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ زیادہ باخبر رہ سکتے تھے۔ ان کا ارتداد کے اس قصے کو بیان نہ کرنا اس بابت ثبوت صریح مہیا کر دیتا ہے۔
سو روایتاً و درایتاً دونوں اعتبار سے ہی یہ قصہ سخت مجروح اور ناقابلِ اعتبار ہے اور ایسی بے بنیاد کہانی کی بنیاد پر کسی سابقون الاولون مسلمان کے ارتدار پر ایمان لانا قطعی درست طرزِ عمل نہیں۔ المختصر سیدنا عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سابقون الاولون میں شامل ایک شخص تھے، جن کی وفات حالتِ ایمان میں ہوئی اور جن کو اس امت کی وہ تمام مراعات حاصل ہیں جو کہ کسی بھی صحابیِ رسول کو حاصل ہونی چاہیے۔

کو نجران کا والی بنایا گیا اور آخر عہدِ نبوی تک آپ اس منصب پر فائز رہے۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ اس خانوادے کے ساتھ نہیں دیکھتے تھے؟!

لہٰذا یہ حدیث کسی طرح قابلِ قبول نہیں اور ہم اسے کسی درجے میں بھی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان نہیں سمجھ سکتے۔ امام مسلم رحمہ اللہ اگر ذرا اور گہری نگاہ ڈالتے تو اسے کبھی کتاب میں جگہ نہ دیتے۔ اسی قسم کی احادیث ہیں جن کے سبب صحیح مسلم کا درجہ صحیح بخاری سے کم سمجھا جاتا ہے، اگرچہ ان کے ہاں روایت قبول کرنے کی شرطیں کافی سخت ہیں، لیکن آدمی ظاہر ہی تو دیکھ سکتا ہے، دل میں چھپی ہوئی بیماری کا علم آسانی سے نہیں ہوتا، اسی لیے صحاح میں بھی ان لوگوں کا داؤ چل گیا ہے جو تقدس کا لبادہ اوڑھ کر باتیں بنایا کرتے ہیں۔ [1]

---

[1] علامہ ابن کثیر "البداية و النهاية" (٤/ ١٣٠) میں اس روایت کی بابت فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے باعث امام مسلم پر سخت اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اسی طرح سے امام نووی رحمہ اللہ نے بھی شرح صحیح مسلم میں اس حدیث کی بابت لکھا ہے کہ یہ حدیث مسلم کی ان مشہور احادیث میں سے ہے جن پر اعتراضات کیے گئے ہیں اور پھر کچھ اعتراضات و شواہد نقل بھی فرمائے ہیں جیسا کہ صحیح روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے سنہ ٦ ھ میں حبشہ میں نکاح منعقد ہوا جبکہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ سنہ ٨ ھ کا ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

> "صحیح مسلم کی اس روایت میں جو یہ بات آئی ہے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح پڑھایا تو یہ انتہا سے زیادہ غریب بات ہے اور یہ امر تو بہت مشہور ہے کہ صلح حدیبیہ کی تجدید کی غرض سے جب ابوسفیان رضی اللہ عنہ مدینہ گئے اور اپنی بیٹی امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنے لگے تو زوجہ نبی امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے نیچے سے بستر کھینچ لیا۔"

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ حدیث موضوع ہے۔ اسے عکرمہ بن عمار نے وضع کیا ہے لیکن ان کے اس قول کا کوئی اور مؤید نہیں۔ لیکن ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن حزم رحمہ اللہ کی یہ بڑی جسارت ہے کہ وہ بڑے بڑے راویوں پر کلام کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تجدیدِ نکاح کی درخواست کی ہو، تا کہ ان کی طبیعت خوش ہو جائے لیکن ابن الصلاح رحمہ اللہ کی اس تاویل کو امام نووی رحمہ اللہ یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ حدیث میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدیدِ نکاح فرمایا ہو یا سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ ←

نبی اکرم ﷺ کے حضور:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو نسبی، سیاسی اور معاشرتی تفوق کے ساتھ ذاتی خصائص بھی اس درجے کے حاصل تھے کہ ہجرت کے ساتھ ہی نبی کریم ﷺ نے آپ کو اپنی پیشی میں لے

← نے اس کی درخواست کی ہو۔ البتہ شیخ ابراہیم خلیل نے دعویٰ کیا ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نہیں بلکہ ان کی بہن عزہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی بات کی تھی۔ راوی نے غلطی سے امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نام لے لیا ہے۔ لیکن اس بابت حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں صراحت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی تمام باتیں قبول فرما لیں تھی، سو اگر یہ عزہ رضی اللہ عنہا ہوتیں تو نبی کریم ﷺ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو بھی وہی جواب دیتے جو انھوں نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو دیا تھا کہ دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

لیکن حافظ ابن قیم رحمہ اللہ جب اس روایت سے متعلق زادالمعاد میں کلام کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی تینوں باتیں نہیں، بلکہ صرف ایک بات مانی تھی اور ایسی ہی تاویل بیشتر اہلِ حدیث علما نے کی ہے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی چھوٹی بیٹی عزہ کی کنیت بھی امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا تھی اور سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کرنے کی درخواست کی تھی۔ لیکن حافظ ابن قیم اور متاخرین اہلِ حدیث علما کی یہ بات خود حدیث کے الفاظ کے خلاف ہے جہاں تینوں باتیں ماننے کی صراحت موجود ہے۔ کیونکہ حدیث میں صاف صراحت موجود ہے کہ ہر درخواست کے جواب میں آپ ﷺ "نعم" فرماتے جاتے تھے۔ جبکہ اگر یہ عزہ ہوتیں تو نبی ﷺ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو منع فرما دیتے کہ دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ سو حدیث کے ظاہری الفاظ سیدہ عزہ رضی اللہ عنہا سے متعلق قطعی قابلِ قبول نہیں ہیں اور یہ تاویل حدیث کے مطابق نہیں بنتی۔

پھر اس حدیث میں صراحت ہے کہ نبی ﷺ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے کہنے پر ان کو کفار کے خلاف جنگ کرنے کے لیے عہدہ دیا جبکہ یہ بات معروف ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم کسی کو مانگنے پر عہدہ نہیں دیتے تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو کیونکر عہدہ دے دیا۔ پھر یہ بات بھی شواہد سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو کفار کے خلاف کسی جنگ میں عہدہ دینے کے بجائے ان کو نجران کا عامل بنا کر بھیج دیا تھا تو پھر یہ سپہ سالار بنانے والی بات کب ہوئی۔

اسی طور سے اس روایت کے متن میں ایک اور چیز جو اس احقر کو سخت الجھن میں مبتلا کرتی ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمان نہ تو سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھتے تھے اور نہ ان کے ساتھ بیٹھتے تھے، اسی لیے ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے یہ تین چیزیں نبی ﷺ سے عرض کیں۔ جبکہ مکہ ←

لیا اور کتابتِ وحی کی خدمت آپ کے سپرد کی جو اخص خواص ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ لوگوں کو اس کا تو یارا نہ ہوا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس اہمیت اور بارگاہِ رسالت میں اس مقبولیت پر حرف رکھ سکیں، کیوں کہ متواترات کا انکار ممکن نہیں، لہٰذا یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ قرآن کے علاوہ باقی چیزوں کی کتابت آپ کے سپرد تھی۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکاری تحریروں اور فرمانوں

← کی غالب اکثریت نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے ایک یا دو دن بعد ہی اسلام قبول کیا تھا، سو ایک دن پہلے تک تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ ان کے سردار تھے، جن کی اہلِ مکہ بے پناہ عزت کیا کرتے تھے، پھر اچانک سے ان کو یہ کیا ہو گیا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو ''منہ لگانا'' چھوڑ دیا۔ جہاں تک انصار و مہاجرین کی بات ہے تو ان کا اخلاق اس بات سے بہت ماورا تھا کہ وہ اس قسم کی حرکت کرتے، وہ تو نئے مسلمان ہونے والے لوگوں کی تالیفِ قلب کرتے تھے نا کہ مکہ کے سردار جن کی فراست کی وجہ سے مکہ بغیر کسی خاص مزاحمت کے فتح ہو گیا تھا، کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھتے۔ اور پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر کو دارالامن قرار دیکر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا جو اکرام کیا تھا، اس کے بعد یہ سب کہاں ممکن تھا کہ لوگ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیتے۔ پھر یہ ارشاد بھی زیرِ غور رہے کہ اسلام لانے سے پہلے جو معزز تھا، اسلام لانے کے بعد اس کے اعزاز میں مزید اضافہ ہو گیا اسی لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ و سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے کے بعد از حد احترام کرتے تھے۔

بالفرض اگر اس روایت کو صحیح باور کیا جائے تو اس روایت کے آخر میں راوی ابوزمیل کے الفاظ کہ اگر سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان چیزوں کا مطالبہ نہ کرتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کبھی یہ چیزیں عطا نہ کرتے، بہت مہمل اور قابلِ اعتراض ہیں۔ معاذ اللہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کیا کوئی گری پڑی خاتون تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح کرنا پسند نہ فرماتے یا پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جو صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لے آئے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک امانت دار نہیں تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کبھی اپنا کاتب مقرر نہ کرتے۔ اس روایت میں جہاں تاریخی لحاظ سے کئی قباحتیں ہیں، وہاں اس کو درست ماننے سے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا پر بھی تبرا آتا ہے۔ درست بات یہی ہے کہ یہ روایت شاذ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے فتح مکہ سے کافی پہلے ۶ ھ میں ہی نکاح فرما لیا تھا، جبکہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی سفارش کے ان کی قابلیت کے پیشِ نظر کوئی عہدہ طلب کرنے سے پہلے ہی نجران کا عامل بنا کر روانہ کر دیا تھا اور یہی کچھ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ہے کہ ان کو بھی بلا کسی سفارش کے اپنا کاتب مقرر فرمایا تھا۔

کی حیثیت ان لوگوں کے نزدیک ثانوی ہے اور جو شخص اس خدمت پر مامور ہو وہ اس کا اہل نہیں کہ قرآن حکیم کی کتابت بھی اس کے سپرد کی جائے، حالانکہ وحی خفی ہو یا جلی، ہر حال میں وحی ہوتی ہے۔

پھر ان لوگوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے پاس قرآنی اور نبوی تحریروں میں یہ باریک فرق نکالنے کی گنجایش کن نصوص اور شریعتِ اسلامیہ کے کن اصول سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم جو قرآن و حدیث میں فرق کرتے ہیں تو اسی لیے کہ قرآن تواتر سے پہنچا ہے اور اس کی روایت باللفظ ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں۔ برخلاف حدیث کے کہ اول تو اکثر احادیث کی روایت بالمعنی ہے اور دوسرے اس لیے کہ متواتر احادیث بہت کم ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے یہ دقت نہیں تھی، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات براہِ راست سنتے تھے، ان کے نزدیک یہ ارشادات بھی ایسے ہی یقینی تھے جیسے قرآنی الفاظ۔ اسی لیے وہ تصریح کروا لیا کرتے تھے کہ ارشاد مبارک حکم ہے یا مشورہ، یا اجتہادی رائے، اور حکم کی تعمیل بے چون و چرا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اللہ اور رسول کے فرمان میں کوئی فرق نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کافر قرار دیا ہے جو حکمِ الٰہی اور حکمِ نبوی میں فرق کرتے ہیں (النساء: ۱۵۰۔۱۵۲) نبی کا قول جب صحت کو پہنچ جائے تو وہ قرآن ہی کی طرح واجب العمل ہے، کیوں کہ وہ قرآن ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ مزید گفتگو خارج از مبحث ہے۔

ہمیں یہاں بس اتنا ہی کہنا ہے کہ سوائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین کے اور کوئی جذبہ نہیں جو اس قسم کی باتیں کہنے پر آدمی کو ابھارے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کاتبِ نبوی تو تھے مگر قرآن کی کتابت ان کے سپرد نہ تھی، بعض سمجھ دار لوگ بھی ان واہی خیالات سے متاثر ہو جاتے ہیں، تعجب اس پر ہے۔

صحاح کی ایک اور روایت (صحیح مسلم، ص: ۴۳۷، طبع مصر) ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھوانے کے لیے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلوایا، معلوم ہوا آپ کھانا کھا رہے

ہیں، پھر بلوایا، معلوم ہوا کہ کھانا کھا رہے ہیں۔ غرض دو تین دفعہ ایسا ہوا تو فرمایا: « لا أشبع اللّٰہ بطنه » ''اللہ کرے اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے'' اس روایت کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کی حیثیت سے بیان کیا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بددعا دی، لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام کسی دوسرے سے کیوں نہ لیا اور کیوں بار بار سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کو طلب کیا۔ گویا یہ حدیث میں نہیں ہے، بلکہ منقبت میں ہے کہ پیش گاہِ نبوی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ مقام حاصل تھا کہ جس حسن کے ساتھ آپ اپنی خدمت بجا لاتے تھے وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ رہے کلماتِ نبویہ تو یہ بددعا نہ تھی، بلکہ پیار کی بات تھی۔

اگر بددعا ہوتی تو اس کا ظہور ہوتا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بارگاہِ خداوندی میں معتوب ہو جاتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت تو یہ ہے کہ جو مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو اپنی آواز سے دبانے کی کوشش کرے گا اس کے سب اعمال برباد ہو جائیں گے (الحجرات: ۱۔۲) اہلِ ایمان پر یہ فرض ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طلب فرمائیں تو فوراً حاضر ہوں، حتی کہ فرض نماز پڑھ رہے ہوں تو اسے توڑ دیں اور چلے آئیں۔ صحاح میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایسے واقعات موجود ہیں۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا کھانا کھاتے رہنا مرضیِ نبوی کے موافق تھا، اگر نہ ہوتا تو آپ گناہِ کبیرہ کے مرتکب سمجھے جاتے۔ لوگ بات کہہ دیتے ہیں، لیکن مآل نہیں دیکھتے۔[1]

---

[1] کبار محدثین نے ''لا اشبع اللّٰہ بطنه'' نوع کے کلمات کے محامل کا ذکر کرتے ہوئے ان کو زبان زد محاورات اور غیر ارادی کلمات کے درجے میں شمار کیا ہے۔ اہلِ لسان کے نزدیک ایسے کلمات بغیر قصد کے متکلم سے صادر ہوتے ہیں اور ان سے لغوی معانی مقصود نہیں ہوتے جیسے: ''ثکلتك امك، عقری و حلقی، تربت یداك'' وغیرہ۔ ان کلمات سے بددعا مقصود نہیں ہوتی۔

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

''ھذا دعاء لا یراد وقوعه بل عادة العرب التکلم بمثله علی سبیل التلطف ..... ثم ھذا و أمثال ذالك مثل تربت یداہ و ثکلته أمه مما یقع في کلامھم لدلالة علی تھویل الخبر و ان ما سمعه لا یوافقه لا للقصد إلی وقوع مدلوله الاصلی و الدلالة علی الماسة

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ: ۳۷۲/۵، باب خطبه یوم النحر، الفصل الأول) ←

عہدِ صدیقی و فاروقی:

حضرت خلیفہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ ادنیٰ ترین امور میں بھی آپ منہاجِ نبوی کو نہیں چھوڑتے تھے اور بلاخوف لومۃ لائم ہر اس کام پر مُصر ہوتے تھے جو آپ کو نبی ﷺ کے عزائم میں نظر آتا تھا۔

ایسی حکومت چلانے کے لیے کارکن بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں جن کے قلوب انہی جذبات سے معمور ہوں۔ اس لیے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے چن چن کر ایسے ہی اصحاب کو حکومت کے مناصب عطا فرمائے جن کے متعلق آپ کو اعتماد تھا کہ روحِ صدیقی کے ساتھ کام کریں گے۔ چنانچہ مرتدینِ عرب سے قتال کرنے کے لیے آپ نے جو فوجیں روانہ فرمائیں ان میں جہاں قدیم الاسلام اموی بزرگ سیدنا خالد بن سعید بن العاص اور سیدنا یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما تھے وہاں معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو بھی شامل کیا۔

دعوتِ محمدیہ کے یہ عظیم ترین علم بردار جن میں امین الامت سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جیسے اکابر صحابہ تھے، انھوں نے ملت کے نازک ترین موقع پر جہاد فی سبیل اللہ کیا اور نہایت بے جگری کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کر کے دین کی کشتی منجدھار سے نکال لائے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کے اس گروہ میں ہے۔

آپ کو جو شرف عہدِ نبوی میں حاصل تھا وہی عظمت و مقبولیت انھیں عہدِ صدیقی اور فاروقی میں بھی حاصل رہی۔ حضرت خلیفہ رسول اللہ ﷺ نے شام کی حکومت سیدنا یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ کر دیا۔ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دور میں شام کی حکومت پر سیدنا یزید ہی کو فائز رکھا۔ سیدنا یزید رضی اللہ عنہ نے جب

← بعینہ یہی مضمون "شرح صحیح مسلم للنووي" (۲/۳۳۵)، "باب من لعنه النبي ﷺ أو سبه" میں بھی بیان ہوا ہے۔ ان کلمات کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی تنقیص پر مبنی گردانا نہ صرف پرلے درجے کا تعصب ہے، بلکہ عربی زبان و ادب سے ناواقفیت کا ثبوت بھی۔

وفات پائی تو اپنے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو وہاں کا والی بنایا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس تقرر کی توثیق فرما دی اور مزید کچھ علاقے کا اضافہ کر کے اس عظیم تر شام کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے تحت کر دیا اور اپنی زندگی بھر انہی کو وہاں رکھا۔

جن حضرات کو امیر المومنین عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کا طریقہ کار مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہے، وہ جانتے ہیں کہ والیوں اور کارکنوں کے ساتھ آپ کا رویہ کس قدر متشددانہ ہوتا تھا۔ ادنیٰ سی بات پر گرفت ہوتی تھی اور نہایت معمولی فروگذاشت پر آپ والیوں کو معزول کر دیتے تھے۔ کسی والی کو آپ نے مدتِ معینہ سے زیادہ ایک جگہ نہیں رہنے دیا۔ برابر تبدیلی ہوتی رہتی تھی، لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وہ واحد شخصیت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اعتماد آپ پر روز بروز بڑھتا گیا اور وقتاً فوقتاً آپ ان کے اختیارات وسیع تر کرتے چلے گئے۔ تنخواہ بھی انہی کی سب والیوں سے زیادہ تھی، یعنی پانچ ہزار دینار سالانہ۔ یہ شان بہت ہی کم حضرات کو نصیب ہوئی۔ ظاہر ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر تو خویش پروری کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ نسباً وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بہت دور ہیں اور نسبتی رشتہ بھی کوئی نہیں تو پھر سوچنا چاہیے کہ عہدِ فاروقی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اتنی اہمیت کیوں حاصل کر لی کہ اجلّہ صحابہ بھی ان کے مقابلے میں یہ اعزاز حاصل نہ کر سکے۔

وجہ صاف ہے کہ شام کے والی کو بازنطینی حکومت کا ہر وقت مقابلہ تھا اور ایسی جگہ کا والی وہی ہوسکتا تھا جس کی قابلیت غیر معمولی ہو، جس پر اعتماد سب سے زیادہ کیا جا سکے اور جس سے امور جہاں بانی میں کسی کمزوری کا خطرہ نہ ہو۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا اس طرح مستقلاً شام کا والی رہنا، کسی طرف سے آپ کی شکایت بارگاہِ فاروقی میں نہ پہنچنا اور روز مرہ آپ کے اختیارات میں اضافہ ہونا، ایسی بڑی صفت ہے جس کا نتیجہ خود بخود یہ مرتب ہونا تھا کہ ایک دن پوری امت کی زمام کار آپ کے ہاتھ میں چلی جائے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جب کسی صاحب کو والی مقرر فرماتے تو سب فرائض اچھی

طرح سمجھا دیا کرتے تھے۔ ان فرائض کو آپ نے عام مجمعوں میں بھی بیان کیا ہے، تاکہ سب لوگ جان لیں کہ انھیں اپنے والیوں سے کیا توقعات رکھنی چاہئیں۔ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کی:

"اللهم أشهدك على أمراء الأمصار أني إنما بعثتهم ليعلموا الناس دينهم وسنة نبيهم وأن يقسموا بينهم فيئهم وأن يعدلوا فإن أشكل عليهم شيء رفعوه إلي" [1]

"اے اللہ! میں تجھے تمام شہروں کے والیوں کے بارے میں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انھیں اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے نبی کی سنت سکھائیں۔ فے کا مال ان پر تقسیم کریں اور انصاف کو کام میں لائیں۔ کوئی مشکل اگر درپیش ہو تو مجھ سے مشورہ کریں۔"

یہ فرائض سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس خوبی سے ادا کیے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ان کی طرف سے ہمیشہ مطمئن رہے۔ وقائع تاریخی میں ایسی کسی بات کا سراغ نہیں ملتا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی کسی حرکت پر بارگاہِ فاروقی میں کوئی شکایت پہنچی ہو۔ گویا آپ نے عملاً ثابت کر دیا کہ آپ ایک مثالی حکمران تھے اور کتاب وسنت کے بہت بڑے عالم وپیرو۔

اس زمانے کی تاریخ وجغرافیہ پر نگاہ ڈالی جائے تو سیاسی اعتبار سے شام کا علاقہ نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ ایک بڑی طاقتور غیر مسلم حکومت کی سرحدیں ملتی تھیں جس کی حریفانہ کارروائیاں عہدِ نبوی سے جاری تھیں، اس لیے وہاں کے نظم ونسق اور خارجی حکمتِ عملی کے لیے غیر معمولی دل ودماغ کی ضرورت تھی، جیسا کہ مذکور ہوا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ کسی قسم کا داخلی یا خارجی فتنہ اٹھنے کا امکان نہ چھوڑا۔ رعایا خوش حال اور خوش دل تھی اور وہاں آپ کی مقبولیت ومحبوبیت اور عزت واحترام کا وہ

---

[1] محمد الخضري: محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية (٢/٩)

عالم تھا کہ باید وشاید۔ اس پر مستزاد تھا وہ مستقل رعب جو بازنطینی حکومت پر طاری رہتا تھا۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس حاضر ہوئے ہیں تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کا استقبال بڑی شان و شوکت سے کیا تھا۔ حضرت امیر المومنین نے اس پر اعتراض کیا کہ وہ سادہ روی کیوں چھوڑی؟ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حکیمانہ جواب دیا: ''شام کی سرحد پر قیصر کی فوجوں کا اجتماع رہتا تھا، اس کے جاسوس ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے قیصر و نصاریٰ کو مرعوب رکھنے کے لیے شان و شوکت کی ضرورت ہے۔'' یہ سن کر سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''امیر المومنین! دیکھیے کس خوب صورتی سے یہ اپنے آپ کو الزام سے بچا لے گئے۔'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب ہی تو یہ بارِ گراں ہم نے اُن پر ڈالا ہے۔''[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے امام برحق اور سرخیل اربابِ ہدیٰ تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس جواب سے مطمئن ہو گئے، لیکن لوگ ہیں کہ پھر بھی ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کا مزاج شاہانہ تھا اور کافر بادشاہوں کی سی شان و شوکت انھوں نے اختیار کر رکھی تھی، حالانکہ ان سے پہلے خلفا پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے اور فقر و مسکنت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفا کی بابت اس قسم کی لغو باتیں لوگوں کی خود ساختہ ہیں اور کتاب و سنت کی روح کے منافی، لیکن ان بیان کردہ امور میں سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرنے کے جو سچے واقعات مذکور ہیں تو ان سے یہ کس طرح ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ جب فراخی دے اور عام خوش حالی کا دور دورہ ہو تب بھی شان و شوکت اور مرفہ حالی کی زندگی سے گریز کر کے کفرانِ نعمت کیا جائے۔ کوئی ایک آیت نہیں ہے، متعدد ہیں۔ دو چار حدیثیں نہیں ہیں، بیسیوں ہیں جن سے لوگوں کے بیان کردہ اس تصور کی مخالفت ثابت

[1] البداية والنهاية (۸/۱۲۴۔۱۲۵) منقول از العواصم من القواصم

ہوتی ہے جو انھوں نے بے دلیل قائم کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ [الأعراف: ۳۲]

''تو کہہ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں؟ کہہ دے یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں (بھی) ہیں، جب کہ قیامت کے دن (ان کے لیے) خالص ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو جانتے ہیں۔''

نبی کریم ﷺ اور خلفائے اربعہ رہا کرتے تھے قلبِ اسلام میں، اپنے ساتھیوں اور کنبوں کے درمیان۔ قرب و جوار کی عربی دنیا بھی اسی سادہ روی کی عادی تھی، لیکن جب اسلام کی برکتیں ظاہر ہوئیں اور متوازن معاشی نظام برپا ہو گیا تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنی زندگی میں فراخی اور بود و باش میں بلند معیار اختیار کیا، اگرچہ عربی سادگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ دوسرے ماحول میں رہتے تھے اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو متاعِ دنیوی ہی کو اصل حیات سمجھتے تھے۔ اس لیے غیرتِ دینیہ کے تحت بالکل جائز اور طیب طریقے پر روحِ قرآنی اور اصل سنت کی پیروی میں آپ نے وہ شان و شوکت اور تمکنت اختیار کی جس میں سطحیت نہ تھی اور جو ہر طرح ولی امیر المومنین کو زیب دیتی ہے۔

یہ شان و شوکت معیوب اس وقت ہوتی جب اُن کی رعایا مفلوک الحال ہوتی اور خداداد نعمتوں تک ہر کس و ناکس کو دسترس نہ ہو سکتی، جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتا ہے۔ اسلامی نظام جو معاشی عدل اور عمرانی مساوات پر مبنی ہے، وہاں ایک مباح اور طیب طرزِ عمل پر اعتراض کرنا قرآن مجید کی روح کچلنے کے مرادف ہے۔ پھر یہ اعتراض اکیلے

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر نہیں ہو گا، بلکہ جمہور صحابہ اس کی لپیٹ میں آئیں گے، حتی کہ خود سیدنا علی امیر المومنین رضی اللہ عنہ بھی جو خلیفہ ہونے کے بعد دنیا کے مالدار ترین امام تھے اور جن کی محض زکات کا روپیہ ہزاروں دینار ہوتا تھا۔ (المنتقیٰ، ص: ٤٩١)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال کے متعلق بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

”عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ مُحَمَّدٍ، قَالَ: كُنَّا عِنْدَ أَبِي هُرَيْرَةَ وَعَلَيْهِ ثَوْبَانِ مُمَشَّقَانِ مِنْ كَتَّانٍ، فَتَمَخَّطَ، فَقَالَ: بَخْ بَخْ! أَبُو هُرَيْرَةَ يَتَمَخَّطُ فِي الْكَتَّانِ، لَقَدْ رَأَيْتُنِي وَإِنِّي لَأَخِرُّ فِيمَا بَيْنَ مِنْبَرِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ إِلَى حُجْرَةِ عَائِشَةَ مَغْشِيًّا عَلَيَّ، فَيَجِيءُ الْجَائِي فَيَضَعُ رِجْلَهُ عَلَى عُنُقِي وَيُرَى أَنِّي مَجْنُونٌ، وَمَا بِي مِنْ جُنُونٍ، مَا بِي إِلَّا الْجُوعُ“ [1]

”ایوب سے روایت ہے، انھوں نے محمد رحمہ اللہ کا حوالہ دیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیٹھے تھے، آپ اس وقت کتان کے دو نقشین کپڑے پہنے ہوئے تھے، اتنے میں آپ نے ناک صاف کی اور فرمایا: ”کیا کہنے ہیں اب تو ابوہریرہ کتان سے ناک صاف کرتا ہے، مجھے وہ وقت یاد ہے جب میں منبرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان بے ہوش پڑا ہوتا تھا۔ آنے والا آتا اور میری گردن پر پاؤں رکھتا، کیوں کہ اسے ایسا لگتا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں، حالانکہ مجھے جنون نہیں ہوتا تھا، بلکہ صرف بھوک نے بے حال کر رکھا ہوتا تھا۔“

یہ صرف ایک مثال ہے اور ادنیٰ ترین۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا معیارِ زندگی اپنے وسائل کے مطابق بلند رکھا تھا، وہ اسی طرزِ عمل کو شکر گزار بندے کے شایانِ شان سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں نے خیال قائم کیا ہے کہ دولت کی یہ فراوانی صرف مجاہد صحابہ میں تھی۔ ویسے امت میں غربا اور مساکین کا طبقہ موجود تھا اور

[1] صحیح البخاري (٤/٦٢٥) طبع مصر

اس طرح دولت کی تقسیم نامنصفانہ ہوگئی تھی کہ کچھ لوگ تو مالدار تھے اور کچھ بہت غریب۔ اسی تصور کو قائم کر کے انھوں نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کے موقف کو اپنے مطلب کی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دراصل ان لوگوں نے اپنے زمانے کے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام پر قیاس کر کے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا نام اچھالنے کی کوشش کی ہے۔

اول تو سوچنا چاہیے کہ جس قوم کا ہر بالغ مرد مجاہد ہو اور چاروں طرف مہمیں جاری ہوں وہاں یہ خیال خود بخود باطل ہو جاتا ہے کہ دولت کی فراوانی صرف محدود طبقے میں تھی۔

دوسرے انھوں نے وظائف کے دیوان کا خیال نہیں کیا، جہاں حکومت کی طرف سے ایک ایک فردِ مملکت کے آرام و آسایش کا خیال رکھا جاتا تھا اور پیدا ہوتے ہی ہر بچے کی پرورش کی ذمے دار حکومتِ اسلامیہ ہوتی تھی۔ یہ دیوان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں قائم ہوا تھا اور اس کی مدات میں برابر توسیع ہوتی چلی گئی، جیسا کہ آیندہ مذکور ہوگا۔

تیسری بات ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھی کہ نظامِ اسلامی میں زکات کا محکمہ نہایت جاندار اور فعال ہوتا ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ مالدار ہوگا اتنی ہی زیادہ زکات ادا کرے گا اور جس قوم میں زکات کا رکن ہماری طرح مردہ اور جامد نہ ہو وہاں کوئی شخص مفلس اور حاجت مند رہ ہی نہیں سکتا۔ زکات ہے ہی اس لیے کہ ملک میں کوئی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ ہم نے خیرات کھانے والا ایک مستقل طبقہ ہندوؤں کی طرح قائم کر رکھا ہے اور سالانہ دو دو روپیہ ہر شخص کو دے کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے پانچ ہزار روپیہ زکات میں دے دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں یہ دستور نہیں تھا، وہاں سب زکات بیت المال میں جمع ہوتی تھی اور اسے منظّم طریقے پر خرچ کیا جاتا تھا۔

بے شک ہمیں بعض بزرگوں کے احوال میں ملتا ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن یہ فقر اختیاری تھا اور اب بھی اصحابِ ترک و تجرید اسی طرح مجاہدہ کرتے ہیں۔ یہ انفرادی چیز ہے، اس سے پورے معاشرے کے متعلق کوئی غلط قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

وہ معاشرہ تو بہت دور کی بات ہے، موجودہ مشینی دور سے پہلے سوائے عالم گیر قحط کے اور کوئی شخص بھوک سے نہیں مرتا تھا۔ ہم چونکہ اس عہد کے مسلمانوں کی عام خوش حالی کا اس زمانے میں کوئی تصور نہیں کر سکتے، اس لیے اپنے احوال پر قیاس کر کے خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔

ویسے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی طبیعت سے زاہد و عابد شخص تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حضور لے کر آپ کی جو تربیت کی تھی، اسی کے مطابق آخر وقت تک زندگی بسر کی۔ وہ سادگی جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی شان تھی وہ آپ میں بھی برابر جلوہ گر رہی، اور آپ بسا اوقات اپنے عمل سے بتا دیتے تھے کہ انسان کا اصل شرف ایمان اور عمل صالح سے ہے نہ کہ صورت، نسب اور ظاہری شان و شوکت اور فاخرانہ لباس سے۔ چنانچہ حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے کتاب الزہد (ص: ۱۷۲، طبع مکہ) میں قوی سند سے حضرت ابی حملہ رحمہ اللہ کا بیان نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق کے منبر پر خطبہ دیتے دیکھا ہے، آپ کی قمیص اس وقت دریدہ تھی۔''[1]

اسی طرح امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے (البدایة والنهایة: ۸/ ۳٤)حضرت امام اوزاعی رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق کے بازار میں اس طرح سوار جاتے دیکھا ہے کہ آپ کے پیچھے آپ کا غلام بیٹھا ہوا تھا اور آپ کی قمیص کا گریبان دریدہ تھا۔ اسی حالت میں آپ بازار میں پھر رہے تھے۔''[2]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آپ کے عسکری افسر آپ کے کپڑوں کو بطورِ تبرک لے جایا کرتے تھے۔ ایسا شخص یہ متبرک کپڑے پہنے ہوئے جب مدینہ طیبہ حاضر ہوتا تو لوگ بیش قرار رقوم دے کر انھیں حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سیدنا ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ جو آپ کے ایک بڑے سپہ سالار اور صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، وہ ایسی ہی ایک

---

[1] العواصم من القواصم (ص: ۲۰۹) حاشیه.

[2] العواصم من القواصم (ص: ۲۰۹) حاشیه.

بوسیدہ چادر اوڑھے ہوئے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور قبر شریف ومنبر کے درمیان نماز پڑھنے لگے۔ لوگوں نے چادر کو پہچان لیا کہ حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہے۔ ایک صاحب ابوالحسن البراد رحمہ اللہ نے سمجھا کہ کوئی گنوار آدمی ہیں، ان سے معاملہ بآسانی طے ہو جائے گا، لیکن تین سو دینار تک انھوں نے لگا دیے اور کام نہیں بنا۔ مگر سیدنا ضحاک رضی اللہ عنہ نے حضرت حویطب بن عبدالعزی کے ہاں جا کر دوسری چادر اوڑھ لی اور حضرت ابوالحسن البراد کو ویسے ہی ہدیتاً دے دی اور فرمایا: ''وہ آدمی بہت برا ہے جو تبرک میں ملی ہوئی چیز کو فروخت کرے، لو اسے پہنو۔''

یہ تھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت ومحبت ان کے ہم عصروں کے دل میں، وہ اس عقیدت کے ساتھ اپنے اس جلیل القدر اور معیاری امام کو دیکھتے تھے۔ صلوات اللّٰہ و سلامہ علیہ.

عہدِ عثمانی:

امیر المومنین سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدستور شام کی ولایت پر فائز رکھا اور آپ کی بے نظیر کارگزاریوں کو دیکھ کر اختیارات میں مزید توسیع کر دی۔ زیرِ نگرانی علاقے کا رقبہ بھی بڑھا دیا۔ بڑا تعجب ہوتا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک سب کا طرزِ عمل سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ہے۔ پھر بھی لوگ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ نے شام کا علاقہ ان کے زیرِ نگین کیوں رکھا۔ وجہ محض یہ ہے کہ چونکہ ان صدیقی، فاروقی اور عثمانی عمال کے ہاتھوں جن میں اموی سادات نمایاں تھے، اہلِ کفر مغلوب ہوئے عجمی ممالک پر اسلام کا پرچم لہرایا اور منافقوں کی ریشہ دوانیوں کی روک تھام ہوئی، اس لیے بعض لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اموی سادات میں جتنے عیب نکال سکتے ہوں، نکالیں۔ اور چونکہ یہ کام تلبیس وافترا کے ذریعے کیا جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ بھی ان کے فریب کا پردہ چاک کرتا رہتا ہے۔

یہودیوں اور مجوسیوں نے اسلام کا جامہ پہن کر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بہت سی

باتیں تراشیں اور نہایت سادہ و بے ضرر امور کو کج کر کے دکھانے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں کچھ لوگ متاثر ہوئے اور بعض صالح حضرات بھی دھوکے میں آ گئے، لیکن کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی صاحب کسی مفسد و فرقہ باز کی کوشش سے جماعت کو چھوڑ بیٹھے ہوں۔ بے شک بعض صحابہ فتنوں میں مبتلا ہوئے، لیکن بالآخر اپنے آپ کو صاف نکال لے گئے۔ فرقہ بازوں نے اپنی اہمیت جتانے کے لیے بعض صحابہ، مثلاً: سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کے متعلق جھوٹی باتیں وضع کر کے اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی ہے، مگر واقعات سے اس تصور کی تائید نہیں ہوتی۔ بعض غیر صحابہ، مثلاً حجر بن عدی کو صحابیت کا صداقت نامہ دے کر کام چلانا چاہا ہے مگر چلا نہیں۔ حقیقی واقعات کی روشنی میں سب باتیں ہوائی ثابت ہوتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ جماعت میں فرقہ بازی کا کیا کام۔ جماعت جو پہلے دن سے جماعت تھی، وہی آج تک جماعت چلی آ رہی ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ نے ۱۹۳ھ کے احوال کے تحت (۱۰/ ۱۱۷) حضرت مصعب بن عبداللہ زبیری رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کیا اور انھوں نے اپنے والد حضرت عبداللہ بن مصعب رحمہ اللہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ ان سے امیر المومنین ہارون الرشید نے دریافت فرمایا: ''آپ کی رائے ان لوگوں کے متعلق کیا ہے جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کرتے ہیں؟'' فرمایا: ''میں نے عرض کی: یا امیر المومنین! کچھ لوگوں نے اُن پر طعن کیا اور کچھ لوگ ان کے ساتھ رہے، جنھوں نے طعن کیا وہ ان سے الگ ہو گئے۔ ان میں شیعوں کے مختلف گروہ ہیں، اہلِ بدعت ہیں اور مختلف قسم کے خوارج ہیں، لیکن جو ان کے ساتھ تھے وہ وہی ہیں جو آج تک جماعت چلے آتے ہیں۔'' اس پر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ کے اس جواب کے بعد اس مسئلے پر مجھے اب کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔''

حضرت امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ چونکہ اموی ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوہرے داماد ہیں، مخلص اصحاب میں ہیں، قریش کے محبوب ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقبول امام ہیں

اور پھر درفش کاویانی آپ ہی کے ہاتھوں سرنگوں ہوا، ساسانی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور اس کے دوبارہ احیا کے تمام مواقع ہمیشہ کے لیے نسیاً منسیاً کر دیے گئے، اس لیے مجوسیوں کو سب سے زیادہ عداوت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے ہے، یعنی عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سے بدلہ لینے کی تو انھیں آسان صورت مل گئی کہ دو تین آدمیوں نے سازش کر کے آپ کو چپکے سے شہید کر دیا۔ سامنے اکیلا ابولؤلؤ فیروز آیا جسے بابا شجاع کا لقب دے کر ہیرو بنا دیا گیا، حتی کہ اس کا سالانہ عرس ہونے لگا۔ ''عید بابا شجاع الدین'' کے نام سے اس میلے کی ایجاد قُم میں کی گئی اور چونکہ فیروزہ نام کے ایک پتھر کو اس کے نام سے مشابہت ہے اس لیے اسے بڑا مبارک پتھر سمجھ لیا گیا ہے کہ لوگوں کے نزدیک اسے انگوٹھی میں پہننا ایک شعار سا ہے۔ جنھیں یہ پسِ منظر معلوم نہیں وہ ناواقفیت میں اسے پہنتے ہیں۔ ابولؤلؤ کے علاوہ جو دوسرا مجرم تھا، ہرمزان [1] وہ بھی نہ بچ سکا۔ مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ بات نہیں کھلی کہ سازش کتنی گہری تھی۔

---

[1] ہرمزان ایک ایرانی مرزبان تھا اور جب گرفتار ہو کر آیا تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس نے پینے کو پانی مانگا اور برتن ہاتھ میں لے کر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ اقرار کیجیے کہ جب تک میں یہ پانی نہ پی لوں، آپ مجھے قتل نہیں کریں گے'' آپ نے فرمایا: ''ہاں جب تک تم یہ پانی نہ پی لو گے تمھیں قتل نہیں کیا جائے گا۔'' یہ سن کر اس نے پانی پھینک دیا اور کہا: ''اب آپ مجھے قتل نہیں کر سکتے، میں نے یہ پانی نہیں پیا۔'' اس طرح اس حیلہ ساز مجوسی نے امام المسلمین رضی اللہ عنہ کے ایفائے عہد پر بھروسا کر کے الفاظ سے کھیلنے کی جراَت کی اور اپنی جان بچا لی۔ پھر اس نے اسلام کا اعلان کیا، لیکن اس کے ایمان کی نوعیت یہ تھی کہ جو بھی ایرانی گرفتار ہو کر آتا یہ اس سے گلے مل کر روتا۔ اسی جذبے کے تحت اس نے ابولؤلؤ فیروز اور ایک نصرانی غلام جُفَینہ سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو شہید کر دینے کی سازش کی اور یوں فیروز کے ہاتھوں اس عدل مجسم کے وجود سے امت کو محروم کر دیا جس کی خلافت پرتوِ نبوت تھی۔ (ملاحظہ ہو خضری: محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیة: ۲/ ۲۵)

سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے گواہی دی کہ ''کل شب میں ابولؤلؤ کے پاس سے گزرا تھا، اس وقت وہ اور ہرمزان اور جفینہ تینوں سرگوشی میں مشغول تھے۔ میرے اچانک پہنچ جانے سے گھبرا گئے اور ان کے پاس سے ایک خنجر گرا جس کے دو پھل تھے۔ ذرا دیکھو کہ امیر المومنین پر قاتلانہ ←

یہ گہرائی کھلی امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے سریر آرائے خلافت ہونے کے چھے برس بعد۔ حضرت امیر المومنین کی مقبولیت ومحبوبیت اور آپ کے والیوں کی کارگزاریوں

حملہ کس ہتھیار سے کیا گیا ہے۔''

جس وقت فیروز آپ کو زخمی کر کے بھاگا تھا تو ایک تیمی بزرگ اس کے پیچھے ہو لیے تھے، تا آنکہ اسے گرفتار کر لائے۔ اس کے پاس ویسا ہی خنجر موجود تھا۔ حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے یہ سب باتیں سنیں اور دیکھیں۔ اس وقت تو خاموش رہے، لیکن جب حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو آپ نے جا کر ہرمزان کو قتل کر دیا اور جُفینہ کو قتل کرنے چلے۔ ان کے جانے کی اطلاع سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ کو ہوگئی جو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق انتخابِ خلیفہ تک کے لیے نماز کے متولی تھے۔ آپ نے حضرت عبیداللہ کو واپس لانے کے لیے لوگوں کو بھیجا اور وہ عین اس وقت گرفتار کر لیے گئے جب جفینہ پر ہاتھ اٹھانے والے تھے۔ ان سے تلوار لے لی گئی اور انتخابِ خلیفہ تک کے لیے قید کر دیا گیا۔

حضرت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تکمیل پر پہلا مقدمہ آپ کے سامنے یہی پیش ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو قصاصاً قتل کر دینے کا مشورہ دیا تھا، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ امر شاق تھا، وہ کہتے تھے: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کل عمر رضی اللہ عنہ قتل ہوئے اور آج ان کے فرزند کو قتل کر دیا جائے۔''

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب مسلمانوں کا کوئی امام نہ تھا اور سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی گواہی سے حضرت عبیداللہ رضی اللہ عنہ کا مشتعل ہو جانا قدرتی بات تھی۔ البتہ یہ ان کا تقویٰ تھا کہ زخم کاری اور مہلک ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے والد ماجد ۔صلوات اللہ علیہ۔ کی وفات تک ان قاتلوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس لیے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر المومنین سے عرض کی کہ یہ واقعہ آپ کے ہاتھ میں اختیارات آنے سے پہلے کا ہے اور آپ کی حکومت پر اس کی ذمہ داری نہیں۔ اس لیے عبیداللہ کو قتل نہیں کرنا چاہیے، اس پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بحیثیت امام کے اس خون کا ولی میں ہوں اور میں اپنی جیب سے اس مقتول کی دیت ادا کیے دیتا ہوں۔'' چنانچہ یہی فیصلہ ہوا۔

اس واقعے کی تفصیلات کے بارے میں روایات کا سخت اختلاف ہے۔ ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کے بیٹے کو قصاص لینے کی اجازت دے دی تھی اور وہ اس پر بظاہر تیار بھی ہو گئے تھے۔ لوگوں کا جمِ غفیر اُن کے ساتھ تھا جو حضرت عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے فعل کی مذمت کرتا تھا، لیکن ساتھ ہی عفو و درگزر کی بھی استدعا کر رہا تھا، لیکن وہ خاموش تھے، تا آنکہ حضرت عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے تلوار انھیں دے دی گئی۔ انھوں

کے نتیجے میں چھے برس تک ان مجوسی دشمنانِ دینِ محمد کو کچھ کرنے کی جراَت نہیں ہوئی۔ پھر

➜ نے اس وقت مجمع سے کہا: ''اگر میں انھیں قتل کر دوں تو آپ لوگ حارج تو نہیں ہوں گے؟'' لوگوں نے کہا: ''ہرگز نہیں۔ یہ تمھارا حق ہے، البتہ تم چاہو تو معاف کر دو جس کی ہم درخواست کرتے ہیں۔'' اس پر انھوں نے کہا: ''میں نے معاف کر دیا۔'' لوگوں نے خوشی سے بے قابو ہو کر انھیں کندھوں پر اٹھا لیا اور اسی طرح ان کے گھر تک پہنچایا۔

بہر حال جو بھی صورتِ حال ہو، یہ امر مسلم ہے کہ سیدنا عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی جان بخشی حضرت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے ایسے فیصلے سے ہوئی تھی جس سے مقتول کے وارث بھی مطمئن تھے اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی۔ چونکہ ہرمزان ایرانی تھا اور اپنے علاقے میں صاحبِ نمود، اس لیے سبائی لوگوں کو اسے صاحبِ ایمان بتا کر مقتدائے ملت باور کرانے پر اصرار ہے اور وہ اس کے قتل کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ پر من جملہ اور اعتراضات کے یہ بھی ایک زبردست اعتراض ہے کہ آپ نے ہرمزان کے قصاص میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے فرزند کو قتل نہیں کیا۔ اپنے اس موقف کی مضبوطی ثابت کرنے کے لیے یہ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی ہرمزان کے قتل کا سخت ملال تھا اور آپ بضد تھے کہ عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ضرور قتل کیا جائے۔ اس سے بھی بڑھ کر ان کا دعویٰ ہے کہ خلیفہ ہوتے ہی آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے اور اسی لیے وہ مدینے سے فرار ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام چلے گئے۔

اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کو ایک شخصِ واحد کا قتل سمجھا جائے اور ایسے شخص کے قتل کو اہمیت دی جائے جس کا ایمان مشتبہ تھا اور جو امام المسلمین کے قتل میں بداہتاً شریک رہا۔ اور کیا یہ امر بھی سخت تعجب انگیز نہیں کہ حضرت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص کو ٹالا جائے اور ہرمزان کے قصاص کو قیامِ خلافت کا پہلا کارنامہ بنانے کی سوجھے اور خلافت کی ابتدا کی جائے، فرزندِ عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے منصوبے سے۔

یہ لغو اور لچر روایتیں محض اس لیے وضع کی گئی ہیں کہ اپنے آپ کو حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا پیرو باور کرائیں اور آپ کو آلِ عمر رضی اللہ عنہ کا دشمن، حالانکہ بات اتنی ہی ہے جتنی اُن کے ایک شاعر نے خود کہہ دی:

بشکست عمر پشت ہزبرانِ عجم را　　برباد فناد ادرگ و ریشۂ جم را
ایں عربدہ از غصب خلافت ز علی نیست　　باآلِ عمر کینہ قدیم اس عجم را

''عمر نے عجم کے شیروں کی پشت توڑ دی اور ایران کا رگ و ریشہ مٹا کر رکھ دیا۔ یہ ➜

عبداللہ بن سبا (ابن سوداء) ایک یہودی نے زمام کار اپنے ہاتھ میں لی۔ تمام مجوسی اس کے ساتھ ہو گئے۔ سرحدی علاقوں کے بعض جاہل عربوں کو بھی انھوں نے اپنے ساتھ ملا لیا۔

یہ جھگڑا کچھ اس لیے نہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کی خلافت انھوں نے غصب کر لی تھی، بلکہ عجم کا کینہ آلِ عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت پرانا ہے۔''

ممکن ہے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ہاشمی موقف کے مطابق محض اقرارِ اسلام کی بنا پر ہرمزان کو مومن باور کر کے ابتداءً اس کا قصاص لینے کا مشورہ دیا ہو، لیکن ان جیسے امام الفقہاء سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ امام سابق نے جو قضیہ جمہور صحابہ کے مشورے سے طے کر دیا تھا اور مقتول کے وارث بھی اس سے راضی ہو گئے تھے، پھر اس قضیے کو اپنی حکومت میں دوبارہ اٹھائیں اور وہ بھی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے اہم ترین قضیے کی موجودگی میں۔

جس طرح سیدنا طلحہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہم حادثۂ شہادت کے بعد مدینے سے باہر چلے گئے تھے، اسی طرح حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ بھی چلے گئے۔ یہ تصور لغو ہے کہ وہ سیدھے شام گئے تھے، کیوں کہ اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ اہلِ شام کا موقف کیا ہوگا، البتہ یہ درست ہے کہ بعد کے احوال کے تحت سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ کی طرح آپ بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت پر تھے اور انھیں کی طرف سے لڑتے ہوئے صفین میں شہید ہوئے۔ رضي الله تعالی عنه

اس سلسلے میں مسعودی کا بیان بھی ناقابلِ قبول ہے کہ صفین میں جب سیدنا عبیداللہ رضی اللہ عنہ مبارز طلب ہوئے تو ان کے مقابلے کے لیے خود حضرت امیر المومنین نکلے تھے اور باہمی مقابلے میں آپ نے عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو دے پٹکا تھا۔ یہ خیالی باتیں ہیں اور آلِ عمر رضی اللہ عنہ سے دلوں میں جو کینہ ہے اس کی ان روایتوں میں نمود ہے۔

امام اگر میدانِ کارزار میں موجود ہو تب بھی وہ خود نہیں لڑتا۔ اس کا کام فوجوں کو لڑانا ہے۔ صفین کے معرکوں میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شمشیر زنی کی تمام روایتیں اور رجز خوانیاں فرضی ہیں۔ نہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ ان معرکوں میں مبارز طلب ہوئے اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ۔ نہ حضرت عبیداللہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا مقابلہ ہوا اور نہ حضرت عمرو بن العاص اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا۔

اسلام کا جانباز سپاہی ہونے کی حیثیت سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کارنامے صفحۂ دہر پر ثبت ہیں۔ پھر امام بن جانے کے بعد آپ اس کے مکلّف نہ تھے کہ خود تیغ و سنان لے کر نکلیں۔ یہ امر منصبِ امامت کی عظمت اور وقار کے خلاف ہے۔ آپ پر قربان ہونے والوں کی کوئی کمی تھی جو آپ خود لڑنے نکلتے؟!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تینوں خلفا کا عمل اس بارے میں واضح ہے تو پھر کس طرح ممکن ہے

ظاہر ہے کہ عربی عجمی اختلاف پیدا کر کے عربوں کو نہیں ملایا جا سکتا، اس لیے یہ محاذ کھولا گیا۔قریش کے خلاف کہ یہ لوگ تمام امت پر مسلط ہو گئے ہیں۔ یوں امیر المومنین اور ان

← کہ آپ میدان میں اترتے اور کس صاحبِ ایمان میں جرأت تھی کہ آپ سے دو بدو جنگ کرتا؟!
اجتہادی اختلاف یا سیاسی اصول کے تحت فوج کشی کی نوبت آ جاتی ہے، لیکن اس کا ہرگز امکان نہیں کہ باہمی حرمت اور ذاتی تعلقات کو پسِ پشت ڈال دیا جائے۔ جنگِ جمل کے بعد جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند سیدنا محمد رضی اللہ عنہ کی نعشیں دیکھیں تو آپ کو کس قدر سخت صدمہ ہوا تھا، اور اپنے زانو پر اُن کے سر رکھ کر آپ نے کیسے حسرت ناک کلمات کہے تھے۔
یہ ممکن نہ تھا کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سا چچا سامنے آئے اور سیدنا عبیداللہ رضی اللہ عنہ سا بھتیجا مقابلے کی جرأت کر سکے۔ گھمسان کی جنگ میں بھی ان سے گستاخی کا امکان نہ تھا۔ جمل وصفین واقعات کی جتنی تفصیلات لوگوں نے مرتب کی ہیں۔ ان میں صرف طینت کی دنائت کا مظاہرہ کیا ہے، کیسی دلچسپ بات ہے کہ ایک طرف تو امام کا مقام نبوت سے بھی افضل سمجھا جاتا اور دوسری طرف ان کے نزدیک امام کی حیثیت یہ ہے کہ میدانِ کارزار میں اکھاڑ پچھاڑ کرتا پھرے۔
سیدنا عبدالرحمٰن بن خالد امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نائب کی حیثیت سے حمص کے والی تھے۔ دورِفتن میں آپ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا تھا اور آپ کے بھائی حضرت مہاجر بن خالد رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا۔
حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ میں اپنے والد ماجد کی سی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں اور امت میں ویسی ہی مقبولیت حاصل تھی۔ ان کا شمار ابطالِ اسلام میں ہے، لیکن راویوں کو ان کی اس مقبولیت میں بھی زہر نظر آتا ہے۔
المعارف لابن قتیبہ رحمہ اللہ میں مذکور ہے کہ آخر عمر میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب ولایتِ عہد کے بارے میں تقریر کی اور فرمایا: ''میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کر جاؤں۔ آپ حضرات کسی کا نام تجویز کیجیے'' تو لوگوں نے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے فرزند عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی کا نام پیش کیا تھا۔ جس پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ناراض ہو گئے اور یہودی طبیب کے ذریعے انھیں زہر دلوا دیا۔ کہتے ہیں کہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے فرزند عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور ان کے بھتیجے خالد بن مہاجر بن خالد رضی اللہ عنہ نے اس یہودی طبیب کو قصاص میں قتل کر دیا تھا۔
یہ روایت اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ قطعی بے اصل ہے۔ یہ مسئلہ جس طرح طے ہوا تھا اس کے احوال زیرِ نظر کتاب میں ولایتِ عہد کے تحت ملیں گے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس قسم کی کوئی ←

کے والیوں کے بارے میں مستقلاً خفیہ خفیہ زہر اگلنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

سیدنا سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہما [1] جو فاتحِ طبرستان ہیں اور امیرِ کوفہ تھے، وہاں

← تقریر نہیں کی تھی جو ان کے سامنے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا نام لیا جاتا اور انھیں یوں خفیہ طریقے سے راہ سے ہٹانے کی ضرورت پڑتی۔ پھر جب زہر خوانی کا واقعہ خفیہ تھا تو اس کا پتا ان راویوں کو کیسے چل گیا اور اگر اس یہودی طبیب کو کسی نے بطور خود قصاصاً قتل کر دیا تھا تو حکومت نے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ خلافتِ اسلامیہ میں ایک ذمی کا قتل معمولی بات نہیں۔ خالد بن عبدالرحمٰن ہوں یا خالد بن مہاجر رضی اللہ عنہم۔ ان حضرات کے متعلق یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ محض شبہے کی بنا پر وہ قانون اپنے ہاتھ میں لیں گے اور قتل بھی اسے کریں گے جو محض آلہ کار تھا۔ ہمت تھی تو یہ قاتلانہ حملہ امیر المومنین پر کرتے اور اگر یہ قتل خفیہ تھا، یعنی حکومت کو پتا نہ چلا کہ یہودی طبیب کا قاتل کون ہے تو ان راویوں کو کیونکر معلوم ہو گیا کہ یہ قتل خالد بن عبدالرحمٰن یا خالد بن مہاجر نے کیا ہے؟!

تعجب ہوتا ہے کہ اُس عہد کے مسلمانوں کو خصوصاً صحابہ اور ان کی اولاد کو لوگوں نے بے آئینی اور لاقانونیت کا پیروکار کیوں سمجھ رکھا ہے اور یہ کیوں باور کر لیا ہے کہ احکامِ الٰہی اور شعارِ اسلامی کی طرف سے وہ بالکل بے پروا تھے۔ پھر حکومت کو اور وہ بھی امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کو انھوں نے ایسا کیوں خیال کر لیا کہ وہاں نظم ونسق میں اختلال تھا اور آدمی آزاد تھا کہ جسے جب چاہے قتل کر دے اور اسے باز پرس کا خطرہ نہ ہو۔ (مولف)

[1] سیدنا سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ صغار صحابہ میں سے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت آپ کی عمر نو (۹) سال تھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ان کے ترجمہ میں ''الاصابہ'' میں نقل کرتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ بدر کے دن میں نے تمھارے والد عاص کو قتل نہیں کیا تھا۔ اس پر سیدنا سعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المومنین رضی اللہ عنہ! اگر آپ ہی میرے باپ عاص کو قتل کرتے تو کیا ہی بات تھی، وہ باطل پر تھا اور آپ حق پر تھے۔ سیدنا سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اس شان کے مومن تھے کہ آپ کی ساری تربیت اکابر صحابہ رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ قرآن مجید کے بڑے عالم تھے اور زبان کی صحت کے معاملے پر حجت سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ جب امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو جمع کیا تو جن بزرگوں کے ذمے قرآن پاک کے وحدانی نسخے کی کتابت کی تھی، ان میں سیدنا زید بن ثابت، سیدنا عبداللہ بن زبیر، سیدنا عبدالرحمان بن حارث بن ہشام اور سیدنا سعید بن العاص رضی اللہ عنہم کو بھی مصحف کی نقل پر مامور کیا تھا۔ اس بہترین علمی اور دینی خدمت کے علاوہ آپ جہادِ اسلامی میں بھی بڑا نام پیدا کر چکے تھے۔ طبرستان کے جہاد کی کمان آپ کے ہاتھ میں ہی تھی جس میں آپ ←

ایک واقعہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں ایک جتھے کے کچھ لوگ سامنے آ گئے، یعنی مالک بن الحارث الاشتر اور عمرو بن ضابیٔ وغیرہ۔ ان سے یہ گستاخانہ حرکت سرزد ہوئی کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں انھوں نے ایک نوجوان کو زد و کوب کیا۔ اشرافِ کوفہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس درخواست گزاری کی کہ ان مفسدوں کو کوفے سے نکال دیا جائے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان سب کو جمع کر کے معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا جائے، تاکہ وہ ان کی اصلاح کر دیں۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں عزت و مدارات کے ساتھ رکھا اور ہر طرح استمالت کی کوشش کی۔ پھر ایک موقع پر فرمایا:

''آپ لوگ پختہ عمر ہیں، فصاحتِ لسانی سے متصف ہیں، پھر اسلام کا شرف آپ کو حاصل ہے، جس کے نتیجے میں اقوامِ عالم کی سرزمین اور ان کا ثقافتی و معاشی ورثہ آپ کو مل گیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ قریش سے ناراض ہیں، حالانکہ قریش اگر نہ ہوتے تو آپ پہلے ہی کی طرح ذلیل رہتے۔ آج آپ کے ائمہ آپ کے پشت پناہ ہیں۔ یہ ڈھال اپنے سے جدا مت کیجیے۔ اس وقت تو آپ کے امرا آپ کی گستاخیاں برداشت کر لیتے ہیں، لیکن بخدا اگر آپ نے اپنی ذہنیت نہ بدلی تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی حکومت میں آپ کو مبتلا کر دے گا جو آپ پر سختی کریں گے اور اگر آپ نے برداشت کر لیا تو وہ اسے آپ کی خوبی نہیں جانیں گے .....''

← کی سپہ سالاری اور قیادت میں کئی ہاشمی حضرات جیسے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سب شامل تھے۔ (طبري: ٥/ ٥٧)۔ صالح بن کیسان رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''سعید بن العاص رضی اللہ عنہ بڑے بردبار اور باوقار انسان تھے۔ جب کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرتے تو اس کا اظہار نہ کرتے بلکہ فرماتے تھے کہ دل بدلتے رہتے ہیں، اس لیے آدمی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ آج کسی چیز کی تعریف کرے اور کل اسی کی مذمت کرنے لگے۔ ۵۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔''

اس مناسب و ملائم تنبیہ کا جواب ان لوگوں نے سختی سے دیا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی سختی کا لہجہ اختیار کیا، کیوں کہ آپ نے سمجھ لیا کہ ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ یہ تو شام میں بھی اسی طرزِ عمل پر اتر آئے جو عراق میں تھا۔ آپ نے فرمایا:

''یہ کوفہ نہیں ہے۔ بخدا اگر اہلِ شام نے تمھاری حرکتیں دیکھ لیں تو میں اگرچہ ان کا امام ہوں، لیکن تمھارے قتل سے انھیں باز نہیں رکھ سکوں گا۔ اپنی جان کی قسم! مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمھاری باہمی کوئی سازش ہے۔''

پھر آپ نے حضرت امیر المومنین کو مطلع کر دیا کہ ''میں ان کی اصلاح نہیں کر سکا، اور ان کا شام میں رہنا بھی مجھے گوارا نہیں۔'' سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمان بھیجا کہ انھیں حمص بھیج دیا جائے۔ جہاں کا انتظام معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کی اچھی طرح گوشمالی کی، تا آنکہ ایک سال کے بعد انھوں نے اپنی حرکتوں سے باز رہنے کا عہد کیا اور اپنے طرزِ عمل پر پشیمانی ظاہر کی۔ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمان بھیجا کہ انھیں کوفہ واپس جانے کی اجازت دے دی جائے۔ (طبري: ٥/ ٨٧)

سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اشتر کو حکم دیا کہ مدینہ طیبہ حاضر ہو کر حضرت امیر المومنین کی خدمت میں بالمشافہہ سب کی توبہ پیش کرے۔ باقی لوگوں کی قلبی حالت کچھ بدل گئی، اس لیے انھوں نے کوفہ نہ جانے ہی میں عافیت سمجھی، البتہ اشتر مدینہ حاضر ہوا۔ یہاں اس نے ایسے عجز کا مظاہرہ کیا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے بھی کوفہ جانے کی اجازت دے دی۔ اب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا۔ یہاں کوفہ سے ایک خط آیا ہوا رکھا تھا، جس میں ان لوگوں کو فوراً کوفہ پہنچنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان سب کی رائے تھی کہ اس خط کو نظر انداز کر دیا جائے، لیکن اشتر کو یہ رائے پسند نہیں آئی اور تمام عہد و پیمان اور توبہ کو بالائے طاق رکھ کر کوفہ پہنچ گیا۔ اس نے پے بہ پے وہاں قسم قسم کے فتنے بپا کیے اور علانیہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ

کے مقابلے پر آ گیا، تاآنکہ آپ کی شہادت کا دلگداز واقعہ ان لوگوں کے نامہ اعمال میں لکھا گیا ع

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین

اس جگہ مزید تفصیل کا موقع نہیں، اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ سبائی تحریک کا جو اندازہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے لگایا تھا کہ یہ ایک منظّم ہمہ گیر سازش ہے وہ حرف بحرف ثابت ہوا۔ آج تک امت میں جتنے فساد ہوئے اور مصائب ٹوٹے، اُن کی تمام ذمے داری سبائیہ پر ہے۔ اس گروہ کے بعض افراد کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں اور یہاں ان کا یاد کر لینا ضروری ہے، تاکہ آیندہ کے واقعات میں ان کا کردار سمجھ میں آ جائے۔ نمایاں شخصیتیں یہ ہیں:

① مالک بن الحارث الاشتر النخعی
② ثابت بن قیس نخعی
③ کُمَیل بن زیاد نخعی
④ زید بن صوحان عبدی
⑤ جنوب بن زہیر غامدی
⑥ جندب بن کعب ازدی
⑦ عروہ بن جعد کوفی
⑧ عمرو بن ضابی
⑨ حکیم بن جبلہ

مصر میں سبائی گروہ کے لوگ حسبِ ذیل تھے:

① عبداللہ بن سبا، جو تحریک کا روحِ رواں تھا اور عراق و شام میں کام کر کے مصر چلا گیا تھا، کیوں کہ شام میں اس کی دال نہ گل سکی۔
② غافقی بن حرب
③ خالد بن ملجم
④ سودان بن حمران
⑤ کنانہ بن بشر
⑥ محمد بن ابوحذیفہ بن عتبہ اموی۔ [1] یہ صاحب حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے سوتیلے بیٹے

[1] حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "الإصابة في تمييز الصحابة" میں اس محمد بن ابوحذیفہ کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں:



تھے اور آپ ہی کے زیرِ سایہ پرورش پائی تھی، انھیں ہوس تھی کہ کہیں کے حاکم بن جائیں، لیکن چونکہ اہل نہ تھے اس لیے نہ بن سکے۔ ہر طرح ناکام رہے تو عرض کی کہ میں کہیں اور جانا چاہتا ہوں۔ حضرت امیر المومنین نے سب انتظام کر دیا تو مصر چلے گئے اور وہاں سبائی گروہ میں شرکت کر کے حضرت امیر المومنین کے سخت ترین دشمن بن گئے۔ ان کی نااہلی کا ثبوت یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جب مصر میں بیعت ہوگئی تو زمام کار انہی محمد نے سنبھال لی۔ لیکن امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے مصر کا والی بنا کر سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہ بن عبادہ کو بھیج دیا اور یوں محمد بن ابی حذیفہ اب بھی محروم رہے۔

➜ ''اس کے والد ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کے بعد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی پرورش کی۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مصر جانے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اجازت دے دی، لیکن وہاں جا کر یہ محمد بن ابو حذیفہ سب سے زیادہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ثابت ہوا ..... اس نے والیِ مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی غیر موجودگی میں ان کے نائب عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو مصر سے نکال دیا اور خود مصر کی امارت پر قابض ہوکر لوگوں کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت توڑنے کی دعوت دینی شروع کر دی۔ لیث بن عبدالکریم بن حارث حضرمی سے روایت ہے کہ یہ محمد بن ابو حذیفہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے نام سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف طعن آمیز خطوط لکھا کرتا تھا اور پھر قافلوں کو روک کر ان کے لوگوں کو پکڑ لیتا اور اذیتیں دیتا اور پھر ان کو یہ خطوط دے کر مدینہ سے آنے والے راستوں پر جانے کا حکم دیتا اور پھر یہ ان کے پیچھے قاصد بھیجتا جو ان کے آنے کی خبریں لائیں، ساتھ ہی یہ لوگوں کو ان سے ملنے کا حکم دیتا۔ جب لوگ ان سے ملتے تو پوچھتے کہ کیا خبر لائے ہو، اس پر یہ لوگ یہ خطوط آگے کر دیتے۔ محمد بن ابی حذیفہ آگے بڑھ کر یہ خطوط لے لیتا اور ان کو مسجد میں مجمع عام کے سامنے پڑھتا جس میں لکھا ہوتا کہ اہلِ اسلام! ہم تم لوگوں سے عثمان رضی اللہ عنہ کی فلاں فلاں بات کی شکایت کرتی ہیں، ان خطوط میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع ہوتی تھی جس کی وجہ سے مسجد میں موجود لوگ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑک جاتے تھے ..... یہ محمد بن ابی حذیفہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش برپا کرنے والوں کا سرغنہ تھا۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو صفین کے قریبی زمانے میں قتل کروا دیا تھا۔'' (الإصابة في تمييز الصحابة جلد: ٥، ترجمة محمد بن أبي حذيفه)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اولاد میں دو شخص ہیں جن کا ذکر مسلمانوں کے لیے ندامت وعبرت کا باعث ہے: ایک سیدنا ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ اموی کے فرزند یہ محمد اور سیدنا ابو عبید ثقفی کا بیٹا مختار کہ دنیا و آخرت کی رسوائی انھوں نے مول لے کر ملتِ اسلامیہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ حسرت کا مقام یہ ہے کہ دونوں کے باپ نہایت مخلص مجاہد اور ذی رتبہ صحابی تھے۔ البتہ اس کا ثبوت نہ مل سکا کہ مختار کی طرح محمد بن حذیفہ کے عقائد بھی خراب ہو گئے تھے یا نہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ محمد کی تمام حرکتیں محض ذاتی اور سیاسی تھیں، ان کے عقائد سبائی نہ تھے، لیکن نفس پروری اور ملت کشی میں ان کی حرکتیں انتہا کو پہنچ گئی تھیں جن کی تفصیل مسلمانوں کے لیے موجبِ ندامت ہو گی۔

⑦ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما۔ آپ حضرت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف نہ تھے اور نہ سبائی گروہ سے ظاہراً یا باطناً کچھ تعلق تھا۔ اپنے سوتیلے باپ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن جب سیدنا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بجائے ان محمد بن ابی بکر کو مصر بھیجا گیا اور انھیں راستے میں حضرت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے امیر مصر کے نام وہ جعلی خط ملا کہ یہ لوگ جب مصر پہنچیں تو انھیں قتل کر دیا جائے، اس وقت سے یہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف ہو گئے تھے، بلکہ آپ کے قتل کے درپے بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس ظلمِ عظیم سے بچا لیا اور استغفار کرتے ہوئے یہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے سے ہٹ گئے، لہٰذا انھیں سبائی گروہ میں سمجھنا درست نہیں اور نہ ان کی مخالفت کی سازش میں یہ کسی طرح شریک تھے۔ محض ایک وقتی جذبے کے سبب ان سے ناشائستہ حرکات سرزد ہو گئی تھیں جن سے انھوں نے توبہ کر لی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ ان کی بعد کی حرکات محض سیاسی ہیں اور موجبِ طعن نہیں۔ بہرحال یہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اب ہم پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے احوال پر آتے ہیں۔

دورِ امارت:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمات عسکری تھیں، لیکن جب عہدِ فاروقی میں آپ اپنے برادرِ بزرگ سیدنا یزید رضی اللہ عنہ کے بعد شام کے والی بن گئے تو آپ کی قابلیت کے حقیقی جوہر کھلے۔ داخلی انتظام کے علاوہ، جس کے مجمل احوال اوپر گزرے، آپ کو بڑی فکر یہ تھی کہ بری فوج کے ساتھ ساتھ بحری بیڑا تیار کیا جائے جو بازنطینی فوجوں کا مقابلہ سمندر میں کر سکے۔ دفاعی انتظامات میں بحریہ کا نہ ہونا آپ کے نزدیک ایک بڑی کمی تھی۔ اس لیے کہ رومیوں کی فوجیں جہازوں کے ذریعے آیا کرتی تھیں اور وہ اطمینان سے ساحل پر اتر سکتے تھے، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بحریہ بنانے کی اجازت نہیں دی۔ خشکی پر اسلامی فوجیں چاروں طرف مشغول تھیں، اس لیے وسائل کی کمی کے سبب آپ بحری محاذ کھولنا نہیں چاہتے تھے۔

عہدِ عثمانی میں جب اسلام کے بطلِ جلیل سیدنا عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ [1] بن کریز کے

---

[1] سیدنا عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ صحابی بن صحابی ہیں۔ جب پیدا ہوئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں لے کر برکت کی دعا دی اور اپنا لعابِ دہن ان کے منہ کو لگایا جسے انھوں نے چوسنا شروع کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنوعبدشمس! یہ بچہ تم سے زیادہ ہم پر پڑا ہے، مجھے امید ہے کہ یہ لوگوں کی پیاس بجھانے والا ہوگا۔ (کتاب نسب قریش للمولف مصعب زبیری، ترجمہ ولد بنوعبدشمس، عبداللہ بن عامر)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس لیے فرمایا کہ ان کی دادی یعنی ان کے والد عامر بن کریز رضی اللہ عنہ کی والدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی سیدہ بیضاء ام حکیم بنت عبدالمطلب تھیں (کتاب نسب قریش صفحہ: ۱۴۷)۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ان کی نیکیاں اور لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت کی جو کیفیت تھی اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔" (منهاج السنة: ۱۸۹/۳)

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی رحمہ اللہ کی کتاب العواصم من القواصم کے حاشیہ میں ان عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں علامہ محبّ الدین خطیب مصری لکھتے ہیں کہ اگر ان کی طرح کے لوگ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے اسلاف میں ہوتے تو وہ ان کی عظمت کو ثقافت وتہذیب کی ←

ہاتھوں ایران کا آخری فیصلہ ہوتا نظر آنے لگا تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی دیرینہ خواہش پوری کر دی اور بحری بیڑے کی تیاری کا حکم دے دیا۔ چنانچہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جہاز سازی کے کارخانے قائم کر دیے اور فوجیوں کی بحری تربیت کا بھی خاطر خواہ انتظام کر دیا۔ یہ سب اہتمام اس سرعت سے ہوا کہ ۲۷ھ ہی میں جزیرۂ قبرص پر بحری حملہ ممکن ہو گیا اور ۲۸ھ میں اہلِ قبرص نے جزیہ پر صلح کر لی۔ ان کی پیشکش یہ تھی کہ خلافتِ اسلامیہ کو سات ہزار دینار سالانہ ادا کریں گے مگر ساتھ ہی اجازت مانگی تھی کہ اتنی ہی رقم شاہِ روم کو بھی دے دیا کریں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین کی اجازت سے یہ درخواست منظور کر لی مگر شرط لگائی کہ اگر پشت کی طرف سے اُن پر حملہ ہو تو مسلمانوں پر ان کی امداد ضروری نہ ہو گی۔ لیکن اگر شاہِ روم کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کوئی بحری پیش قدمی ہو تو اس کی اطلاع مسلمانوں کو یہ لوگ پہنچا دیا کریں گے اور جب مسلم بحری بیڑہ ادھر سے گزرے گا تو اسے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائیں گے اور اس کا خیال رکھیں گے کہ اس بیڑے کو اہلِ قبرص کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہونے پائے۔ مسلمانوں کے اس پہلے بیڑے کی کمان سیدنا عبداللہ بن قیس حارثی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ گویا آپ کو مسلمانوں کا سب سے پہلا امیر البحر ہونے کا شرف حاصل ہے اور جنتی مجاہدوں کا امیر ہونے کی عزت مستزاد۔

سیاسی اور عسکری اعتبار سے یہ نہایت اہم ابتدائی کارروائی ہوگئی، یعنی قبرص کو ایک نیم آزاد حکومت بنا دیا گیا۔ رومی حکومت کے تسلط سے بہرحال وہ آزاد ہو گیا۔ اگرچہ اسلامی مملکت کا جزو نہ بن سکا، لیکن مسلمانوں کو سمندر میں ایک اہم فوجی مرکز مل گیا۔ جن اہلِ تصنیف نے قبرص کو مفتوحہ علاقہ قرار دیا ہے انھوں نے اس اولین بحری جہاد کی تفصیلات

← کتابوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتے۔ (العواصم من القواصم، صفحہ: ۸۵، بر حاشیہ)۔ ان کی فتوحات کا حال یہ تھا کہ تمام خراسان، فارس کے علاقے، سجستان، کرمان وغیرہ فتح کیے اور غزنہ تک پہنچ گئے۔ ان ہی کے عہدِ حکومت میں ایرانیوں کا آخری بادشاہ یزدگرد مارا گیا تھا۔

پر غور نہیں کیا۔ درحقیقت اس جزیرے پر باہمی سمجھوتے سے مسلمانوں کی بالادستی قائم ہوئی تھی۔ وہ مملکتِ اسلامیہ کا جز اس وقت نہیں بنا تھا۔ قبرص کی یہ مہم ذیلی حیثیت رکھتی ہے، لیکن بحری مہموں کے لیے اس اقدام نے راہ کھول دی۔ اہلِ روم سے اب سمندر میں باقاعدہ جھڑپیں ہونے لگیں اور ان کے لیے سب سے سخت بات یہ تھی کہ عموماً مسلمان ان کے جنگی جہاز چھین لیا کرتے تھے۔

تاریخ کا طالب علم جب اسلامی بحریہ کے ان ابتدائی کارناموں کو دیکھتا ہے کہ کس طرح وہ دنیا کی متمدن ترین حکومت کے بحریہ کے لیے وبالِ جان بن گیا تھا تو اسے حیرت ہوتی ہے۔ مختصر مدت، بالکل نیا تجربہ جس سے عربوں کو چنداں مناسبت نہ تھی، وہ اس خوبی سے پہلے ہی امتحان میں کامیاب ہوگیا، یہ ایک عجوبہ تھا۔ اس سے جہاں اس عہد کے مسلمانوں کی عزیمت معلوم ہوتی ہے وہاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت کا بھی گہرا نقش دل میں بیٹھ جاتا ہے کہ امورِ جہاں بانی کا کوئی گوشہ ان کی فکر کے لیے اجنبی نہ تھا۔ ہر تعمیری شعبے میں وہ اپنی قائدانہ صلاحیتیں اس طرح بروئے کار لاتے تھے کہ گویا بس اسی کام کے لیے بنے ہوں۔

بحری جہاد کے لیے خلافتِ اسلامیہ کو اس وقت تیار کرنا مشکل تھا۔ سیوطی رحمہ اللہ جیسے مورخوں کی عنایت سے لطیفہ مشہور ہے اور بالکل غلط کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بحریہ مرتب کرنے کی اجازت مانگی تو انھوں نے والیِ مصر سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ سمندر کی کیفیت لکھ بھیجیں۔ ان کا جو جواب بیان کیا جاتا ہے وہ ادبِ عربی کا شہ پارہ ہے۔ فرماتے ہیں:

”إني رأيت خلقاً كبيراً يركبه خلق صغير، إن ركن خرق القلوب وإن تحرك أزاغ العقول. يزداد فيه اليقين قلة والشك كثرةً، هم فيه كدود على عود. إن مال غرق، وإن نجا برق“[1]

[1] تاريخ الخلفاء (ص: ٦٠) طبع مصر

''میں نے ایک بڑی مخلوق دیکھی (یعنی سمندر) جس پر ایک چھوٹی مخلوق سوار ہوتی ہے (یعنی جہاز)، اگر لنگر ڈالے ہو تب بھی دل خوف زدہ رہیں اور اگر حرکت کرے تو عقلیں زائل ہو جائیں۔ یقین ہے کہ ہر آن کم ہوتا جاتا ہے اور شک ہے کہ گھڑی گھڑی بڑھتا رہتا ہے۔ ان کا علم یہ ہوتا ہے جیسے لکڑی پر کیڑا اچمٹا ہو۔ (لکڑی) جھکے تو (کیڑا) ڈوب جائے اور نجات پائے تب بھی دہشت زدہ رہے۔''

علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ خط پڑھ کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حق کے ساتھ بھیجا! میں کبھی کسی مسلمان کو سمندر میں اترنے نہیں دوں گا۔'' ہمارے نزدیک یہ محض ایک لطیفہ ہے جس میں صداقت کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید جس قوم کے ہاتھ میں ہو وہ سمندر اور جہاز کی کیفیت سے بے خبر نہیں رہ سکتی۔ پھر مدینہ طیبہ سے سمندر اتنی دور نہ تھا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کے احوال سے اجنبی ہوں۔ شام کے قافلے بسا اوقات ساحلِ بحر ہی کی راہ مدینہ سے گزرتے تھے۔ اس کے علاوہ عربوں کو جاہلیت کے زمانے میں بھی بحری سفر کا تجربہ تھا۔ خود پہلی ہجرت بذریعہ بحری سفر حبشہ کو ہوئی تھی۔

پھر یہ بات غور طلب ہے کہ بحریہ بنانے کی اجازت طلب کرتے ہیں والیِ شام سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سمندر کی کیفیت پوچھی جاتی ہے والیِ مصر سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ سے۔ حالانکہ تاریخِ اسلام میں خود آپ کی شخصیت وہ ہے کہ آپ نے بحیرۂ روم اور بحرِ قلزم کو ملانے کے لیے نہر بنانے کا منصوبہ تیار کیا تھا اور اس سے پہلے دریائے نیل اور بحرِ قلزم کو ایک نہر کے ذریعے ملا کر تجارتی جہازوں کی آمدورفت کا انتظام کر چکے تھے۔ (الفاروق، ص: ۳۸۲، طبع ملتان)

پھر ان پر سمندر کا کیا خوف ہوتا؟ اس لیے جس سیاسی مصلحت سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بحریہ کھولنے کی اجازت نہیں دی، اسی مصلحت کے تحت نہر بنانا بھی

ملتوی کرا دیا۔ موجودہ نہر سوئیز اسی ابتدا کی انتہا ہے۔ ان دونوں منصوبوں پر عمل درآمد کی اجازت نہ دینے کی وجہ صرف سیاسی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو بحری جنگ کا تجربہ نہیں تھا اور خشکی پر ان کی مہمیں اتنے وسیع پیمانے پر ہو رہی تھیں کہ نیا بحری محکمہ کھولنا موجودہ وسائل کے تحت مشکل نظر آ رہا تھا، ورنہ مسلمانوں کی سی صاحبِ عزیمت قوم کے لیے جو اللہ کے واسطے جان ہتھیلی پر لیے پھرتی تھی، یہ تجربہ اتنا ہولناک نہیں ہو سکتا تھا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے عظیم ترین فرماں روا اور کوہِ استقامت، ایسی زبردست قسم کھا کر جہاد فی سبیل اللہ کی ایک اہم راہ مسلمانوں پر بند کر دیتے۔

بات صرف وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت خشکی کی مہمات جاری تھیں اور نیا محاذ کھولنا مشکل تھا، کیوں کہ اس کے لیے بالکل دوسری قسم کے انتظامات کرنے پڑتے اور تربیت کا طریقہ بھی نیا ہوتا، ویسے سب مسلمان جانتے تھے کہ انھیں وقت آنے پر بحری جہاد شروع کرنا ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

حضرت امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مبارک عہد میں مال و دولت کی فراوانی ہوئی تو مسلمان اس قابل ہو گئے کہ بحری جہاد کی مستقل مد قائم کریں۔ لوگ کہتے ہیں اور غالباً ان کا مقصد یہ ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قلب پر سمندر کا ہول دکھائیں کہ آپ نے بحریہ کی اجازت اس شرط پر دی تھی کہ کسی پر جبر نہ کیا جائے۔ صرف وہی لوگ بھرتی ہوں جو اپنی خدمات رضا کارانہ پیش کریں۔ یہ خیال اور اس کے تحت جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ بھی غلط ہے۔ جنگی ضروریات کے لیے مسلمانوں پر جبر کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ امیر المومنین کا ایک اعلان کافی ہوتا تھا کہ فلاں مہم پر فوج جانی ہے اور لوگ خود بخود حاضر ہو جاتے تھے۔ تمام فوجی خدمت رضا کارانہ تھی۔ لہٰذا بحریہ کے متعلق آپ کا یہ فرمان بھی محض دستور کے مطابق تھا۔ سمندر کے خوف کو اس میں مطلقاً کچھ دخل نہ تھا۔

اس ذیل میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جوں ہی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بحریہ

کے انتظامات مکمل کر کے قبرص کی طرف پیش قدمی کی تو والیِ مصر سیدنا عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ [1] بن ابی سرح نے بھی پوری امداد دی اور خود ایک فوجی دستے کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہوئے، حالانکہ آپ اس وقت افریقہ کی فتوحات میں مشغول تھے۔ گویا بحری جنگ کا سلسلہ نہایت عزیمت کے ساتھ شروع کیا گیا اور یوں قبرص کی پہلی مہم سر ہوئی۔

اسے اگر ایک طرف بحریہ کا عظیم کارنامہ کہا جا سکتا ہے تو دوسری طرف یہ سیاسی اور عسکری فکر کا بھی شاندار نمونہ ہے۔ جزیرے پر مکمل قبضے کے معنی ہوتے محاذِ جنگ کو قسطنطنیہ کے بہت قریب کر دینا اور یہ بالکل نئے تجربے کے تحت اطمینان بخش بات نہ ہوتی۔ دوسرے قبرص کی رعایا پر تسلط کے لیے انتہائی انتظامات کی ضرورت پڑتی جو اس وقت کی مشغولیتوں کی بنا پر آسان کام نہ ہوتا۔ پاک ہے وہ ذات جس نے شام کی ولایت کے لیے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جیسی عظیم اور صاحبِ تدبیر شخصیت کو منتخب فرمایا۔

اس بحری جہاد کا منظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا تھا اور آپ نے اس پر فخر کیا تھا (صحیح بخاری: ۴/۹۵، طبع مصر) مسلمان اس غزوے کا ذوق وشوق سے انتظار کر رہے تھے، کیوں کہ اس میں شریک ہونے والوں کو جنت اور رضائے الٰہی کی بشارت دی گئی تھی۔ اس

---

[1] عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ماں جائے بھائی تھے اور بنی عامر بن لؤی سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور امان طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امان دیدی۔ ان کی جہادی مساعی بے شمار ہیں۔ فتوحاتِ مصر میں ان کی نمایاں خدمات تھیں۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو مصر کا گورنر بنا دیا تھا۔ اپنی گورنری کے زمانے میں بہترین خدمات انجام دیں جس میں فتح قبرص میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بھرپور مدد بھی شامل ہے۔ یزید بن ابی حبیب کا قول ہے کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ رملہ گئے، صبح کے قریب یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! میرا آخری عمل صبح کی نماز بنا دے۔ چنانچہ وضو کر کے نماز پڑھی، دائیں طرف سلام پھیرنے کے بعد بائیں جانب سلام پھیرنے ہی لگے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کر لی۔ ان کا انتقال خلافتِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخری سال ۵۹ھ میں ہوا۔ (الإصابة في تمييز الصحابة، ج ۳، ترجمة عبد الله بن سعد بن أبي سرح رضي الله عنه)

حدیث کو ہم ان شاء اللہ تعالیٰ غزوۂ قسطنطنیہ کے تحت نقل کریں گے، کیوں کہ اس غزوے کے شرکا پر بھی نبی ﷺ نے فخر کیا ہے اور ان سب کے لیے بھی مغفرت کی بشارت دی ہے۔ ان دونوں غزوات کا ایک ایک سپاہی جنتی ہے اور سب پر دوزخ حرام ہے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ امارت میں بحری جہادوں کا جو سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس میں سے ایک بہت بڑا معرکہ ۳۱ھ میں پیش آیا۔ قسطنطین شاہِ روم نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے ایک عظیم الشان بیڑہ تیار کیا جس میں پانچ سو کے قریب بڑے بحری جہاز تھے اور تمام آلاتِ حرب استعمال کے لیے لائے گئے تھے، چونکہ خود قسطنطین اس بیڑے کی قیادت کر رہا تھا، لہٰذا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بہ نفسِ نفیس اس کے مقابلے پر نکلے۔ بیڑے کی کمان سیدنا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ جب نصرانی اور مسلم بیڑے آمنے سامنے ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے پیغام دیا گیا کہ باہم امن رہے، تا آنکہ دونوں فوجیں ساحل پر اتریں اور خشکی پر لڑیں اور وہ جنگ فیصلہ کن ہو۔ مگر نصرانیوں نے کہا کہ ہم سمندر میں لڑیں گے۔ چنانچہ مسلمان اس پر راضی ہو گئے اور اتنی سخت جنگ ہوئی کہ بقول راوی "رجعت الدماء إلى الساحل" (کشتوں کا خون ساحل تک بہتا ہوا نظر آیا)۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور قسطنطین شکست کھا کر پسپا ہوا۔ (عرجون: عثمان بن عفان، طبع مصر، ص: ۲۱۶۔۲۱۷)



زمانۂ فتن

خلافتِ اسلامیہ اپنے عروج پر تھی۔ ایران جیسی بہت بڑی مخالف طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ یہ وہ طاقت تھی جو عہدِ نبوی ہی سے اسلام کے خلاف عملی کارروائیاں کر رہی تھی۔ مدعیانِ نبوت کا ان علاقوں میں کھڑا ہونا جو ایران کے زیرِ اثر تھے، ایسی بات نہیں جس سے آنکھ بند کی جا سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیفہ رسول اللہ ﷺ کی برکت وعزیمت کے ذریعے اس اندرونی اختلال کا خاتمہ کر دیا۔ پھر سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اموی اور سیدنا عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ بن کریز عبشمی جیسے قائدینِ کرام نے ایران کی قسمت پر آخری مہر لگا دی اور یوں فاتحِ قادسیہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جن کارناموں کی ابتدا کی تھی وہ عہدِ عثمانی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئے۔

ادھر بحری محاذ کھل جانے سے دوسری بڑی طاقت، یعنی بازنطینی حکومت کے لیے اسلام دردِ سر بن گیا۔ رومیوں کے ساتھ بھی عہدِ نبوی ہی سے چپقلش شروع ہو گئی تھی اور ہر میدان میں مسلمان اسے شکست پر شکست دے رہے تھے۔ مثلاً عرب، مصر اور شمالی افریقہ سے اس کا تسلط بالکل اٹھ گیا تھا۔ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسلام کی طاقت کو دنیا میں سب سے اونچا کر دیا تھا اور امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے ارتقا کا یہ سلسلہ پوری قوت سے جاری رکھ کر اسلام کی طاقت کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ اہتمام بحری محاذ کھل جانے سے عالمِ کفر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اہلِ کفر پر مادی اور روحانی، ذہنی اور عملی، سیاسی اور معاشی، انفرادی اور اجتماعی ہر اعتبار سے شکست خوردگی طاری تھی۔ اسلام

اور مسلمانوں کے علاوہ اقوامِ عالم کے لیے کوئی موضوعِ سخن نہ تھا۔ لہٰذا اہلِ کفر وطغیان میں جو مواد پک رہا تھا وہ یہودیوں اور مجوسیوں کے باہم مل جانے سے پھوٹ پڑا۔

ان لوگوں پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ کھلے میدان میں وہ اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے، استدلال اور وجدان دونوں کا قلوب پر غلبہ ہو رہا ہے۔ انھیں نظر آ رہا تھا کہ بہت قلیل مدت میں اہلِ عالم کا دین اسلام ہو جائے گا۔ نسل اور وطن اور قومیت کی داستانیں پارینہ ہو جائیں گی۔ ذہنی غلامی اور معاشی وسائل کی اجارہ داری کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ پیدائشی برتری کا تصور خواب وخیال ہو جائے گا۔ سوائے ایمان باللہ اور عملِ صالح کے زندگی کا کوئی معیار ہی نہیں رہے گا۔ اس لیے ابلیس کے یہ کارندے چور دروازے سے داخل ہوئے اور اسلام کا جامہ پہن کر امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ کے بے نظیر عمال کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ دعوتِ محمدیہ کے یہی مخلص علمبردار تو تھے جو اُن آنکھوں میں کھٹکتے تھے، کیوں کہ انھوں نے اہلِ کفر وشرک کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔

شام کے علاوہ باقی ہر جگہ سبائیوں کو نو مسلموں میں سے اپنے مطلب کے آدمی مل گئے، حتی کہ بعض صلحا بھی ان کی تلبیس کا شکار ہو گئے۔ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے جب عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں کو اصلاح کے لیے شام بھیج دیا تھا تو خود وہ بھی وہاں اپنی کارروائی کے لیے آن موجود ہوا۔ شام کے کسی شخص کو اپنا ہم نوا نہ بنا سکا تو اس نے ایک نئی چال چلی۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

یا أبا ذر! ألا تتعجب من معاوية يقول: المال مال الله، إلا أن كل شيء لله، كأنه يريد أن يحتجبه دون المسلمين ويمحو اسم المسلمين“

”اے ابو ذر! کیا آپ کو اس پر تعجب نہیں ہوتا کہ معاویہ اس مال کو اللہ کا مال کہتے ہیں۔ ویسے ہے تو ہر چیز اللہ ہی کی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں

کے بجائے خود اس پر قابض ہو کر مسلمانوں کا نام مٹا دینا چاہتے ہیں۔''

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ یہ سن کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور دریافت کیا: ''کیا بات ہے جو آپ مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کہتے ہیں۔'' انھوں نے فرمایا: ''ابو ذر! اللہ آپ پر رحم کرے۔ کیا ہم اللہ کے بندے نہیں؟ کیا یہ مال اس کا نہیں؟ یہ مخلوق اس کی نہیں! اور کیا حکم صرف اسی کا نہیں چلتا؟'' فرمایا: ''بہرحال اب ایسا مت کہا کیجیے گا۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مال اللہ کا نہیں، البتہ اسے مسلمانوں کا مال کہا کروں گا۔''

یہ قصہ ختم ہوا تو پھر ابن سبا نے سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ کو تاکا اور یہی بات ان سے بھی کہی۔ یہ نہ سوچا کہ زاہد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عالم وفقیہ اور قاضی بھی تو ہیں جو بات کی تہہ تک پہنچنا جانتے ہیں۔ انھوں نے چھوٹتے ہی فرمایا: ''تو کون ہے؟ مجھے تو یہودی معلوم ہوتا ہے۔'' وہاں سے ناامید ہو کر ایک تیسرے زاہد سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا۔ انھوں نے اسے پکڑ لیا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے جا کر فرمایا: ''بخدا یہی ہے وہ شخص جس نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔'' تب اُسے شام سے نکالا گیا۔

اس شخص کی چال دیکھنی چاہیے کہ شام جیسے پرامن، منظم اور خوش حال علاقے میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے کامل حکمران کے خلاف کیا شوشہ چھوڑا ہے۔ اس نے سب سے پہلے تین ایسے بزرگوں کو تاکا جو زہد میں ممتاز تھے۔ ان میں دو جو فقیہ تھے وہ اس کی چال سمجھ گئے، لیکن تیسرے اس کے کہنے میں آ گئے۔ اس حیثیت سے نہیں کہ ان پر اس کا جادو چل گیا، بلکہ اس اعتبار سے کہ جو ان کا حال تھا اسی کے مطابق ان سے بات کی۔

لوگوں نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کا نام اچھالنے کی بہت کوشش کی ہے۔ کچھ نے مفتریات کے ذریعے فتنوں کو ہوا دینے کے لیے اور کچھ نے موجودہ دورِ اشتراکیت میں یہ کہہ کر کہ اسلام میں وہ سب سے پہلے اشتراکی تھے۔ (نعوذ باللہ من ذلك) ان کے

مذہب کو اشتراکیت سے کیا علاقہ؟ ان کا تو وہ طرزِ عمل تھا جو امتِ محمدیہ کے اصحابِ ترک و تجرید نے ہمیشہ اختیار کیا اور کرتے رہیں گے۔

بہرحال دکھانا یہ مقصود ہے کہ سبائیوں کی ریشہ دوانیاں کیسی ہمہ گیر تھیں۔ اب اصحابِ شعور کو سوچنا چاہیے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کوئی خلیفہ یا حاکمِ اعلیٰ تھے کہ جو چاہیں سو کریں۔ بیت المال کے متعلق جو طرزِ عمل آپ کا تھا وہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ سے پہلے دونوں ائمہ کے دستور کے مطابق تھا۔ خود اللہ تعالیٰ نے انفال وغنیمت کو اپنا مال بتایا ہے اور اس کے متعلق احکام متعین فرمائے ہیں جن پر عہدِ نبوی سے عمل درآمد ہوتا چلا آ رہا تھا اور جن کے امور کے گواہ اور کارکن وہ سب حضرات تھے جو زمین پر اللہ کے گواہ ہیں۔

ابو ذر رضی اللہ عنہ:

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ بھی من جملہ ان چند بزرگواروں کے ہیں جن پر قسم قسم کے جھوٹ بولے گئے ہیں، حتی کہ ان کا وجود ہی افسانوی بنا دیا گیا ہے۔ مسعودی وغیرہ نے جو طومار باندھا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے درمیانی مناقشات کا جو نقشہ کھینچا ہے تو بالکل عقل کو خیر باد کہہ کر ان روایات پر تنقید کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے اور اگر اس کی ضرورت ہو گی بھی تو امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے احوال کے تحت۔ مناسب ہے کہ جو صاحب تحقیق کرنا چاہیں وہ ''العواصم من القواصم'' ملاحظہ فرمائیں کہ امام ابوبکر بن العربی اور فاضل محشی جناب محبّ الدین الخطیب نے شافی بحث کی ہے۔

البتہ یہاں ان کے مسلک سے بحث کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے درمیان ان بن ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے جب اپنے ''مذہب'' کی تبلیغ بے محابا شروع کر دی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی شکایت بارگاہِ خلافت میں بھیجی تو انھیں شام سے بلا لیا گیا مگر مدینہ آ کر بھی انھوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا، تاآنکہ یہاں کے باشندے ان سے ناراض ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے

مشورے سے انھوں نے ربذہ میں قیام اختیار کیا، جس کے لیے سرکاری طور پر انتظام کر دیا گیا۔ ان کی خدمت کے لیے غلام اور اونٹ بھی دے دیے گئے۔

ان بیان کردہ باتوں میں کچھ جھوٹ ہے اور کچھ سچ۔ سچ بس اتنا ہے کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ چونکہ صاحبِ ترک تھے، لہٰذا ربذہ چلے گئے اور سرکاری خرچ پر وہیں رہتے رہے۔ ویسے وہ مدینہ طیبہ آتے جاتے رہتے تھے۔ جھوٹی باتیں وہ ہیں جو مال کے بارے میں ان کے متعلق کہی جاتی ہیں اور طرح طرح کی رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جیسے کوئی ناصح کھڑا ہو اور بد راہ لوگ اس کی بات سنیں۔ یہ سب مکروہ فضا محض شر انگیزی کے لیے پیدا کی گئی ہے، تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت دلوں سے کم ہو اور اس عہد کے معاشی نظام کے متعلق لوگوں کے دلوں میں بالکل خلافِ واقعہ تصورات جاگزیں ہو جائیں۔

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کے متعلق مسعودی اور بعد کے لوگ جن میں خضری وغیرہ جیسے اصحابِ فہم بھی شامل ہیں، ایسی باتیں کہتے ہیں کہ اگر انھیں سب کو سچ باور کر لیا جائے تو آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کو مطلقاً قرآن فہمی کی صلاحیت نہیں تھی۔ یہ بات اس ذات گرامی کی بابت کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اصحاب میں تھے۔ بس اتنی بات ہے کہ آپ پر حال کا غلبہ تھا اور چاہتے تھے کہ آپ کی طرح سب صاحبِ ترک ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کے نزدیک تمام مال دار صحابہ دین کھو بیٹھے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یہ حضرات اپنے پاس کچھ نہ رکھیں اور اپنی سب دولت تقسیم کر دیں۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی بات پر چلی تھی، ان کی حجت یہ آیت تھی جس کو وہ بار بار پڑھا کرتے تھے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [التوبة: ٣٤]

''اور جو لوگ سونا چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں

خرچ نہیں کرتے، تو انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔''

آیت واضح ہے کہ جو لوگ اللہ کے نام پر لوگوں سے روپیہ اکٹھا کریں اور جس غرض سے اہلِ خیر نے انھیں دیا، اس پر خرچ کرنے کے بجائے اسے اپنا ذاتی مال بنا لیتے ہیں اور یوں مقاصدِ الٰہی بر لانے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، یعنی اللہ کی راہ میں اُسے خرچ نہیں کرتے تو اُن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس آیت کو ان مسلمانوں پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے جو حلال طریقے پر کمائیں اور حدودِ الٰہی کے مطابق خرچ کریں؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾

[بني إسرائيل: ٢٦]

''اور رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو اور مت بے جا خرچ کر، بے جا خرچ کرنا۔''

پھر فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿29﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا﴾ [بني إسرائيل: ٢٩۔٣٠]

''اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا کر لے اور نہ اسے کھول دے، پورا کھول دینا، ورنہ ملامت کیا ہوا، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے گا۔ بے شک تیرا رب رزق فراخ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے، بے شک وہ ہمیشہ سے اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔''

یعنی بخل کرو گے تو لوگ طعنہ زن ہوں گے، بری طرح لٹاؤ گے تو پھر حسرت سے لوگوں کا منہ تکا کرو گے، لہٰذا جب کسی کی مدد کرو تو اس کا ظرف اور اپنی سکت دیکھ لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھاری فراخ دلی سے بدراہ ہو جائے یا تم اپنی کنجوسی کے سبب لوگوں کی نگاہ سے

گر جاؤ۔ پھر فرماتا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾

[الفرقان: ٦٧]

''اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور (ان کا خرچ) اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے۔''

یہ احکام ہو گئے معمولی اور عام حالات میں، لیکن اگر ہنگامی اور غیر معمولی احوال ہوں تو اس کے احکام دوسرے ہیں، مثلاً:

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢١٩]

''اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں، کہہ دے جو بہترین ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم غور وفکر کرو۔''

یہ آیت جہاد اور معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں ہے۔ یعنی احوال کے مطابق قومی ضروریات کا خیال کر کے جان و مال کی قربانی کی جائے۔ ضرورت کا تعین اعتباری چیز ہے اور اس کا انحصار حالات پر ہے۔ عام طور پر تو آدمی اپنے اخراجات و خیرات وصدقات میں توازن قائم رکھے، لیکن بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی کو بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اگر حکومتِ اسلامیہ کوئی معیار قائم کر دے اور قومی ضروریات کے مطابق یہ تحدید کر دے کہ اس سے کم اور اس سے زیادہ کسی کی آمدنی نہیں ہوسکتی، تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس مقررہ معیار سے جو کچھ زائد ہو وہ بحقِ سرکار لے لیا جائے۔ اگر مزید احوال نازک ہوں تو زندگی خرچ کرنے میں ہے۔ جتنا بھی خرچ آدمی کے امکان میں ہو اس سے دریغ نہ کرے، بلکہ سب کچھ دے دینے کا موقع ہو تو اس وقت بھی نہ ہچکچائے:

﴿ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا ۚ

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [البقرۃ: ۱۹۵]

’’اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔‘‘

عام حالات میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا موجبِ ہلاکت ہے اور بوقتِ ضرورت خرچ نہ کرنا بھی۔ اس لیے احسان کی راہ اختیار کرنی چاہیے کہ فراستِ ایمانی کام میں لائی جائے کہ یہ وقت ہاتھ روکنے کا ہے یا کھولنے کا۔ اس طرح ہلاکت سے نجات ملے گی۔ احسان کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بطور خود آدمی رضا کارانہ اپنی دولت پیش کرے۔ حکومت کو جبراً ضبط کرنے کی ضرورت نہ ہو، متفق علیہ بلکہ متواتر حدیث صحیح کے مطابق نبی کریم ﷺ نے احسان کی یہی تعریف کی ہے:

((أَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ))

’’اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، ورنہ کم از کم یہ تصور ضرور ہو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔‘‘

بندۂ مومن جب اپنے ضمیر کی آواز سنے گا اور اپنی ملت کے احوال کا واقعی اندازہ لگائے گا تو خود بخود اس کو معلوم ہو جائے گا کہ وقت کی ضروریات کیا ہیں اور اسے کس حکمِ خداوندی کی تعمیل کرنی چاہیے۔ ہر قوم پر ایسے ہنگامی حالات آتے ہیں جہاں افراد سے انتہائی قربانی طلب کی جاتی ہے۔ اس وقت جو شخص کترانے کی کوشش کرے گا وہ ملت کا غدار ہے اور جبراً اس کا تمام مال و متاع ضبط کر لیا جائے گا۔ ایسی صورت میں خدائے عزوجل سے اجر کی توقع حماقت ہوگی۔ اجر اسی پر ہے جو آدمی رضا کارانہ اپنی بندگی اور ایمان کا ثبوت دے کر اپنا سب کچھ اللہ کے لیے قربان کر دے۔

ان تمام آیات کی موجودگی میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر عارف صحابی کے متعلق جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں وہ کسی درجے میں سچی

ہوں۔ ان کا غالب حصہ جھوٹا ہے، افتراء محض ہے۔ باقی امور تلبیس ہے اور کچھ کا کچھ کر کے دکھایا گیا ہے۔ صرف اتنا باور کیا جا سکتا ہے کہ ذاتی طور پر آپ اپنے احوالِ قلبی کے تحت اسے پسند کرتے تھے کہ کم سے کم ضرورت رکھیں۔ امتِ محمدیہ میں اصحابِ ترک کا یہی دستور رہا ہے۔ انھیں لذت ہی اس میں ملتی ہے اور ان کی روحانی ترقی کا مدار ہی اس پر ہوتا ہے، لیکن یہ افراد کا ذاتی رجحان ہے، اسے شعارِ قومی نہیں بنایا جا سکتا۔ امت کی اقتصادی حالت درست ہو اور دولت کی تقسیم متوازن اور اس کے باوجود لوگ اپنا معیارِ زندگی بلند نہ کریں اور نعمائے الٰہی سے لطف اندوز نہ ہوں تو کفرانِ نعمت ہے اور قرآن کی برکتوں سے اپنے آپ کو جان بوجھ کر محروم کرنا ہے، چونکہ یہ امتِ مصطفیٰ ہے، اس لیے اس کی اکثریت کو مرفہ حال ہونا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو کمزور بتایا ہے جو فرار کی راہیں اختیار کریں اور اپنی ہستیوں کو مادی مشقتوں میں ڈالیں۔ چنانچہ صحیح حدیث کے مطابق خود سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کو بھی آپ ﷺ نے بتایا کہ تم ضعیف ہو، لہٰذا زاویہ نشینی اختیار کر لینا۔ دعوتِ محمدیہ کے پیرووں کو ''کنجِ عافیت'' میں بیٹھنے سے کیا مطلب، وہ تو اس دنیا میں امامت کے فرائض ادا کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، انھیں تو ہر شعبۂ زندگی کی آبیاری کرنی ہے اور ہر زاویۂ نگاہ سے اقوامِ عالَم کو نمونہ بن کر دکھانا ہے کہ زندگی یوں بسر کی جاتی ہے، بلکہ جس طرح بعض کمزور طبائع کی ترقی گوشہ نشینی میں ہوتی ہے، اسی طرح بعض کی ترقی کا انحصار ہی اس پر ہوتا ہے کہ وہ خوب ناز ونعم میں پرورش پائیں، سیر کریں اور سفر پر رہیں۔ غرض یہ ہے کہ زندگی اپنی اصل میں انفرادی ہے اور ہر شخص تن تنہا اپنے پروردگار کے سامنے جواب دہ ہے۔ کوئی ایک طریقہ سب کے لیے وضع نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: ١٦٣]

''یہ لوگ اللہ کے نزدیک مختلف طبقے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے آمد وخرچ کے حدود مقرر فرما رکھے ہیں۔ اُن حدود کے اندر رہ کر آدمی

بالکل آزاد ہے کہ جتنی دولت چاہے کمائے اور جتنی مناسب سمجھے خرچ کرے۔ معیوب و مردود ہے حد سے تجاوز کرنا۔ یعنی حرام و مشتبہ طریقوں سے دولت کمانا اور حرام و مشتبہ طریقوں پر خرچ کرنا۔ فی سبیل اللہ کمائے اور فی سبیل اللہ خرچ کرے۔ ارشادِ حق ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا﴾ [طٰهٰ: ١١٢]

''اور جو شخص اچھی قسم کے اعمال کرے اور وہ مومن ہو تو وہ نہ کسی بے انصافی سے ڈرے گا اور نہ حق تلفی سے۔''

یہ خوش خبری دنیا و آخرت دونوں کے لیے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ [طٰهٰ: ١٢٤]

''اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔''

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ حرام کی دولت جمع کرتے ہیں ان کی زندگی ہمیشہ تلخ رہتی ہے اور جو حرام پر خرچ کرتے ہیں ان کی بھی۔ آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جس کی آمدنی حرام کی ہے اور اس کی زندگی حرام بنی ہوئی نہ ہو۔ رات کی نیند اڑ جانا یا ہضم خراب رہنا تو ادنیٰ عذاب ہے۔ پھر ہے اولاد اور اس کی طرف سے ہر وقت کی کوفت۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو حرام طریقے پر اپنی دولت لٹاتے ہیں کہ چہرے مسخ ہو جاتے ہیں اور احوال دگرگوں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں جتنی برائیاں پیدا ہوئی ہیں، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ دولت مالداروں ہی میں گشت کرتی رہتی ہے اور اس طرح ایک مخصوص طبقے کے علاوہ باقی لوگ پریشان خاطر رہتے ہیں۔ اسی سے اخلاقی جرائم بڑھتے ہیں۔ یہ اللہ کی یاد کو دلوں سے بھلا دینے کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے اسلام میں وہ سب طریقے حرام ہیں جو دولت کو مالداروں ہی

میں محصور کر دیں۔ نظامِ اسلامی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دولت کو دست گرداں رکھے۔ حلال کمانے کی آزادی کے ساتھ ساتھ اس نے ایسے طریقے مقرر کر دیے ہیں کہ آدمی کی دولت مفید مقاصد کے لیے تقسیم ہوتی رہے:

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ [الحشر: ۷]

''تاکہ وہ تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ ہو۔''

اشتراکی نظام کی خرابی یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا، جب تک انفرادی آزادی ختم نہ کر دی جائے اور افراد پر ہر وقت اسٹیٹ کا خوف غالب نہ رہے۔ اسٹیٹ عبارت ہوتی ہے چند آدمیوں سے۔ یہ سرمایہ داری سے بھی بدتر چیز ہے کہ وہاں معیشت اپنے ہاتھ میں نہیں رہتی اور یہاں دل و دماغ اور زبان مفلوج ہو جاتی ہے۔

لیکن نظامِ اسلامی میں اسٹیٹ کے بجائے اللہ کا خوف ہے جو ظاہر و باطن سب جانتا ہے اور جس کے سامنے آدمی ہر قول وعمل وفکر کے لیے جواب دہ ہے اور جس کی پکڑ سے مرنے کے بعد بھی چھٹکارا نہیں۔

اسی لیے حدودِ الٰہی کی جو کامیاب رعایت اسلامی نظام میں میسر ہے وہ کسی دوسرے نظام میں میسر نہیں۔ دولت میں کبھی بھی کسی غیر اسلامی نظام کے ذریعے وہ توازن پیدا نہیں ہو سکتا جو آدمی کو طبعاً شکر گزار بندہ بنائے۔ اللہ کا بندہ اور بندوں کا بھائی ہونے کا جذبہ ہی انسان کی زندگی میں زندہ و پایندہ توازن قائم رکھنے والی چیز ہے جو فرد کی ترقی وتحفظ کی ضامن ہے اور جو ہر مادی خوف سے نجات دلا کر دنیوی و اخروی نعمتوں سے صحیح معنی میں لطف اندوزی کا موقع دیتی ہے۔ یہ موقع ہر مسلمان کو نصیب ہوسکتا ہے، بلکہ مملکتِ اسلامیہ میں رہنے والے ہر فرد کو، بشرطیکہ حکومت کی بنیاد کتاب وسنت پر ہو اور حدودِ الٰہی کی پاسداری کی جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب تھا وہ معاویہ رضی اللہ عنہ ہوں یا ابوذر رضی اللہ عنہ۔ گمراہ لوگ کچھ بھی کہتے پھریں، وہ اپنے عمل سے دنیا کو سنوار گئے اور امت کا منہاج درست کر گئے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اجتماعی زندگی کی امامت فرما رہے تھے اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کی رہنمائی ان حضرات کے لیے تھی جو زندگی کی تگ و دو میں سینہ سپر ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں:

﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ [بني إسرائيل: ٨٤]

''کہہ دے ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے۔''

اپنی اس افتادِ طبع کا حال سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے خود بیان کر دیا ہے۔ ادنیٰ توجہ سے مسئلہ خود حل ہو جائے گا کہ وہ اپنے حال سے مغلوب تھے اور اسی لیے چاہتے تھے کہ ساری دنیا انہی کی راہ اختیار کرے۔ اصحابِ حال جو اپنے احوالِ قلبیہ سے مغلوب ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ننگی تلوار بن جاتے ہیں، لیکن جن کی تربیت بطریق سلوک ہوتی اور حبِ علمی کے ذریعے ان کی تکمیل کی جاتی ہے اُن پر فیضانِ نبوت ہوتا ہے اور یہ ولایت سے بدرجہا بلند مقام ہے۔ اکابر صحابہ جن سے دین لیا جاتا ہے وہ کتاب اور سنت اور منشائے نبوت و رسالت کی پیروی کرتے ہیں، کیوں کہ ان کے سپرد ہوتی ہے تربیتِ خلق۔

''عن زيد بن وهب قال: مررت بالربذة فإذا أنا بأبي ذر رضي الله عنه فقلت له: ما أنزلك منزلك هذا؟ قال: كنت بالشام فاختلفت أنا و معاوية في الذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله. قال معاوية: نزلت في أهل الكتاب، فقلت: نزلت فينا وفيهم. فكان بيني وبينه في ذاك، وكتب إلى عثمان رضي الله عنه يشكوني، فكتب إلي عثمان أن أقدم المدينة فقدمتها، فكثر علي الناس حتى كأنهم لم يروني قبل ذلك، فذكرت ذلك لعثمان، فقال لي: إن شئت تخليت فكنت قريبا، فذاك الذي أنزلني هذا المنزل، ولو أمرّوا علي حبشيا لسمعت وأطعت''[1]

[1] صحيح البخاري (١/ ٢٤٤) باب وجوب الزكاة، طبع مصر.

''زید بن وہب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں ربذہ کی طرف گزرا تو دیکھتا کیا ہوں کہ وہاں (سیدنا) ابوذر رضی اللہ عنہ تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے عرض کی: یہاں آپ کے قیام کا سبب کیا ہوا؟ فرمایا: ''میں شام میں تھا، وہاں میرا اور (سیدنا) معاویہ رضی اللہ عنہ کا اختلاف ان لوگوں کے بارے میں ہو گیا جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ میں نے کہا: اس کا نزول ہمارے اور ان دونوں کے لیے ہوا ہے۔ میری اور ان کی رد و کد بس اسی مسئلے میں تھی۔ انھوں نے (سیدنا) عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں میری شکایت لکھ بھیجی۔ (سیدنا) عثمان رضی اللہ عنہ نے مجھے ایک خط لکھا کہ مدینہ آ جاؤ۔ چنانچہ میں چلا آیا، یہاں لوگ مجھے ایسا ہجوم کر کے دیکھنے آتے تھے کہ جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ میں نے اس بات کا تذکرہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا۔ انھوں نے فرمایا: ''یہاں سے اگر آپ ہٹنا چاہیں تو کہیں قریب ہی جا رہیے۔'' یہ سب ہوا جو میں یہاں مقیم ہوں۔ میرے اوپر اگر کسی حبشی کو بھی یہ لوگ حاکم بنا دیں گے تو میں اس کی بات سنوں گا اور اطاعت کروں گا۔''

لوگوں نے عجیب و غریب طریقے پر اس بات کو بیان کیا ہے اور مسعودی نے خوب خوب اس میں رنگ آمیزی کی ہے، لیکن صحیح بخاری کی یہ حدیث وضاحت کر رہی ہے کہ سادہ سا معاملہ تھا۔ ایک صاحبِ حال شخص کے دل میں ایک بات اتر گئی تھی اور اسی پر انھیں اصرار تھا۔ اس لیے امامِ وقت نے انھیں مشورہ دیا کہ لوگوں سے الگ ہو کر بیٹھ جائیں۔ اسی میں اُن کے لیے عافیت رہے گی۔ اہلِ مدینہ جو انھیں دیکھنے آتے تھے تو اس تعجب کی بنا پر کہ اہلِ کتاب کے ان علما و رہبان کی کج روی اور بددیانتی کے بارے میں جو آیت اتری ہے کہ مصارفِ خیر کے لیے لوگوں سے روپیہ لیتے اور خود کھا جاتے تھے، اس

وعید کو انھوں نے مسلمانوں کے لیے بھی سمجھ لیا جو اللہ و رسول کے حکم کے مطابق کماتے اور خرچ کرتے ہیں، اس پر اتنا غلو ہے اور ان نصوص پر نگاہ نہیں جن سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی واضح سنت موجود ہے۔ چونکہ اصحابِ حال سے بحث کبھی مفید نہیں ہوتی، اس لیے مرشد برحق نے انھیں انزواء کی تلقین کی۔ ویسے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی حق ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں کے لیے بھی ہے جو چندے اور وقف کا مال کھا جاتے ہیں اور ان مقاصد پر خرچ نہیں کرتے جن کے لیے یہ روپیہ انھیں دیا گیا ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو زمین پر اللہ کے گواہ تھے اور میزانِ عدل قائم کرنا جن کا کام تھا، انھوں نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور امت کو ایک ایسے اقتصادی نظام سے روشناس کیا جو دنیا کے ہر نظام سے بہتر ہے، کیوں کہ نہ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں ہیں اور نہ اشتراکی نظام کی، لیکن خوبیاں دونوں کی موجود ہیں اور کامل توازن کے ساتھ۔

شہادتِ امیر المومنین:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے پہلی نگاہ میں سبائیوں کو سمجھ لیا تھا اور جانتے تھے کہ یہ لوگ امت کو کن مصائب میں مبتلا کریں گے۔ صرف ان کا علاقہ تھا جہاں سبائیہ کو قطعاً ناکامی رہی۔ جب ان لوگوں کی شرارتیں حد سے بڑھ گئیں تو امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام عمال کو حج کے موقع پر طلب فرما کر ان کے بارے میں یہ مشورہ کیا۔ سیدنا معاویہ، سیدنا سعید بن العاص اموی اور سیدنا عمرو بن العاص سہمی رضی اللہ عنہم سب نے یہ مشورہ دیا کہ ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے، لیکن حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ان کے حقوق کو ادا کرو اور ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کرو، البتہ اللہ کا معاملہ آ جائے تو بے شک سختی برتو۔'' یہ فرما کر سب کو رخصت کر دیا۔

اگر ان مفسدوں کے دلوں میں ایمان و اخلاص کا شائبہ بھی ہوتا تو اس رحیم و کریم امام کے پاؤں دھو کر پیتے جو اپنے اخلاق کی رفعت اور پدرانہ شفقت میں انبیا کا نمونہ تھا۔ بہر حال اس فیصلے کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ سامنے آیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس نتیجے کو بھی پہلے

سے دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے آپ نے امیر المومنین سے عرض کی تھی کہ آپ شام چلیں اور دمشق ہی کو مستقرِ خلافت بنا لیں، لیکن آپ نے پسند نہیں کیا کہ آخر عمر میں جوارِ نبوی چھوڑیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دوسری تجویز پیش کی کہ شامیوں کی فوج کا ایک دستہ حفاظت کے لیے مدینہ طیبہ بھیج دیں۔ آپ نے اسے بھی منظور نہیں کیا کہ اہلِ مدینہ پر تنگی ہو جائے گی۔ یوں جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ چند شریر النفس دشمنانِ دین و ملت کے ہاتھوں امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ جیسے مقدس و محبوب محترم خلیفہ برحق، اپنے دار الخلافہ میں، احبا و اصدقا کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیے گئے اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ کسی کو گمان نہ تھا کہ حالات اس درجے تک پہنچ جائیں گے۔ انھیں توقع تھی کہ ایمان و اسلام آڑے آئے گا اور یہ لوگ کوئی حرکت ایسی نہ کریں گے جو دنیا و آخرت میں انھیں روسیاہ کر دے۔

مگر ان لوگوں کے سامنے آخرت کب تھی، دین کب تھا اور امت کب تھی۔ یہ تو آئے ہی تھے اس لیے کہ مسلمانوں میں فتنے کا وہ دروازہ کھول دیں جو کبھی بند نہ ہو۔ ہم ان میں سے بعض کے نام اوپر دے چکے ہیں جو اس فتنہ عمیاء کے بانی تھے۔ اس دلگداز حادثے سے تمام بستی غم و اندوہ میں ڈوب گئی اور ان مفسدوں کے خلاف عام نفرت پھیل گئی، لیکن شہر پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا، حتی کہ کسی صحابی یا مدنی کے بجائے غافقی بن حرب اس وقت کا مدینہ کا والی بنا ہوا تھا۔ سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو امیر المومنین کے حکم سے آپ کے محصور ہو جانے کے بعد مسجد نبوی شریف میں نماز پڑھایا کرتے تھے، انھیں امامت سے روک دیا گیا اور خود غافقی نماز پڑھانے لگا۔ مصر اور عراق کے ہزار ہا آدمی شہر میں دندناتے پھرتے تھے، اس لیے فوری کارروائی نہ ہو سکی۔

حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی حفاظت کا پورا انتظام تھا، لیکن آپ نے صراحتاً حکم دے دیا تھا کہ جو شخص آپ کی بیعت پر مستقیم رہنا چاہتا ہے وہ ہتھیار رکھ دے اور گھر بیٹھا رہے، اس لیے سوائے حفاظتی تدابیر کے اور کچھ نہ کیا جا سکا، ورنہ اہلِ مدینہ کے لیے کچھ

دشوار نہ تھا کہ ان لوگوں کو مار بھگائیں۔ اطاعتِ امیر کا جو تصور اس عہد کے مسلمانوں میں تھا اس سے مجبور تھے۔ اور چونکہ خود صاحبِ ایمان وتقویٰ تھے، اس لیے سمجھ رہے تھے کہ ان باغیوں کو بھی اتنے بڑے جرم کی جرأت نہ ہوگی اور افہام وتفہیم سے کام بن جائے گا۔ یہ ہے حقیقی صورتِ حال جسے منافقوں اور بے دینوں نے یوں بیان کیا ہے کہ امیر المومنین کو قتل کرنے پر سب اہلِ مدینہ متفق تھے اور صحابہ کی خواہش تھی کہ باغی لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ امیر المومنین کو شہید کرنے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا، اس تک عربی دماغ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ عرب ذہنیت تو یہ تھی کہ ہجرت کی رات قریش نبی کریم ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیے رہے اور پسند نہیں کیا کہ گھر میں گھس کر سوتے ہوئے آدمی کو قتل کر دیں، وہ لوگ صبح کو گھر میں داخل ہوئے۔ اس لیے وہ کیسے سوچ سکتے تھے کہ مجوسیوں اور یہودیوں کی طرح ایک خالی مکان میں سے یہ قاتل داخل ہو کر حضرت امیر المومنین کو قتل کر دیں گے۔ انھوں نے تو پہرہ دروازے پر لگایا تھا۔

جو لوگ ان افترا پردازوں کے اس بیان سے کسی درجے میں متاثر ہو گئے ہوں، انھیں سوچنا چاہیے کہ امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اگر قریش اور صحابہ میں نامقبول ہوتے یا آپ سے ناگوار حرکات کا صدور ہوا ہوتا تو آپ کی شہادت سے یوں آگ لگ جاتی جیسی لگی۔ پانچ برس تک یہ اختلال ہوتا جو رہا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے امت کی اکثریت اسی طرح منحرف ہوتی جیسی ہوئی؟ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی محبوبیت تو ضرب المثل تھی۔ شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

أُحِبُّكِ وَالرَّحمَانِ حُبَّ قُرَيْشٍ عُثْمَان

”بخدا مجھے تجھ سے اتنی محبت ہے جتنی قریش کو عثمان سے۔“

طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما:

اس حادثۂ فاجعہ سے مجروح تو سب دل تھے، لیکن جن کی یہ حیثیت تھی کہ ان کی

آواز سنی جائے، انھوں نے مناسب سمجھا کہ باغیوں کی سرکوبی کے لیے بڑے پیمانے پر انتظام کیے بغیر کام نہیں بنے گا۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب یہ حضرات باہر نکلیں اور امت کو اس سانحے کی تفصیلات پر مطلع کر کے قومی محاذ قائم کریں۔ چنانچہ سیدنا طلحہ، زبیر، مروان بن الحکم اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہم وہاں سے چل دیے اور مکہ کا رخ کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو امیر المومنین کے حکم سے ازواجِ مطہرات کو لے کر حج کے لیے گئے ہوئے تھے اور آپ کے فرمان کے مطابق حجاجِ بیت اللہ کو تمام حالات سے باخبر کر چکے تھے، وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے کچھ دن بعد مدینہ پہنچے۔ آپ کو راستے میں اس واقعے کی اطلاع ہو چکی تھی۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ سنا تو چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا: ''واللہ! جب تک عثمان کا قصاص نہیں لیا جائے گا چین نہیں آئے گا۔'' اس لیے آپ نے مدینہ کا خیال ترک کر کے مکہ کی راہ لی۔ باقی ازواجِ مطہرات کو بھی سخت صدمہ تھا، زار و قطار رو رہی تھیں اور گو انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا مناسب نہیں سمجھا، پھر بھی وہ سب مکہ واپس ہو گئیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کس پر چھوڑا۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کے محرم نہ ہوتے تو وہ انھیں چھوڑ کر نہیں آ سکتے تھے۔ یہ محرم تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ ام المومنین کے سگے بھائی، یہ محرم تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ام المومنین کے سگے بھانجے جن کے نام پر آپ کی کنیت امِ عبداللہ تھی، یہ محرم تھے۔ سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف، یہ بزرگوار حضرت ام المومنین کے ساتھ تھے، اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو انھیں چھوڑ دینا غیر مناسب نہ تھا۔

عہدِ مرتضوی:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب مدینہ پہنچے ہیں تو اس وقت تک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت

نہیں ہوئی تھی۔ یہ امر متفق علیہ ہے، البتہ لوگ آپ کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ بیّن دلیل ہے کہ وہ تمام روایتیں قطعاً باطل و بے اصل ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ یا سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے طوعاً و کرہاً حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی تھی۔ سبائیہ کو فخر ہے کہ سب سے پہلے بیعت مالک بن الحارث الاشتر نے کی تھی اور یہی صحیح ہے۔[1]

بہر حال ام المومنین کی قیادت میں رائے عامہ کی استواری کے لیے تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس طرح امت کی غالب اکثریت اس امر پر مجتمع ہو گئی کہ جب تک قاتلانِ عثمان سے قصاص نہیں لیا جائے گا، امت کی سیاست روز بروز گرتی چلی جائے گی اور ہر خلیفہ پر یہ خوف مسلط رہے گا کہ معلوم نہیں کس وقت اس کے گلے پر چھری پھیر دی جائے۔

دشمنانِ دین و ملت نے اس خالص تعمیری کام کو بغاوت کی صورت دے کر امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے مقابلے کے لیے فوج کشی پر ابھارا۔ آپ کے احبا و اقربا اور مخلص اصحاب اس اقدام کے خلاف تھے، لیکن چونکہ خلافتِ مرتضوی پر سبائیہ کا غلبہ تھا، امت انتشار میں مبتلا تھی، اس لیے ان لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا اور آپ یلغار کرتے ہوئے بصرہ پہنچ گئے۔

یہاں آ کر اصل حقیقت کھلی کہ مقصد تعمیر ہے تخریب نہیں۔ چنانچہ آپ بھی اپنی ماں اور بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے مظلوم بھائی کا قصاص لینے کے لیے تیار ہو گئے (العواصم: ١١١) اور حکم دے دیا کہ جتنے لوگ قتلِ عثمان میں شریک تھے وہ جماعت سے باہر ہو جائیں۔ طبری نے اپنی تاریخ (١٩٩/٥) میں اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البدایة والنهایة" (٢٣٩/٨) میں یہ تصریح کی ہے کہ فریقین اس امر پر متفق ہو گئے تھے کہ سب مل کر قاتلانِ عثمان سے قصاص لیں۔ صبح کو عہد نامہ مرتب ہونا قرار پایا تھا۔ مجاہد کبیر سیدنا قعقاع بن عمرو تمیمی رضی اللہ عنہ نے طرفین کی غلط فہمیاں رفع کرنے میں بڑا کام کیا تھا۔

[1] طبري (١٥٦/٥)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”و عوّلوا جمیعاً علی الصلح، و باتوا بخیر لیلة لم یبتوا بمثلها للعافیة و بات الذین آثاروا أمر عثمان بشر لیلة ما باتوها قط“

”سب کے سب صلح پر تیار ہو گئے اور چین کی نیند سوئے۔ ایسے اطمینان کی نیند اب تک نہ سو سکے تھے، لیکن جنھوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہنگامہ برپا کیا تھا ان کی نیند اس رات حرام ہو گئی۔“

چنانچہ ان لوگوں نے سازش کر کے ایک دم جنگ چھیڑ دی اور یوں دونوں اس غلط فہمی میں ایک دوسرے سے الجھ پڑے کہ فریق ثانی نے غدر کیا ہے، چونکہ یہ جنگ صبح اندھیرے منہ شروع کی گئی تھی، اس لیے فریقین کو غلط فہمی ہونا تعجب انگیز نہیں۔

بہرحال جنگ ہوئی اور خون ریزی کے بعد پھر صلح پر ختم ہو گئی، بلکہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی فتح پر۔ سیدنا طلحہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہما دونوں کو شہید کر دیا گیا۔ جنگ میں نہیں، بلکہ سبائیہ نے یہ حرکت دھوکے سے کی تھی۔ یہ حادثۂ فاجعہ جمادی الآخر ۳۶ھ کا ہے۔

سبائی لوگوں نے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو ملحدانہ بلکہ کافرانہ حرکتیں کی تھیں، اسے لوگ خالص بغاوت اور فساد کے بجائے اجتہادی مسئلہ بنانے کے درپے ہوئے اور چونکہ امت کی بدقسمتی سے انھیں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ جیسے امام سے وابستہ ہونے کا موقع مل گیا، اس لیے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زبانی اس قسم کی باتیں انھوں نے بیان کی ہیں جن سے یا تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو کچھ کیا گیا وہ درست تھا، یا یہ کہ جن لوگوں نے یہ حرکتیں کیں وہ چنداں قابلِ ملامت نہیں، یا یہ کہ جو ہو گیا وہ ہو گیا، اب قضیہ آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔ یا یہ کہ ایک شخصِ واحد کا قتل تھا اور اس کے قاتل حتمی طور پر پیش نہیں کیے گئے، اس لیے قصاص لینے کا امکان نہیں رہا۔

اس طرح سب طرف سے حصار کر کے ان لوگوں نے جو فضا قائم کی ہے اور

مسعودی جیسے مورخوں نے صفحے کے صفحے سیاہ کیے ہیں وہ محض اس لیے ہے کہ امت کی نگاہیں ان پر نہ پڑیں، بلکہ مسلمان نظری حیثیت سے آپس ہی میں الجھے رہیں اور معاملہ ملت کے قتل کے بجائے ایک فردِ واحد کے قتل کا ہو جائے۔

لیکن جنگِ جمل کے موقع پر امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مادرِ امت کے ساتھ ہو کر ان قاتلوں کے بارے میں جو موقف اختیار کیا وہ ان سب رعایتوں کو باطل کر دیتا ہے۔ آپ کے نزدیک بھی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل ایک شخص کا نہیں تھا، بلکہ پوری امت کا تھا۔ آپ بھی ان قاتلوں سے قصاص کو واجب سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ یہ ملتِ اسلامیہ کے دشمن ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے جنگِ جمل کو شروع کر کے جس طرح صورتِ حال بدل دی اور پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جس طرح حاوی ہو گئے اس سے احوال بگڑتے چلے گئے، جیسا کہ آیندہ واقعات سے معلوم ہو گا۔ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے فرزندِ اکبر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور اعزہ و مخلص احباب کی رائے رد کر کے مدینہ سے کوفہ نہ آتے جو سبائیوں کا مرکز اور ان کی جمعیت کا گڑھ تھا، تب بھی شاید حالات پر قابو پا لیا جاتا۔

بہر حال سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خاموشی اور ضبط کے ساتھ صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ آپ کو توقع تھی کہ ام المومنین کی کوششوں سے معاملات درست ہو جائیں گے۔ اسی لیے آپ نے کسی بھی قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔ سبائیہ نے چونکہ تمام فضا عمّالِ عثمانی کے خلاف پیدا کی تھی اور اس لیے انھیں سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ امت کے سر سے ان والیوں کا سایہ کسی طرح اٹھا دیا جائے، چنانچہ انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ابھارا کہ نئی خلافت کے نئے عمّال مقرر ہوں۔ افسوس کہ آپ نے پھر تمام مخلص حضرات کی رائے ٹھکرا کر ان لوگوں کے مشورے پر عمل کیا۔ سب کے پاس برطرفی کے فرمان پہنچ گئے اور نئے عمّال روانہ کر دیے گئے۔

ان میں سے بعض کو اپنے اپنے مستقر تک پہنچنے میں کامیابی ہو گئی، شام کا معاملہ

دوسرا تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بیعت سے انکار کر دیا، جیسا کہ آگے آرہا ہے اور یوں عاملِ مرتضوی کو شام کی سرحد میں داخلہ بھی نصیب نہ ہو سکا۔ عاملِ مصر سیدنا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں آپ سے کچھ مشورہ کرنے کے لیے آپ کی اجازت سے روانہ ہو چکے تھے اور ابھی فلسطین ہی میں تھے کہ آپ کی شہادت کی خبر پہنچ گئی، لہٰذا وہیں رک گئے۔ آپ نے مصر واپس ہونا چاہا تھا، لیکن وہاں کی حکومت پر محمد بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ قابض ہو چکے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ بغیر خون ریزی کے مصر میں داخل ہو سکیں۔ اس لیے آپ نے صبر و ضبط سے کام لیا اور مصر میں جارحانہ داخلے سے گریز فرمایا، ورنہ آپ کے پاس وسائل تھے اور آپ داخل ہونا چاہتے تو ہو سکتے تھے اور پھر وہاں بھی شام ہی کا سا حال ہوتا۔ جو تلوار اہلِ کفر سے جہاد کے لیے آپ نے ہاتھ میں لی تھی اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے سے آپ نے گریز کیا، لیکن امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ ایسا نہ تھا کہ لوگوں کو اس کی خبر رفتہ رفتہ ہوتی۔ یہ خبر تو آگ کی طرح پھیل گئی اور چاروں طرف سے ایک ہی آواز اٹھتی تھی۔ انتقام! انتقام!

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اور جنگِ جمل ختم ہونے پر اموی سادات سب شام چلے گئے، وہاں ان کے بیانات سن کر دمشق میں کہرام مچل گیا۔ اہلِ شام نے حلف اٹھا لیے کہ جب تک عثمان رضی اللہ عنہ مظلوم کا قصاص نہیں لیا جائے گا لذائذِ دنیوی سے دور رہیں گے، لیکن اس اندرونی تیاری کے باوجود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ انھیں شروع سے توقع تھی کہ اجلّہ صحابہ اور حضرت امیر المومنین کی کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گی اور کام ہو جائے گا، لیکن نہ ہو سکا اور مسلمانوں کا خون بے وجہ ضائع ہوا۔

البتہ جنگِ جمل سے پہلے بعض سبائیہ کو قتل کیا گیا تھا۔ من جملہ ان کے حکیم بن جبلہ بھی تھا۔ اسی کی شرارت سے کشت و خون کی نوبت آئی تھی۔ اس نے ام المومنین کو گالی دی تھی، اس پر ایک مسلمہ نے اسے ٹوکا تو اس مردود نے اس عفیفہ کو شہید کر دیا۔ اس پر قتال شروع ہوا

تھا۔[1] ورنہ اصحابِ جمل کی یہ رائے نہیں تھی کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ ملائے بغیر یہ قدم اٹھائیں۔ خود والیِ بصرہ سیدنا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کا موقف بھی یہی تھا کہ امیر المومنین کی تشریف آوری تک انتظار کیا جائے، لیکن اہلِ حق کی تمام تدبیریں سبائیہ نے برباد کر دیں۔

جنگِ جمل کے بعد امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو بیعت کا پیغام دے کر شام بھیجا، سبائیہ کو یہ امر ناگوار گزرا۔ اشتر کی خواہش تھی کہ اسے بھیجا جائے۔ ان لوگوں کو یہ امر گوارا نہ تھا کہ خلافتِ مرتضوی کی نمایندگی ان کے ہوتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سپرد ہو۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو روکے رکھا اور کوئی حتمی جواب نہیں دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اپنی آنکھوں سے اچھی طرح شام کا حال دیکھ لیں اور ان کا موقف پہچان لیں۔ چنانچہ آخر میں آپ نے صاف جواب دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت پر باغیوں کا قبضہ ہے۔ ان کی خلافت کی حیثیت آئینی نہیں۔ ہماری گردنوں میں ہمارے خلیفہ کی بیعت ہے جو نہ خلافت سے دستبردار ہوئے اور نہ طبعی حالات میں وفات پائی، بلکہ انھیں ظلماً اور بغیر حجت کے بے وجہ قتل کیا گیا ہے۔ ان قاتلوں سے قصاص کا مطالبہ جو آپ کے امام کے سامنے رکھا گیا تو اس کی پذیرائی پر وہ تیار نہیں ہوئے، اس لیے ہم بیعت نہیں کریں گے۔ آپ کے امام کو ہم اپنے امام کے قتل میں شریک سمجھتے ہیں اور اگر وہ نہیں ہیں تو ان مفسدوں سے علاحدگی اختیار کریں۔ ہم خود انھیں کیفرِ کردار کو پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔

سیدنا جریر رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر یہ صورتِ حال امیر المومنین کے سامنے رکھ دی۔ اب بھی موقع تھا کہ جنگِ جمل سے سبق لے کر آپ اپنے لشکریوں کی ذہنیت کا اندازہ لگا لیں۔ مگر پھر اشتر اور ابن الکواء وغیرہ ہی کی رائے غالب رہی۔ مخلص لوگ، فرزند اور اقربا سمجھاتے ہی رہے مگر آپ نے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کر لیا۔ اجلّہ صحابہ اس اقدام سے

---

[1] طبري (۵/ ۱۸۰)

اختلاف رکھتے تھے۔ چنانچہ سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو جنگِ جمل تک ساتھ تھے، اب الگ ہو گئے۔[1]

خود سیدنا جریر رضی اللہ عنہ کی سب باتیں آنکھوں دیکھی تھیں اور مسئلہ انھوں نے سمجھ لیا تھا، وہ بھی الگ ہو گئے اور پھر شام چلے گئے۔ اشتر نے ان کے پیچھے ان کے خلاف مضبوط محاذ بنا لیا تھا۔



[1] الإصابة في تمييز الصحابة، تحت عنوان خالد بن زيد.

معرکۂ صفین

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جنگ کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ معاملہ گفت وشنید سے طے ہو، لیکن اس لشکر کشی سے وہ بھی فوجیں بڑھانے پر مجبور ہوئے۔ کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے جنگ کا کوئی عملی اقدام ہوا ہو یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج کشی سے پہلے ان کی فوجوں نے حرکت کی ہو۔[1]

یہاں ایک بات بیان کر دینا ضروری ہے کہ جو لوگ حیا اور غیرتِ ملیہ سے عاری ہیں انھوں نے ایک روایت یہ وضع کی ہے کہ صفین کی طرف روانہ ہونے سے پہلے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے شاہِ روم کو کچھ روپیہ دے کر صلح کر لی تھی۔ بعض نابکاروں نے یہاں تک لکھا ہے کہ جنگوں کے بعد بھی آپ شاہِ روم کو برابر ''خراج'' ادا کرتے رہے۔ معلوم نہیں یہ مردود روایت جس کا وضعی ہونا عیاں ہے، ان لوگوں کو کہاں سے ملی؟! ملی کہاں سے خود وضع کی ہے۔ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ صفین کے موقع پر جب آپ کو اطلاع ملی کہ شاہِ روم کا عندیہ عالمِ اسلام پر حملہ کرنے کا ہے اور اس کی فوجیں اس غرض سے منظّم ہو رہی ہیں، بلکہ وہ خود سرحد پر آ گیا ہے تو آپ نے لکھا:

''واللہ لئن لم تنتہ وترجع إلی بلادك یا لعین لأصطلحنّ أنا

[1] شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے ''منہاج السنۃ'' میں کئی مقامات پر یہ تصریح کی ہے کہ جنگ صفین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے شروع نہیں کی گئی تھی، بلکہ ان پر جنگ مسلط کی گئی تھی جس کے نتیجے میں انھوں نے مدافعانہ جنگ لڑی۔ دیکھیے ''منہاج السنۃ'' (۲/۲۰۲، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۳۳) یہی بات طبری نے اپنی تاریخ (۴/۵۶۳) میں اور ابن اثیر نے ''الکامل'' (۳/۲۷۹) میں رقم کی ہے۔

وابن عمّي ولأخرجنّك من جميع بلادك ولأضيقنّ عليك الأرض بما رحُبت"[1]

"قسم ہے اللہ کی! اے لعین! اگر تو فوراً نہ رکا اور اپنے علاقے کو واپس نہ ہوا تو میں اپنے چچا کے بیٹے سے صلح کرلوں گا اور تجھے تیرے سب ممالک سے نکال دوں گا اور زمین کو اس کی فراخی کے باوجود تجھ پر تنگ کر ڈالوں گا۔"

یہ خط دیکھ کر اس پر اتنا رعب طاری ہوا کہ اپنی سب فوجیں ہٹا کر پسپا ہوگیا۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اللہ کے دشمنوں نے امت کو سلف صالحین سے بدظن کرنے کے لیے کس طرح قسم قسم کی شرانگیز روایتیں وضع کی ہیں اور آنکھوں میں کیسے دھول ڈالنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

صفین پر جب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا تو آدابِ اسلامی کے تحت پھر گفت وشنید کا سلسلہ شروع کر دیا گیا جو سبائیہ کی شرارت سے ناکام رہا۔ محرم کے مہینے میں جنگ قطعاً بند رہی۔ یکم صفر کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ مسعودی نے بڑی زوردار عبارت میں آپ کا اعلان نقل کیا ہے۔ عرب کے قاعدے کے مطابق دونوں طرف سے سپاہی نکل نکل کر دادِ شجاعت دینے لگے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ سب سے پہلے مبارزطلبی کے لیے اشترنخعی نکلا تھا۔ اہلِ فکر کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ سات دن یہی حالت رہی۔ ۸ صفر ۳۷ھ کو جنگ مغلوبہ ہوگئی۔ لڑائی کے ان احوال کے لیے (جو سراسر اختراعی ہیں اور بعد میں اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر تصنیف کیے گئے ہیں) ملاحظہ ہو: مروج الذهب (۲/۳۸۷)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج مدافعانہ جنگ کر رہی تھی اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے اشترنخعی وغیرہ کے حملے جارحانہ ہو رہے تھے۔ سبائی لوگ بڑے فخر سے اشتر کے کارنامے گناتے تھے اور ان کی مجلسوں میں داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا کی طرح

---

[1] البداية والنهاية (۸/۱۹۹)

عجیب وغریب تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ خود راقم الحروف کو ایک بڑے ''ذاکر'' کی بیان کردہ یہ روایت سننے کا اتفاق ہوا کہ ایک دن اشتر کے ہاتھ سے قتل ہونے والوں کی تعداد امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مقتول ہونے والوں سے زیادہ ہوگئی۔ اس پر اس نے فخر کا اظہار کیا اور لوگوں نے اس کی ''داد'' دی۔ لیکن جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا: ''ہاں درست ہے مگر فرق اتنا ہے کہ میں نے صرف ایسے ہی شخص کو مارا ہے جس کی پشت سے کوئی صاحبِ ایمان پیدا ہونے والا نہیں تھا، لیکن اشتر نے بے محابا قتل کیا ہے۔'' ذاکر صاحب کے اس بیان پر جو واہ واہ ہوئی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گویا اشتر اتنا صاحبِ تصرف تھا کہ مشیتِ الٰہی پر غالب آ گیا اور اس نے ایسے آدمی مار دیے جن کی اولاد میں اہلِ ایمان پیدا ہونے والے تھے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو غیب کا اتنا علم تھا کہ اگلی نسلوں کا ایمان و کفر بھی ان پر کھل گیا۔

اس قسم کے خرافات پر ان لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہے، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ خود نہیں لڑے۔ امام المسلمین ہونے کی حیثیت سے یہ آپ کے شایانِ شان تھا نہ دوسری طرف سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ لڑے۔ جس کے ہاتھ میں فوج کی کمان ہو وہ لڑے گا یا لڑائے گا؟! پھر ان لوگوں کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ جو شخص مسلمانوں کے قتل پر دلیر ہو اس کا وجود قابلِ فخر ہوگا یا موجبِ ندامت۔ مومن کا کام مومن کے قتل سے گریز کرنا ہے، لیکن جن لوگوں نے سیدنا عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم جیسے ایمان و انسانیت کے نمونوں کو دھوکے سے شہید کر دیا اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے ہودج پر تیر برسائے، انھیں کسی اور مسلمان کے قتل میں کیا باک ہوتا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مخلص اہلِ ایمان کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ جنگ میں مبتلا تو ہوئے مگر رک رک کر، بچ بچ کر۔ اُن پر یہ امر شاق تھا کہ مسلمانوں کی گردنیں مسلمانوں کے ہاتھ سے ماری جائیں۔ جنگِ جمل جس طرح برپا ہوئی، اس کے احوال انھیں معلوم تھے اور

ویسے بھی اکثر اصحاب کے قلوب میں سبائیہ کی طرف سے کدورت و بدظنی تھی۔ اکابر صحابہ میں پچیس تیس حضرات کی شرکت جمل و صفین میں دونوں طرف سے ثابت ہے۔ اور جن پر صحابیت کا اطلاق ہوتا ہے وہ دونوں موقعوں پر دونوں طرف سے سو سوا سو سے زیادہ نہ تھے۔ ان دونوں جنگوں میں صحابہ کی تعداد اس سے زیادہ ثابت نہیں کی جا سکتی اور باقاعدہ ثبوت اگر فراہم کیا جائے تو یہ تعداد اس سے بھی کم نکلے گی۔ جمہور امت کو یہ ہنگامے ناپسند تھے اور سب کی دلی خواہش تھی کہ مسلمانوں میں خون ریزی اور خانہ جنگی نہ ہو۔ اس لیے دونوں جنگوں میں اسلام کے وفادار اس جذبے سے نہیں لڑ رہے تھے جو دونوں حریفوں کے درمیان جنگ کا ہوتا ہے۔ سوائے سبائیہ کے کوئی نہ تھا جو حقیقی جوش سے لڑ رہا ہو۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی کہ جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی تو آپ کی عقلِ ایمانی اور فراستِ نورانی نے یہ سجھایا کہ جنگ بہرحال بند کر دی جائے۔ چنانچہ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مشورے سے نیزوں پر قرآن مجید کے نسخے بلند کر دیے گئے کہ "دیکھو جنگ بند کرو اور کتاب اللہ جو کہے اس پر عمل کرو۔" مسلمانوں نے جنگ بند کر دی، کیوں کہ ان کا دلی جذبہ یہی تھا۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا جذبہ بھی یہی تھا اور آپ نے اس دعوت کی پذیرائی کی۔ بار بار اشتر کو حکم بھیجا کہ تلوار روک لے مگر وہ نہ رکا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں اس سے ناراضی پھیل گئی، تب وہ ہاتھ روکنے پر مجبور ہوا۔ اشتر کی یہ حرکت متفق علیہ ہے۔ اسی سے ان لوگوں کی ذہنیت اور عزائم کا اندازہ لگانا چاہیے۔

لوگوں نے داستانیں وضع کی ہیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے ادبی شہ پارے ادا کرائے ہیں کہ آپ جنگ روکنے کے مخالف تھے، آپ نے فرمایا:

"یہ معاویہ اور عمرو بن العاص، یہ ابن ابی معیط اور حبیب بن مسلمہ، ابن ابی سرح اور ضحاک بن قیس، نہ اصحابِ دین ہیں اور نہ اصحابِ قرآن۔ میں انھیں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ بچپن سے میرا ان کا ساتھ رہا ہے، یہ بدترین بچے تھے

اور بدترین مرد ہیں۔ انھوں نے قرآن بلند کرنے کی یہ حرکت محض دھوکا دینے کے لیے کی ہے، خود انھیں قرآن سے کچھ تعلق نہیں۔''[1]

اس قسم کے لغو اور شر انگیز الفاظ جو واقعات کے سراسر خلاف ہیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ جیسے امام الاتقیاء کی زبان سے ہرگز نہیں نکل سکتے۔ کیا آپ اور جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں جانتے تھے کہ سیدنا معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی حیثیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آخر عہدِ عثمانی تک کیا رہی۔ نیز سیدنا ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو صدیقِ اکبر، فاروقِ اعظم اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہم کا اعتماد کس درجہ حاصل تھا۔ کیسی اہم ترین خدمات ان کے سپرد رہیں اور دین کے لیے ان کے کارنامے کیسے عظیم اور اصیل تھے۔ مشرق و مغرب میں ان کی تکبیروں کی گونج ابھی ماند نہیں پڑی تھی، ان کے نام سے اہلِ کفر لرزہ بر اندام تھے۔ یہی عالم سیدنا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا تھا۔ افریقہ والوں سے پوچھنا چاہیے کہ ابن ابی سرح

---

[1] طبری نے اپنی تاریخ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ کلام جس سند سے روایت کیا ہے وہ سخت مجروح ہے۔ سند کچھ یوں ہے کہ ابو مخنف نے عبدالرحمان بن جندب الازدی کے ذریعے جندب الازدی سے روایت کیا ہے کہ جس وقت یہ صورتحال رونما ہوئی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا کلام کیا۔ ابو مخنف لوط بن یحییٰ کی بابت محدثین کا اجماع ہے کہ یہ کٹر رافضی اور کذاب ہے۔ حافظ ابن حجر ''لسان المیزان'' میں فرماتے ہیں: ''یہ ابو مخنف ایک مورخ ہے۔ تاریخ پر اس کی متعدد تالیفات ہیں۔ یہ قابلِ اعتماد نہیں۔'' ابو حاتم رحمہ اللہ وغیرہ اسے متروک قرار دیتے ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں: ''ضعیف ہے۔'' یحییٰ بن معین کہتے ہیں: ''یہ ثقہ نہیں۔'' ایک بار فرمایا: ''یہ کچھ نہیں۔'' یہ صعق بن زہیر اور جابر جعفی رافضی سے روایات نقل کرتا ہے۔ اس سے مورخ مدائنی وغیرہ روایات نقل کرتے ہیں۔ ۱۷۰ھ سے پہلے اس کا انتقال ہوا۔ ابو عبید الآجری کا بیان ہے: ''میں نے ابو حاتم رازی رحمہ اللہ سے اس کے بارے میں دریافت کیا، وہ ہاتھ جھاڑ کر کہنے لگے کہ اِس جیسے شخص کے بارے میں کوئی سوال کیا جاتا ہے؟ یعنی یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کے بارے میں کوئی سوال کرے۔'' عقیلی رحمہ اللہ نے اس کا کتاب الضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ ابن عدی کامل میں فرماتے ہیں: یہ کٹر شیعہ ہے اور شیعوں ہی کا مورخ ہے۔ (لسان المیزان: ۴۹۲/۲، میزان الاعتدال: ۴۱۹/۳) سو ابو مخنف کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منسوب سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ وغیرہ کے خلاف یہ کلام قطعی قابلِ قبول نہیں۔

کا وجود کفر کے حق میں کیا تھا۔ یہی کیفیت سیدنا ضحاک بن قیس اور حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہما کی تھی۔ یہ بزرگوار جو ملتِ اسلامیہ کے عظیم ترین افراد میں ہیں اور جن کی زندگیاں جہاد فی سبیل اللہ میں گزریں اور جن کے روح پرور کارنامے الم نشرح ہیں، ان کے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایسی بات کیسے فرما سکتے تھے جسے جھٹلانے کے لیے ہر قرشی اور ہر صحابی کھڑا ہو جاتا۔ یہ سب داستانیں ان لوگوں نے وضع کی ہیں جو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ابطالِ اسلام کی توہین و تذلیل کو اپنی زندگانی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔

ہمارے سامنے جو تاریخی حقیقت ہے وہ اتنی ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں قرآن بلند کیا گیا اور اس کے نتیجے میں جنگ بند ہوگئی۔ اس جنگ کا بند ہونا امت کی عین خواہش اور فریقین کے حقیقی جذبے کے مطابق ہوا۔ البتہ سبائیوں کو یہ امر ناگوار تھا اور اشتر نخعی جیسے لوگ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں خون ریزی کا سلسلہ بند نہ ہو۔

لوگوں نے جمل و صفین کے واقعات بیان کرنے میں انتہائی مبالغے سے کام لیا ہے اور ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ گویا یہ بھی کوئی مہابھارت کی جنگ تھی جس میں بقول ہندوؤں کے لاکھوں آدمی مبتلا ہوئے، حالانکہ ان کے اہلِ فکر بھی اس جنگ کی تفصیلات کو خیال آرائی سے تعبیر کرتے ہیں۔

واقعاتِ ثابتہ کی روشنی میں جمل و صفین کی بابت لوگوں کے پیدا کردہ تصور کی کوئی گنجایش نہیں۔ دونوں دفعہ جنگ کا وقوع سبائیہ کی چالاکی سے ہوا۔ دونوں موقعوں پر صلح کی فضا پیدا ہوگئی تھی اور دونوں دفعہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخلص متبعین چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں تلوار نہ چلے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت ماند نہیں پڑی تھی۔ دونوں جنگوں کی تمام ذمے داری سبائیوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقتولوں کی تعداد ہمارے لیے قابلِ قبول ہے اور نہ ہم فوجوں کی یہ قوت مانتے ہیں جو بیان کی جاتی ہے اور نہ ہم ان افسانوں کو تسلیم کرتے ہیں جو ان جنگوں کی تفصیلات کے بارے میں وضع کیے گئے ہیں۔ یہ سب باتیں بعد کی مخترعات

ہیں اوران رجز خوانیوں میں ان مصنفوں نے محض خیالی گھوڑے دوڑائے ہیں۔

جب جمہور صحابہ اور تمام امت کو خون ریزی ناگوار ہو، جب ہر دفعہ کوشش یہی ہو کہ صلح ہو جائے اور اس کے مواقع بھی پیدا ہو جائیں اور جب قلیل عرصے بعد یعنی چند گھنٹوں کے اندر جنگ ختم ہو جائے تو ہزاروں آدمی کیسے مارے جا سکتے تھے؟ صفین کی لڑائی سات دن اس طرح رہی کہ فریقین میں ایک ایک آدمی نکلتا تھا، دونوں ماہرِ حرب وضرب ہوتے تھے۔ آٹھویں دن گھمسان کا رَن پڑا اور کہتے ہیں کہ رات کو بھی لڑائی رہی اور پوری شب ہوتی رہی۔ پھر بھی چونکہ اسی اثنا میں قرآن بلند کر دیا گیا اور جنگ بند ہوگئی، اس لیے اتنے آدمی قتل نہیں ہو سکے جتنے بیان کیے جاتے ہیں، بلکہ ان کے عُشرِ عشیر بھی نہیں۔ جمل کی لڑائی اس سے بھی کم مدت رہی تو پھر ستر ہزار ایک جنگ میں اور بے شمار دوسری جنگ میں کیسے مارے جا سکتے تھے۔ بعض لوگوں نے صفین کے دنوں کی تعداد زیادہ بتائی ہے، لیکن معتبر و مستند سندوں سے معرکوں کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی ہم نے بیان کی۔ یہ جو ایک سو انیس معرکے بتائے جاتے ہیں تو اس سے ایک سو انیس دن مراد لینا درست نہیں۔ یہاں یہی مراد ہوسکتی ہے کہ دونوں طرف سے اتنے اتنے آدمیوں کی انفرادی جنگ ہوئی۔ افراد کی اس نبرد آزمائی کو فوجوں کے مابین تصادم بنا دیا گیا ہے۔

اہلِ فکر کو سوچنا چاہیے کہ پہلی جنگِ عظیم میں تمام دنیا شامل تھی اور تباہ کن آلات کا استعمال تھا، یہ جنگ پورے چار برس خشکی اور تری میں لڑی گئی اور ہزاروں میل رقبہ میدانِ جنگ تھا۔ پھر بھی صرف چند لاکھ آدمی کام آئے۔ تو پھر جنگِ جمل وصفین میں چند گھنٹوں کے اندر ہزارہا آدمی کیسے قتل کیے جا سکتے تھے جب کہ آلاتِ حرب ایسے تھے کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی مر سکتا تھا۔ نہ توپ کے گولے برس رہے تھے اور نہ طیاروں سے بمباری ہو رہی تھی اور نہ سپاہیوں کے پاس برین گنیں یا مشین گنیں تھیں۔ خدا ان مورخوں کو سمجھے گا جنھوں نے اخلاف کے ساتھ غداری کر کے اسلاف کے کردار کا ایسا

دلدوز نقشہ پیش کیا ہے کہ جیسے قوموں اور ملکوں کا تصادم ہو اور تہذیبوں اور تمدنوں اور ثقافتوں کی ٹکر ہو۔

یہ جنگ بالکل باہمی غلط اندیشی کے تحت شروع ہوئی اور بالکل صحیح اور خالص جذبۂ اخوت کے مطابق بند کر دی گئی۔ اس کا حال ہم مسعودی کی کتاب ''مروج الذہب'' سے پیش کرتے ہیں اور بطورِ حجت اس لیے کہ یہ شخص یا تو بطورِ خود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور اموی خلفا کا کھلا دشمن تھا یا محض آلِ بُوَیہ کو خوش کرنے کے لیے اس نے یہ کتاب لکھی ہے۔ کہتا ہے:

''فقال عمرو: أيها الناس، مَنْ كان معه مصحف فليرفعه على رُمُحه، فكثر في الجيش رفع المصاحف، وارتفعت الضجة ونادوا: كتاب الله بيننا وبينكم، مَنْ لثغور الشام بعد أهل الشام؟ ومَنْ لثغور العراق بعد أهل العراق؟ ومن لجهاد الروم؟ ومن للترك؟ ومن للكفار؟ ورفع في عسكر معاوية نحو من خمسمائة مصحف، وفي ذلك يقول النجاشي بن الحارث:

فأصبح أهل الشام قد رفعوا الْقَنَا
عليها كتاب الله خير قُرَان
فنادوا علياً يا ابن عمّ محمد
أما تتقي أن يَهْلِكَ الثقلان؟ [1]

''حضرت عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے لوگو! جس کے پاس قرآن ہو اسے وہ اپنے نیزے پر بلند کر لے۔'' چنانچہ بکثرت مصاحف بلند کر دیے گئے۔ ایک شور مچ گیا اور لوگوں نے آوازیں لگائیں: ''یہ وہی اللہ کی کتاب ہے ہمارے اور تمھارے درمیان! اہلِ شام نہ رہے تو شام کی سرحدوں کی حفاظت کون کرے

[1] مروج الذهب (٢/ ٤٠٠)

گا اور اہلِ عراق نہ رہے تو عراق کی سرحدیں کس کی نگرانی میں رہیں گی؟ رومیوں سے کون لڑے گا؟ ترکوں اور کافروں سے کون لڑے گا؟'' اس دن معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں پانچ سو کے قریب مصاحف بلند کیے گئے۔ اس مضمون کو نجاشی بن حارث نے نظم کیا ہے:

''اہلِ شام نے اس دن نیزے بلند کر دیے جن پر اللہ کی کتاب تھی پڑھنے کی بہترین چیز۔ انھوں نے علی رضی اللہ عنہ کو آواز دی: اے محمد کے چچا کے بیٹے! کیا تمھیں خوفِ خدا نہیں کہ طرفین ہلاک ہو جائیں گے۔''

یہ تھا صحیح جذبہ جس کے تحت جنگ بند ہوئی اور جسے مسعودی جیسا شخص بھی نہ چھپا سکا۔ یہ عبارت بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کو یہ لڑائیاں کس درجہ ناگوار تھیں اور کس طرح وہ انھیں بند کرنے پر حریص تھے۔



تحکیم

جنگ بند ہونے کے بعد کتاب اللہ کا ایک ہی حکم ہے کہ ما بہ النزاع مسئلے کا فیصلہ ثالثی کے ذریعے طے کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ثالث بنا دیا گیا اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ثالث بنے۔ کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی طرف سے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ثالث بنانا چاہتے تھے، لیکن آپ کے لشکر کا اصرار ہوا کہ چونکہ سیدنا ابو موسیٰ غیر جانبدار رہے ہیں، اس لیے انھی کو ثالث بنایا جائے۔ چچا کے بیٹے کو ثالث بنانے کا کیا مطلب ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ خود امیر المومنین ہی نے سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کے فضائل و مکارم کی وجہ سے ثالث مقرر فرمایا ہو گا۔ ویسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اگر تقرر ہوتا تو وہ بھی ایسے ہی غیر جانبدار ہو جاتے جیسے مقرر کردہ دونوں ثالث ہو گئے تھے، جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا۔

ثالثوں کے فیصلے پر عمل درآمد کے لیے فریقین میں حسبِ ذیل معاہدہ ہوا:

”بسم الله الرحمن الرحيم . هذا ما تقاضى عليه علي بن أبي طالب و معاوية بن أبي سفيان. قاضى علي على أهل الكوفة ومن معهم من شيعتهم من المؤمنين والمسلمين. وقاضى معاوية على أهل الشام ومن كان معهم من المؤمنين والمسلمين.

إنا ننزل على حكم الله عز وجل وكتابه ولا يجمع بيننا غيره، وإن كان الله عز وجل بيننا من فاتحة إلى خاتمة نحي ما أحيى،

ونميت ما أمات، فما وجد الحكمان في كتاب الله عز وجل، وهما أبو موسى الأشعري عبد الله بن قيس، و عمرو بن العاص القرشي عملا به، وما لم يجدا في كتاب الله عز وجل فالسنة العادلة الجامعة غير المفرقة"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وہ تصفیہ ہے جو علی بن ابی طالب اور معاویہ بن ابی سفیان کے درمیان ہوا۔ علی کا یہ فیصلہ تمام اہلِ کوفہ اور ان کے سب ہوا خواہوں کی طرف سے ہوا جو اہلِ ایمان اور اہلِ اسلام ہیں۔ معاویہ کا یہ تصفیہ اہلِ شام اور ان کے سب ساتھیوں کی طرف سے ہوا جو اہلِ ایمان و اہلِ اسلام ہیں۔

"ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ سوائے اس کے اور ہم کسی بات پر متفق نہیں ہوں گے۔ اب شروع سے آخر تک جب خدائے عزوجل ہی ہمارے درمیان ہے تو ہم بھی اسی چیز کو زندہ رکھیں گے جسے اس نے زندگی بخشی اور اسی چیز کو مٹائیں گے جسے اس نے قابلِ فنا قرار دیا۔ لہٰذا یہ دونوں ثالث یعنی ابوموسیٰ اشعری عبداللہ بن قیس اور عمرو بن العاص قرشی جو کچھ کتاب اللہ میں پائیں اس پر عمل کریں اور اگر کتاب اللہ میں کچھ نہ پائیں تو پھر اس سنت کو دیکھیں جو عادلانہ ہو اور مجتمع کرنے والی ہو نہ کہ ایسی جو تفرقہ ڈالے۔"

اس کے بعد دونوں ثالثوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے الگ الگ عہد لیا۔ دونوں نے حسبِ ذیل مضمون کی دستاویز دی:

"أنا على ما في هذه الصحيفة وإني قد أوجبت قضيتهما على المؤمنين، فإن الأمن والاستقامة ووضع السلاح بينهم أينما ساروا على أنفسهم وأهليهم وأموالهم وشاهدهم وغائبهم وعلى عبد الله بن قيس وعمرو بن العاص عهد الله وميثاقه أن

يحكما بين هذه الأمة ولا يرداها في حرب ولا فرقة حتى يعصيا، وأجلا القضاء إلى رمضان وإن أحببا أن يؤخروا ذلك أخراه على تراضٍ منهما.
وإن توفي أحد الحكمين، فان أمير الشيعة يختار مكانه وليا من أهل العدل والقسط، وإن مكان قضيتهما الذين يقضيان فيه مكان عدل بين أهل الكوفة وأهل الشام، وإن رضيا وأحبا فلا يحضرهما فيه إلا من أرادا، وأخذ الحكمان من أرادا من الشهود ثم يكتبان شهادتهما على ما في هذه الصحيفة. وهم أنصار على من ترك هذه الصحيفة وأراد فيه إلحادا أو ظلما"
''میں اس دستاویز (ثالثی نامے) کے مضمون پر عمل درآمد کا عہد کرتا ہوں اور اس کے فیصلے کی پابندی اہلِ ایمان پر لازمی قرار دیتا ہوں، یعنی وہ جہاں کہیں بھی جائیں، ان کی جانیں، ان کے اہل وعیال، ان کے مال ومتاع اور ان کے حاضر و غائب سب کے حق میں امن رہے گا، اس کی پوری طرح پاسداری کی جائے گی اور کسی کے خلاف ہتھیار کا استعمال نہیں ہوگا۔
عبداللہ بن قیس اور عمرو بن العاص پر عہد و پیمانِ الٰہی کے سبب یہ ذمے داری ہے کہ وہ اس امت کے بارے میں ثالثی کا فرض ادا کریں، دوبارہ اسے جنگ میں نہ دھکیلیں اور نہ اختلاف کی صورت پیدا کر کے گناہ گار بنیں۔ فیصلے کے اعلان کے لیے رمضان کا مہینا مقرر کریں اور اگر چاہیں تو باہمی رضا مندی سے اس مدت میں توسیع کر دیں۔ اگر دونوں ثالثوں میں سے کسی کی وفات ہو جائے تو ہر گروہ کا جو امیر ہو وہ اس کے بجائے کسی دوسرے شخص کا تقرر کر دے۔ مگر (نئے ثالث میں) عدل گستری اور انصاف پروری کی صفت کا خیال

رکھے۔ ان دونوں کا فیصلہ سنانے کی جگہ جہاں وہ اپنا محاکمہ مرتب کریں گے، اہلِ کوفہ اور اہلِ شام کی بستیوں کے وسط میں ہوگی۔ ان دونوں کی رضا مندی اور مرضی کے بغیر کوئی شخص ان کے پاس نہ جائے۔ یہ دونوں ثالث جس کی موجودگی کے خواہش مند ہوں اسے بلا لیں اور پھر اس ثالثی نامہ کے معاملے میں فیصلہ قلم بند کریں۔ تمام اہلِ ایمان اس شخص کے خلاف ان کی مدد کریں گے جو اس ثالثی نامے کو پسِ پشت ڈال دے اور اس بارے میں ہٹ دھرمی اور ظلم کا مرتکب ہو۔''

یہ معاہدہ ۱۳ صفر ۳۷ھ کو لکھا گیا اور اس کی غور طلب دفعات یہ ہیں:

① فریقین کے نزدیک دونوں ثالث اہلِ عدل و انصاف تھے اور دونوں فریقوں کو ان پر کامل اعتماد تھا۔

② معاہدہ دو ایسے فریقوں میں ہوا تھا جو برابر کی حیثیت رکھتے تھے، کسی کو کسی پر تفوق نہ تھا۔

③ ثالثوں کے فیصلے کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ تھی۔

④ ثالثوں کو حق تھا کہ جتنے آدمیوں کو مناسب سمجھیں مشورے کے لیے طلب کریں، لیکن ان کی مرضی کے بغیر ان کے پاس کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔

⑤ ثالثوں کو اختیار تھا کہ رمضان ۳۷ھ کے بجائے باہمی رضا مندی سے اگلی مدت مقرر کر دیں۔

⑥ فیصلہ سنانے تک طرفین کے آدمیوں کو ایک دوسرے کے علاقے میں آزادانہ آمد و رفت کی اجازت تھی۔ کسی پر کوئی قدغن نہ تھی اور طرفین کے ہوا خواہوں میں کامل امن رکھنے کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر تھی۔

⑦ مشوروں کے بعد ثالثوں کا جو بھی فیصلہ ہو اسے قلم بند کیا جائے۔

ان دفعات کی روشنی میں یہ باتیں قابلِ غور ہیں:

① فریقین کی حیثیت مساویانہ کس بارے میں تھی؟ ظاہر ہے کہ منصب میں نہیں، کیوں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مدعیِ خلافت نہیں تھے۔ اگر بالفرض ان کے دل میں اس قسم کے خیالات سمجھ بھی لیے جائیں تو ان کا ظہور قطعاً نہیں ہوا تھا۔

برخلاف اس کے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کئی ملکوں میں مسلم تھی، بلکہ سوائے شام کے سب جگہ، لہٰذا ثالثوں اور دونوں فریقوں کو ایسا ناسمجھ نہیں باور کیا جا سکتا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ مساویانہ حیثیت جو تسلیم کی گئی تو سیاسی اور منصبی اعتبار سے تھی۔ یہ خیال کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مدعیِ خلافت تھے، بعد کی اختراع ہے۔ ہم عصر مسلمانوں نے انھیں اس حیثیت سے نہیں دیکھا۔ تو اب یہ تسلیم کرنا لابدی ہے کہ مساویانہ حیثیت ما بہ النزاع مسئلے میں تھی، یعنی امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص اور اسی کے نتیجے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی آئینی حیثیت، کیوں کہ یہی قاتل آپ کی خلافت پر حاوی تھے اور مسلمانوں میں اسی وجہ سے بیزاری پھیلی ہوئی تھی اور صرف اس طبقے کا وجود تھا جس کی وجہ سے امیر المومنین کی بیعت کی تکمیل نہ ہو سکی۔

② فیصلہ سنانے تک طرفین کے آدمیوں کی آزادانہ نقل و حرکت، اختلاف کے مظاہرے کی ممانعت اور کامل امن پر استقامت سے دو باتیں خود بخود مسلم ہو گئیں۔ ایک یہ کہ جو صاحب جس علاقے پر متصرف ہیں اس کے نظم و نسق کی ذمے داری بدستور انہی پر ہو گی۔ دوسرے یہ کہ اپنی اصل میں تمام عالمِ اسلام پوری امت کا ہے اور یہ فیصلہ امت کرے گی کہ آیندہ سیاسی صورتِ حال کیا ہو، یعنی دونوں فریق اپنے اپنے موقف اور اختیار پر قائم رہنے میں صرف تا فیصلہ آزاد ہیں، مگر فی الحال صلح صفائی کا ماحول انھیں قائم رکھنا ہو گا۔

اللہ اور رسول کے نام پر ثالثی کا یہ اقدام اس قدر اطمینان بخش تھا کہ سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں اپنی اپنی فوجیں واپس لے گئے اور اپنے اپنے مستقر میں خاموش بیٹھ

گئے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں رہے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ دمشق میں۔ دونوں نے اپنی اپنی فوجیں منتشر کر دیں اور جو لوگ لڑنے آئے تھے وہ سب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے اور یوں تمام عالمِ اسلام میں مکمل امن قائم ہو گیا۔

مصر کا ہنگامہ:

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہونے پر مصر میں بھی آپ کی بیعت ہو گئی تھی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ بن ابی سرح، امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے بعض امور میں مشورہ کرنے مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے، انھیں راستے میں آپ کی شہادت کی اطلاع ملی، چنانچہ آپ فلسطین کے علاقے میں رک گئے۔[1]

ادھر سبائیہ کا جو مرکز فسطاط میں تھا اور وہاں محمد بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ موجود تھے، انھوں نے والیِ مصر کی عدمِ موجودگی اور حالاتِ سیاست بدل جانے کے سبب وہاں بالادستی حاصل کر لی تھی، لیکن امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے مصر کی ولایت پر سیدنا قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا اور آپ نے وہاں کا نظم ونسق سنبھال کر محمد بن ابی حذیفہ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تکمیل ہو گئی، لیکن مصر میں بھی باقی عالمِ اسلام کی طرح ایک گروہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انکار کر دیا تھا، ان کا نظریہ بھی وہی تھا کہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کو ظلماً شہید کیا گیا ہے اور انھی قاتلوں کا اس خلافت پر تسلط ہے، لہٰذا جب باقی عالمِ اسلام اس خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم کر لے گا تو ہم بھی بیعت میں داخل ہو جائیں گے۔

مصر میں ایسی جماعت کا پیدا ہو جانا قدرتی بات تھی۔ ایک تو اس لیے کہ وہاں سبائیہ کا قومی مرکز تھا اور ان کے احوال سے یہ حضرات واقف تھے۔ پھر اس لیے کہ کنانہ بن بشر حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے مصر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے آزاد پھرنے سے نیز محمد بن ابی حذیفہ کی حرکتوں سے ان بزرگواروں کی آنکھوں میں خون اترتا تھا، لیکن

[1] طبري (٥/١٢٧)

انھوں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو موجبِ اختلال ہو، باقی اکابرِ امت کی طرح محض بیعت سے کنارہ کش ہو گئے۔ سیدنا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ چاہتے تو اپنے ہوا خواہوں کے اس طاقتور گروہ کی مدد سے مصر میں کشت وخون کے ذریعے حکومت کر سکتے تھے، لیکن محض امت کی خیر خواہی میں آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ یوں محمد بن ابی حذیفہ کو وہاں بالادستی میسر آ گئی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوگئی۔

سیدنا قیس رضی اللہ عنہ نے نظم ونسق استوار کر کے اس غیر جانبدار گروہ سے فرمایا کہ اگر آپ لوگوں کی طرف سے نقضِ امن کا خطرہ نہ ہوتو ہم بھی آپ کے تمام حقوق کی پاسداری کریں گے اور ان کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا تمام غیر مبایعین کے ساتھ تھا کہ کسی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور سب کے حقوق ادا کیے جائیں۔

ان حضرات نے امن قائم رکھنے کا اپنی طرف سے اطمینان دلایا اور مناسب سمجھا کہ سب طرف سے سمٹ کر ایک بستی میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ خَربتا میں پناہ لے کر بیٹھ گئے۔ سیدنا قیس رضی اللہ عنہ نے ہر طرح ان کی خبر گیری کی اور وظائف وعطیات میں ان کا بھی وہی حق رکھا جو بیعت کرنے والے باقی مسلمانوں کا تھا۔ یہ حضرات قطعاً خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ تعداد میں یہ دس ہزار کے قریب بتائے جاتے ہیں۔ ان کی قیادت سیدنا مسلمہ بن مخلد، سیدنا معاویہ بن خدیج اور سیدنا یزید بن الحارث رضی اللہ عنہم جیسے اکابرِ امت کر رہے تھے۔

سبائیوں کو یہ صورتِ حال ناگوار تھی کہ ان کے ایک مرکز کی زمام ان کے ایک آدمی سے لے کر ایک صحابی کو دے دی گئی اور صحابی بھی وہ جو ملت کے عظیم ترین فرزندوں میں تھا۔ سیدنا قیس رضی اللہ عنہ پر ان لوگوں کو دو اعتراض تھے: ایک خفیہ اور ایک علانیہ۔ خفیہ اعتراض یہ تھا کہ کتاب وسنت کے مطابق عمل، جو سبائیہ پر سب سے زیادہ سخت ہے اور دوسرے یہ کہ جن حضرات نے بیعت نہیں کی تھی ان کے خلاف وہ کوئی کارروائی نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے آپ پر طعن شروع کر دیا، تا آنکہ امیر المومنین کی طرف سے ان کے

پاس فرمان پہنچا کہ اہلِ خِر بتا کے خلاف جنگ کی جائے۔ سیدنا قیس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس وقت کی صورتِ حال مصر کے حالات میں نہایت مناسب ہے۔ میں نے اس کا پورا انتظام کر دیا ہے کہ ان کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا نہ ہونے پائے۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو کسی اور کو بھیج دیجیے، چنانچہ حضرت محمد بن سیدنا ابی بکر کو بھیج دیا گیا۔ یوں سیدنا قیس رضی اللہ عنہ بددل ہو کر مدینہ جا بیٹھے۔

محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے مصر پہنچ کر ایک مہینے کے اندر ہی اندر اہلِ خِر بتا کو کہلا بھیجا کہ یا بیعت کریں یا ملک چھوڑ دیں، ورنہ ان کے خلاف جارحانہ کارروائی کی جائے گی۔ سبائیوں کا سردار کنانہ بن بشر قاتل امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ اس کارروائی میں پیش پیش تھا۔ ان حضرات نے کہا کہ ہم خاموش بیٹھے ہیں، ہمیں مت چھیڑو۔ مگر ان کا جواب حملے کی صورت میں دیا گیا۔ انھوں نے مدافعت کی اور ابن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو ناکامی ہوئی۔ پھر سلسلہ شروع ہو گیا اور ان حضرات پر مستقلاً حالتِ جنگ طاری ہو گئی۔ صفین کے معرکے کے بعد تمام محاذوں پر جنگ بند ہو جانی چاہیے تھی مگر مصر میں بند نہیں ہوئی۔

ثالثوں کو رمضان ۳۸ھ میں فیصلہ سنانا تھا، لیکن اہلِ خِر بتا سے جنگوں کا سلسلہ جاری رہا اور محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ شکست ہوئی۔ اہلِ خِر بتا کی جنگ کے مدافعانہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حریف کو بار بار شکست دینے کے باوجود انھوں نے اپنا رقبہ بڑھانے کی قطعاً کوشش نہیں کی اور بدستور خِر بتا ہی میں پناہ گیر رہے۔ لوگوں نے بہت سی باتیں بنائی ہیں کہ امیر المومنین نے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے فوجیں بھیجنی چاہیں، لیکن جانے پر کوئی راضی نہ ہوا۔ بالآخر آپ نے اشتر نخعی کو بھیجا جو مصر نہ پہنچ سکا اور راستے ہی میں ہلاک ہو گیا۔

اشتر:

مالک بن الحارث الاشتر نے پچھلے دور کے غزوات میں نمایاں معرکے سر کیے تھے

اور اس کے کارنامے شاندار ہیں۔ کاش یہ شجاعت اور بے جگری بعد میں بھی دین کے کام آتی، لیکن ملت کی اور اپنی بدقسمتی سے یہ شخص سبائی گروہ میں شامل ہو گیا اور پھر قریش کی عداوت میں اتنا بڑھا کہ محض امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ ہی کو شہید کر کے عالمِ اسلام کو متزلزل نہیں کیا، بلکہ خود جس امام سے اپنے آپ کو وابستہ کہتا تھا انہی پر اعتراضات کرنا، ان کے احکام کو ٹھکرانا اور ہر مسئلے میں من مانی کرنا اس کا وتیرہ تھا۔

البتہ تعجب یہ ہے کہ ان تمام ذہنی کوائف کے باوجود یہ شخص خارجی نہ بنا۔ غالباً یہ بھی مصلحت تھی، کیوں کہ خارجی ہو کر اسے جمہور اہلِ اسلام کے مقابلے پر شمشیر بکف ہونا پڑتا اور یہ بات اس تحریک کے مقاصد کے خلاف ہوتی۔ ان کا تمام فائدہ مارِ آستین بننے میں ہے۔ چنانچہ اشتر نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے دامن سے وابستگی ضروری سمجھی اور وہ سب حرکتیں کیں جو ادعائے وفاداری کے ساتھ ملت کشی کے لیے ممکن تھیں۔ اس کی خودسری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور اس کے تحت مصر جا رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے زہر دلوا دیا تھا جیسا کہ مسعودی وغیرہ نے کہا ہے اور فقرے چست کیے ہیں، لیکن کیا ثبوت ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے زہر دلوایا، وہ قتل بھی تو کر سکتے تھے، کیوں کہ وہ سبائیوں کا سرکردہ تھا اور امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں ہونے کی وجہ سے واجب القتل۔ دوسرے آپ کے علاقے میں سے ہو کر اس کا گزرنا موجبِ فساد تھا اور اس عہد نامے کے خلاف جو ثالثوں نے فریقین سے لیا تھا۔ ثالثی نامے کے مطابق فریقین کو کامل امن کے ساتھ رہنا تھا جس شخص کی طرف سے نقضِ امن کا خطرہ ہو اس کے ساتھ رعایت کی گنجایش کہاں تھی۔ مگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے انتہائی ضبط سے کام لے کر اسے گزر جانے دیا۔

لوگوں نے زہر کا سہارا اس لیے لیا ہے کہ کسی اور طرح وہ اس کی موت میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ثابت نہیں کر سکتے۔ بہرحال اتنا قطعی معلوم ہو گیا کہ متارکۂ جنگ کے

معاہدے پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے پوری پابندی کی گئی اور آپ نے کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جسے ثالثی نامے کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا جا سکے۔ زہر کا افسانہ تراشنے کی یہی وجہ ہے۔

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ مصر کو فوج بھیجنا چاہتے ہیں اور آدمی نہیں ملتے اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ تنہا اشتر مصر جا رہا ہے اور وہاں کی ولایت کا فرمان اسے امیر المومنین کی طرف سے ملا ہے۔ گویا وہ اتنا بڑا آدمی تھا کہ اس کی صورت دیکھتے ہی سب اس کے مطیع ہو جاتے، لیکن جب ہم اس فرمان کو دیکھتے ہیں جو امامِ وقت کا بتایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہرگز نہیں، کیوں کہ فضول اور لایعنی باتوں سے بھرا ہوا ہے اور اتنا طویل ہے کہ ہاشمی بلاغت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تحریریں مختصر اور جامع ہوا کرتی تھیں۔ تمام احکام کا منبع قرآنِ حکیم ہے اور وہ ہر مسلمان کے مطالعے میں رہتا تھا۔

یہ فرمان قطعی وضعی ہے اور اس سے جہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا تعلق نہیں معلوم ہوتا وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ایک فضول ادیب تھا اور اس فرمان میں اس نے محض خوب صورت فقرے لکھنے کی نمایش کی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اشتر کو جاہل ترین شخص سمجھ لیا، جسے اسلام اور دعوتِ محمدیہ کے مبادیات بتانے کی بھی ضرورت تھی، جنھیں قرآن پڑھنے والا معمولی قابلیت کا آدمی جانتا ہے۔

بہرحال امت کو اس پر غور کرنا ہے کہ امیر المومنین نے مصر کو قطعاً کوئی فوج نہیں بھیجی۔ تاریخی حقیقت اور امرِ واقع یہ ہے کہ مصر کو کوئی فوج نہیں گئی۔ باقی سب باتیں ہیں جن کا عملی ثبوت کوئی نہیں اور جن کے راوی محض مسعودی جیسے نامعتبر لوگ ہیں، البتہ اشترنخعی وہاں گیا اور چونکہ اس کے لیے جو ''فرمانِ ولایت'' بتایا جاتا ہے وہ جعلی ہے، لہٰذا وہ یقیناً بطور خود گیا، محض اس لیے کہ مصر جیسا سبائی مرکز ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا اور اس کے آدمی

کثیر التعداد ہونے کے باوجود ناکام ہوئے جا رہے تھے۔ اس کے پیشِ نظر نہ ملت تھی اور نہ خلافت کی مضبوطی۔ وہ محض اپنے گروہ کی تنظیم کے لیے جا رہا تھا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اگر کسی کو بھیجتے تو مخلص اصحاب میں اس کی اہلیت کے لوگ بہت تھے۔ خود سیدنا قیس رضی اللہ عنہ کو راضی کر کے بھیجا جا سکتا تھا۔ دوسرے اگر جنگ کرنی ہی ہوتی تو ضرورت فوج بھیجنے کی تھی، کیوں کہ مقامی آبادی سے محمد بن ابی بکر کو مدد نہیں مل رہی تھی، ورنہ ایک بستی کو فتح کر لینا کیا بڑی بات تھی۔

دراصل وجہ یہ تھی کہ متارکۂ جنگ کی شرائط کے تحت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اس کے پابند تھے کہ اہلِ خربتا کے خلاف تمام کارروائیاں بند کر دیں۔ اس لیے اپنی طرف سے آپ نے یقیناً اس کی پاسداری کی۔ یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ خدا اور رسول کے نام پر جو عہد کیا جائے اسے علی رضی اللہ عنہ جیسا امام الاتقیاء بے محابا توڑ دے؟ مگر سرکشوں اور باغیوں کی ٹولی جو سیاست پر حاوی تھی اور آپ کی حکمتِ عملی کو نہیں چلنے دیتی تھی، اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ بارگاہِ خلافت کی طرف سے کسی قسم کی کوئی فوج مصر گئی ہو یا کسی درجہ میں محمد بن ابی بکر کی امداد کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا ہو یا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے وہاں کے حالات میں کچھ مداخلت کی ہو۔ صرف باتیں ہیں اور وہ بھی افترا پردازوں کی، عملی ثبوت کچھ نہیں۔ ایک طرف اہلِ خربتا ہیں اور دوسری طرف محمد بن ابی بکر، بلکہ کنانہ بن بشر تھا۔

یہی زمانہ ہے جب ثالث اپنا فیصلہ سنانے جمع ہوتے ہیں۔ ثالثوں کا فیصلہ کیا ہوا؟ اس پر بحث آگے آ رہی ہے۔ یہاں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ثالثی نامہ مرتب ہو چکنے کے باوجود اور فریقین کے نمایندوں کے تحریری عہد کے باوجود مصر میں امن نہیں اور اہلِ خربتا کو ہر وقت اپنے فنا ہونے کا خطرہ ہے۔ بالآخر ان حضرات کی طرف سے امداد طلب کی جاتی ہے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی مدد کے لیے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پانچ

ہزار فوج بھیج دیتے ہیں۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو سرکاری طور پر خط بھیجا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں۔ خود سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے بھی موقع پر پہنچ کر اپنی طرف سے انھیں لکھا کہ ''میدان سے ہٹ جاؤ، ہم نہیں چاہتے کہ کسی طرح تمھیں تکلیف پہنچے۔''[1] لیکن افسوس کہ وہ نہ مانے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی سی دیر میں مصر کا فیصلہ ہو گیا۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کام آئے اور کنانہ بن بشر مارا گیا۔

سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہی نے مصر کو فتح کر کے دار الاسلام بنایا تھا اور وہاں ایسا عادلانہ اور کریمانہ نظامِ حکومت قائم کیا تھا جو اہلِ مصر کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اس لیے مصر کی روایات نے آپ کی تشریف آوری کو غنیمت جانا اور سب لوگ خوش دلی کے ساتھ آپ کے ہم نوا ہو گئے۔

سیدنا قیس رضی اللہ عنہ کے چلے آنے کے بعد سبائیوں کی تخریبی حرکتیں اہلِ مصر کے لیے نفرت انگیز تھیں، اسی لیے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو اہلِ خربتا کے خلاف مصر سے امداد نہیں مل رہی تھی اور اسی لیے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو وہاں نظم و ضبط قائم کرنے میں کچھ دقت نہیں ہوئی۔ مصر میں اب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کوئی نمایندہ نہیں تھا۔ اہلِ خربتا کے موقف سے سب کو ہمدردی تھی۔ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے صورتِ حال سب کو سمجھا دی تھی، اس لیے مصر میں محض امن ہی قائم نہیں ہوا، بلکہ اہلِ شام کے موقف کے تعمیری رنگ کے سبب سب کی

---

[1] سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو جو مکتوب لکھا تھا اس کا متن علامہ خضری نے یوں نقل کیا ہے:

''امابعد! اے ابن ابی بکر، اپنی جان محفوظ رکھنے کے لیے میری راہ سے ہٹ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ہاتھوں تمھیں کوئی خراش پہنچے۔ اس علاقے کے سب لوگ تمھارے خلاف مجتمع ہیں۔ وہ تمھارا تسلط ہٹا دینے پر متفق ہو چکے ہیں اور تمھیں میرے سپرد کر کے رہیں گے اگرچہ معاملہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو جائے۔ لہٰذا یہاں سے نکل جاؤ، میں تمھارا خیر خواہ ہوں۔'' (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ۶/ ۱۷۷)

ہمدردیاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوگئیں اور یوں عملاً ہر طرف جنگ کے امکانات ختم کر دیے گئے، جو ثالثوں کا مقصد اور دونوں فریقوں کا مدعا تھا۔

لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رمضان ۳۸ھ میں جب ثالثوں نے فیصلہ سنایا تو اس سے پہلے ہی حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ قتل ہو چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنا فیصلہ سنانے مصر سے تشریف لائے تھے اور یہ بالکل غلط ہے۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اہلِ خربتا کو جو امداد بھیجی گئی وہ ثالثوں کے فیصلہ سنانے کے بعد کی بات ہے۔ اسی لیے لوگوں نے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مصر جانے کو جارحانہ فوج کشی سے تعبیر کیا ہے اور پسِ منظر یہ بنایا ہے کہ ثالثی کے فیصلے کو مسخ کر کے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ''مکر'' سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو توسیعِ ملک کی فکر کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے دوبارہ جنگ کی صورت میں انھیں اپنی پشت کی طرف سے اطمینان رہے۔ یہ سب تصور تلبیسِ محض ہے اور واقعات کو بالکل غلط رنگ میں پیش کر کے صورتِ حال کو مکروہ بنا دیا گیا ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔



تحکیم پر تبصرہ

ثالثوں کے تقرر کی تفصیل اوپر گزر چکی اور دونوں فریقوں کے معاہدوں کی بھی، لیکن یہاں ہم اس کے ایک ایک مسئلے پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخِ اسلام کا یہ ایک نہایت اہم واقعہ اس بری طرح مسخ کیا گیا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ایک گھناؤنا کوڑا کرکٹ ہے جس کی ڈھیر میں اصل حقیقت کا ہیرا دبا پڑا ہے۔

صحیفہ:

سب سے پہلے دیکھنا ہے ثالثوں کے تقرر کا عہد نامہ۔ دونوں فریق برابر کی اہمیت کے ساتھ عہد کرتے ہیں کہ وہ ثالثوں کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔ ثالث بھی اللہ اور رسول کی ذمہ داری پر عہد کرتے ہیں کہ وہ بالکل بے لاگ فیصلہ سنائیں گے۔ بشرطیکہ امت امن سوز حرکتوں سے محترز رہے۔ اس اہم ترین مقصد کے لیے کئی مہینے کی مدت مقرر ہوتی ہے جس میں ثالثوں کی باہمی رضا مندی سے توسیع بھی کی جا سکتی ہے۔ ثالثوں کو یہ بھی آزادی ہے کہ اپنی مدد کے لیے جتنے آدمیوں کو چاہیں بلا لیں۔ کسی شخص کو اختلاف نہیں کہ ایسا عہد نامہ مرتب ہوا تھا۔

اب اگر حیا اور دیانت ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حسنِ ظن رکھا جاتا اور داستانیں وضع کرتے وقت خدا کا خوف کیا جاتا کہ ہم اس بہترین امت کے رہنماؤں کی کیسی نفرت انگیز صورت پیش کر رہے ہیں۔ یہ معاہدہ بھی کیا یورپ کے سیاست دانوں کا تھا جو عہد کرتے ہی اس لیے ہیں کہ جب موقع ملے توڑ ڈالیں اور تمام اخلاقی اقدار کو خیر باد

کہہ کر محض اپنے مفاد کے درپے ہوں؟!

یہ معاہدہ کیا تھا قرشی عربوں نے جو جاہلیت کے زمانے میں بھی عہد شکنی کو موجبِ ننگ و عار اور منافیِ شیوۂ مردانگی جانتے تھے اور جنھیں عہد کی پاسداری میں جان و مال اور اقربا تک کو قربان کر دینے میں باک نہ تھا۔ تو کیا خاتم النبیین ﷺ کے اصحاب ایمان لا کر جاہلیت سے بھی گئے گزرے ہو گئے؟!

یہ معاہدہ کیا تھا سید المرسلین ﷺ کے بہترین اصحاب نے جنھیں حکم ہے:

﴿ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ [المائدۃ: ۱] ''عہد پورے کرو۔''

اور جن کی صفت ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ [المومنون: ۸]

''اور وہی جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔''

ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ ثالثوں نے یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوئی حرکت ایسی کی ہو جسے عہد شکنی یا بددیانتی سے تعبیر کیا جا سکے۔ اور حقیقت بھی یونہی ہے کہ سب نے پورے خلوص اور دیانت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا، لیکن یہ بات ہے اہلِ ایمان کی۔ مفسدوں کا حال مسعودی کی زبان سے سنیے:

''ولما وقع التحكيم تباغض القوم جميعاً وأقبَلَ بعضهم يتبرأ من بعض، يتبرأ الأخ من أخيه، والابن من أبيه، وأمر عليٌّ بالرحيل، لعلمه باختلاف الكلمة، وتفاوت الرأي، وعدم النظام لأمورهم، وما لحقه من الخلاف منهم، وكثر التحكيم في جيش أهل العراق، وتضارب القوم بالمقارع ونعال السيوف، وتسابوا، ولام كل فريق منهم الاخر في رأيه، وسار علي يؤم الكوفة، ولحق معاوية بدمشق من أرض الشام، وفرَّقَ

عساکرہ فلحق کل جند منھم ببلدہ" [1]

"جب ثالثوں کا تقرر ہو گیا تو پوری قوم میں نفرت پھیل گئی۔ سب ایک دوسرے سے تبرا کرنے لگے۔ بھائی نے بھائی سے بیزاری کا اعلان کیا اور بیٹے نے باپ سے، اس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کوچ کا حکم دے دیا، کیوں کہ آپ نے دیکھ لیا کہ کتنا اختلاف ہے، رائے میں تضاد ہے، نظم میں اختلال اور باہمی مخالفت کا کیا عالم ہے۔ اہلِ عراق کے لشکر میں زیادہ تر گفتگو تحکیم ہی کے مسئلے میں تھی۔ آپس میں کوڑے اور تلواروں کے دستے چلنے لگے۔ گالم گلوچ شروع ہو گئی اور سب ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی طرف کوچ کیا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کے علاقے میں دمشق کی طرف۔ وہاں انھوں نے اپنی فوجیں منتشر کر دیں اور سب لشکری اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔"

ثالثوں کے تقرر کے بعد کا یہ ہے وہ نقشہ جو مسعودی کو بھی پیش کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات: ۹]

"اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔"

نیز فرمایا:

﴿وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ [الأنفال: ٦١]

"اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسا کر۔"

---

[1] مروج الذھب (٤٠٥/٢)

لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ خود امتیوں کے مابین صلح ناگوار ہے اور قرآن کی طرف دعوت دینے کو مکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کفار حربی اگر جنگ بند کر دینے کی دعوت دیں تو نبی ﷺ اور آپ کی امت کو حکم ہے کہ اللہ پر بھروسا کر کے ہاتھ روک لیں، لیکن اشتر نخعی اس حکم سے بے پروا ہے۔ وہ اپنے امام کا بھی حکم ٹھکرا کر لڑائی جاری رکھنا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جذبات انھی لوگوں کے تھے جو فتنے کے بانی ہیں اور جو نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں خون ریزی بند ہو۔ انھیں معلوم تھا کہ اگر حالات پرامن ہو گئے تو پھر ہمارے منصوبے بروئے کار نہیں آ سکیں گے اور امت کی توجہ آپس میں الجھنے کے بجائے ہماری طرف ہو جائے گی، لیکن دونوں فریقوں کو یہ بات پسند تھی، کیوں کہ اس میں خود انھی کے جذبات جھلک رہے تھے۔ اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے مستقر پر پہنچ کر فوجیں منتشر کر دیں۔ مسعودی نے یہ بات صرف سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بتائی ہے کہ انھوں نے دمشق پہنچ کر لشکریوں کو اپنے اپنے گھر بھیج دیا۔ لیکن امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہی باور کرنا چاہیے، جیسا کہ مصر وغیرہ کے معاملے میں ہمیں عملاً نظر آ رہا ہے کہ آپ نے وہاں کسی قسم کی کوئی امدادی فوج نہیں بھیجی۔ اگرچہ افترا پرداز لوگ کہے جا رہے ہیں کہ آپ فوج بھیجنا چاہتے تھے، لیکن لوگ ہی جانے پر تیار نہیں ہوئے۔ ہم صرف واقعہ دیکھتے ہیں کہ فوج نہیں گئی اور نہ ثالثوں کے فیصلے کے مطابق جا سکتی تھی۔

ثالث:

ثالثوں کے متعلق خبیث النفس لوگوں نے قسم قسم کی روایتیں وضع کی ہیں۔ بعض بے عقل دین دار بھی الفاظ کے استعمال میں احتیاط نہیں برتتے اور نہ معاملہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے ذکی وفطین عالم اور مدبر شخص کو بے وقوف اور سادہ لوح بتایا جاتا ہے جنھیں بات سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی اور عیاذاً باللہ ایک ابلہ شخص تھے۔

"كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ" [1]

''اس کتے کی طرح جس پر بوجھ لادو تب بھی ہانپے گا اور نہ لادو تب بھی ہانپتا رہے گا۔''

مسعودی کے نزدیک (معاذ اللہ) یہ الفاظ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق استعمال کیے۔

گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفا اپنی مملکت کے انتظام کے لیے سادہ لوح اور بے وقوف لوگوں کو منتخب کیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا ہے (صحيح البخاري، كتاب استتابة المرتدين: ج ٤ ب ٢، طبع مصر) کہ لوگوں کو دین سکھائیں اور پھر ان کی ماتحتی میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو بھی مدد کے لیے بھیج دیا، یا فاروقِ اعظم نے انھیں قاضی بنایا اور عدلیہ کے متعلق ان کے لیے رسالہ مرتب کیا جو بعد کے تمام قاضیوں کا دستور العمل ہے یا امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں کوفہ کا والی بنایا تھا تو انھیں خبر نہ تھی کہ یہ ایک بے وقوف اور سادہ لوح شخص ہیں اور انھیں عملی سیاست میں حصہ لینے کا سلیقہ نہیں؟ امام محمد رحمہ اللہ نے "كتاب الآثار" میں لکھا ہے:

"ستة من أصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم يتذاكرون الفقه بينهم: ابن أبي طالب وأبي وأبو موسىٰ علاحدة، وعمر و زيد و ابن مسعود علاحدة"

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں چھے حضرات تھے جو فقہی مسائل پر باہم تبادلہ خیال کیا کرتے تھے: سیدنا علی بن ابی طالب، اُبی اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہم باہمی اور سیدنا عمر، زید اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم باہمی۔''

پھر امام ذہبی رحمہ اللہ نے "تذكرة الحفاظ" میں صفوان بن سلیم کا قول نقل کیا ہے:

---

[1] مروج الذهب (٢/ ٤١٠)

”لم یکن یفتي في زمن النبي ﷺ غیر عمر و علي و معاذ و أبي موسیٰ[1]“

”نبی کریم ﷺ کے زمانے میں صرف چار حضرات فتویٰ دیا کرتے تھے:
حضرت عمر، علی، معاذ اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم۔“

ان دونوں روایتوں کے لیے ملاحظہ ہو: علامہ شبلی کی ”الفاروق“ (ص: ۵۷۱) طبع ملتان۔

فقہی مسائل پر صرف وہی شخص فتویٰ دے سکتا ہے جسے نصوص پر عبور ہو، مسائلِ شریعت اس کی نگاہ میں ہوں اور قانونِ اسلامی کی روح سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفا کے عہد میں جس شخص کی عظمت کا یہ حال ہو، اسے مورخوں نے ابلہ واحمق کہا ہے۔ نعوذ باللہ من شرورھم

سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بس اتنا قصور ہے کہ آپ فتنہ وفساد سے روکتے تھے اور آپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مسلمانوں میں خون ریزی نہ ہو، بلکہ صلح و آشتی اور امن کے ماحول میں اپنے مسائل کا تصفیہ کریں۔ یہ ذہنیت احمقانہ ہے یا بغایت عاقلانہ اور مدبرانہ؟ آپ نے اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا، اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو نہایت چالاک، مکار، فتنہ پرداز، دنیا دار، باطل پرست اور ہوا و ہوس کا بندہ بتایا جاتا ہے، بلکہ بعض ”اہلِ تحقیق“ کے نزدیک وہ تو مسلمان ہی نہیں تھے یا اسلام لا کر مرتد ہو گئے تھے۔ گویا نبی کریم ﷺ اپنے بہترین اصحاب کے لشکر کی کمان ایک منافق کے سپرد کر دیتے تھے اور شاہِ عمان کے پاس تبلیغِ دین کے لیے سفیر بنا کر ایک چالاک ہوا پرست شخص کو بھیجا تھا جس نے اپنی دلنشین تقریر سے شاہِ عمان جیسے شخص کو رام کر لیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انھیں مصر کی مہم سپرد کر کے فتح کے بعد انہی کو وہاں کا والی بنا کر گویا امت پر ایک فتنہ پرداز شخص کو مسلط کر دیا تھا اور امورِ حکومت میں ایسے شخص سے مشورے کیا کرتے تھے جس کا دین ہی مشتبہ تھا۔

اللہ اور دعوتِ محمدیہ کے دشمنوں نے ان دونوں بزرگ ہستیوں کی جس طرح بے حرمتی کی ہے، وہ تو کرتے ہی کہ ان کا شعار ہے اور ان کی محفلوں کی روح کہ جب تک اصحابِ رسول ﷺ پر فقرے چست نہ کریں اور استہزاءً و استخفافاً ان کا ذکر نہ کر لیں ان کے نزدیک محض پھیکی رہتی ہے، لیکن افسوس ان لوگوں پر ہوتا ہے جو مدعیِ علم ہیں اور امام تسلیم کیے جانے کی ہوس میں مبتلا کہ ان کے قلم سے کس قسم کی باتیں نکلتی ہیں۔ اللہ نے انھیں یہ قلم چلانا اس لیے سکھایا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے بہترین اصحاب اور خلفا پر جھوٹ بولیں، اتہام لگائیں اور اس بات کا خوف نہ کریں کہ اپنے لکھے کی جواب دہی بھی کرنی ہے؟

اسلام اور مسلمانوں کو سبائیوں کی کتابوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا، جتنا ان مقدس مصنفوں کی تحریروں سے پہنچا ہے۔ کبھی تو خضری جیسے لوگ امت کے خیالی ماضی پر افسوس کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیانت اور مکارمِ اخلاق کا سبق پڑھانے بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی سیوطی جیسے حضرات اطمینان سے لکھ دیتے ہیں:

”فرفع أهل الشام المصاحف يدعون إلى ما فيها مكيدة من عمرو بن العاص. فكره الناس الحرب وتداعوا إلى الصلح“ [1]

”اہلِ شام نے مصاحف بلند کر دیے اور لوگوں کو احکامِ قرآنی کی طرف آنے کی دعوت دی۔ یہ چال عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی تھی، اس وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جنگ سے نفرت ہوگئی اور سب طرف سے صلح کی آوازیں آنے لگیں۔“

گویا ان صاحب کے نزدیک قرآن کی دعوت دینا چالاکی اور مکر ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں جنگ سے نفرت ہونا اور صلح کی خواہش کرنا مذموم ہے۔ پھر ثالثی کے فیصلے کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

”واجتمع الناس بأذرُح في شعبان من هذه السنة (يعني ٣٨هـ)

---

[1] تاريخ الخلفاء (ص: ٨٧) طبع مصر

وحضرها سعد بن أبي وقاص وابن عمر وغيرهما من الصحابة فقدم عمرو أبا موسىٰ الأشعري مكيدة منه فتكلم فخلع عليّا، وتكلم عمرو فأقر معاوية، وبايع له، فتفرق الناس على هذا، وصار علي في خلاف مع أصحابه حتى صار يعض على أصبعه ويقول: أعصىٰ ويطاع معاوية .... الخ“

”پھر لوگ اذرح کے مقام پر اسی سال (۳۸ھ) شعبان میں جمع ہوئے (حالانکہ اجتماع رمضان میں ہوا تھا)۔ سعد بن ابی وقاص اور ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ صحابہ بھی آ گئے۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے چال چلی کہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو آگے کیا۔ ابو موسیٰ نے گفتگو کی اور علی رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا۔ پھر عمرو رضی اللہ عنہ نے تقریر کی اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو (خلیفہ) تسلیم کر کے ان کی بیعت کر لی۔ اسی پر سب لوگ متفرق ہو گئے۔ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں اختلاف ہو گیا، حتی کہ علی رضی اللہ عنہ دانتوں میں انگلی دیتے اور کہتے: میری نافرمانی کی جاتی ہے اور معاویہ کی اطاعت!“

ان صاحب نے جہاں سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ کی جناب میں گستاخی کی ہے، وہاں ایک پر نہیں دونوں ثالثوں پر اتہام رکھا ہے اور پھر اس کی لپیٹ میں جمہور صحابہ کو لے لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر مکتب کا تعلیم یافتہ شخص جو اپنے آپ کو عالم کہتا ہے وہ ان مدعی امامت صاحب کے یہ الفاظ دہرا کر اپنے آپ کو مواخذہ سے بری سمجھ لیتا ہے۔ (راقم الحروف نے دہلی کے ایک مشہور عالم کو تاریخ الخلفاء کے حوالے سے ایسی ہی واہی روایتیں بیان کرتے خود سنا ہے)۔

مسعودی کے نزدیک سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حیثیت گدھے کی سی تھی: ﴿ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ﴾ [الجمعة: ٥] چار پائے برد کتابے چند۔[1]

---

[1] مروج الذهب (٢/ ٤١٠)

یہ ہے نقشہ جو اُن لوگوں نے اصحابِ رسول اللہ ﷺ کے کردار کا کھینچا ہے، یعنی جنھوں نے تمام عالم کو مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی، صدق و امانت کا سبق دیا اور تقویٰ کا شعور پیدا کیا وہ ایسے تھے!

﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۚ إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ﴾ [الكهف: ٥]

''بولنے میں بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے، وہ سراسر جھوٹ کے سوا کچھ نہیں کہتے۔''



ثالثوں کا فیصلہ

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فیصلہ سنانے سے پہلے ثالثوں میں کیا گفتگو ہوئی، کیوں کہ بیان کردہ کسی ایک بات کا بھی حتمی ثبوت نہیں۔ تحکیم کو جو صورت دی گئی ہے، اسی کو سچ کر دکھانے کے لیے قسم قسم کی خیالی باتیں لوگوں نے وضع کی ہیں اور سوائے کذب و افترا کے انھیں کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

کئی مہینے کے غور وخوض کے بعد انھوں نے ایک عہد نامہ مرتب کیا تھا جس کا متن قطعاً مفقود ہے۔ ثالثی نامے میں خود اس کی تصریح موجود ہے کہ ثالث جو فیصلہ کریں اسے قلم بند کر لیں۔ مسعودی کو اعتراف ہے کہ فیصلے کے تحریر ہونے کی روایت اسے پہنچی ہے اور اس کی بھی زبانی کوئی تقریر نہیں ہوئی۔[1]

عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب ثالثوں کا تقرر تحریر کے ذریعے ہوا، گواہوں نے اپنی گواہیاں اس پر ثبت کیں اور فریقین نے الگ الگ بھی اپنی رضا مندی اور فیصلے کی پابندی کا اظہار تحریری کیا تو لازماً فیصلہ بھی تحریری ہوا ہو گا۔ دونوں ثالثوں اور گواہوں نے اس پر دستخط ثبت کیے ہوں گے اور اس طرح سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوا ہو گا کہ اس تحریری دستاویز کو پڑھ کر سنایا گیا ہو اور اس کی ایک نقل دونوں فریقوں کے نمایندوں کے سپرد کر دی گئی ہو۔ گویا یہ سب افسانے ہیں کہ ثالثوں میں سے فلاں صاحب اٹھے، انھوں نے یوں کہا اور فلاں صاحب کھڑے ہوئے اور وہ یہ بولے۔

---

[1] مروج الذهب (٦/ ٤١١)

مسعودی نے ایسا فیصلہ لکھے جانے کی تفصیلات بھی دی ہیں اور پھر حسبِ عادت اس میں بے سروپا باتیں لکھ ماری ہیں۔ صحیح ہے کہ باہم جو گفت وشنید ہوئی ہو گی، اہل الرائے نے جو مشورے دیے ہوں گے، ان سب کا نچوڑ اور آخری فیصلہ اس میں مندرج کیا ہو گا۔ کس قدر حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اس اہم ترین تحریر کا متن اس بری طرح مفقود ہو گیا۔ دراصل یہ مفقود نہیں ہوا، بلکہ قصداً وعمداً اسے ضائع کیا گیا ہے کہ اصل صورتِ حال لوگوں کے سامنے نہ آ سکے۔ اس سے سبائی تحریک کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مسعودی کا بیان ہے اور خضری وغیرہ نے بھی تقریباً انھی تفصیلات کو نقل کیا ہے[1] کہ جب رمضان ۳۸ھ میں اذرُح (علاقہ دومۃ الجندل) میں فیصلہ سنانے کے لیے یہ ثالث جمع ہوئے تو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے چار سو نمایندے سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں آئے تھے، جن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی تھے اور آپ ہی کے سپرد تمام امور کا انصرام تھا۔ نماز کی امامت بھی آپ ہی کرتے تھے۔ اتنے ہی نمایندے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ خود سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما تشریف نہیں لائے تھے، البتہ کارروائیوں سے دونوں کو برابر باخبر رکھا جاتا تھا اور دونوں کے مراسلات اپنے اپنے نمایندوں کے پاس آتے رہتے تھے۔

خضری کا بیان ہے:

”وكان معاوية إذا كتب إلى عمرو جاء الرسول وذهب لا يدري بما جاء به ولا بما رجع به ولا يسأله أهل الشام. وإذا جاء رسول علي جاء أهل العراق إلى ابن عباس رضي الله عنهما فسألوا ما كتب إليك أمير المؤمنين فإن كتمهم ظنوا به الظنون وقالوا ما نراه إلا كتب بكذا أو بكذا. فقال لهم ابن عباس رضي الله عنهما: أما

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية (٢/ ٧١)

تعقلون أما ترون رسول معاوية يجيء ولا يعلم بما جاء به ويرجع ولا يُعلم بما رجع به ولا يسمع لهم صياح ولا لغط وأنتم عندي كل يوم تظنون الظنون"

''سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جب سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی مراسلہ بھیجتے تو پیغام رساں آتا اور جاتا، کسی کو خبر نہ ہوتی کہ کیا پیغام لایا اور کیا مراسلہ لے گیا۔ اہلِ شام آپ سے کوئی بات دریافت نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قاصد آتا تو اہلِ عراق سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آ کر دریافت کرتے، امیر المومنین نے آپ کو کیا لکھا ہے؟ آپ اگر ان سے بات پوشیدہ رکھتے تو پھر خود ہی تکے لڑایا کرتے کہ امیر المومنین نے ہماری رائے میں فلاں فلاں بات ہی لکھی ہوگی۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان سے فرمایا: ''تم کبھی سمجھ سے بھی کام لو گے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا قاصد آتا ہے تو نہ اس کی خبر ہوتی ہے کہ کیا پیغام لایا اور نہ اس کی کہ کیا خبر لے گیا۔ نہ ان کے ہاں آوازیں بلند ہوتی ہیں اور نہ شور وغوغا ہوتا ہے مگر تم ہو کہ میرے بارے میں روز اٹکل پچو اڑایا کرتے ہو۔''

اہلِ عراق اور اہلِ شام کی ذہنیت، نظم، وفاداری، باہم اعتماد اور اطاعتِ امیر کی کیفیت کا موازنہ اس صورتِ حال سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً دونوں گروہوں کے ہاں روزانہ یہی منظر رہا کرتا ہوگا۔

اذرُح:

آج کل کے جغرافیہ کے مطابق یہ مقام شرق اردن اور سعودی عرب کے درمیان جنوب کی طرف شام کے علاقے میں تھا۔ ایک فرانسیسی مورخ کا بیان ہے کہ اس اجتماع کے تمام ارکان کے قیام و طعام کا انتظام سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے تھا۔ اس قول کی

تائید مسعودی کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک موقع پر سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو موسیٰ سے عرض کی تھی، کیوں کہ ہر موقع پر انہی کو مقدم رکھا کرتے تھے:

”ولك حقوق كلها واجبة لسِنّك وصحبتك رسول الله ﷺ وأنت ضيف“[1]

”تمام حقوق آپ ہی کے ہیں۔ ایک تو عمر کے اعتبار سے بزرگی اور پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں طویل مدت تک حاضری اور اس کے علاوہ آپ ہمارے مہمان بھی ہیں۔“

اذرُح چونکہ شام کی سرحد میں تھا، اس لیے یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ طرفین کے نمایندوں کی مہمان داری سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوئی ہو اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متارکۂ جنگ کے بعد عالمِ اسلام میں کیسی پرامن اور خوش آیند فضا قائم ہو گئی تھی اور جو دونوں حریف گروہ تھے ان میں کیسی مودت واخوت کا سماں بندھ گیا تھا۔

خرافات:

تحریری فیصلے کے متعلق مسعودی کے بیان کا تضاد اور خضری وغیرہ کی لغو تفصیلات اس قابل نہیں کہ ان پر قانونی حیثیت سے محاکمہ کیا جا سکے۔ کوئی بات باقاعدہ حوالے سے بیان نہیں کی گئی۔ اس مجموعۂ روایات پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو اتنا پتا چلتا ہے کہ دونوں ثالث اس امر پر متفق تھے کہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کو ظلماً شہید کیا گیا اور ان کے ولی کو قصاص کے مطالبے کا حق ہے۔ یہ بھی گفتگو ہوئی کہ اہلِ عراق کبھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو پسند نہیں کریں گے اور اہلِ شام کے ہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ مقبول نہ ہوں گے، لہٰذا دونوں کو معزول کر کے کسی تیسرے شخص کو منتخب کیا جائے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مختلف نام پیش کیے مگر سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بضد رہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں۔ وجہ یہ تھی

---

[1] مروج الذهب (٤٠٧/٢)

کہ وہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔

چنانچہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت پر بھی سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ راضی نہیں ہوئے (حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگ صحابی تھے، عشرۂ مبشرہ میں تھے، فاتحِ قادسیہ تھے اور ان چھ بزرگواروں میں سے تھے جنھیں امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے نامزد کیا تھا اور پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سیدنا ابو موسیٰ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی طرح وہ غیر جانبدار بھی رہے۔ ان کی فتوحات شاندار تھیں اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں انتظامِ مملکت کا تجربہ بھی حاصل کر چکے تھے) ان کا نام ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے محض اس لیے رد کر دیا کہ اپنے داماد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنائیں۔ (حالانکہ ادنیٰ ترین درجے میں بھی انھیں عملی سیاست میں حصہ لینے کا موقع کبھی نہیں ملا تھا) اس قسم کی اور بھی فضول و لایعنی اور خیالی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کی اندرونی تفصیلات انھیں ناقابلِ قبول بنا دیتی ہیں۔

ایک اور روایت:

سب سے زیادہ قوی روایت وہ ہے جو امام دارقطنی رحمہ اللہ کے حوالے سے حضرت امام ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ نے "العواصم من القواصم" (ص: ۱۷۸) میں نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"حضین بن منذر (جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں تھے اور جمل وصفین میں آپ ہی کی طرف سے لڑے تھے) بیان کرتے ہیں: جب عمرو رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا تو میں گیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے خیمے کے قریب اپنا خیمہ لگایا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو مجھے بلایا اور کہا: ان صاحب (یعنی عمرو رضی اللہ عنہ) کے متعلق مجھے اس اس قسم کی باتیں معلوم ہوئی ہیں، تم تحقیق کرو کہ صحیح ہیں یا نہیں۔"

کہتے ہیں: "میں نے جا کر پوچھا کہ آپ کے اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے سپرد جو کام ہوا تھا اس میں آپ نے کیا کیا؟ فرمایا: لوگ بہت کچھ کہہ رہے ہیں، بخدا

بات وہ نہیں جو انھوں نے بنائی ہے، بلکہ ہوا یہ کہ میں نے ابوموسیٰ سے کہا: اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ اس معاملے کو ان لوگوں کے سپرد کر دیا جائے جن سے رسول اللہ ﷺ راضی ہو گئے۔ میں نے کہا: میرا اور معاویہ کا کیا ہوگا؟ کہنے لگے: اگر تم سے مشورہ لیا گیا تو تم اس کے اہل ہو، اور اگر نہ لیا گیا تو بہت سی باتیں ہیں جہاں اللہ نے تمھاری مدد سے بے نیاز رکھا ہے۔ بس یہ بات ہے جس سے معاویہ مرے جا رہے ہیں۔

حصین کہتے ہیں: پھر میں معاویہ کے پاس گیا اور انھیں سب بات بتا دی، انھوں نے ابوالاعور ذکوانی کو بلایا (جو صحابی ہیں اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بہت معتمد سپہ سالار تھے) اور انھیں سواروں کا ایک دستہ دے کر عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور چیختے ہوئے وہاں پہنچے۔ کہاں ہے وہ اللہ کا دشمن، کہاں ہے وہ فاسق؟

اس بات کے راوی ابو یوسف کہتے ہیں: ''غالباً وہ اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا کرنے پر تلے ہوئے تھے (یعنی سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ کے قتل کے گناہ پر) عمرو رضی اللہ عنہ نے جو یہ دیکھا تو خیمے میں ایک گھوڑا کھڑا تھا، اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو گئے اور ایڑ لگاتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ کے خیمے تک گئے اور کہا:

''إِنَّ الضَّجُوْرَ قَدْ تَحْتَلِبُ الْعَلْبَةَ يَا مُعَاوِيَة! إِنَّ الضَّجُوْرَ قَدْ تَحْتَلِبُ الْعَلْبَةَ''

''مرکھنی اونٹنی بھی دودھ دیتی ہے معاویہ! مرکھنی اونٹنی بھی دودھ دیتی ہے۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا:

''أَجَلْ! وَتَرْبُذُ الْحَالِبُ فَتَدُقُّ أَنْفَه وَتَكْفَأُ إِنَاءَ هُ''

''ہاں! مگر وہ دوھنے والے کے منہ پر مار کر اس کی ناک توڑ دیتی ہے اور برتن

گرا دیتی ہے۔“

یہ ہے حال سب سے قوی روایت کا، اسے قبول کیا جا سکتا تھا، کیوں کہ دارقطنی رحمہ اللہ کی ہے جو طبری وغیرہ سب سے بلند رتبہ اور عادل ہیں، جن کے سامنے مسعودی جیسے لوگ کسی قطار و شمار میں نہیں۔ پھر اس کے راوی ہیں ایک ایسے صاحب جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں اور متارکۂ جنگ سے پہلے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے مخالفوں میں تھے، لیکن اس کی تفصیلات میں کئی باتیں ہیں جو اسے محلِ نظر بنا دیتی ہیں:

① من جملہ ازاں یہ ہے کہ اس روایت کے مطابق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو اذرُح میں ماننا پڑے گا، جو ثابت نہیں۔ وہاں نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے اور نہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ۔ اگر سمجھا جائے کہ حضین کی یہ آمدورفت اذرح اور دمشق کے درمیان تھی، تب بھی بات نہیں بنتی۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق کے قیام میں خیمے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ وہ سب روایتیں غلط ہیں جن سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا اذرح میں موجود نہ ہونا ثابت ہے، یعنی آپ یقیناً وہاں موجود تھے تو ظاہر ہے کہ آپ کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ فیصلہ سناتے وقت آپ کی موجودگی کو غیر ضروری سمجھا جائے۔ آپ خود فریق تھے اور اپنے گروہ کے امام۔ لہٰذا اس اجتماع میں آپ کی جگہ صفِ اول میں ہو گی۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ جب مجمع میں ایک اعلان کیا جائے یا تحریر پڑھ کر سنائی جائے تو جو وہاں حاضر ہو اور سب سے ممتاز جگہ بھی بیٹھا ہو اسے اس اعلان کی تفصیلات کی تحقیق کی ضرورت اس طرح نہیں ہوتی جیسے حضین نے بیان کی ہے۔ اگر آپ مجمع میں تشریف نہ بھی لائے ہوں تو تمام تفصیلات آپ کے اپنے معتمد نمایندے آپ کی خدمت میں سرکاری حیثیت سے گوش گزار کرتے۔ آپ کی حیثیت یہ نہیں تھی کہ سنی سنائی باتیں آپ تک پہنچیں اور نہ ان باتوں کے پہنچانے والے عراقی مزاج کے لوگ تھے۔ یہ باتیں تو آپ کے وفادار اور معتمد کارکن گوش گزار کرتے۔

② دوسری ناقابلِ قبول بات ہے دونوں کو معزول کر دینے کا ذکر، جس پر بحث آگے آرہی ہے۔

③ تیسری ناقابلِ قبول بات ہے حصین کے ذریعے تحقیق جو فریقِ مخالف سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر آپ نے اپنے آدمیوں پر اعتبار نہیں کیا تھا تو پھر تحقیق کے لیے ان میں سے کسی صاحب کا انتخاب کرتے جو غیر جانبدار تھے، مثلاً: سیدنا سعد رضی اللہ عنہ یا ابن عمر رضی اللہ عنہما۔ کیوں کہ یہ امر مسلم ہے کہ دونوں فریقوں کے چار چار سو نمایندوں کے علاوہ وہاں ایک جماعت غیر جانبدار حضرات کی بھی تھی، مثلاً: عشرہ مبشرہ میں سے سعد بن ابی وقاص اور سیدنا سعید بن زید، ابن عمر اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم وغیرہم۔

یہ جتنی روایتیں ہیں ان کے ڈرامائی انداز اور تضاد سے قطع نظر کر لیں، تب بھی معاہدہ تحریری ہو یا اس کے مطابق ثالثوں کی تقریر زبانی، سب میں یا ایک کو معزول کر دینے کا ذکر ہے یا دونوں کو معزول کر کے کسی تیسرے صاحب کو منتخب کرنے کا۔ یہی وہ چیز ہے جو اس موضوع پر تمام روایتوں کو ساقط عن الاعتبار بنا دیتی ہے۔ یہ لوگوں کا اپنا اپنا بیان ہے یا تصور جو اپنے خیال میں انھوں نے ثالثوں کے فیصلے کے بارے میں قائم کر رکھا ہے یا ثالثوں کا بیان سننے کے بعد اسے قصداً مسخ کر دیا ہے۔ اس لیے ہمیں صرف واقعات کے استقصا سے ثالثوں کا فیصلہ اور اس کا نتیجہ معلوم کرنا ہوگا۔ امت کی یہ بدقسمتی ہے اور دشمنانِ امت کی کامیابی کہ ایسی اہم دستاویز اور اس طرح غائب کر دی گئی۔

تجزیہ:

① سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت کے مدعی ہی کب تھے جو انھیں معزول کرنے یا مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی اصلاً موضوعِ بحث نہ تھی، بلکہ مسئلہ تھا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص کا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت محض اس لیے ضمناً زیرِ بحث آئی تھی کہ یہی قاتل اور مفسد آپ کی حکومت پر مسلط تھے۔ اگر آپ ان سے علاحدگی اختیار کر لیتے یا امت کو ان کے خلاف منظّم ہونے کی دعوت دیتے، یعنی وہی

موقف رکھتے جو جنگِ جمل کے موقع پر طے ہو گیا تھا تو کسی کو آپ کے خلیفہ تسلیم کرنے اور بیعت کر لینے پر اعتراض نہ تھا، لیکن جنگِ جمل جس طرح شروع اور ختم ہوئی اس سے اصل مسئلہ جو وجۂ نزاع تھا ''غتر بود'' ہو گیا۔ غضب یہ ہوا کہ تمام مخلصوں کی رائے کے خلاف امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے مستقل طور پر مدینہ چھوڑ دیا اور آ کر گھر گئے کوفیوں اور بصریوں میں۔ جن کے چنگل سے نکلنے کی سبیل پھر نہ نکل سکی اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

خلافت تو اہلِ حل و عقد میں سے دو آدمیوں کے بیعت کر لینے سے بھی منعقد ہو جاتی ہے، بشرطیکہ امت تسلیم کر لے، لہٰذا آپ کی خلافت پر اجماع ہو جانا لازمی تھا، کیوں کہ آپ ہر طرح اس کے اہل تھے اور کسی کو آپ کے مقام و عظمت کا انکار نہ تھا۔ جتنے حضرات نے بیعت سے احتراز کیا تھا، اس کا سبب محض قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ تھی اصل اور انہی قاتلوں کے استیلاء کے سبب خلافت کا مسئلہ ضمناً اٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور مسئلہ زیرِ بحث نہ تھا۔ لہٰذا یہ تصور ناممکن ہے کہ ثالثوں نے اصل مسئلہ نہیں سمجھا یا جان بوجھ کر اسے خلافت کا مسئلہ بنا دیا اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ گویا خلافت کے دو مدعی ہیں جن کے مابین انھیں فیصلہ کرنا ہے۔

② اگر کہا جائے کہ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے عین وقت پر متفقہ فیصلے کے خلاف سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کر دیا اور اس کی پروا نہیں کی کہ معاملہ کیا تھا اور وہ اسے کیا بنا رہے ہیں تو یہ تصور قطعاً بالکل باطل ہے۔ خود ان افترا پرداز مورخوں کو اعتراف ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت اس وقت تک نہیں ہوئی تھی جب تک سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے ان کے خلیفہ بنانے کا اعلان نہ کر دیا تو اب سوال ہے کہ جب یہ ثالث دونوں کو معزول کرنا چاہتے تھے تو یہ عزل کس اعتبار سے ہوتا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلافت سے معزول کیا جاتا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو امارتِ شام سے، اگر ایسا کر بھی دیتے تو

اس مسئلے کا حل کیا نکلتا؟!

③ اگر کہا جائے کہ وہ کسی تیسرے صاحب کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے جیسا کہ مسعودی وغیرہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنانے پر سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو اصرار تھا تو کیا ان دونوں کے ہاتھ میں یہ طاقت تھی کہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو ان کے علاقے سے بے دخل کر دیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام سے نکال دیں اور یوں تمام امت کی مرکزی طاقت ایک تیسرے صاحب کے تحت کر دیں؟ نیز کیا تیسرا شخص اپنی پشت پر اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اپنے حق میں ثالثوں کا فیصلہ سننے کے بعد اپنی خلافت قائم کر لے؟ کیا رائے عامہ کی تربیت ہو گئی تھی؟ کیا اذرُح کا مجمع تمام امت کا نمایندہ اجلاس تھا، یا کم از کم ایک لاکھ آدمی یہ عہد کر چکے تھے کہ ثالث جس کے نام پر اتفاق کریں گے ہم اس کی پشت پر ہیں اور ہر اس شخص سے لڑیں گے جو اس فیصلے سے سرتابی کرے؟

اگرچہ ٹھیک ہے کہ ثالثی نامہ میں امت کا یہ فرض بتایا گیا تھا:

”وهم أنصار على من ترك هذه الصحيفة و أراد فيه إلحادا و ظلما“

”اور وہ سب یعنی تمام مسلمان اس شخص کے خلاف ان ثالثوں کا ساتھ دیں گے جو ثالثی نامے کی خلاف ورزی کرے یا ہٹ دھرمی اور ظلم سے اس کا مقصد فوت کرنا چاہے۔“

اب اگر بالفرض یہ سب باتیں ہو جائیں تب بھی ثالثوں نے اپنے ذمے یہ فرض عائد کیا تھا کہ وہ امت کو دوبارہ جنگ میں نہیں دھکیلیں گے اور ایسی کوئی بات نہیں کریں گے جو اللہ و رسول کے حکم کے خلاف ہو اور جس کا نتیجہ اختلال و اختلاف نکلے۔ لہٰذا ان کا فیصلہ ایسا ہونا چاہیے تھا جو موجبِ امن ہو، لیکن ان کے یہ دونوں فیصلے جو بیان کیے جاتے ہیں، ظاہراً و باطناً عہد نامے کے خلاف ہیں اور امت کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دینے کے مرادف۔

دونوں کے عزل کی صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام امت کی رائے عامہ

استوار ہو چکی تھی اور وہاں جتنے لوگ جمع ہوئے تھے وہ یہ تہیا کر کے آئے تھے کہ ثالث جب اپنا فیصلہ سنائیں گے تو بہر حال اسے نافذ کر دیا جائے۔ یعنی اس اجتماع کے علاوہ بھی ثالثوں کو اتنے بڑے مسلح اور موثر جمِ غفیر کی حمایت حاصل تھی کہ اگر کسی طرف سے اُن کے فیصلے پر احتجاج ہوتا تو اسے قوت کے ساتھ دبا دیا جاتا۔

دوسری صورت میں یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو معزول اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اعلان سے دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں: یا تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو خلیفہ برحق سمجھ کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کرتے کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں اور بیعت کر لیں۔ یا پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے اعلان ہوتا کہ ثالثوں میں سے ایک نے یا دونوں نے غداری کی ہے۔ ایک کی حماقت اور دوسرے کی چالاکی سے پرانا جھگڑا مٹنے کے بجائے نیا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ لہٰذا یہ سب کارروائی ناجائز ہوئی ہے اور اس کے نتیجے میں دوبارہ جنگ چھیڑ کر شام پر حملہ کر دیتے۔

اہلِ باطل نے یہی باتیں ثابت کرنے کے لیے قسم قسم کی روایتیں وضع کی ہیں اور باور کرانا چاہا ہے کہ واقعی سیدنا علی رضی اللہ عنہ تو فوجوں کو شام پر حملہ کرنے کے لیے ابھارتے تھے لیکن فوج آگے بڑھنے پر تیار نہیں ہوتی تھی، اس لیے مجبور ہو گئے۔ یہ روایتیں قبول کی جا سکتی تھیں بشرطیکہ ان کا کوئی عملی ثبوت بھی ہوتا۔ کوئی شخص باور نہیں کر سکتا اور کسی صاحبِ فہم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی کہ جس شخص کے قبضے میں شام و مصر کے علاوہ باقی تمام عالمِ اسلام ہو، اسے ضرورت پڑنے پر فوج نہ مل سکے۔ اگر کوفہ اور بصرہ کے لوگ غدار تھے تو کیا آپ کے والی اتنی بھی حیثیت نہ رکھتے تھے کہ آپ کے طلب کرنے پر دو دو چار چار ہزار آدمی فوج کشی کے لیے بھیج دیں؟ صحیح روایت ہے جو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے تحت آگے بیان ہو گی کہ آپ (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) کے جھنڈے کے نیچے انہی اہلِ عراق میں سے لڑنے کے لیے ایک طاقتور فوج جمع ہو گئی تھی، تو بڑا تعجب ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو فوج

میسر نہ آ سکی، حالانکہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے زیرِ تصرف بہت ہی کم اور محدود رقبہ تھا۔

اس کے بعد سوال ہے کہ دونوں ثالثوں کی یا ایک کی غداری سے جو شخص ناجائز طریقے پر بددیانتی سے خلیفہ بن بیٹھا تھا، اس کی فوجیں عراق کی کس سرحد پر تھیں اور وہ خود کوفے سے کتنی دور پڑاؤ ڈالے پڑا تھا کہ عراق کی طرف سے حملہ ہو تو مدافعت کر سکے؟ ادنیٰ ترین عقل کا آدمی بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ ایک ہوا پرست، مکار، بے دین شخص جس کی حکومت کا اعلان ہو چکا ہے، جس کی طاقت مجتمع ہے، جس کی فوج منظّم ہے اور وہ فوج ایسی ہے کہ بیس برس سے بازنطینی حکومت کے لیے وبالِ جان بنی ہوئی ہے، وہ حریف کے اندرونی اختلال سے فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ اگر عراق پر حملہ کرنے سے اس پر اشترنخعی جیسے سورماؤں کا رعب طاری تھا تو اشتر مر چکا تھا اور عراقی فوج میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ''دشمن'' کی طاقت کے متعلق تمام خطرات رفع ہو چکے تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے عراق پر حملہ نہیں کیا؟

ہم دیکھتے ہیں کہ آپ مستقلاً دمشق میں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ کی فوج کا کوئی حصہ عراق کی سرحد پر نہیں۔ آپ نے تو ثالثوں کا فیصلہ سننے کے لیے اذرُح آنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

فیصلہ جب سنایا جاتا ہے تو دونوں فریقوں کے چار چار سو بڑے سردار اور ذی رتبہ اشخاص وہاں موجود ہیں، غیر جانبدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی ایک جمعیت حاضر ہے، لیکن فیصلہ سننے کے بعد کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا اور خوش اسلوبی کے ساتھ تمام حاضرینِ اجلاس اپنے اپنے مستقر واپس ہو جاتے ہیں۔ اگر بات وہ ہوتی جو بیان کی جاتی ہے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ میں باقاعدہ جنگ سے پہلے معرکہ قتال گرم ہوتا اور دونوں ثالثوں کو نہیں تو کم از کم ایک کو یقیناً قتل کر دیا جاتا۔

یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ فیصلہ اتنا امن پسندانہ، عاقلانہ اور مدبرانہ تھا کہ کسی فریق

کے جذبات میں ہیجان پیدا نہیں ہوا اور نہ اس فیصلے کے بعد دونوں اماموں نے کوئی ایسی حرکت کی جسے حریفوں کے مابین نقضِ امن سے تعبیر کیا جا سکے۔ کسی محاذ پر سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کی فوجوں میں تصادم نہیں ہوا۔ کوئی شخص کسی ادنیٰ ترین اور مردود روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ صفین کے وقت جو ہتھیار اٹھائے گئے تھے اور متارکۂ جنگ کے وقت رکھ دیے گئے، وہ کبھی دوبارہ ایک دوسرے کے خلاف اٹھائے گئے ہوں۔

یہ ثبوت ہے عملی، یقینی اور حتمی کہ تحکیم کے بارے میں یہ جتنی متضاد روایتیں دشمنانِ دین وملتِ محمدیہ نے وضع کی ہیں، ان میں سے ایک بھی قابلِ استناد نہیں۔ سب نے واقعے کی صورت مسخ کر دی ہے، حتی کہ دارقطنی رحمہ اللہ کی روایت بھی اس طرح قبول نہیں کی جا سکتی، جس طرح "العواصم من القواصم" میں امام ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ نے قبول کی ہے۔

البتہ یہ روایت سنداً قوی ہے، لیکن یقیناً بعد کے کسی راوی نے اس میں معناً تصرف کر دیا ہے، پھر بھی اس میں ایک فقرہ ایسا موجود ہے جس سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے، یعنی معاملہ ان حضرات کے سپرد کر دیا جائے جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے۔

راوی کی یہ غلط فہمی تھی کہ انھوں نے ان اصحاب میں سے کسی کے خلیفہ منتخب کرنے کا خیال پیدا کر لیا یا اس کا کہ ثالثوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ یا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یا دونوں کو معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ثالثوں کا عیاناً مقصد یہ تھا کہ مابہ النزاع مسئلے کا تصفیہ ان بزرگواروں کے سپرد کر دیا جائے جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے۔ نہایت حماقت اور انتہائی گستاخی ہو گی اگر یہ سوچا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا علی، سیدنا معاویہ، سیدنا ابوموسیٰ اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم سے راضی نہیں تھے۔ نہ یہ بزرگوار ایسی رکیک اور خلافِ واقعہ بات سوچ سکتے تھے، لہٰذا ان لوگوں کو جو انتہائی دیدہ دلیری سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن کرتے ہیں، یہ طعن خود اپنی عقل پر کرنا چاہیے اور ماتم اپنے ایمان پر کہ بات کیا تھی اور انھوں نے اسے کر کیا دکھایا؟!

ثالثوں کا عندیہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ معاملہ خود ان کے ہاتھ میں رہنے کے بجائے جمہور کے ان عظیم المرتبت نمایندوں پر ڈال دیا جائے جو اللہ و رسول کے ہاں مقبول ہیں اور مسئلہ مابہ النزاع میں فریق نہیں۔ اس طرح امت کے مسائل میں بات کرنے کا حق رکھنے سے وہ لوگ خود بخود نکل گئے جو جماعت سے خارج تھے یا جنھیں صحبتِ نبوی کا شرف حاصل نہیں تھا۔

ثالثوں کی یہ للّٰہیت، خلوص اور عبدیت تھی کہ انھوں نے غور و خوض کے بعد محض اپنے آپ کو اس کا مجاز نہیں سمجھا کہ امت کے نمایندوں سے بالا ہو کر بطورِ خود کچھ فیصلہ سنا دیں، یا محض بڑے بڑے لوگوں کی رائے لینے ہی پر اکتفا کر لیں، ان کے نزدیک ضروری تھا کہ اصحابِ رسول ﷺ کے ایک عام اجتماع میں اس قضیے کا فیصلہ ہو۔

چونکہ فیصلے کا اصل متن مدون شکل میں ہمارے سامنے نہیں اور نہ کسی معتبر و مستند روایت سے اس کی تفصیلات متعین شکل میں معلوم ہوسکتی ہیں، اس لیے قانوناً اس کی تنقیح نہیں کی جاسکتی اور محاکمہ ناممکن ہے، لیکن بیان کردہ باتوں کے مشترک امور اور فیصلے کے بعد واقعاتِ ثابتہ سے جو اندازہ ہوتا ہے اور جو تاریخی حقائق کی روشنی میں نہایت صائب اور اطمینان بخش معلوم ہوتا ہے جس سے لوگوں کی پیدا کردہ وہ تمام الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے اصحاب کے شایانِ شان ہے جو حاضرینِ اجلاس کی طمانیتِ قلب کا سبب ہوسکتا تھا اور جس کے نتیجے میں اجلاس پرامن طریقے سے برخواست ہوگیا، وہ صرف یہ ہے:

① دونوں ثالث اس امر پر متفق تھے کہ اصولاً دونوں فریق حق پر ہیں۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص واجب ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بالفعل درست۔

② دونوں نے خطائے اجتہادی کی۔ ایک نے اپنی خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم کرنے کے لیے تلوار اٹھا کر اور دوسرے نے قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر۔

لہٰذا دونوں کو اس موقف سے معزول کیا جاتا ہے۔ یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ تلوار روکیں

اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ قصاص لینے کا معاملہ اپنے ہاتھ میں نہ رکھیں۔

③ دونوں باتوں کا فیصلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک عام اجتماع میں ہو جس میں وہی حضرات شریک ہوں جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس اجلاس میں اور کوئی نہ ہو اور اس مقصد کے لیے رائے عامہ استوار کی جائے، تاکہ مقبولِ عام اربابِ حل وعقد جب فیصلہ کریں تو ان کی پشت پر طاقت ہو۔

④ جب تک عام اجتماع میں فیصلہ نہ ہو اس وقت تک دونوں فریق اپنے اپنے زیرِ نگیں علاقوں کا نظم ونسق بدستور چلاتے رہیں، لیکن ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائیوں کا سلسلہ قطعاً مسدود رہے۔

گویا ثالثوں نے حکومت اور تصرف فی البلاد کے اعتبار سے نہ ایک کو معزول کیا اور نہ دوسرے کو۔ انھوں نے صرف اصولاً طے کیا کہ زیرِ بحث معاملات کے تصفیہ کے لیے ان اصحابِ رسول پر بھروسا کریں جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے اور جن کی شہادت اور فیصلہ عند اللہ والناس مقبول ہے۔ یہ عزل اس اعتبار سے تھا نہ کہ اس صورت سے جو لوگوں نے مسخ کر کے پیش کی ہے۔

اس فیصلے کے کارگر ہونے کی توقع دونوں ثالثوں کو اس بنا پر تھی کہ پچھلے چند ماہ میں جس طرح امن قائم رہا اور فریقین آپس میں نہیں الجھے اسی صورت کو کچھ دن اور قائم رکھا جائے، لہٰذا انھوں نے امن کی مدت میں بلاتعیینِ وقت توسیع کر دی، اس توسیع کا اختیار انھیں ثالثی نامے میں دیا گیا تھا اور ثالثی نامے ہی میں انھیں اس کا بھی اختیار دیا گیا تھا کہ اپنے فیصلے میں اگر چاہیں تو دوسرے حضرات کی رائے بھی شامل کر لیں۔

ثالثوں کی یہ فراستِ ایمانی تھی اور خلوص تھا کہ انھوں نے اتنے بڑے فیصلے کی ذمے داری محض اپنے سر نہیں رکھی، بلکہ اس کا حق پوری امت کو دے دیا کہ امت کے صحیح رہنما اور تمام مستند نمایندے اس کا فیصلہ کریں۔ یہ دو آدمیوں کا، دو فریقوں کا یا دو خاندانوں

کا معاملہ نہیں تھا کہ دو صاحب باہمی سمجھوتے سے کوئی فیصلہ کر دیں۔ یہ مسئلہ تھا تمام امت کے حال و استقبال کا، اس لیے اسلم و احسن طریقہ یہی تھا کہ تمام امت کے بہترین افراد کے سر پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے۔ اس سے زیادہ عادلانہ اور حکیمانہ فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا اور سوائے اس کے کسی ایسے تصفیہ کا امکان نہ تھا کہ جس پر فریقین بھی راضی ہو جائیں اور غیر جانب دار طبقہ بھی جو اس وقت امت کا سوادِ اعظم تھا اور جذبات سے عاری ہو کر اطمینان سے مسائل کا احصاء کر سکتا تھا۔

جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنگ کے خلاف تھے، سب نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بالفعل تسلیم کر لی تھی، لیکن آئینی حیثیت سے بیعت نہیں کی تھی۔ سب چاہتے تھے کہ شہیدِ مظلوم امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور اس مردود گروہ سے امت کو نجات دلائی جائے جو سیاساتِ اسلامیہ پر بغیر حق مسلط ہو گیا تھا۔

یہ لوگ جنھوں نے تاریخ کی کتابوں کے اوراق سیاہ کیے ہیں، انھوں نے امت کے سوادِ اعظم کو قطعاً نظر انداز کر دیا اور یہ نہیں دیکھا کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ان جھگڑوں سے الگ رہے، وہ بھی نظریات و تصورات رکھتے تھے، انھیں بھی بولنے کا حق تھا، بلکہ اصل حق انھی کا تھا اور انھی کے ہاتھ میں میزانِ عدل تھی۔ ثالثوں نے ان کے جذبات کی پذیرائی کی اور ان کا واجبی حق انھیں دے دیا، کیوں کہ جماعت جسے کہتے ہیں وہ وہی تھے اور انھی کا حق تھا کہ زمامِ کاران کے ہاتھ میں آئے، اسی جماعت کا یہ عقیدہ تھا جو ثالثوں نے اپنے فیصلے میں پیش کیا۔

جماعت شروع سے کہتی چلی آ رہی ہے کہ فریقین حق پر تھے، البتہ ان سے اجتہادی خطا ہوئی۔ اختلاف صرف اتنا ہے کہ خطا دونوں سے ہوئی یا ایک سے، اور ایک سے ہوئی تو کس سے یا دونوں سے نہیں ہوئی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "منهاج السنة" (۲/۲۱۹۔ ۲۲۰) میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر امام احمد رحمہ اللہ تک ہر طبقے کے نظریات بیان

کیے ہیں۔ یہ نظریات امت کے اس سوادِ اعظم کے موقف سے مستفاد ہیں جو اس وقت فریقین کی اس کشمکش میں غیر جانبدار تھا اور جس کی خواہش تھی کہ تمام معاملات کا تصفیہ پرامن ماحول میں ہو۔ دونوں ثالثوں نے خدا و رسول اور اہلِ ایمان کی مرضی کے مطابق اسی سوادِ اعظم کے سپرد تمام امور کا تصفیہ کر دیا۔

اس سوادِ اعظم کے بڑے بڑے مقتدا حسبِ ذیل حضرات تھے: سیدنا سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید (دونوں عشرہ مبشرہ میں سے ہیں)، قدامہ بن مظعون، عبداللہ بن عمر، ابو برزہ اسلمی، اسامہ بن زید (نبی کریم ﷺ کے منہ بولے بیٹے کے فرزند)، عبداللہ بن سلام، ابومسعود، حسان بن ثابت (شاعرِ رسول ﷺ)، مسلمہ بن مخلد، فضالہ بن عبید، عمران بن حصین، محمد بن مسلمہ، معاویہ بن خدیج رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہم۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جنھوں نے ثالثی کا فرض انجام دیا وہ بھی اسی جماعت میں تھے۔ پھر ہیں سیدنا مغیرہ بن شعبہ، کعب بن عجرہ، کعب بن مالک، ابوسعید خدری، نعمان بن بشیر رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہم۔ یہ حضرات دس بیس نہیں تھے، اکابر میں سیکڑوں تھے اور جن پر صحابیت کا اطلاق ہوتا ہے وہ ہزاروں تھے، پھر تابعینِ کرام تھے۔ گویا نصف کے قریب امت تھی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن حضرات نے ایک طرف یا دوسری طرف سے حصہ لیا، ان میں اکابر کی تعداد پچیس تیس سے زیادہ ثابت نہیں کی جاسکتی اور جن پر صحابیت کا اطلاق ہوتا ہے وہ سو ڈیڑھ سو بھی نہیں تھے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ یہ بات اس کا عملی ثبوت ہے کہ امت کا بڑا حصہ جسے سوادِ اعظم کہتے ہیں وہ غیر جانبدار تھا اور اس غیر جانبدار طبقے کے متعدد حضرات اذرُح کے اجتماع میں موجود تھے۔

اگر ثالثوں نے بددیانتی کی ہوتی (نعوذ باللہ من ذلك) تو اول تو دونوں طرف کے سرکاری نمایندے الجھ پڑتے اور نہیں الجھے تو کم از کم غیر جانبدار طبقے کے جو نمایندے تمام امور کے شاہد تھے وہ اپنے اپنے مستقر کو واپس ہو کر تمام حالات سے امت کو واقف کر

دیتے کہ کس طرح بددیانتی ہوئی ہے۔ یوں نہ سیدنا ابوموسیٰ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی حیثیت اُن کے ہاں مقبول و باوقار رہتی اور نہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو وہ کامیابی ہوتی جو ہوئی۔

غور طلب ہے یہ بات کہ جو حضرات سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کرتے، محض اس لیے کہ انھیں ان کی خلافت کے آئینی ہونے میں شک ہے اور ان کا اصرار ہے کہ جو کام ہو وہ امت کے عام اجماع سے ہو نہ کہ باغیوں کے تسلط سے، ایسے حضرات یہ کیونکر برداشت کر لیتے کہ فریقین کو برطرف کر کے نظامِ عالم کو درہم برہم کر دیا جائے یا یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو چالاکی سے خلیفہ بنا دیا جائے؟!



فیصلے کے بعد

تجزیہ:

اپنی واہی روایتوں کے باوجود اہلِ تاریخ متفق ہیں کہ فیصلہ سننے کے بعد دونوں فریقوں کے نمایندے اپنے اپنے مستقر کو چلے گئے اور غیر جانبدار حضرات بھی۔ گویا اس اجتماع میں اشتعال کی قطعاً کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ لغو باتیں کہ فلاں نے فلاں کے لات ماری اور آپس میں ایک دوسرے کو گدھا اور کتا کہا، یا فلاں نے فلاں کو کوڑا مارا اور تلوار ہاتھ میں نہ ہونے کی حسرت بیان کی، ان باتوں میں جان نہیں۔ یہ محض اس لیے وضع کی گئی ہیں کہ فضا کے پر امن ہونے کا انکار ممکن نظر نہیں آتا۔ یہ اجتماع ہوا تھا امت کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے اور ملت کے طاقتور مقتدیوں کی موجودگی میں جن کے ساتھ چار چار سو مسلح افسر تھے۔ پھر ایسے مسئلے میں جس پر امت کی فنا و بقا کا انحصار ہو، اگر بد دیانتی کی جائے تو لاتیں اور کوڑے نہیں چلا کرتے اور نہ زبانی طعن و تشنیع ہوا کرتی ہے۔ وہاں تو جان دینے اور لینے کا جذبہ ابھرتا ہے۔

لہٰذا سوچنا چاہیے کہ اس طرح کی خاموشی سے یہ اجلاس کیسے برخواست ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ فیصلے کے عادلانہ اور مدبرانہ ہونے کی بنا پر اور ثالثوں کی دیانت، تقویٰ، احساسِ ذمہ داری اور دور بینی کا صحیح ادراک لے کر، کیوں کہ ثالثوں کے اس فیصلے کے نتیجے میں حقیقتاً فریقین کے مابین جنگ بند ہو گئی اور امت میں عام امن کی فضا کو فروغ ہوا۔

چونکہ ثالثوں کے فیصلے میں نمایاں کردار سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تھا، جیسا کہ

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس وقت امت میں ان کی عظمت و محبت پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی اور سب نے عیاناً دیکھ لیا کہ یہ شخص ہے جس نے کشتیِ ملت کو گردابِ بلا سے نکالا ہے۔

سبائیہ کے زیرِ اثر بعد کے لوگوں نے انھیں احمق و ابلہ اور سادہ لوح کہا ہے، مگر ان کے عہد میں اور ان کے بھی کچھ بعد تک انھیں سب سے زیادہ عقل مند اور مخلص ترین افرادِ ملت میں باور کیا جاتا تھا، جس کی کوششیں بارآور ہوئیں اور سعی مشکور۔ مسعودی جیسے لوگوں نے یہ فضا پیدا کی ہے کہ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ جب اپنی ''کم عقلی'' کی وجہ سے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی ''چالاکی'' کے سبب ''مات'' کھا گئے تو ان پر ایسی انفعالی کیفیت طاری ہوئی کہ کوفہ واپس جانے کے بجائے مکہ چلے گئے اور کہا: ''میں علی رضی اللہ عنہ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔'' اسے کہتے ہیں ایک جھوٹ کے لیے دس جھوٹ بولنا۔ بھلا سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو منہ چھپانے کی کیا بات تھی، ان کا تو سر بلند تھا اور قیامت تک رہے گا۔ اسلام کی جب صحیح تاریخ مرتب ہوگی تو سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ وہ امت کی کشتی کے کھیون ہار ہیں۔ شاعر ذوالرمہ نے سیدنا بلال بن برید بن ابی موسی اشعری رضی اللہ عنہم کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں کہتے ہیں:

أَبُوكَ تَلَافِي الدِّيْنَ والنَّاسَ بَعْدَ مَا
تَشَاءُوْا وَ بَيْتُ الدِّيْنِ مُنْقَطِعُ الْكَسْرِ
فَشَدَّ أَصَارَ الدِّيْنِ أَيَّامَ أَذْرُحٍ
وَرَدَّ حُرُوْباً قَدْ لَقِحْنَ إِلَى عَقْرٍ [1]

''وہ آپ ہی کے تو باپ تھے جنھوں نے دین اور اہلِ دین کی اس وقت شیرازہ بندی کی جب لوگوں میں پراگندگی تھی اور قصرِ دین منہدم ہوا چاہتا تھا۔

[1] العواصم من القواصم (ص: ۱۷۶) تعلیقه ۱

انھوں نے اَذرُح کے دنوں میں خیمۂ دین کی طنابیں کس دیں اور اُن جنگوں کو روک دیا جو اسلام کی نسل منقطع کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔''

واقعی حالات کا صحیح طور پر جائزہ لینے والا یہ کہہ اٹھے گا کہ یہ کتابیں جو بدقسمتی سے تاریخ کی کہلاتی ہیں اور جو آلِ بویہ کے زیرِ اثر لکھی گئیں، اگر سب کی سب سوخت کر دی جائیں تو امت کو اتنا نقصان نہیں پہنچے گا جتنا فائدہ ہو گا۔ خدا مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ سبائیہ کی ہمہ گیر تحریک کو سمجھیں جو دعوتِ محمدیہ کو شکست دینے کے لیے جاری کی گئی اور جس کی روز افزوں سمیّت نے تنِ ملت کو نیم جاں بنا دیا ہے۔

صحیح ہے کہ ثالثوں نے جس عام اجتماع میں زیرِ بحث مسئلے کے تصفیہ کا فیصلہ کیا تھا وہ اجتماع نہ ہو سکا۔ اس سے پہلے ہی حالات نے دوسرا رخ اختیار کر لیا، لیکن نتیجہ بہرحال وہی نکلا جو جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چاہتے تھے کہ امت ایک جھنڈے کے نیچے آ جائے اور مفسد عناصر کی سرکوبی ہو۔ اگر دونوں ثالث امن کی یہ فضا قائم کر دینے میں کامیاب نہ ہوتے تو یہ مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو ہوا۔



ہوا کا رخ اور بعض اہم واقعات

مصر:

مصر کا قضیہ اوپر بیان ہو چکا کہ کس طرح سبائیہ کی شرارت سے وہاں ثالثی نامہ کی بے حرمتی ہوئی اور اہلِ خِربتا کے خلاف محمد بن ابی بکر اور کنانہ بن بشر نے ایک مستقل مہم چلا رکھی تھی۔ فضا میں سوائے اس ایک اختلال کے اور کوئی تکدر نہ تھا۔ ثالثوں کا فیصلہ آ چکنے کے بعد جب یہ تخریبی کارروائی بند نہ ہوئی تو اہلِ خربتا کی فریاد پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں فوج بھیج کر یہ قصہ پاک کر دیا اور پورے مصر میں بہت جلد امن و عافیت کا دور دورہ ہو گیا۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ امن کوشی تھی اور نہایت تقویٰ کہ آپ نے مصر کے معاملے کو آگے نہیں بڑھایا، ورنہ ثالثی نامہ کی بے حرمتی کے سبب آپ عراق کے خلاف اعلانِ جنگ کر سکتے تھے، لیکن صورتِ حال آپ کو معلوم تھی کہ یہ کارروائی امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی طرف سے نہیں۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ بارگاہِ مرتضوی سے کسی قسم کی کمک مصر نہیں جا رہی، اس لیے آپ نے بھی اسے صرف مقامی مسئلے کی حیثیت دی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر عہد شکنی کا الزام رکھ کر جنگ کی آگ نہیں بھڑکائی۔

اشتر نخعی جو اپنے آپ کو حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا فرستادہ بتاتا تھا، وہ بغیر فوج کے جا رہا تھا، اس کے پاس تقرر کی کوئی سرکاری دستاویز بھی نہیں تھی۔ جو فرمان سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا بتایا جاتا ہے، وہ بعد کی اختراع ہے اور قطعاً وضعی، جیسا کہ ہم بیان کر چکے۔ یہ دوسرے

اہلِ فکر کے نزدیک بھی جعلی ہے، چنانچہ خضری نے بھی کہا ہے:

"والظاهر أن هذا العهد قد كتب بعد ذلك بأزمان" [1]

"ظاہر ہے کہ یہ پروانۂ تقرری بہت طویل عرصہ کے بعد کسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے مصر میں امن قائم کرنے کے علاوہ اور کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف فوجی کارروائی سے تعبیر کیا جا سکے۔ ورنہ ان کا حق تھا اور مورخ انھیں حق بجانب سمجھتا کہ وہ اہلِ خربتا کے خلاف فوجی اقدامات کو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے فرمان کے مطابق سمجھ کر متارکۂ جنگ کے فیصلے کی بے حرمتی قرار دیتے اور اعلانِ جنگ کر دیتے۔

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی یہ رائے ہرگز نہیں تھی کہ جو حضرات بیعت سے محترز ہو کر خاموش بیٹھ گئے تھے، ان کے خلاف جنگ کی جائے۔ اگر آپ کی یہ رائے ہوتی تو ایسی جنگوں کا سلسلہ خود مدینہ طیبہ سے شروع ہوتا اور پھر قریہ بہ قریہ لڑائی کی جاتی، کیوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت کی اکثریت بیعتِ خلافت سے محترز تھی۔

اس لیے ہمارا یقین ہے کہ حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو اہلِ خربتا سے جنگ کرنے کا حکم ممکن ہے محض ابتدائے صفین کے موقع پر دیا گیا ہو، لیکن تواتر کے ساتھ جنگ کے احکام امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہرگز نہیں گئے اور نہ ثالثی نامہ کے بعد ایسے احکام آپ کی طرف سے جا سکتے تھے۔ لوگوں نے جن فرامین کا بھیجا جانا بیان کیا ہے اور مسعودی وغیرہ نے ان کے مضامین نقل کیے ہیں وہ سب وضعی ہیں۔ اشتر نخعی بھی آپ کے حکم سے نہیں گیا تھا، بلکہ بطور خود جا رہا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اگر اسے بھیجتے تو فوج دے کر بھیجتے، کیوں کہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی پسپائیوں کا اور مقامی امداد سے محرومی کا یہی تقاضا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ آپ کے نام سے خط گئے ہوں، لیکن وہ سب ایسے ہی تھے جیسے اس

---

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية (٢/٧٧)

سے پہلے حضرت امیر المومنین عثمان، علی، طلحہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے نام سے اشتر اور حکیم بن جبلہ نے ابتدائی ہنگاموں میں بھیجے تھے اور جن کی وجہ سے تمام فساد بپا ہوا۔ جعلی خط بھیجنا سبائیہ کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ گویا محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ جس طرح امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے جعلی فرمان وصول ہونے پر دھوکا کھا گئے۔ عجیب بات ہے کہ جن ہستیوں کا نام سبائیہ نے اچھالا ہے وہی سب سے زیادہ اس ٹولی کی فتنہ پردازی کا شکار ہوئے۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کو محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر سخت صدمہ ہوا اور آپ نے ان کی طرف سے صدقہ دیا اور خیرات کی۔ ایسا ہی صدمہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو بھی ہوا تھا۔

نہروان:

ادھر ثالثوں کے فیصلہ سنانے کا وقت آ رہا تھا اور ادھر عراق میں ایک شورہ پشت گروہ خوارج کا پیدا ہو گیا۔ یہ سبائیوں کا ایک طبقہ تھا اور مشہور سبائی سرغنہ ابن الکواء اس گروہ کا نمایاں فرد تھا۔ ان لوگوں نے اپنے ایک سرگرم کارکن عبداللہ بن وہب کو ''امیر المومنین'' بنا لیا، کیوں کہ اس وقت تک جنھیں یہ امیر المومنین کہتے تھے اور ان کی خلافت کے لیے شمشیر بکف پھرتے تھے، اس امام برحق پر اب انھوں نے کفر کا ''فتویٰ'' صادر کر رکھا تھا اور آپ سے لڑنے مرنے کو تیار تھے، بلکہ تمام مسلمان ان کے نزدیک واجب القتل قرار پائے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں راہِ راست پر لانا چاہا مگر اس کا اثر الٹا ہوا۔ یہ ہنگامہ محض کوفی سبائیوں ہی کا نہ تھا، بصرہ وغیرہ سے بھی لوگ آ آ کر اُن میں شریک ہو گئے تھے۔ کئی آدمیوں کو انھوں نے قتل کر ڈالا، جن میں سیدنا عبداللہ بن خباب، ان کی زوجہ محترمہ اور رفقا رضی اللہ عنہم تھے۔ ان کا قصور بس اتنا تھا کہ انھوں نے سیدنا عثمان اور علی رضی اللہ عنہما دونوں کو خدا کا راست باز بندہ اور اسلام کا عظیم فرزند بتایا تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سمجھانے سے اُن کے بہت سے آدمی تائب ہو گئے تھے، مگر پھر بھی ان کا جتھا بہت مضبوط تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کی تعداد پچیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ادھر ثالثوں کے فیصلے کا اعلان ہوا اور ادھر امیر المومنین کو ان خارجیوں سے الجھنا پڑا،

گھمسان کی جنگ ہوئی اور چند کے علاوہ باقی خوارج جو میدان میں موجود تھے، مارے گئے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ دراصل سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ثالثوں کے اس فیصلے سے ناراض ہو کر (جو ان لوگوں نے فرض کر رکھا ہے) شام کے خلاف فوج کشی کرنی چاہی تھی، لیکن خوارج کا قضیہ پیش آ جانے سے وہ مہم رک گئی اور اس کے بعد عراقیوں نے یہ بہانا کیا کہ ہمارے ہتھیار کند ہو گئے ہیں، کچھ دن آرام کر کے پوری تیاری کر لیں تو چلیں، لیکن تیاری کے بجائے یہ لوگ رفتہ رفتہ کھسک گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوردار تقریروں کے باوجود میدان میں جانے پر راضی نہ ہوئے۔ اس روایت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ثالثی کے متعلق اس روایت کی تصدیق ہو سکے کہ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے ''چالاکی'' سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔

یہ اور ایسی ہی تمام روایتیں یہ ثابت کرنے کے لیے وضع کی گئی ہیں کہ ثالثوں کی غداری سے حالتِ جنگ پیدا ہو تو گئی تھی، مگر اپنے آدمیوں کی سرکشی کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ یہ جنگ جاری نہ رکھ سکے۔ حالانکہ بات وہی ہے کہ ثالثوں کا فیصلہ اتنا اطمینان بخش تھا کہ جنگ آزمائی کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ نہ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ کی ''چالاکی'' تھی، نہ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی ''ابلہی'' نہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان ہوا تھا، نہ انھوں نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا، نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فوج کشی کرنی چاہی تھی اور نہ ان باتوں میں سے کسی بات کے ظہور پذیر ہونے کا کسی درجہ میں امکان تھا، بلکہ ہر طرح امن و امان کا دور دورہ تھا اور سب مطمئن تھے کہ عام اجتماع تک رائے عامہ کو اپنے حق میں کر لیں گے۔

نہروان کی جنگ محض سبائیوں کی اس خُو کا نتیجہ تھی کہ انھیں مسلمانوں کے ہاں امن ہونا کسی طرح گوارا نہیں۔ ایک نہ ایک قضیہ اٹھتا رہنا چاہیے، اگرچہ خود اپنا ہی نقصان ہو۔ شاید ہی کسی باطل مقصد کے لیے اتنی قربانیاں کی گئی ہوں، جتنی دعوتِ محمدیہ کو شکست دینے کے لیے سبائیہ کی ہیں۔

یہاں ہم پھر سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر ثالثوں کے فیصلے سے دوبارہ اختلاف پیدا ہو گیا تھا، حالتِ جنگ واپس آ گئی تھی اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی بے دست و پائی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ لڑنے کے لیے آپ کو سپاہی نہیں ملتے تھے، تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا رکاوٹ تھی؟ انھیں اس اختلال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ کیسا اچھا موقع تھا کہ ایک ہی حملے میں عراق پر قبضہ ہو جاتا۔ ایک حریف کے ہاں انتشار ہو، لڑنے کو فوج نہ ہو اور دوسرے حریف کے پاس ایسی وفادار اور منظّم افواج ہوں جو بڑی بڑی سلطنتوں سے اپنا لوہا منوا چکی ہوں اور اسے یہ قدرت ہو کہ ایک ہی ہلے میں اپنا کام بنا لے تو اس نے یہ موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیا؟ خصوصاً جب بقول مورخوں کے اس کی خلافت کا اعلان ہو چکا تھا اور وہ خود بھی ایک ''دنیا دار، باطل پرست، مکار اور منافق'' شخص تھا۔ جسٹس امیر علی اب اس عدالت میں پہنچ چکے ہیں، جہاں وہ جج کی حیثیت سے فیصلے صادر نہیں فرمائیں گے، بلکہ ملزم و مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انھیں یہ جواب دہی کرنی ہو گی کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے مقبول بارگاہِ احدیت و رسالت کی جناب میں یہ گستاخانہ کلمات اپنی کتاب میں کیسے لکھے، اور وہ بھی اسے ''روحِ اسلام'' کا نام دے کر!

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی للّٰہیت اور حق کوشی کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے نہروان کے جھگڑے سے قطعاً فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور اس کی توجیہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ثالثوں نے متارکۂ جنگ کی مدت میں توسیع کر دی تھی اور فریقین اس کے پابند تھے کہ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ اقدام نہ کریں۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس فیصلے کا احترام کیا اور ایسی کوئی حرکت نہ کی جو بے دین اور حریف حکمرانوں کا شعار ہے۔



حجاز ویمن

حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے زیرِ نگین علاقہ میں محض ایک خوارج کا قضیہ نہیں تھا، بلکہ اور بھی بہت بڑے اہم حوادث ہوئے، مثلاً: ایرانیوں کی بغاوت جو ۳۹ھ میں ہوئی اور جسے حضرت امیر المومنین کے حکم سے امیر زیاد نے پوری قوت سے کچل دیا۔

البتہ عالمِ اسلام کے اس وقت کے نقشے پر توجہ کی ضرورت ہے کہ ایک طرف وہ وسیع علاقہ ہے جس میں شام کے علاوہ باقی تمام عرب ہے، ایران ہے اور جملہ ممالک محروسۂ اسلام ہیں، اور دوسری طرف صرف دو ملک ہیں: ایک شام اور دوسرا مصر۔ ایک طرف ہزار ہا آدمی ایسے ہیں جو خلافتِ مرتضوی کے زیرِ نگیں علاقوں میں رہتے ہیں، لیکن انھیں اس خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم نہیں، اس لیے انھیں بیعت سے گریز ہے اور علاقے کے حاکمِ اعلیٰ کے تمام سیاسی اقدامات سے اختلاف۔ پھر وہ ہیں جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے جھنڈے کے نیچے مسلمانوں کے قتل پر دلیر تھے، جنھوں نے کوششیں کر کے جنگیں چھیڑی تھیں، لیکن جب جنگ بند ہو جانے کے امکانات قوی نظر آئے تو پھر اپنے اسی امام سے لڑنے کھڑے ہو گئے۔ کل تک جس امام کے مخالفوں کو کافر و بے دین کہتے تھے، آج ان کے نزدیک ان کا وہی امام کافر و بے دین ہے، بلکہ تمام وہ لوگ بھی جو اس کے کفر میں شک کریں۔ امام کا جرم کیا ہے؟ یہی کہ اس نے ان ''کافروں'' کو اپنی ہی طرح کا مسلمان کیوں سمجھا اور ان ''بے دینوں'' سے جنگ کیوں بند کی۔ قریہ بہ قریہ دلوں میں اختلاف ہے اور اس سلسلے کے ختم ہونے کی بظاہر کوئی سبیل نہیں۔

خود مسعودی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی کی زبانی ان کی مملکت کا نقشہ کھینچا ہے کہتا ہے کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا:

”وقد زعمت قريش أن ابن أبي طالب شجاع ولكن لا علم له بالحروب. تربت أيديهم وهل فيهم أشد مراساً لها منّي؟ لقد نهضت فيها وما بلغت العشرين وها أنا ذا قد أربيت على نيّف وستّين ولكن لا رأي لمن لا يطاع“ [1]

”قریش نے گمان کر رکھا ہے کہ ابو طالب کا فرزند بہادر تو ہے مگر فنونِ جنگ سے واقف نہیں۔ خاک پڑے اُن کے ہاتھوں پر! ان میں ہے کوئی جو مجھ سے زیادہ اس کا ماہر ہو؟ میں نے تو لڑنا اس وقت شروع کیا تھا جب میں بیس برس کا بھی نہ تھا۔ اب میری مہارت ساٹھ برس سے زیادہ کی ہے، لیکن جس کی اطاعت نہ کی جائے، اس کی رائے کی کوئی قیمت نہیں۔“

ممکن ہے حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد فرمایا ہو، کیوں کہ یہ واقعات کے مطابق ہے۔ جو بات آپ نے کرنی چاہی وہی نہ کرنے دی گئی اور جو نہ کرنا چاہا اسی کے لیے ایسی صورتیں پیدا کر دیں کہ کرنا پڑے۔ یہ بات کچھ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس ٹولی کے ہتھے چڑھ جاتے تو ان کا بھی یہی حشر ہوتا، بلکہ شاید حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا بھی۔ ہمیں عباسیوں کے دور میں ایسے خلفا کے احوال ملتے ہیں جو اپنی قابلیت اور علوِ مرتبت میں ہر طرح واجب التعظیم ہیں اور ان میں سے ہر شخص ذاتی طور پر یگانۂ روزگار معلوم ہوتا ہے، لیکن سبائیوں نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ خلافت کو ایک کھیل بنا دیا اور خلفا کی سیاسی زندگی مفلوج کر دی۔ کون ہے جو آلِ بویہ کے دور کی سیاہی میں نور کی کوئی کرن دیکھ سکے!

---

[1] مروج الذهب (٢/٤١٤)

ان حالات کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ سامنے آیا۔ امت کا سوادِ اعظم جو اختلال، افتراق اور انتشار سے پراگندہ خاطر تھا، دیکھ رہا تھا کہ جس عزیمت کے ساتھ دین قائم کیا گیا، جن مقاصد کے تحت اقوامِ عالم سے جنگ مول لی گئی اور جس بے جگری سے قربانیاں دی گئی ہیں وہ سب عزائم خواب و خیال ہو گئے۔ سبائیوں کی ایک نابکار چھوٹی سی ٹولی تھی جس نے تمام عالمِ اسلام کو آماجگاہِ مصائب بنا رکھا تھا۔

امام کی کامیابی کا انحصار تدبر اور فراست سے زیادہ اعوان و انصار پر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سا اولو العزم رسول جو قدم قدم پر معجزے دکھاتا تھا، اسے امتی ملے تھے اسرائیلی، اس لیے ارضِ موعود میں داخلہ نصیب نہیں ہوا اور ساری عمر پریشانیوں میں گزری، تا آنکہ پکار اٹھے:

﴿ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴾ [المائدۃ: ۲۵]

''اے میرے رب! بے شک میں اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں، سو تو ہمارے درمیان اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان علاحدگی کر دے۔''

یہی حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رہا۔ آپ بھی پکار اٹھے:

''اللھم سئمتھم وسئمونی وکرھتھم وکرھوني، اللھم أرحھم منّي وأرحني منھم'' [1]

''خدایا یہ مجھ سے تنگ آ گئے ہیں اور میں ان سے، انھیں مجھ سے نفرت ہے اور مجھے ان سے، خدایا انھیں مجھ سے نجات دے اور مجھے ان سے۔''

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت چار برس کے قریب رہی، لیکن ایک دن چین نصیب نہ ہوا۔ اگر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سا بیٹا، ابن عباس رضی اللہ عنہما سا بھائی اور امیر زیادہ سا مددگار اور چند مخلص ساتھی نہ ہوتے تو شاید آپ کی خلافت چار مہینے بھی نہ رہتی۔ سبائی لوگ اور کسی

---

[1] البدایة والنھایة (۸/ ۲۰)

مسلم حکومت کو پنپنے دیں! ناممکن ہے۔

غیر مبایعین:

ابوبکر بن العربی اور بعض بزرگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جو صحابہ جنگ سے محترز تھے انھوں نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی تھی۔ البتہ اپنے اجتہاد کے تحت جنگوں سے الگ رہے، یہ خیال درست نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب وہ بیعت کر لیں تو پھر اپنے امام کے اجتہاد سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔ اجتہادی مسائل میں اگر امام کے اجتہاد کی عملاً مخالفت کی جائے تو پھر نظم قائم نہیں رہ سکتا۔ بیعت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ و رسول کی سنت کے مطابق امام کی اطاعت کی جائے۔ سوائے معصیتِ الٰہی کے اور کسی صورت میں امام کی مخالفت نہیں کی جا سکتی۔ ((الإمام جُنّة)) ارشادِ نبوی ہے۔ یعنی امام امت کی ڈھال ہوتا ہے۔ اگر اس ڈھال ہی پر گُرز پڑنے لگیں تو حفاظت اور بچاؤ کی سبیل کیا رہے گی۔

مانعینِ زکات کے سلسلے میں عموماً صحابہ کی رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے وہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن حضرت خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عزیمت ظاہر کی اور کتاب و سنت سے اپنے موقف کی حقانیت پیش کی تو سب آپ کے ساتھ ہو گئے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے عرب لونڈیوں کے متعلق حکم دیا کہ انھیں آزاد کر کے ان سے نکاح کیا جائے اور جتنے عربی النسل غلام ہیں وہ سب آزاد کر دیے جائیں تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بے چون و چرا اس کی تعمیل کی اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ قرآن کی کس آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کس ارشاد کے تحت یہ تحدید کی جا رہی ہے۔ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے جب حج کے موقع پر نماز پڑھی اور اپنے لیے اس کی دلیل بھی بتا دی تو جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مذہب میں قصر ہی واجب تھا، انھوں نے بھی امام کے اتباع میں پوری نماز پڑھی، اگرچہ امام کی اقتدا میں نہ پڑھی ہو۔ سب کی رائے تھی کہ سبائیوں کے خلاف جہاد کیا جائے، لیکن امیر المومنین

عثمان رضی اللہ عنہ نے جب فرما دیا کہ جو شخص میری بیعت پر رہنا چاہتا ہے وہ ہتھیار ڈال دے اور گھر میں بیٹھ رہے تو سب مجبور ہو گئے، ورنہ ان باغیوں کو مار بھگانا کیا بات تھی۔

اطاعتِ امیر کا جذبہ جس طرح صحابہ میں تھا وہ بعد کے لوگوں میں کیا ہو گا۔ انفرادی، اجتماعی، سیاسی اور معاشرتی تمام امور کے اجتہاد پر عمل کرنا ان کا شعار تھا، اگرچہ طالبانِ علم کو وہ اپنے مذہب اور اس کی حجت سے بھی باخبر رکھتے تھے، لیکن عمل امام ہی کے اجتہاد پر ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جن حضرات نے جنگوں سے احتراز کیا، انھوں نے بیعت نہیں کی تھی، اسی لیے وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی نہیں کہتے تھے اور جنھوں نے بیعت کر لی تھی وہ بہرحال ان جنگوں میں شامل رہے۔

غیر مبایعین نے جہاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی نہیں سمجھا اور ان سے جنگ کو واجب نہ جانا، وہاں انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بالفعل بھی تسلیم کی، یعنی رہتے تھے ان کے ملک میں مگر عمل کرتے تھے اپنے اجتہاد پر اور ان جنگوں کو فتنہ کہتے تھے۔ اسی لیے ثالثوں نے مابہ النزاع مسئلے کا فیصلہ ان غیر مبایعین کے سپرد کر دیا تھا، کیوں کہ وہ ہر اعتبار سے غیر جانبدار تھے اور ان کا فیصلہ بے لاگ ہوتا۔ اس لیے یہ تصور درست نہیں کہ یہ حضرات سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے خلافت کی بیعت کر چکے تھے، مثلاً: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنا کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں، لیکن بعد کے خلفا سے ان کی بیعت کا تذکرہ صحاح میں موجود ہے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیعت میں تامل کرنا یا جمل و صفین میں کسی طرف سے حصہ لینے سے گریز کرنا متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ من جملہ ازاں ملاحظہ ہو:

”عن شقيق بن سلمة قال: كنت جالساً مع أبي مسعود وأبي موسى وعمار فقال أبو مسعود: ما من أصحابك أحد إلا لو شئت لقلت فيه غيرك. وما رأيت منك شيئًا منذ صحبت

رسول الله ﷺ أعيب عندي من استسراعك في هذا الأمر، فقال عمار: يا أبا مسعود! ما رأيت منك ولا من صاحبك هذا شيئًا منذ صحبتما النبي ﷺ أعيب عندي من إبطائكما في هذا الأمر. فقال أبو مسعود وكان موسراً: يا غلام هات حُلّتين فأعطى إحداهما أبا موسى والأخرى عماراً فقال: روحا فيه إلى الجمعة" [1]

''حضرت شقیق بن سلمہ رضی اللہ عنہ (ابو وائل تابعی) فرماتے ہیں: میں ابو مسعود، ابو موسیٰ اور عمار رضی اللہ عنہم کے پاس بیٹھا تھا۔ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے (حضرت عمار رضی اللہ عنہ) سے فرمایا: آپ کے ساتھیوں میں کوئی ایسا نہیں جس کے متعلق میں کچھ کہنا چاہوں اور نہ کہہ سکوں سوائے آپ کے، لیکن جب سے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا، اس وقت سے میں نے آج تک آپ کے اس معاملے میں جلدی کرنے سے زیادہ کوئی معیوب بات نہیں دیکھی۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ اور آپ کے یہ ساتھی جس دن سے رسول ﷺ کی خدمت میں رہے، میں نے آپ کی کوئی بات اتنی معیوب نہیں دیکھی جتنا اس معاملہ سے آپ کا گریز ہے۔ اس پر حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ جو بہت سخاوت پسند تھے، بولے: لڑکے دو حُلّے لے آؤ، ان میں سے ایک حُلّہ آپ نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو دیا اور دوسرا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو اور فرمایا: یہ پہن کر جمعہ کی نماز میں شرکت فرمایئے۔''

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس حُسن کے ساتھ اپنے اختلافی مسائل میں بات کیا کرتے تھے۔ یہی واقعہ اگر مسعودی بیان کرتا تو معلوم نہیں کیسے کیسے فقرے ایک دوسرے کی زبان سے

[1] صحيح البخاري، كتاب الفتن، ج ٤، طبع مصر

چست کراتا اور ممکن ہے دست بدست جنگ اور سب وشتم بھی دکھا دیتا۔

اس حدیث سے اُن تمام امور کی بخوبی تردید ہوگئی جو سبائیوں نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی بابت مشہور کر رکھے تھے کہ انھوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ کہا اور یہ کیا۔ ہمارے اکابر کو جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے صفائی میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں اور لاطائل توجیہات کی ضرورت پڑتی ہے وہ محض اس وجہ سے ہے کہ اُن کے سامنے مورخوں کی مفتریات ہوتی ہیں۔ صحابہ کے احوال صحاح سے مرتب کیے جائیں تو کوئی بھی الجھن نہ رہے۔

اب یہ حضرات جو جنگوں سے محترز رہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی کے علاقوں میں رہتے تھے۔ ملک کے احوال پر کڑھ رہے تھے۔ تحکیم کے نتیجے میں انھیں توقع تھی کہ حالات رو بہ صلاح ہو جائیں گے اور پرامن فضا میں معاملات کا تصفیہ ہو سکے گا، لیکن سبائیوں نے جو اندرونی اختلال پیدا کر رکھا تھا، اس نے یہ خیال بھی ناپائیدار کر دیا۔

بے شک فریقین کے مابین جنگ بند تھی، لیکن امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے ملک کے اندرونی احوال پریشان کن تھے۔ امت اپنی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ دوسری طرف کیسا امن و امان ہے، یکجہتی ہے، خوش حالی ہے اور کسی طرح اختلال کا خاتمہ کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ کوئی شخص نہیں جو امیر کی رائے سے منحرف ہو اور امیر بھی وہ ہے جو تمام صفاتِ عالیہ سے متصف ہونے کے علاوہ عظمت و شرف کی اس بلندی پر کمر بستہ ہے۔ اس لیے قدرتاً لوگوں کے قلوب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف مائل ہو گئے اور انھوں نے سوچا کہ عام اجتماع تو معلوم نہیں کب ہو اور ہو بھی تو فیصلہ کیا کرے، اس لیے اس روز افزوں اختلال کا کوئی فوری مداوا ہونا چاہیے۔

ان کے سامنے ایک شخص موجود تھا جسے حکومت کی صلاحیت ورثہ میں ملی تھی، جو بیس برس سے عملاً دکھا رہا تھا کہ وہ ایک مثالی حکمران ہے اور اسے اختلال و بدنظمی رفع کرنے کی ایسی مہارت ہے کہ اس نے چند گھنٹوں میں مصر کو دار الامان بنا دیا، لہٰذا انھوں نے سوچا کہ اگر

زمامِ کار اسی شخص کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ کشتیِ ملت کو اس گرداب سے صحیح وسلامت نکال لے جائے گا۔ چنانچہ مختلف علاقوں کے وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مصر کی طرح ہمارے علاقوں کا انتظام بھی آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

چونکہ ثالثوں کے فیصلے کے تحت سب طرف کے لوگوں کو سب طرف جانے کی مکمل آزادی تھی اور فریقین کو اس کا کامل اختیار تھا کہ رائے عامہ اپنے حق میں استوار کریں، اس لیے معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان وفود کی خواہش کی پذیرائی کی اور اپنے چند افسروں کو مختلف اطراف میں روانہ کیا کہ اپنی آنکھوں سے ان علاقوں کی کیفیت دیکھیں اور معلوم کریں کہ ان نمایندوں کی خواہش کی پشت پر رائے عامہ ہے یا نہیں۔

چنانچہ بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کو یمن و حجاز کی طرف، ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کو اور بعض کے نزدیک عبداللہ الحضری کو بصرہ کی طرف، حضرت عبداللہ بن مسعدہ کو تیماء کی طرف، حضرت نعمان بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہ کو عین التمر کی طرف روانہ کیا۔ تھوڑی تھوڑی فوج حفاظت کے لیے ساتھ کر دی۔ کسی کے پاس تین ہزار سے زیادہ سپاہی نہ تھے۔ حضرت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کو انبار و مدائن بھیجا،[1] چونکہ یہ علاقے عرب سے باہر تھے اس لیے ان کے ساتھ چھے ہزار فوج کر دی۔

ظاہر ہے کہ یہ فوجیں لڑنے کے لیے نہیں گئی تھیں اور نہ بڑے رقبہ کے فتح کرنے کے لیے اس طرح فوجیں حرکت میں لائی جاتی ہیں اور نہ اتنی تھوڑی تھوڑی فوجوں سے بیک وقت اتنے بہت سے محاذ کھولے جا سکتے ہیں۔ ان کا مقصد محض یہ دیکھنا تھا کہ اہلِ ملک

[1] نقشے کے مطابق دمشق سے انبار اور وہاں سے مدائن جانے کا راستہ سیدھا ہے۔ کوفہ کافی دور جنوب میں رہ جاتا ہے۔ اگر راویوں کی یہ روایتیں صحیح ہیں تو ممکن ہے اس زمانے میں قافلوں کی راہ ایسی ہو کہ دمشق سے جنوب مشرق کی سمت کوفہ کے قریب سے ہو کر شمال کی طرف مڑ کر انبار پہنچے۔ فی زمانہ کوفہ کے مقابلے میں انبار کا راستہ دمشق سے زیادہ سیدھا اور قریب کا معلوم ہوتا ہے۔ (مولف)

ان کی پذیرائی کس طرح کرتے ہیں اور ان کے نمایندوں نے اپنے علاقوں کی صحیح خواہش پیش کی ہے یا نہیں۔ ان ''فوجوں'' کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی اور ان کے ایک ہی دورہ میں یہ سب علاقے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہم نوا بن گئے۔ مگر اس اقدام سے عالمِ اسلام کے سیاسی اور معاشرتی امور میں کوئی اختلال رونما نہیں ہوا۔

لوگوں نے ان فوجوں کی روانگی کو جنگی مہمیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا طیاروں، ٹینکوں اور توپوں کے پرے کے پرے ایک لشکرِ جرار کے جلو میں آگ اگلتے اور بستیاں پھونکتے چلے جا رہے تھے اور نہتی رعایا تھی کہ ہر جگہ سر اطاعت خم کرنے پر مجبور تھی۔

ان مورخوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کشی اور غارت گری کی فضا تو اپنی دانست میں قائم کر دی، مگر اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ عرب کی زندگی قبائلی تھی، جہاں معاملات اجتماعی طریقے پر طے ہوتے ہیں۔ ہر بالغ شخص مسلح اور ماہرِ حرب وضرب تھا۔ اگر یہ فوجیں لڑنے گئی تھیں اور اہلِ ملک نے ان کی پیش قدمی کو دشمن کا جارحانہ حملہ سمجھا تھا تو کہیں تو ان کا مقابلہ ہوتا، کبھی تو انھیں کمک کی ضرورت پڑتی اور کسی جگہ تو گھٹنے ٹیک کر لڑنا ہوتا۔ لیکن یہ فوجیں تو ایسے گئیں جیسے کوئی سیر کرنے جائے۔ کہیں سے اس کا عملی ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ فلاں جگہ گھمسان کا رن پڑا؟

کبھی کہہ دیتے ہیں کہ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جب عین التمر پہنچے تو وہاں کے والی مالک بن کعب رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے امداد طلب کی، لیکن وہاں سے وہ ایک آدمی بھی نہ بھیج سکے۔ خضری نے (۲/۷۸) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ نقل کیا ہے جو آپ نے ان لوگوں سے مایوس ہو کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی نے حرکت نہ کی۔ یہ خطبہ بھی بعد کے کسی دماغ کی اختراع ہے، کیوں کہ اس کی زبان میں آلِ نبوت کی نورانیت کی جھلک نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ حضرت مالک رضی اللہ عنہ ایک علاقے کے حاکم ہیں اور ان کے پاس اتنے آدمی بھی نہیں کہ وہ تین ہزار ''حملہ آوروں'' کا مقابلہ کر سکیں۔ انھوں نے مدافعت کا

پہلے سے کوئی انتظام نہ کیا، حالانکہ انھیں اختلال کا علم ہے اور امداد اس وقت طلب کرتے ہیں جب ''دشمن'' سر پر آ پہنچا۔ ان مورخوں کی سمجھ میں سیدھی سی یہ بات نہیں آئی کہ جنگ نہیں ہوئی اور چونکہ نہیں ہوئی اس لیے ایسی روایتیں وضع کرنے کی ضرورت پڑی، کیوں کہ فوجوں کی نقل و حرکت اور باہمی آویزش کا اور کوئی ثبوت نہیں دے سکتے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کیا محض کوفہ ہی میں تھی اور صرف وہیں فوج کے بل پر خلافت کر رہے تھے؟

کبھی کہہ دیتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعدہ رضی اللہ عنہ جب تیما پہنچے تو ان کے مقابلے کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مسیّب رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا، وہاں سخت خون ریز جنگ ہوئی، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ خود مسیّب نے جو ''حملہ آور'' کو ختم کرنے گئے تھے، فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ سبحان اللہ! خود تیما میں اتنے آدمی نہ تھے جو مرکز سے فوج بھیجنے کی ضرورت ہوئی اور یہ صاحب جو گئے تو انھوں نے فنِ حرب کا یہ مظاہرہ کیا کہ اپنے علاقے میں آئے ہوئے دشمن کو فرار کا موقع دے دیا۔ دشمن کے علاقے میں لڑتے اور وہ فرار ہو جاتا تو ایک بات ہوتی، دشمن آ چکا ہے، اس نے مورچہ بنا لیا ہے، مرکز سے فوج آتی ہے، تو اس نے اپنا مورچہ ایسا کیوں نہیں بنایا کہ دشمن فرار نہ ہو سکے۔ پھر سوال ہے کہ مرکز سے تیما کے لیے فوج مل گئی، لیکن عین التمر کے لیے کیوں نہ مل سکی، جو حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو وہ خطبہ دینا پڑا، جس کا حوالہ خضری کی کتاب "محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية" سے ہم ابھی دے چکے ہیں۔

حضرت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ ہے کہ وہ چھے ہزار فوج لے کر انبار و مدائن کی طرف گئے، وہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج کو شکست دے کر مال و متاع لوٹ لیا اور خراج وغیرہ جمع کر کے کوفہ کے قریب ہوتے ہوئے نکل گئے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ تعاقب کے لیے نکلے، مگر وہ ہاتھ نہ آئے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ''دشمن'' کی چھے ہزار فوج اپنے علاقے میں قتل و غارت کر کے مال و متاع لوٹ لے اور رعایا سے خراج بھی وصول کر کے چل دے، اس وقت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو خبر نہ ہو، لیکن

جب وہ واپس اپنے ملک کو جا رہی ہو تو تعاقب کے لیے نکلیں، مگر دشمن ہاتھ نہ آئے۔ گویا چھے ہزار فوج کا انبار آنا جانا کوئی پندرہ بیس منٹ یا آدھے گھنٹے کی بات تھی کہ دشمن کا داؤ چل گیا اور اکثر عالمِ اسلام کا حاکمِ اعلیٰ چُوک گیا۔

یہ سب خرافات محض اس لیے وضع کی گئی ہیں کہ کسی طرح امت کے دل میں یہ خیال جاگزیں کیا جا سکے کہ ثالثوں کے فیصلے کے بعد حالتِ جنگ قائم ہوگئی تھی۔ تعجب ان مورخوں پر ہوتا ہے جو ایک طرف بخاری و مسلم کو بھی قابلِ استناد نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔ ہم روایات میں پھنسنا نہیں چاہتے، مگر دوسری طرف مسعودی اور طبری کی روایتیں بغیر تنقید کے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ سب مردود روایتیں مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم کی ہیں جو انھوں نے خضری سے نقل کیں اور تاریخ الامت میں درج فرمائیں۔

اب اس حالتِ جنگ کی نوعیت مسعودی سے سنیے:

”ولم يكن بين عليّ و معاوية من الحرب إلا ما وصفنا بصفين، و كان معاوية في بقية أيام علي يبعث سرايا تغير، و كذلك علي كان يبعث من يمنع سرايا معاوية من أذية الناس“ [1]

”علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہوئی، سوائے ایک صفین کے جس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ البتہ علی رضی اللہ عنہ کے باقی دنوں میں معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی فوجیں غارت گری کے لیے بھیجا کرتے تھے اور علی رضی اللہ عنہ بھی فوجیں بھیج دیا کرتے تھے، تاکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکریوں کے ہاتھوں لوگوں کو اذیت نہ پہنچے۔“

بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ:

اس تمام غارت گری میں سیدنا بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کی شقاوت کی داستانیں بڑے اہتمام سے بیان کی جاتی ہیں۔ اصل میں ان کا قصور بس اتنا تھا کہ وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے

---

[1] مروج الذهب (٢/ ٤٢١)

طرف داروں میں تھے اور امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ سے بغایت عقیدت رکھتے تھے۔ اسی لیے ان میں دنیا جہاں کے عیب جمع ہو گئے، حتی کہ اسلام و ایمان کا بھی شائبہ نہ رہا۔

حضرت بسر رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا اس لیے کہ اول مدینہ طیبہ حاضر ہوں، پھر مکہ معظّمہ اور وہاں سے یمن ہوتے ہوئے مستقر کو لوٹ آئیں۔ ان راویوں کو جغرافیہ سے بحث نہیں کہ دمشق سے چلنے والا شخص حجاز و یمن کی غارت گری کے بعد کس اطمینان سے دمشق کو واپس ہوسکتا تھا، البتہ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ تین ہزار فوج چلتی ہے اور چونکہ مسعودی اور ان تمام مورخوں کے نزدیک گویا دمشق سے لے کر مدینہ طیبہ تک، مدینہ سے لے کر مکہ معظّمہ تک، مکہ سے صنعا تک پھر صنعا سے واپس دمشق تک سب چٹیل میدان ہے، کہیں نام کو کوئی بستی نہیں، اگر بستیاں ہیں تو ان میں کوئی مرد نہیں رہتا۔

اس لیے یہ تین ہزار فوج خون کی ندیاں بہاتی مدینہ طیبہ پہنچی ہے۔ وہاں عاملِ مدینہ ہیں سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ۔[1] آپ سیدنا بسر کی اطلاع پاتے ہی وہاں سے ہٹ جاتے ہیں اور پھر سارے اہلِ مدینہ حضرت بسر کی ایک ہی دھمکی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیتے ہیں۔ یہ وہی ابو ایوب رضی اللہ عنہ ہیں جو ابھی جنگِ جمل میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا چکے ہیں اور ابتدا سے لے کر فتح مکہ تک جن کی شجاعت کے جھنڈے گڑے ہوتے ہیں اور جو دس برس بعد فتحِ قسطنطنیہ کے جہاد میں وصیت کر جاتے ہیں کہ دشمن کی سرزمین میں جتنی دور میرا جنازہ لے جا سکو وہاں مجھے دفن کرنا۔ اس عزیمت اور جلادت کا شخص بسر رضی اللہ عنہ کی تین ہزار فوج کے خوف سے کہیں روپوش ہوسکتا تھا؟ اور وہی اہلِ مدینہ جو سبائی فوج کے مدینہ پر تسلط کے باوجود سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کرتے اور چار برس تک اس انکار پر جمے رہتے ہیں، ان پر بسر رضی اللہ عنہ کی اتنی ہیبت طاری ہوتی ہے کہ جیسے شامیوں کی نہیں کوئی جنوں کی فوج آ گئی ہو، اور سب کے سب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیتے ہیں، البتہ

---

[1] مروج الذھب (۳/ ۲۰۔۲۱)

مسعودی نے یہاں یہ بیان نہیں کیا کہ ان ''بے دین'' شامیوں نے اہلِ مدینہ کے کتنے گھر لوٹے اور کتنے ہزار خواتین کی بے حرمتی کی۔ معلوم نہیں یہ چوک کیوں ہوگئی؟

بہرحال سیدنا بسر رضی اللہ عنہ جب مدینہ کے بعد مکہ میں اپنی فاتحانہ شان کا سکہ بٹھا کر یمن کی طرف رخ کرتے ہیں تو سیدنا عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ پر ان کی یلغار سے اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ ملک سے تو فرار ہوئے ہی تھے، بیوی بچوں کو بھی بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔ ادھر بسر رضی اللہ عنہ نے جو دیکھا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو ایسے آپے سے باہر ہوئے کہ سیدنا عبیداللہ کے دو صغیر السن بچوں کو شہید کر دیا۔ ان کی حسین و جمیل والدہ منہ کھولے بال بکھرائے ان کا نوحہ کرتی پھرتی تھیں اور کوئی مسلمان نہ تھا جس میں حرارت و غیرت کا جذبہ بیدار ہو۔ بسر رضی اللہ عنہ کی ''سیاہ کاری'' کا مکمل نقشہ یہ ہے:

''وقد كان بسر بن أرطاة العامري ـعامر بن لوئ بن غالب ـ قتل بالمدينة وبين المسجدين خلقاً كثيراً من خزاعة وغيرهم، وكذلك بالجرف قتل بها خلقاً كثيراً من رجال همدان، وقتل بصنعاء خلقاً كثيراً من الأبناء. ولم يبلغه من أحد أنه يمالئ علياً أو يهواه إلا قتله، ونما إليه خبر حارثة بن قدامة السعدي فهرب، وظفر حارثة بابن أخي بسر مع أربعين من أهل بيته فقتلهم'' [1]

''یہ بسر بن ارطاۃ عامری یعنی عامر بن لوئ بن غالب کی نسل کے ایسے شخص تھے کہ انھوں نے مدینہ میں اور حرمین شریفین کی درمیانی بستیوں میں خزاعہ وغیرہ میں سے بہت سی مخلوق کو قتل کر دیا۔ اسی طرح جرف میں بہت سے ہمدانیوں کو قتل کیا اور اسی طرح صنعا میں بہت سے مقامی باشندوں کو قتل کیا۔ انھیں کوئی ایسا

[1] مروج الذهب (۳/۳۱)

نہ ملا جو علی رضی اللہ عنہ کی طرف مائل ہو یا اس کے دل میں ان کی محبت ہو اور انھوں نے اسے قتل نہ کیا ہو، لیکن جب انھیں حارثہ بن قدامہ سعدی رضی اللہ عنہ کی آمد کی اطلاع ملی تو فرار ہو گئے۔ ادھر حارثہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ کو بسر رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہاتھ لگ گئے تو انھوں نے انھیں اور ان کے گھرانے کے چالیس آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔''

یہ ہے مسعودی صاحب کے نزدیک پہلی صدی کے وسط میں، ان عربوں کا حال جنھوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کا تختہ الٹ دیا تھا۔ یہ سب لوگ ان تین ہزار آدمیوں سے اتنے مرعوب تھے کہ گاجر مولی کی طرح ان کے ہاتھوں کٹتے چلے گئے اور خود یہ بسر رضی اللہ عنہ اتنے بہادر تھے کہ حارثہ رضی اللہ عنہ کے دو ہزار آدمیوں کی خبر سن کر بھاگ گئے۔ یہ حال اس امت کے اسلاف کا بیان کیا جا رہا ہے جو آج بھی جبر کی حکومت کو برداشت نہیں کرتی اور غیر مسلح ہونے کے باوجود توپوں، ٹینکوں اور بمبار طیاروں کے مقابلے پر ڈٹ جاتی ہے۔

یہ حضرت حارثہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ وہ بزرگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے انھیں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ حضرت بسر رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر بھیجا تھا۔ مگر یہ ایسے پھرتیلے تھے کہ ہمیشہ بسر رضی اللہ عنہ کے نکل چکنے کے بعد پہنچتے تھے اور ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ دو ہزار آدمیوں نے وہ شانِ سپہ گری دکھائی اور ایسا پینترہ چلے کہ اکتالیس آدمیوں کو گھیر کر مار دینے میں کامیاب ہو گئے۔

چونکہ یہ بے چارے مورخ اپنے دل کی بیماری سے مجبور ہیں اور انھیں گوارا نہیں کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے کردار کی رفعت کا کوئی نقش اخلاف کے دل میں باقی رہے، یا اُن کے متعلق یہ تصور کیا جا سکے کہ وہ امن سے رہنا جانتے تھے، حریت کے نام سے آشنا تھے اور تعلیماتِ اسلامیہ کی برکات کے حامل تھے، اس لیے ان کی بدامنی، شقاوت اور بزدلی دکھانے کے لیے اس قسم کی روایتیں وضع کی گئی ہیں یا دوسروں سے نقل کر کے اپنی حسرتیں نکالی گئی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سیدنا ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کی آمد کی خبر سن کر وہ بھی اپنے بھائی کی طرح بصرہ سے فرار ہو گئے تھے، مگر اتنا ضرور کہہ دیا کہ بیت المال کا روپیہ لے کر مکہ جا بیٹھے۔ تعجب خضری جیسے شخص پر ہے، جنھوں نے اگرچہ صراحت کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خیانت تو نہیں دکھائی، لیکن امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ حکم لگا دیا کہ آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر خیانت کا الزام لگایا تھا، جس سے برافروختہ ہو کر وہ مکہ چلے گئے۔[1]

اب یہ پتا نہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جو مکہ پہنچے تو بسر رضی اللہ عنہ کے وہاں پہنچنے سے پہلے گئے تھے یا بعد میں۔ اور اگر پہلے گئے تھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نمایندوں نے ان کا استقبال کس طرح کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بغیر مکہ میں رہ نہیں سکتے تھے تو پھر مکہ جانے کے بجائے سیدھے شام کیوں نہ چلے گئے جہاں زیادہ آؤ بھگت ہوتی اور دنیا دیکھتی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حریف کا ایک اور بھائی بھی توڑ لیا۔

افسوس ان اہلِ قلم پر ہے جو ایمان کا دعویٰ تو رکھتے ہیں اور امت کی خیر سگالی میں وعظ و نصیحت کرنے بیٹھ جاتے ہیں وہ اس پر کیوں اتنے دلیر ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت اطہار کے متعلق جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں اور جو قلم سے نکلتا ہے گھسیٹ ڈالتے ہیں۔ یہی شان جو خضری صاحب کی ہے اس وتیرہ پر مصر کے طٰہٰ حسین بھی ہیں جنھوں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ خرافات نقل کر کے یہاں تک کہہ دیا کہ بیت المال کا یہ روپیہ جو انھوں نے خورد کیا تھا اس سے ناچنے والی لڑکیاں خریدیں اور مکہ میں بیٹھ کر دادِ عیش دینے لگے۔ إنا للّٰہ و إنا إلیه راجعون

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بصرہ ہی کے والی رہے۔[2] آپ اس عہد نامہ کے گواہوں میں ہیں جو سیدنا حسن اور

---

[1] محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیة (۲/ ۷۹)

[2] الإصابة في تمییز الصحابة تحت ترجمة عبد اللّٰه بن عباس.

معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہوا تھا۔

غرض یہ ہے کہ ان ملحدوں اور زندیقوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق حماقت، چالاکی، عہد شکنی، دروغ حلفی، سفاکی، فتنہ انگیزی اور بزدلی کی یہ جتنی داستانیں وضع کی ہیں ان میں خود خبثِ نفس اور سرشتِ بد کی نمایش کی ہے، تاکہ کسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ بہترین امت کو بدترین جماعت ثابت کر کے دعوتِ محمدیہ کی حقانیت کا یقین دلوں سے اٹھا سکیں، ورنہ یہ بزرگوار جو آخری نبی کی برپا کردہ بہترین امت کے افراد تھے وہ واقعی ایسے تھے جیسے اللہ نے اُن کے متعلق فرمایا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

''تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی۔''

حضرت بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں سیدنا عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے دو معصوم بچوں کا شہید ہونا محض افسانہ ہے اور ایسا ہی وضعی اور خیالی، جیسے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کے دو فرزندوں کا کوفہ میں حسرت ناک طریقے پر شہید کیا جانا یا میدانِ کربلا میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ایک شیر خوار فرزند کے گلے میں خیالی تیر کا پیوست ہونا یا عین میدانِ کارزار میں حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کی شادی اور ان کی دلہن کے ہاتھوں میں منہدی کا لگایا جانا۔

اگر بالفرض حضرت بسر رضی اللہ عنہ سے اس شقاوت کا صدور ہوا تھا تو کیا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اسے پی جاتے یا سیدنا حسن رضی اللہ عنہ معاہدۂ صلح کے وقت ان معصوم بھائیوں کو بھول جاتے اور بسر رضی اللہ عنہ سے قصاص کا مطالبہ نہ کرتے یا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو معاہدۂ صلح مرتب کرتے وقت بھتیجوں کی پیاری صورتیں یاد نہ آتیں یا خود سیدنا عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس ظلمِ عظیم کے خلاف داد رسی کے لیے کوشاں نہ ہوتے۔ یہ کوئی سیاسی قتل نہیں تھا کہ خاموشی اختیار کر لی جاتی اور نہ حدودِ الٰہی جاری کرنے میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کبھی مداہنت کو کام میں لاتے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے پاس سادہ کاغذ اپنی مہر کر کے بھیج دیا تھا کہ جو شرطیں چاہیں لکھ لیں اور صحیح بخاری کی حدیث آگے آ رہی ہے جس کے مطابق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے نمایندے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی ہر بات پر کہتے تھے: ''ہم اس کے ذمے دار ہیں'' تو کیا یہ تعجب انگیز نہیں کہ نہ انھوں نے ان معصوم بچوں کا قصاص کا مطالبہ کیا اور نہ باپ اور چچا نے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک بسر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دینا اس صلح کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اور نہ ان کے قتل سے کسی ادنیٰ ترین سیاسی اختلال کا خطرہ تھا۔ اللہ کے دشمنوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو دین سے بے پروا تو کہا ہے، لیکن سیاست سے بے خبر کہنے کی جرأت تو کسی کو نہیں ہوسکتی۔ اس قصاص کا مطالبہ اگر کیا جاتا تو ضرور پورا ہوتا، لہٰذا ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بچوں کے قتل کا یہ افسانہ محض تخیل کی پرواز ہے۔ حضرت بسر رضی اللہ عنہ کے متعلق ہم ہرگز باور نہیں کر سکتے کہ انھوں نے احکامِ الٰہی اور شعارِ اسلامی کو پامال کر کے دو معصوم بچوں کا خون بلاوجہ اپنی گردن پر لیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ انھوں نے اس سفاکی کا مظاہرہ کیا جو مسعودی وغیرہ بیان کرتے ہیں اور نہ اُن میں اس کی قدرت تھی، نہ انھیں علمِ غیب تھا کہ لوگوں کے دلوں میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی چھپی ہوئی محبت معلوم کر کے انھیں قتل کر دیں اور نہ اُن کے پاس کوئی جادو کی چھڑی تھی کہ اس کے ایک اشارے پر ہر جگہ کے لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو جائیں اور نہ اس عہد کے مسلمان ایسے بزدل، منتشر اور غیر مسلح تھے کہ بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کے تین ہزار آدمی تو ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیں اور سرزمینِ عرب کو مذبح بنا کر رکھ دیں لیکن خود ان کا ایک آدمی بھی کام نہ آئے۔

معمولی عقل کی بات ہے کہ اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ کارروائیاں جارحانہ ہوتیں اور ان کی فوجوں نے واقعی یہ قتل و غارت کیا ہوتا تو تمام عالمِ اسلام میں اُن کے خلاف نفرت پھیل جاتی، ان کا موقف باطل ہو جاتا، ہر طرف سے اُن کے خلاف

آوازیں بلند ہوتیں اور سب طرف کے لوگ رغبتِ دلی کے ساتھ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر اس ظلم وستم اور امن سوزی کا بدلہ لیتے۔

اگر بالفرض سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ان فوجوں نے واقعی ہر جگہ کے لوگوں کو مغلوب کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا تو ان مورخوں کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ جن علاقوں کو اس جبر واستبداد کے ساتھ وہ اپنے زیرِ نگین لائے تھے، انھیں اپنے ہی تحت رکھنے کے لیے کیا اقدامات کیے، کتنے آدمیوں کو غیر مسلح کیا، کس جگہ کون سا خونخوار اور جابر والی مقرر کیا اور پھر ان والیوں کی حمایت کے لیے کہاں کہاں کتنی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ مستبد حکمرانوں کو مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ آج کرنا پڑتا ہے اس سے ہزار گنا زیادہ اس عہد کے مسلمانوں کے ساتھ کرنا پڑتا۔ پھر تاریخ اس بارے میں خاموش کیوں ہے؟

معلوم ہوا کہ یہ سب افسانے ہیں اور مسعودی وغیرہ نے اپنے نامہ ہائے اعمال سیاہ اور آخرت برباد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کتابیں لکھ کر امتِ مسلمہ پر ظلمِ عظیم کیا ہے۔ افسوس ان سمجھ دار لوگوں پر ہے جو واقعات کا استقصاء کیے بغیر سلف صالحین پر طعن کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور اگرچہ منہ سے نہ کہیں لیکن تاریخ پر کتابیں لکھ کر عملاً یہ باور کرانے کے مجرم بنتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بدترین امت کو بہترین بتا کر محض شاعری کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صفین کے بعد سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان قطعاً کوئی جنگ نہیں ہوئی، صرف ایک مصر کا قضیہ تھا جس کی تفصیلات اوپر گزر چکیں، لیکن اس معاملے کو نہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھایا اور نہ سیدنا امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے۔ مصر جیسا ملک ہاتھ سے نکل جائے، محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ جیسا بیٹا کام آئے اور سیدنا علی مرتضی چپکے بیٹھے رہیں! آخر وقت میں دو ہزار فوج کو بھیجا جانا تو بیان کر دیا گیا اور یہ بھی کہ حضرت ابن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر وہ فوج واپس بلا لی گئی، لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ ایسا معاملہ خاموشی

اختیار کرنے کا تھا یا جان لڑا دینے کا؟[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں اوپر مرقوم ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک آپ کا قیام بصرہ ہی میں رہا اور آپ مکہ اس وقت گئے جب سیدنا حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما

---

[1] مولانا سید علی احمد عباسی کی یہ بحث اپنے تئیں اتنی جاندار اور مدلل ہے کہ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت'' میں ''بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کے ظالمانہ افعال'' کی سرخی قائم کر کے حاشیہ نمبر (۱) کے تحت اس مبحث کو پڑھنے کا مشورہ دیا ہے۔ دیکھیں: ''خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت'' (صفحہ:۵۴۷، حاشیہ: ۱)، حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اس بابت مزید لکھتے ہیں:

''بعض محدثین نے بسر بن ارطاہ رضی اللہ عنہ کے متعلق شہرت یافتہ واقعات میں مشغول ہونے یعنی انھیں ذکر کرنے یا ان سے غلط استدلال کرنے سے منع کیا ہے: "وله أخبار شهيرة في الفتن لا ينبغي التشاغل بها" (الإصابة: ۱/۱۵۳) خود ابن کثیر رحمہ اللہ نے جن کے حوالے سے مولانا (مودودی) نے دو بچوں کے قتل کرنے کا واقعہ نقل کیا ہے، دوسرے مقام پر اس واقعہ سمیت تمام تفصیلات کو مشتبہ اور مشکوک قرار دیا ہے: "هذا الخبر مشهور عند أصحاب المغازي والسيّر، وفي صحته عندي نظر" (البداية والنهاية: ۷/۳۲۲)۔ (خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت: ص: ۵۴۷، ۵۴۸)

یہی وجہ ہے کہ البدایہ و النہایہ میں ابن کثیر نے سیدنا بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ سے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا جو خطبہ نقل کیا ہے، وہ سنگدلی و شقاوت کے الزامات پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیتا ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''زہیر بن الارقم کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن ہمارے سامنے تقریر کی اور فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بسر رضی اللہ عنہ اب یمن میں آ گئے ہیں اور بخدا مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ تم پر غالب آ جائیں گے اور ان کے اس غلبے کا سبب ہوگا: "بعصيانكم و طاعتهم إمامهم و بخيانتكم و أمانتهم و إفسادكم في أرضكم وإصلاحهم" یعنی ''تمھارا اپنے امام کی نافرمانی کرنا اور ان کا اپنے امام کی اطاعت کرنا، تمھاری خیانت اور ان کی امانت، تمھارا اپنی زمین میں فساد کرنا اور ان کا اصلاح کرنا۔'' (البداية و النهاية: ۷/۳۲۵)

کہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا بسر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی تعمیری جدوجہد کی مدح وستائش اور کہاں کذاب راویوں کی سیدنا بسر رضی اللہ عنہ سے متعلق سنگدلی و شقاوت کی یہ لغو بیانی۔

کے مابین صلح ہوگئی تھی۔ مناسب ہے کہ یہاں اُس افسانے کی تنقیح کر لی جائے جو آپ کے بصرہ چھوڑنے اور بیت المال پر ناجائز تصرف کرنے کے بارے میں مشہور کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "الإصابة" میں بذیل عنوان عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، اس کی تصریح کی ہے کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک سیدنا عبداللہ کا قیام برابر بصرہ ہی میں رہا، جیسا کہ مذکور ہوا۔ اب طبری کی ایک اور روایت ملاحظہ ہو:

"أن ابن عباس رضي الله عنهما لم يبرح من البصرة حتى قتل علي، فشخص إلى الحسن، فشهد الصلح بينه وبين معاوية، ثم رجع إلى البصرة و ثقله بها فحمله و مالاً من بيت المال قليلاً" (٨٢/٦)

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما برابر بصرہ ہی میں مقیم رہے، تا آنکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا، اس وقت آپ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور اس صلح میں شرکت کی جو ان کے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین منعقد ہوئی تھی۔ پھر آپ بصرہ کو واپس ہوئے جہاں آپ کا مال و اسباب تھا۔ وہاں سے آپ نے اپنا سامان اور تھوڑا سا مال اٹھوا لیا۔"

یعنی جب آپ بصرہ تشریف لے گئے ہیں تو اسباب کے علاوہ نقد روپیہ تھوڑا تھا۔ گویا مستند اور معتبر ماخذ کے مطابق اس افسانے کی کوئی اصل نہیں جو سبائیوں نے طرح طرح مشہور کیا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بصرہ نہیں چھوڑا تھا، بلکہ آپ کی نقل مکانی اس وقت کی ہے جب امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ پر اجماع ہو گیا تھا اور حکومت بدل گئی تھی جس کے آپ اب عہدے دار نہیں رہے تھے۔ ان احوال میں یہ ممکن نہ تھا کہ آپ اپنے حکم سے سرکاری خزانے پر کچھ تصرف کر سکیں۔

اگر کہا جائے کہ عبوری دور تھا اور انھیں تغلب کا موقع مل گیا تب بھی بات نہیں بنتی۔ نئی حکومت کی طرف سے باز پرس لازماً ہوتی۔ آپ کا قیام مکہ ہی میں تھا اور آپ حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ کی دسترس سے باہر نہیں ہو گئے تھے۔

اگر کہا جائے کہ حکومت کو اس تغلب کی اطلاع نہیں ہوئی تو سوال ہے کہ جب امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے بیدار مغز حکمران کو اطلاع نہ ہو سکی تو ان راویوں کو کیسے ہوگئی؟ دو ہی باتیں ممکن ہیں یا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وہی روپیہ ساتھ لیا جو ان کا اپنا تھا، یا خزانے سے اتنا لیا جو ان کی تنخواہ کا واجب نکلا، دونوں صورتوں میں مجالِ دم زدن نہیں۔ جو شخص بھی اس بہتان و افترا کی جرأت کرتا ہے وہ جانے اور اس کا پروردگار۔ اس روایت کے وضع کرنے والوں کو یہ معلوم نہیں کہ بیت المال کا متولی دوسرا شخص ہوتا تھا اور براہِ راست امام کو جواب دہ تھا۔ والی کے لیے ممکن نہ تھا کہ امام سے استصواب کیے بغیر اپنے حکم سے کچھ تصرف کر سکے۔ اب اگر وہ شخص جو خزانہ کا متولی تھا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ناجائز تصرف میں شریک، اس کی بابت کسی روایت میں کیوں کچھ ذکر نہیں؟ حکومت کے سامنے صحیح معنی میں جواب دہ تو وہ تھا۔

بہر حال جو امر ثابت و محقق ہے وہ یہی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مکہ جا کر مقیم ہونا امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے زمانے کا واقعہ نہیں اور وہ سب داستانیں قطعی فرضی ہیں جنھیں لوگوں نے اچھالا ہے۔ تعجب ہے کہ ماخذ کی موجودگی میں ادعائے تحقیق کے باوجود خضری نے حسبِ ذیل کلمات لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی:

"ومن أغرب ما يروى أن ابن عباس وهو المساعد الأشد لعلي فارقه وترك البصرة التي كانت قد ولاه عليها وجاء مكة لأنّ عليّا اتهمه بمال أخذه من مال المسلمين" [1]

''سب سے عجیب روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سب سے زیادہ سرگرم کارکن تھے وہ ان سے جدا ہو گئے اور بصرہ

[1] محاضرات تاریخ الأمم الإسلامية (٧٩/٢)

سے چلے گئے۔ وہی (بصرہ) جس کی حکومت پر انھوں نے انھیں فائز کیا تھا، پھر مکہ جا بیٹھے، کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر مسلمانوں کا مال خورد برد کرنے کا الزام لگایا تھا۔''

اگر خضری کو یہ روایت نا قابلِ قبول ہونے کی وجہ سے عجیب نظر آتی اور انھوں نے بغیر محاکمہ کے اس کو نقل کر دیا ہوتا کہ لوگ خود اس کا باطل ہونا سمجھ لیں گے تب بھی ایک بات تھی، لیکن وہ تو اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تبصرہ کرتے وقت آپ کے عدمِ تدبر کی مثالیں دے کر ان الفاظ میں ان دونوں بزرگوارنِ ملت کی تنقیص کرتے ہیں:

"وعلي يحاسبهم على النقير والقطمير في وقت هو محتاج إليهم حتى كان شيء من ذلك سبباً في تغير قلب ابن عباس عليه وفرقته له فترك البصرة وذهب إلى مكة" [1]

''اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ وہ حقیر ترین امور میں بھی اپنے عمال سے باز پرس کیا کرتے تھے، حالانکہ اس وقت انھیں ان کی امداد کی سخت احتیاج تھی۔ ایسی ہی ایک بات تھی جو ان کی طرف سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دل پھیر دینے اور ساتھ چھوڑ دینے کا سبب بنی۔ چنانچہ وہ بصرہ سے چلے گئے اور مکہ جا بیٹھے۔''

تعجب ہے کہ معتبر ماخذ اور قوی اسناد کی موجودگی میں خضری نے ایک بے سروپا بات پر یہ افسانہ کھڑا کر دیا جس کی لپیٹ میں حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم دونوں آ گئے۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بنو ہاشم اور امت میں یہ مقام رہتا جو بڑے بڑوں کے لیے موجبِ غبطہ ہے؟!

اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے کا یہ واقعہ ہے تو اس وقت مکہ معظّمہ انہی کی قلمرو میں

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلاميةس (٤٨/٢)

تھا۔ محض الزام لگا کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ چپکے کیوں ہو گئے اور انھیں گرفتار کر کے باز پرس کیوں نہ کی؟ بیت المال کے روپیہ پر تصرف کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ ''وہ حقیر ترین امور میں بھی عمال سے باز پرس کرنے کی'' کمزوری میں مبتلا تھے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بلکہ انتہائی گستاخانہ اور اہلِ ایمان کے لیے موجبِ اشتعال ہے وہ بیان جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ''الفتنة الكبرىٰ'' میں دیا ہے اور اس فرضی واقعے کی تفصیلات میں مزید اضافہ کر کے امت کے لیے دلسوزی کے ادعاء کے ساتھ اسلافِ کرام کے کردار کی پستی کا ماتم کرنے بیٹھے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بصرہ کے بیت المال سے جو رقم اڑائی تھی اس سے ناچنے گانے والی لونڈیاں خریدیں اور مکہ میں بیٹھ کر دادِ عیش دینے لگے۔

واقعی مکہ مکرمہ ایسی جگہ ہے جہاں اس زمانے میں رامش و رنگ کی محفلیں جمتی تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کا یہی کردار تھا، خصوصاً اس شخص کا جو نونہالانِ باغِ نبوت میں تنہا اس شرف کا حامل ہے کہ رات نمازوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوتا تھا اور جسے سینے سے لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دین کی سمجھ عطا فرمائے اور قرآن حکیم کے معارف اس پر القا کرے اور جسے تمام امت امام المفسرین اور سید الفقہاء سمجھتی ہے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون

بصرہ چھوڑنے کا واقعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے کا قرار دینا، پھر بصرہ کے بیت المال پر ناجائز تصرف کا بہتان باندھنا اور تمام صحیح و معتبر ماخذ کو نظر انداز کر کے اس پر قسم قسم کی روایتوں کا انبار لگا دینا محض اس لیے ہے کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح اہلِ بیتِ نبوت کے کردار کو بھی بے حیثیت بنا دیا جائے۔ ایسی ہی روایتیں سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ کے متعلق ان لوگوں نے وضع کی ہیں۔ افسوس ان پر ہے جو بغیر تحقیق و تدبر ان واہی روایات کو نقل کر کے امت کے قلوب مکدر کرتے ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قصور اتنا ہے کہ وہ خلفائے عباسیہ کے مورث ہیں اور سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ کا قصور یہ ہے کہ وہ حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہم نوا تھے۔ اس لیے یہ دل کے پھپھولے پھوڑے گئے ہیں۔

سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ:

سیدنا عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ امت کی فلاح اسی میں سمجھتے تھے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیا جائے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ چنانچہ آپ شام تشریف لے گئے اور اپنی وفات تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ رہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے آپ عمر میں بیس برس بڑے تھے، یعنی جب اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر ان کے حریف سے جا ملے تو آپ کی عمر شریف اسّی برس کے قریب تھی اور یہ وہ عمر ہے کہ مومن کی توجہ طبعاً آخرت کی طرف ہوتی ہے اور دنیا کی طرف سے وہ بے رغبت ہو جاتا ہے، لیکن سیوطی صاحب رحمہ اللہ کا قلم کچھ اور کہتا ہے:

”وأخرج ابن عساكر عن حميد بن هلال: أن عقيل بن أبي طالب سأل عليّا فقال: إني محتاج وإني فقير فأعطني. فقال: اصبر حتى يخرج عطائي مع المسلمين فأعطيك معهم، فألحّ عليه فقال الرجل: خذ بيده وانطلق به إلى حوانيت أهل السوق فقل: دق هذه الأقفال، وخذ ما في هذه الحوانيت، قال: تريد أن تتخذني سارقا، قال: وأنت تريد أن تتخذني سارقاً أن آخذ أموال المسلمين فاعطيكها دونهم؟ قال: لآتينّ معاوية، قال: أنت وذاك، فأتىٰ معاوية، فسأله فأعطاه مأة ألفٍ ثم قال: اصعد على المنبر فاذكر ما أولاك به علي وما أوليتك، فصعد فحمد الله وأثنى عليه ثم قال: أيها الناس! إني أخبركم

إني أردت عليّا على دينه فاختار دينه، وأني أردت معاوية على دينه فاختارني على دينه“ [1]

”ابن عساکر نے حمید بن ہلال کے حوالے سے یہ ذکر کیا ہے کہ عقیل بن ابی طالب نے علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا اور کہا: میں محتاج ہوں اور میں فقیر ہوں، لہٰذا مجھے کچھ دو۔ انھوں نے فرمایا: ذرا صبر کیجیے، جب باقی مسلمانوں کے ساتھ میرا حصہ الگ کیا جائے گا تو اوروں کے ساتھ آپ کو بھی کچھ دے دوں گا۔ لیکن وہ سر ہو گئے تو آپ نے ایک شخص سے فرمایا: ان کا ہاتھ پکڑ اور بازار والوں کی دکانوں پر لے جاؤ اور کہو کہ ان کے قفل توڑ کر جو کچھ گوداموں میں ہو وہ لے لیں۔ انھوں نے کہا: تم مجھے چور بنانا چاہتے ہو؟ آپ نے فرمایا: اور آپ مجھے چور بنانا چاہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کا مال لے کر ان کے بجائے آپ کو دے دوں؟ اس پر وہ بولے: تو پھر میں معاویہ کے پاس چلا جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا: یہ آپ کا کام ہے آپ جانیں۔ چنانچہ وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے اور ان سے بھی سوال کیا۔ انھوں نے ایک لاکھ درہم دیے اور فرمایا کہ ذرا منبر پر چڑھ کر بتا دیجیے کہ علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی پذیرائی کس طرح کی ہے اور میں نے آپ کے ساتھ کیا خصوصیت برتی۔ آپ منبر پر چڑھے، اول اللہ کی حمد و ثنا کی اور پھر فرمایا: لوگو! میں تمھیں اصل بات بتاتا ہوں۔ میں نے اپنے لیے علی رضی اللہ عنہ کو دین سے برگشتہ کرنا چاہا تو انھوں نے میرے مقابلے میں دین کو ترجیح دی، پھر میں نے اپنی خاطر معاویہ رضی اللہ عنہ کو دین سے برگشتہ کرنا چاہا تو انھوں نے اپنے دین کے بجائے مجھے اختیار کیا۔“

یہ ہے ان راویوں کے نزدیک اہلِ بیت کی ذہنیت اور شیخ بنی ہاشم کا حال۔ سیدنا

[1] تاريخ الخلفاء (ص: ٧٩) طبع مصر

عقیل رضی اللہ عنہ محتاج اور فقیر کس طرح ہو گئے، یہ کوئی نہیں بتاتا؟ دیوان کا محکمہ کہاں گیا؟ بنو ہاشم کا وہ وظیفہ کیا ہوا جو عہدِ فاروقی سے جاری تھا اور جس میں مال کی فراوانی کے سبب اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر امام کو یہ حق کیوں نہیں کہ اگر ایک شخص پر افتاد پڑ گئی تو بیت المال سے اس کی مدد کرے۔ ویسے اگر روپیہ نہ دیا جاتا تو قرض دیا جا سکتا تھا یا پیشگی وظیفہ دیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس شخص کی زکات کا ہزاروں روپیہ نکلتا ہو اس کا بھائی مفلس ہو جائے۔ سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ کی اولاد موجود تھی، بلکہ اولاد کی اولاد اور ان سب کو بیت المال سے وظیفہ ملتا تھا۔ گویا عرب کی معاشرت کے مطابق ان پر اپنی اولاد کا کچھ بوجھ نہ تھا تو پھر ان کے افلاس کا سبب کیا ہوا؟ اور اگر بالفرض بقول مسعودی کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی مفلسی کی زندگی بسر کرتے تھے تو سیدنا حسن اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کی شہرۂ آفاق دولت اور سخاوت کا کیا فائدہ تھا جو وہ اپنے سگے بڑے چچا کے کام نہ آ سکے۔

ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دینداری اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بے دینی بیان کر کے سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ نے خود اپنے آپ کو کہاں رکھا، دین داروں میں یا دنیا پرستوں میں؟ ان کے پاس یہ روپیہ لینے کا فقہی جواز کیا تھا؟ پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی جو انھوں نے کھلی بے عزتی کی اور خود ان کے اپنے مرکز میں منبر پر انھیں بے دین اور دنیا پرست بتایا تو انھوں نے کس بنا پر انھیں اپنے ہاں احترام کے ساتھ رکھا۔ نعوذ باللّٰہ من سوء الفکر.

چونکہ اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سگے بڑے بھائی جو شیخ فانی کے درجے کو پہنچ گئے تھے انھوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق اپنا سیاسی موقف متعین کرنے میں رشتے کی پروا نہیں کی اور وہی کیا جو ان کے نزدیک امت کے حق میں مفید اور پیش آمدہ حالات کے تحت مناسب تھا، اس لیے ضرورت ہوئی کہ اُن پر قسم قسم کے فقرے چست کر کے خانوادۂ رسالت کے اس اہم رکن کی بے حرمتی کی جائے۔ غرض یہ ہے کہ اسلاف کرام

میں چھوٹا بڑا کوئی ایسا نہ رہنے پائے جس کی کچھ عزت دلوں میں رہ سکے۔ چنانچہ یہ لوگ کسی کی مدح بھی کرتے ہیں تو برنگِ ذم۔

یہاں یہ امر صاف کر دینا ضروری ہے جیسا کہ متعدد جگہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جتنے حضرات نے امرِ خلافت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بے تعلقی یا مخالفت کا موقف بنایا وہ خود ان کے خلاف نہ تھا، ان کی خیر خواہی میں تھا، تا کہ وہ اس ناپاک گروہ سے نجات حاصل کر لیں جو سیاسیاتِ اسلامیہ پر حاوی ہو گیا تھا اور ان کے وجود سے ناجائز فائدہ اٹھا کر امت کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ کا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلا جانا اس امر کا نہایت اہم ثبوت ہے کہ اس وقت سبائیوں کی طرف سے اہلِ دین اور زعمائے ملت کے قلوب کس درجہ متنفر تھے۔



دورِ فتن میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا موقف

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زبانِ مبارک سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق نہایت کریہہ، حقارت آمیز اور تکلیف دہ کلمات نکلوائے گئے ہیں۔ شریف رضی اور شریف مرتضٰی نے اپنے سفیہانہ کلمات کی ادائیگی کے لیے خانوادۂ رسالت کی اس عظیم ترین شخصیت کا نام لیتے وقت اس کا بھی تو خیال نہیں کیا کہ جب غیر مسلم لوگ ''نہج البلاغۃ'' پڑھیں گے تو اہلِ بیتِ نبوت کے متعلق ان کی رائے کیا ہوگی؟ شاید ہی دنیا میں کسی کی ایسی ناخلف اولاد پیدا ہوئی ہو جیسے یہ دونوں بھائی (شریف رضی اور شریف مرتضٰی) امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے لیے باعثِ ننگ و عار ہیں۔

لیکن جب ہم صحاح کی روشنی میں واقعاتِ تاریخی دیکھتے ہیں تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ایسا ہی امام الاتقیاء اور سرخیلِ اولیا پاتے ہیں اور اتنا ہی بلند محسوس کرتے ہیں جیسے ایک ہاشمی سردار کو ہونا چاہیے۔ اس بزرگوار کو جو تیس برس کے قریب جلوت وخلوت میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اور جو آپ کا محض بھائی اور داماد ہی نہ تھا، بلکہ آپ نے اسے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ صلوات اللہ و سلامه علیه.

خودنگری اور انانیت، دوسروں کی تحقیر اور اپنے نسب پر غرور، اپنے سے بزرگ تر ہستیوں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی، اپنی طہارت وتزکیہ کا اعلان اور مخالفوں پر طعن و تشنیع، بلکہ لعنت، یہ وہ باتیں ہیں جو دشمنانِ دین وملت نے آپ کی طرف منسوب کی ہیں اور خضری جیسے لوگوں نے اس افترا کو صحیح باور کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مکارمِ اخلاق کی تعلیم

دینے کی جرأت کی ہے ع

اصلاح می دہد خطِ پروردگار را

لیکن الحمد للہ ثم الحمد للہ! کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا دامن ان تمام لغویات و سیئات سے پاک ہے اور آپ کو اس پست کردار سے دور کی بھی نسبت نہیں جو رضی و مرتضیٰ اور مسعودی نے آپ کا بیان کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سبائی جس کی مدح کرتے ہیں اس میں بھی نیت ذم ہی کی ہوتی ہے۔

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حرمت و عظمت کا پورا احساس تھا اور آپ دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ آپ نے اس سیاسی اور اجتہادی اختلاف کو کبھی ذاتی اور خاندانی نہیں بنایا، جیسا کہ دنی النفس لوگ ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ ثالثی نامہ میں آپ نے اپنا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام مساویانہ لکھا جانا منظور کیا، متارکۂ جنگ کے دوران میں برابر اُن کی اور ان کے ساتھیوں کی بلندی اور مکارمِ اخلاق کی مدح کی اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت وصیت فرما گئے:

”معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت سے کراہت محسوس نہ کرنا، وہ نہ ہوں گے تو تم دیکھو گے کہ امت میں کتنی خون ریزی ہوتی ہے۔“[1]

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے جس طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو کر آپ سے بیعت کر لی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یقیناً انھیں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ وصیت فرمائی تھی۔

ثالثی نامہ کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بالکل خاموشی ہوگئی اور سوائے مصر کے واقعہ کے، جس میں خود آپ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، اور کسی قسم کا کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا جو طرفین میں سے کسی کی ناراضی کا سبب بنتا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب مصر میں امن قائم

[1] سیوطی کی تاریخ الخلفاء (ص: ۷۵) طبع مصر

کر دیا اور ادھر سے امت مطمئن ہوگئی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے صبر و ضبط سے کام لیا۔ پھر یمن و حجاز بھی جب وہاں کے باشندوں کی منظوری سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے تحت چلے گئے تو اسے بھی آپ نے برداشت کر لیا۔

لیکن جب خوارج نے بغاوت کی اور امتِ مسلمہ سے اپنا تعلق منقطع کر کے سب کو کافر اور واجب القتل کہا تو آپ نے پوری قوت سے ان کے خلاف جہاد کیا۔ پھر جب ایران کے لوگوں نے بغاوت کی اور اپنی حکومت الگ کر کے عالمِ اسلام سے نکل جانا چاہا تو اس پر بھی آپ نے سخت اقدام کیا۔ سیدنا زیاد رضی اللہ عنہ کو فوج دے کر بھیجا جنھوں نے پوری قوت اور اعلیٰ سیاست سے اس بغاوت کو کچل کر امن قائم کر دیا۔ مسعودی کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ ایران کی بغاوت کو فرو کرنا امیر زیاد ہی کا کارنامہ تھا۔[1]

اب تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو غور کرنا چاہیے کہ آپ نے یہ مختلف طریق ہائے کار کیوں اختیار کیے۔ یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ چونکہ خوارج سے جنگ کے وقت آپ کے پاس قوت تھی اس لیے آپ ان سے لڑے اور بعد میں وہ قوت نہ رہی تو چپکے ہو گئے۔ یہ تصور لغو اور شر انگیز ہے۔ اسے کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ کوفیوں اور بصریوں کے علاوہ بقیہ زیرِ نگیں علاقوں سے آپ کو یقیناً لڑنے والے سپاہی میسر آ سکتے تھے اور آپ چاہتے تو بڑی آسانی سے ایک لشکرِ جرار فراہم ہو سکتا تھا۔ ایران کی بغاوت فرو کرنے کا واقعہ ۳۹ھ کا ہے۔ یعنی نہروان کی جنگ سے ایک سال بعد کا۔ تو پھر یمن و حجاز کے بارے میں آپ نے سپر کیوں ڈال دی؟

بات یہ ہے کہ آپ نے یمن و حجاز کے اقدام کو بغاوت سے تعبیر نہیں کیا اور نہ سیدنا بسر رضی اللہ عنہ وغیرہ کے دورہ کو جارحانہ کارروائی سمجھا، بلکہ اس سب کو رائے کی آزادی جانا، جو ثالثی نامہ نے پوری امت کو دی تھی۔ ثالثوں کے فیصلے نے فریقین کو حق دیا تھا کہ آنے

---

[1] مروج الذهب (۱۵/۳)

والے اجتماع کے لیے اپنا موقف جس طرح چاہیں رائے عامہ کو استوار کر کے مضبوط بنائیں۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ امت کا مستقبل کیا ہونے والا ہے اور سیاساتِ اسلامیہ کا رخ کدھر ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ میں نہایت قوی سند کے ساتھ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے جو آپ نے اس وقت دیا جب یمن وغیرہ علاقے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے تحت چلے گئے۔ اس خطبہ کی توثیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے اور چونکہ واقعات کے عین مطابق ہے اس لیے اس پر نقطہ رکھنے کی گنجایش نہیں:

”عن زهير بن الأرقم قال: خطبنا علي يوم الجمعة فقال: نبئت أن بسراً قد طلع اليمن وإني والله لأحسب أن هولاء القوم سيظهرون عليكم وما يظهرون عليكم إلا بعصيانكم إمامكم وطاعتهم إمامهم، وخيانتكم وأمانتهم، وإفسادكم في أرضكم وإصلاحهم. قد بعثت فلاناً فخان وغدر، وبعثت فلاناً فخان وغدر، و بعث المال إلى معاوية لو ائتمنت أحدكم على قدح لأخذ علاقته، اللهم سئمتهم وسئموني، وكرهتهم وكرهوني. اللهم فأرحهم مني، وأرحني منهم“ [1]

”زہیر بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے خطبہ میں ہم سے فرمایا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ بسر اب یمن میں آ گئے ہیں۔ بخدا مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ عنقریب تم پر غالب آ جائیں گے اور ان کے غلبہ کا سبب صرف یہی ہو گا کہ تم اپنے امام کے نافرمان ہو اور وہ اپنے امام کے مطیع ہیں، تم خیانت کرتے ہو اور وہ امانت دار ہیں، تم زمین میں فساد

[1] البداية والنهاية (٨/ ٢٠) منقول از العواصم من القواصم (ص: ١٨٣)

کرتے ہو اور وہ اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ میں نے فلاں شخص کو بھیجا اس نے خیانت کی اور غدر کیا، میں نے فلاں شخص کو بھیجا اس نے بھی خیانت کی اور غدر کر کے مال معاویہ کو بھیج دیا۔ میں تم سے کسی کے پاس ایک پیالہ امانتاً رکھواؤں تو وہ اسے چاٹنا شروع کر دے گا۔ خدایا یہ مجھ سے تنگ آ گئے اور میں ان سے، مجھے ان سے نفرت ہے اور انھیں مجھ سے، خدایا انھیں مجھ سے نجات دے اور مجھے ان سے۔''

یہ خطبہ بتا رہا ہے کہ جس طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے رائے عامہ اپنے حق میں کرنے کے لیے اپنے آدمی بھیجے، اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے لوگ بھیجے تھے۔ لڑنے کے لیے نہیں، جیسا کہ مسعودی وغیرہ کہتے ہیں، بلکہ پر امن طریقے پر اپنے موقف کی تبلیغ کرنے کے لیے۔ لیکن ان حضرات نے احوال کا مطالعہ کرنے کے بعد مناسب یہی سمجھا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا جائے۔ رائے عامہ اسی طرف ڈھل رہی تھی اور اس کے بغیر امت کا مستقبل درست نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ ہو گئے اور اس طرح رفتہ رفتہ عالمِ اسلام سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کی طرف جھکتا چلا گیا۔

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے کہ سبائیوں کی حرکتوں کی بنا پر مسلمانوں کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مقبولیت کا دائرہ روز بروز بڑھ رہا ہے، لہٰذا امت کی خیر خواہی میں آپ نے صبر و ضبط سے کام لیا اور ایک بلند ترین حق پرست کی طرح اعتراف کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہلِ شام اپنے کردار کی رفعت، اپنے خلوص و امانت اور تعمیری رجحانات کے سبب اس کے اہل ہیں کہ انھیں کامرانی نصیب ہو۔ اب دیکھنا چاہیے کہ سیدنا بسر رضی اللہ عنہ کا کردار امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک کیا تھا اور مسعودی وغیرہ نے اسے کس رنگ میں پیش کیا ہے۔

اس خطبہ کی گھڑی کیسی مقبول تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دعا سن لی اور

اس نابکار ٹولی سے آپ کو نجات دے دی جس نے آپ کی زندگی کو اجیرن اور امت کی حیاتِ اجتماعیہ کو برباد کر رکھا تھا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ جس ٹولی کے ایک فرد نے باہمی سازش سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، بلکہ اس سے پہلے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی، اسی ٹولی کے ایک دوسرے فرد نے سازش کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کیا۔ صلوات اللّٰہ وسلامه علیه وعلیٰ جمیع الشهداء المظلومین المقتولین بأیدي الکفرة الظلمة المرتدین عن الإسلام والبغاة علی المسلمین.

شہادتِ امیر المومنین:

امت کی سیاست ایک اہم اور خاص رخ اختیار کر رہی تھی کہ تین خارجیوں نے اپنے مقتولوں کا بدلہ لینے یا اپنی دانست میں واقعی امت کی بھلائی کے خیال سے، یا اپنی فطرتِ امن کشی کے جذبے کے تحت، یا امت کے عام اجتماع کے انعقاد سے مایوس ہو کر یہ عہد کیا کہ کوفہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دمشق میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو اور مصر میں سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بیک وقت شہید کر دیا جائے۔ ان ملعونوں کے نزدیک امت میں فساد کے ذمہ دار یہ خود نہیں تھے، بلکہ امت کے ان ائمہ نے یہ تباہی مچائی تھی۔

عبدالرحمٰن بن ملجم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا ذمہ لیا، عمرو بن بکر نے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو اور حجاج بن عبداللہ صریمی نے جو برک کہلاتا تھا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو۔ تجویز یہ تھی کہ نماز کی حالت میں اور وہ بھی رمضان کے مہینے میں یہ نیک کام انجام دیا جائے۔ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طبیعت ناساز تھی اور آپ نے سیدنا خارجہ بن حذیفہ رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کے لیے مامور کیا تھا اور یوں سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ کے دھوکے میں سیدنا خارجہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زخم خفیف آیا اور وہ چند دن میں تندرست ہو گئے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زخم کاری لگا اور تیسرے دن آپ نے وفات پائی۔

لوگوں نے عرض کی: ''اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر کر جایئے۔'' آپ جانتے تھے کہ کیا

ہو گا اس لیے انکار کر دیا اور فرمایا: ''میں تمھیں ایسے ہی چھوڑ جاؤں گا جیسے رسول اللہ ﷺ چھوڑ گئے تھے اور جس طرح آپ کی وفات کے بعد بہترین شخص پر امت کا اجماع ہو گیا تھا، ایسے ہی میرے بعد امت کے بہترین شخص پر تمھارا اجماع ہو جائے گا۔''[1] جن پر ان سب حضرات نے پوری طرح عمل کیا کہ دنیا و آخرت کی بھلائیاں ان نصائح میں تھیں۔[2]



1. البداية و النهاية (١٣/٨)
2. بعض روایات میں یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اعوان و انصار نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ہم آپ کے بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیں تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس پر سکوت فرمایا۔ ابن کثیر دمشقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فقال جندب بن عبداللّٰه: "يا أمير المومنين! إن مت نبايع الحسن؟ فقال: لا آمركم ولا أنهاكم، أنتم أبصر" (البداية و النهاية: ٣٢٧/٧)

''جناب جندب بن عبداللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: ''اے امیر المومنین! اگر آپ فوت ہو جائیں تو ہم سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نہ تمھیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں، تم خود بہتر سمجھتے ہو۔''

اس روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی کوئی خلافِ شریعت یا غیر مطلوب عمل نہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا، وگرنہ وہ لوگوں کو اس تجویز سے سختی سے روک دیتے۔

امیر المومنین سیدنا حسن رضی اللہ عنہ

عراقیوں کو نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر کچھ توقف کرنا چاہیے تھا اور جمہور صحابہ سے عرض داشت کرنی چاہیے تھی کہ جلد عام اجتماع منعقد کر کے خلافت کے مسئلے کا تصفیہ کریں، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اپنی شورہ پشتی پر قائم رہے۔ اہلِ بیتِ اطہار اور مخلص اہلِ ایمان نے اپنے نظریات کے مطابق انھیں من مانی کرنے دی اور یوں امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ کا اعلان کر دیا گیا اور آپ نے بھی ان لوگوں کی بیعت قبول کر لی مگر شرط یہ لگائی کہ جس سے چاہیں گے صلح کریں گے اور جس سے چاہیں گے جنگ۔ سبائی لوگ عزائمِ اہلِ بیت سے واقف تھے، اس لیے اس شرط سے کھٹک گئے مگر مجبوری تھی کہ سوائے اس نورِ مجسم کے اور کسی سے بیعت کر کے بارگاہِ مرتضوی میں اپنی نمایشی عقیدت کا ثبوت کیا دے سکتے تھے۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو راہ سے بھٹکانے کے لیے ایک عظیم الشان فوج بھی مرتب کر لی گئی۔ ان کا مقصد تھا کہ جس طرح امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو قدم قدم پر اپنے مقاصدِ سیئہ کے لیے کام میں لاتے رہے اور ہر موڑ پر ایک نیا فتنہ کھڑا کر کے آپ کو پریشانیوں میں مبتلا رکھا، ایسے ہی نئی خلافت پر بھی حاوی ہو جائیں گے۔ امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ نے بھی اطمینان سے انھیں سب کچھ کرنے دیا اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ واقعی آپ بھی اب تک افترا انگیز حکمتِ عملی ہی پر کاربند رہیں گے اور اس لشکرِ جرار کے ذریعے حریف کو شکست دے کر کوسِ لمن الملک بجائیں گے۔

اہلِ شام:

ثالثوں کے تقرر کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مستقلاً اپنے مستقر ہی میں رہتے تھے اور کوئی ثابت نہیں کرسکتا کہ آپ نے کبھی فوجی ضرورت کے لیے دمشق سے نکلنا ضروری سمجھا ہو یا عراق کی سرحد پر کوئی فوج متعین کی ہو، لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہزار ہا عراقی اپنے نئے امام کی قیادت میں ''لڑ مرنے'' کو تیار ہیں، تو آپ نے بھی لشکر مرتب کیا اور پہلی مرتبہ دمشق سے حرکت کر کے مقابلے پر آ گئے، لیکن یہ صرف عراقیوں پر رعب ڈالنے کی بات تھی، ورنہ حقیقتاً آپ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ دونوں فوجوں میں تصادم ہو۔صرف احتیاط اور حزم کا تقاضا تھا کہ باقاعدہ فوج لے کر میدان میں اتریں۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہما کا موقف آپ کو معلوم تھا اور جانتے تھے کہ ان کا خیمہ زن ہونا بھی محض نمایشی ہے۔ اہلِ بیت اور مخلص اصحاب شروع سے دیکھ رہے تھے کہ خلافتِ مرتضوی پر جو لوگ مسلط ہیں وہ کوئی صحیح اور تعمیری بات نہیں ہونے دیتے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے لے کر تحکیم تک جتنے اقدامات ہوئے وہ سب سیدنا حسن اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے کے خلاف ہوئے اور سب کی ہمدردیاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھیں۔محض امام کی اطاعت کا جذبہ تھا جو یہ حضرات مدینہ چھوڑ کر کوفہ آنے پر راضی ہو گئے اور جمل وصفین میں شرکت کی۔ ورنہ حقیقتاً ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح عراق سے نکل جائیں اور مفسد ٹولی سے نجات پائیں جو امت کے لیے مستقل عذاب بن گئی ہے۔ سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے تھے اور انھی کے موقف کو اس وقت حق جانتے تھے، لیکن سیدنا حسن اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اپنی خوردی کی وجہ سے یہ جرأت نہ کر سکے۔

اس دوران میں سبائیہ کا زور بھی بڑی حد تک ٹوٹ چکا تھا۔حکیم بن جبلہ، مالک الاشتر، کنانہ بن بشر جیسے بڑے بڑے سبائی مارے جا چکے تھے یا مر گئے تھے۔ ان کا ایک

طاقتور گروہ خارجی بن کر ملت سے کٹ چکا تھا اور اب ان کی یہ حیثیت نہیں رہی تھی کہ ہاشمی سیاست پر حاوی ہوسکیں یا خفیہ ریشہ دوانیاں کر کے تعمیری منصوبوں کو خاک میں ملا سکیں، لہٰذا سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے لیے اپنا موقف اعلان کے ساتھ بدل دینا آسان ہوگیا اور آپ نے بطیّبِ خاطر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے بیعت لی اور آپ کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی کہ عراق سے چھٹکارا ہو اور سبائی ٹولی سے امت کو نجات ملے۔

صلح:

لیکن اس صلح میں بھی اصل پیشکش سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس مبارک ترین واقعے کے لیے جس پر یہ امت رہتی دنیا تک فخر کرے گی، ہمیں مسعودی اور طبری دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صحیح بخاری موجود ہے:

"عن أبي موسى قال: سمعت الحسن يقول: استقبل والله الحسن بن علي معاوية بكتائب كأمثال الجبال، فقال عمرو بن العاص: إني أرى كتائب لا تولي حتى تقتل أقرانها، فقال له معاوية وكان والله خير الرجلين: أي عمرو! إن قتل هؤلاء هؤلاء وهؤلاء وهؤلاء من لي بأمور الناس، من لي بنسائهم، من لي بضيعتهم، فبعث إليه رجلين من بني عبد الشمس عبد الرحمن بن سمرة وعبد الله بن عامر بن كريز، فقال: اذهبا إلى هذا الرجل، فاعرضا عليه وقولا له واطلبا إليه، فأتياه ودخلا عليه فتكلما، وقالا له وطلبا إليه. فقال لهم الحسن بن علي: إنا بنو عبد المطلب قد أصبنا من هذا المال، وإن هذه الأمة قد عاثت في دمائها. قالا: فإنه يعرض عليك كذا وكذا، ويطلب إليك ويسألك، قال: فمن لي بهذا؟ قالا: نحن لك به، فما

سألهما شيئا إلا قالا: نحن لك به، فصالحه. قال الحسن: ولقد سمعت أبا بكرة يقول: رأيت رسول الله ﷺ على المنبر، والحسن بن علي إلى جنبه، وهو يقبل على الناس مرة وعليه أخرى، ويقول: إن ابني هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين" [1]

''حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں، میں نے حسن بصری رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا ہے: ''بخدا حسن بن علی رضی اللہ عنہما پہاڑوں کی طرح فوجوں کے پرے لے کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے کو نکلے تھے۔ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں فوجوں کے ایسے پرے دیکھتا ہوں جو اپنے مقابل لوگوں کو قتل کیے بغیر منہ نہیں پھیریں گے (یعنی اگر جنگ ہوئی تب)۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا، اور بخدا وہ ان دونوں میں بہتر شخص تھے: اے عمرو! اگر ان لوگوں نے انھیں قتل کر دیا اور انھوں نے انھیں تو پھر انتظام کے لیے میں آدمی کہاں سے لاؤں گا۔ ان کی خواتین کی دیکھ بھال کو مجھے کون ملے گا اور ان کے مال ومتاع کی حفاظت میں کس سے کراؤں گا؟ پھر آپ نے بنو عبدالشمس میں سے دو صاحبوں کو بھیجا، یعنی سیدنا عبدالرحمٰن بن سمرہ اور عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہما کو اور فرمایا: ان صاحب کے پاس جاؤ، مسئلہ پیش کرو، سمجھاؤ اور اپنے مطالبات ان کے سامنے رکھو۔ چنانچہ یہ دونوں صاحب تشریف لائے، ملاقات کی، گفتگو فرمائی، پیغام پہنچایا اور مطالبہ پیش کیا۔ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: ''ہم بنو عبدالمطلب اس مال سے بھر پائے اور اس امت نے بے وجہ کشت وخون میں ہاتھ رنگے۔'' دونوں نے کہا: تو ان کی طرف سے یہ پیش کش

---

[1] صحيح البخاري (٢٧٠٤)

ہے، ایسا ایسا مطالبہ ہے اور اس اس قسم کی ان کی فرمائش ہے۔ آپ نے فرمایا: ان باتوں کا ضامن کون ہوگا؟ دونوں نے کہا: ہم اس کے ضامن ہیں۔ غرض کہ جو مطالبہ بھی آپ نے پیش کیا، انھوں نے یہی جواب دیا: ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس پر آپ نے صلح کر لی۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے سنا ہے: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا، حسن بن علی رضی اللہ عنہما آپ کے پہلو میں تھے۔ کبھی آپ مجمع کی طرف دیکھتے اور کبھی ان کی طرف۔ اور فرماتے: میرا یہ بیٹا سردار ہے، عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔''

امیر المومنین حسن ۔صلوات اللہ و سلامہ علیہ۔ کے اس مبارک اقدام سے تمام امت ایک مرکز کے نیچے جمع ہوگئی۔ اہلِ ایمان کے باہمی اختلافات سب مٹ گئے۔ جیسے پہلے ایک منظّم جماعت تھی، ویسی ہی جماعت پھر بن گئی اور عالمِ اسلام نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے آپ کو متفق علیہ امام تسلیم کر لیا۔ صلوات اللہ و رضوانہ علیہم.

اس نہایت مسرت و ابتہاج کی یادگار میں اس سال کا نام ''عام الجماعۃ'' رکھ دیا گیا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ مسلمان یوں تو رنج و خوشی کے بہت سے دن مناتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے دور میں امت کی تاریخ کا جو سب سے بڑا دن تھا اور جس کی برکت و عظمت کا ادراک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کر لیا، اسے سب بھولے ہوئے ہیں، بلکہ زبانوں پر نہیں لانے دیتے، کیوں کہ اس میں اختلاف مٹنے کی نمود ہے اور خیالات درست ہونے کی، نہ کہ اختلاف پیدا کرنے اور دلوں میں مایوسی بھرنے کی۔

کس قدر حسرت اور رنج کا مقام ہے کہ امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ کا یہ عظیم ترین کارنامہ جو امت کے لیے باعثِ صد افتخار اور مایۂ ناز ہے اور جس کی برکت و نورانیت کا

اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کا ذکر لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی عظمت غارت ہو اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے حقیر سے حقیر اور مکروہ سے مکروہ صورت میں پیش کر کے امت کو گمراہ کریں۔ تاکہ امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ ''جن پر ان کے جدِ امجد صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر فرمایا ہے'' کی حیثیت، ہیچ اور ان کا اقدام پوچ نظر آئے۔

ایک صاحب ہیں عبداللہ عمادی، انھوں نے تاریخِ اسلام کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے (مطبوعہ محمدی پریس کراچی ۱۹۴۹ء) اور سرِورق پر لکھا ہے: ''ترجمہ تاریخ طبری'' غالباً طبری کی مبسوط تاریخ کی عبارتوں کا جستہ جستہ ترجمہ کر کے بطور خلاصہ شائع فرمایا ہے۔ یہ ظلمِ عظیم ان بچوں اور طالب علموں پر کیا گیا ہے جو اسلام کی تاریخ کے مطالعے کا شوق رکھتے ہیں اور اصل عربی متن تک ان کی رسائی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عمادی صاحب کو صرف وہی روایتیں پسند ہیں جن سے سلف صالحین کا کردار پست و حقیر نظر آئے۔ اب آپ کی جولانیِ قلم ملاحظہ ہو اور بالکل انھی کے الفاظ میں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق لہجہ بھی دیدنی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''حسن بن علی رضی اللہ عنہما اپنے والد کے بعد دو مہینے ٹھہرے رہے اور کہا گیا ہے کہ چار مہینے۔ انھوں نے عبیداللہ بن العباس رضی اللہ عنہما کو بارہ ہزار فوج کے ہمراہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ کے لیے روانہ کیا۔ ان کے ساتھ قیس بن سعد بن عبادہ انصاری بھی تھے۔ انھوں نے عبیداللہ کو یہ حکم دیا کہ وہ قیس بن سعد کے حکم اور انھی کی رائے کے مطابق عمل کریں۔
>
> عبیداللہ جزیرہ کی طرف روانہ ہوئے، معاویہ رضی اللہ عنہ کو جب قتلِ علی کی خبر پہنچی تو وہ قتلِ علی رضی اللہ عنہ کے اٹھارہ روز بعد موصل روانہ ہو گئے۔ دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا، معاویہ رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد سے کہلا بھیجا کہ وہ انھیں دس لاکھ درہم دیں گے، بشرطیکہ وہ معاویہ کے ساتھ ہو جائیں یا ان کے مقابلے سے واپس چلے

جائیں۔ قیس نے اُن کے پاس مال واپس کر کے کہا: تم مجھے میرے دین کے متعلق دھوکا دیتے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے عبیداللہ بن عباس سے کہلا بھیجا اور ان کے لیے بھی دس لاکھ درہم مقرر کیے۔ وہ اپنے آٹھ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ ان کے پاس چلے گئے۔ قیس ان سے جنگ کرتے رہے۔

معاویہ خفیہ طور پر لشکرِ حسن میں ایسے لوگوں کو بھیجا کرتے تھے جو یہ کہیں کہ قیس بن سعد نے معاویہ سے صلح کر لی اور ان کے ساتھ ہو گئے اور لشکرِ قیس میں لوگوں کو بھیجتے جو یہ بیان کرتے تھے کہ حسن نے معاویہ سے صلح کر لی اور معاویہ کو مان لیا ہے۔

معاویہ نے حسن کے پاس مغیرہ بن شعبہ وعبداللہ بن عامر بن کریز وعبدالرحمٰن بن ام الحکم کو بھیجا۔ یہ لوگ اس وقت آئے جب وہ مدائن میں اپنے خیموں میں اترے ہوئے تھے۔ یہ لوگ ان کے پاس یہ کہتے ہوئے اور لوگوں کو سناتے ہوئے نکلے کہ اللہ تعالیٰ نے فرزندِ رسول ﷺ کے ذریعے سے خون کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان کے ذریعے سے فتنے کو ٹھہرا دیا ہے۔ انھوں نے صلح منظور کر لی ہے۔ لشکر میں پریشانی ہو گئی، کسی کو ان لوگوں کی سچائی میں شک نہ تھا۔ لوگوں نے حسن پر حملہ کر دیا۔ ان کے خیمے اور ان کا سامان لوٹ لیا۔ حسن اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور مظلم ساباطا میں گئے۔ جراح بن سنان الاسدی کمین گاہ میں بیٹھا تھا، اس نے کُپتی ان کی ران میں ماری اور زخمی کر دیا۔ حسن نے جراح کی ڈاڑھی پکڑ لی، اسے اکھاڑ دیا، پھر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ حسن کو لاد کر مدائن لایا گیا۔ ان کو سخت خون بہہ رہا تھا اور سخت بیمار ہو گئے تھے۔ لوگ ان کے پاس سے منتشر ہو گئے۔ معاویہ عراق آ گئے، حکومت پر غالب آ گئے۔ حسن بہت علیل تھے۔ جب حسن نے یہ دیکھا کہ ان کے پاس قوت نہیں۔ ہمراہی ان کے پاس سے ایسے جدا ہو گئے کہ دوبارہ ساتھ

دینے کے لیے کھڑے نہ ہوئے تو انھوں نے معاویہ سے صلح کر لی .....الخ۔“

کہاں صحیح بخاری کی یہ تصریح کہ جنگ نہیں ہوئی، طرفین نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ صلح کر لی اور امت کا کلمہ متحد ہو گیا اور کہاں یہ مردود بیان کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے حالات سے مجبور ہو کر صلح کر لی اور وہ بھی ایسے شخص سے جو لالچ اور رشوت دے کر ان کے ساتھیوں کو توڑتا تھا۔ اور ساتھی کون تھے: چچا! یہ سیدنا عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وہی ہیں جن کے دو بیٹوں کو کہا جاتا ہے کہ بسر رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا تھا اور جس کی تفصیل طبری نے بھی اسی دلگداز طریقے پر دی ہے جیسے مسعودی وغیرہ نے۔ یہی عبیداللہ رضی اللہ عنہ عقل اور غیرت سب کو خیر باد کہہ کر محض روپے کے لالچ میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ پھر سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا نام بے وجہ ٹانک دیا گیا ہے، حالانکہ وہ صلح تک غیر جانبدار تھے۔ انھوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کے بعد بیعت کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ کتابوں کا یہ ڈھیر جسے تاریخِ اسلام کہا جاتا ہے، دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت اطہار کے خلاف ایک ہمہ گیر منظّم سازش ہے اور مقصد محض یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو اسلاف کی عظمت و محبت کو اخلاف کے دلوں سے نکال کر دعوتِ محمدیہ کو مضمحل اور امتِ مسلمہ کے قلوب کو بے عزیمت کر دیں، خدا ان مورخوں سے سمجھے گا، لیکن کاش مسلمان بھی سمجھ لیں۔[1]

دونوں سفیر:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جن دو بزرگواروں کو امیر المومنین حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تھا اور صلح کے پورے اختیارات دے دیے تھے کہ جن شرائط پر چاہیں صلح کر لیں یہ دونوں اسلام کی عظیم ترین ہستیوں میں سے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ کے

---

[1] عموماً قدماء مورخین تاریخی واقعات کو سند سے نقل کرتے ہیں جس کا مقصد ان حالات کو صدق و کذب کے اعتبار سے پرکھنا ہوتا ہے کہ ان واقعات کے راوی سامنے موجود ہیں، اس لیے کھرے کھوٹے کی پہچان بہ آسانی ممکن ہے اور معتبر مورخین یہ بات اپنی کتب کے آغاز میں صراحتاً لکھ دیتے ہیں۔

بھیجنے میں ایک نکتہ بھی تھا، باپ کی طرف سے آپ عبشمی ہیں، یعنی عبدالشمس بن عبد مناف کی اولاد اور آپ کی ننھیال ہاشمی ہے۔ آپ کی دادی صاحبہ کی والدہ بیضاء بنت عبدالمطلب تھیں، یعنی نبی کریم ﷺ کی پھوپھی۔ جب یہ پیدا ہوئے اور نبی کریم ﷺ کی گود میں آپ کو ڈالا گیا تو آپ ﷺ نے ان کے والد سیدنا عامر رضی اللہ عنہ بن کریز سے فرمایا: ''یہ بچہ تم سے زیادہ ہم پر پڑا ہے۔'' پھر آپ نے اپنا لعابِ دہن اُن کے منہ میں ڈالا جسے وہ چوسنے لگے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے امید ہے کہ یہ بچہ لوگوں کی پیاس بجھانے والا ہوگا۔'' چنانچہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کی شان تھی کہ پانی کے لیے جہاں بھی زمین کھودتے پانی نکل آتا۔ آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عرفات کے میدان میں حاجیوں کے لیے حوض بنوائے اور چشموں کا پانی ان میں بھروا دیا۔ اس کے علاوہ آپ کی سیاسی خدمات وہ ہیں کہ رہتی دنیا تک یہ امت آپ پر فخر کرے گی۔ ایران کی فتح کی تکمیل آپ ہی کے دستِ مبارک پر ہوئی تھی۔ آپ ہی نے درفشِ کاویانی ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیا اور آپ ہی کے ہاتھوں ساسانیوں کا آخری بادشاہ یزدگرد مارا گیا تھا۔ آپ کی فتوحات کا سلسلہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے مبارک عہد میں جاری رہا۔

سیدنا عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہما جو سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیجے گئے تھے، ان کی بھی بڑی عظیم شخصیت ہے۔ بعد کے جہادوں میں سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی کے تحت کام کرتے تھے اور کابل تک کا علاقہ انھوں ہی نے فتح کیا تھا۔

ان دونوں بزرگواروں کی زندگیاں کفار کے ساتھ جہاد میں گزریں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں اس شرف سے بھی نوازا کہ اہلِ ایمان کے درمیان خوش اسلوبی کے ساتھ صلح کرا کر دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوں۔ جزاهما الله عن الإسلام والمسلمين أفضل الجزاء.



بیعتِ خلافت

امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی تو اس کا نتیجہ خود یہی ہونا تھا کہ امت کی زمامِ کار اُن کے ہاتھ میں چلی جائے۔ اسی لیے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے آپ سے بیعت کر لی اور پھر جمہور اہلِ اسلام نے۔ اس وقت سے آپ کو امیر المومنین اور امام المسلمین تسلیم کر لیا گیا۔

لوگوں کا بیان ہے اور خضری نے اس پر زور دیا ہے، بلکہ عموماً یونہی کہا جاتا ہے کہ تحکیم کے نتیجے میں سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیا تو اہلِ شام نے آپ سے خلافت کی بیعت کر لی تھی، پھر مصر شامل ہو گیا اور پھر یمن و حجاز وغیرہ۔ یہ سب لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کہتے تھے اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے۔ گویا اس وقت دو خلافتیں تھیں اور دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی فکر میں مبتلا۔ یہ تصور قطعاً باطل اور بے اصل ہے، جیسا کہ اب تک کی بحث سے اچھی طرح واضح ہو چکا ہوگا۔

چونکہ تحکیم ہی کو غلط اور خلافِ واقعہ صورت دے دی گئی ہے، اس لیے اس کی توثیق کے لیے یہ مہمل بات وضع کرنی پڑی، حالانکہ نہ روایتاً اس کا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو لوگ خلیفہ کہتے تھے یا وہ خود اپنے آپ کو سمجھتے تھے اور نہ درایتاً اس کا کوئی امکان تھا۔

وہ حضرات جنھوں نے چار برس تک سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی، حالانکہ انہی کی مملکت میں رہتے تھے، وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کس طرح کر سکتے تھے، جو بزرگوار ایک آئینی سقم کی بنا پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کریں، وہ ایک کھلی ہوئی غیر آئینی

بات پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے کیسے بیعت کر سکتے تھے؟!

سیدنا سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، ابن عمر، ابوموسیٰ اشعری، مغیرہ بن شعبہ، مسلمہ، ابومسعود اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم جو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی مملکت میں رہتے تھے، ان کے علاقے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ ہی کی موجودگی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے تحت چلے گئے تھے، ان کے متعلق یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بغیر حجت اپنا موقف تبدیل کر دیا۔ وہ تو کہتے تھے کہ جب تک اجماع نہ ہو ہم بیعت نہیں کریں گے یا اس طرح بیعت کر لی کہ نہ شرعاً اس کی کوئی حیثیت ہے اور نہ عرفاً۔

ان سب بزرگواروں نے بیعت اسی وقت کی جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کر لی۔ اختلاف مٹ گیا اور امت نے محسوس کر لیا کہ بیعت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہی سے ہونی چاہیے۔ اس بات کا کوئی عملی ثبوت نہیں دیا جا سکتا کہ ''عام الجماعۃ'' سے پہلے عالمِ اسلام کے کسی گوشے میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین کہا جاتا تھا اور آپ اپنے آپ کو خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ یہ فرمایا کہ ہماری گردنوں میں ہمارے امام کی بیعت ہے، جنھیں ظلماً شہید کیا گیا، انھی کی طرف سے ہم ان کے قاتلوں سے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں اور انھی کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت یہ سب کام ہو رہا ہے۔ ہم بیعت اس وقت کریں گے جب جمہورِ امت کسی عادلانہ فیصلے پر مجتمع ہو جائے۔

اب سوچنا چاہیے کہ جو شخص خلافت کے اختلافی ہونے کی بنا پر سیدنا علی مرتضیٰ جیسے سید الابرار سے بیعت نہیں کرتا وہ اسی اختلاف کے دور میں اپنی بیعت کی طرف کس طرح بلا سکتا تھا اور بلاتا تو اس کی سنی کب جاتی؟

بے شک اہلِ شام کو آپ سے بہت عقیدت تھی، لیکن یہ عقیدت دین کی بنیاد پر تھی، آئین کے نام سے تھی، ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ وہ محض جذبات میں بہہ

جائیں گے اور یہ نہ سوچیں گے کہ جس اختلاف کی بنا پر وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کر رہے تھے جن کی خلافت اکثر عالمِ اسلام میں تسلیم کر لی گئی ہے تو پھر محض شام یا شام و مصر کے اتحاد سے برپا ہونے والی خلافت کس طرح اجماعی سمجھ لی جائے۔

اس کے علاوہ یہ ہے کہ اگر اہلِ شام کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے رام کر لیا تھا تب بھی وہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کیونکر بیعت کا مطالبہ کر سکتے تھے جو اب تک محض اس لیے محترز تھے کہ اسے برپا کرنے والے لوگ اربابِ حل وعقد نہیں۔ شام میں بھی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک تعداد موجود تھی جو عملی سیاست میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔

ممکن ہے اہلِ شام نے، اہلِ مصر نے اور اہلِ یمن و حجاز نے آپ سے بیعت کی ہو، لیکن یہ بیعت صرف موقف کی حمایت کی ہوسکتی تھی یا ان کی قیادت تسلیم کر لینے کی۔ ایسی بیعت ہر مسلمان لے سکتا ہے۔ ایسی بیعت کو خلافت کی بیعت نہیں کہہ سکتے۔ صحاح میں اور تاریخ میں جہاں کہیں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ امیر المومنین کا لفظ آیا ہے، وہ اسی زمانے کا ہے، جب آپ خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو چکے تھے۔ اگر انھوں نے عام بیعت سے پہلے خلافت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہ سے گر جاتے، کیونکر ظاہر ہے کہ انھیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے افضل و اقدم نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جو کچھ کر رہے تھے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف نہیں تھا۔ ان کا کھلا ہوا مطالبہ تھا کہ قاتلانِ عثمان سے علاحدگی اختیار کر کے رائے عامہ کے سامنے آپ اپنے آپ کو پیش کریں تو ہم بیعت کر لیں گے۔ پھر ان جیسے فرزانہ شخص سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ جو موقف انھوں نے اکثر عالمِ اسلام کے خلاف اس جرأت سے اختیار کیا تھا اور اتنی عظیم قربانیوں کے ذریعے اسے مقبول بنایا تھا اور لوگوں کی روز افزوں ہمدردیاں حاصل کی تھیں، اس موقف کو اپنے ہی ہاتھوں کمزور کر دیں گے اور جس قصر کی تعمیر اس محنت سے کی اسے خود ہی منہدم کرنے کے درپے ہو جائیں گے۔

ان کی مقبولیت کی بنا ہی یہ تھی کہ وہ متفق علیہ خلیفہ کا انتقام لینے کھڑے ہوئے تھے اوران کی دعوت تھی کہ جو خلافت قائم ہو اسے جمہور کے استصواب سے برپا ہونا چاہیے نہ کہ باغیوں کے استیلاء سے۔ یہ موقف قطعاً باطل ہو جاتا، اگر آپ خود خلافت کا دعویٰ کر بیٹھتے۔

بے شک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے عام اجتماع نہیں ہوا، کیوں کہ اس کی ضرورت جاتی رہی تھی۔ معاملات خود بخود صاف ہوتے جا رہے تھے اور طبعی طور پر سوائے ان کے اور کوئی نہ تھا جس پر پوری امت اعتماد کر سکے۔ ان کی بیعت ایسی ہی قدرتی تھی جیسے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت ہوئی تھی کہ کسی دوسرے پر نگاہ ہی نہیں پڑتی تھی۔ عام اجتماع کی ضرورت تھی امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں۔ جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے شہادت سے سرخرو کر کے اٹھا لیا تو اور کون تھا جو مرجعِ انام بن سکے؟

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی چوبیس برس کی سیاسی زندگی سب کے سامنے تھی اور امت نے عملاً دیکھ لیا تھا کہ سوائے اس یگانۂ روزگار ہستی کے اور کوئی نہیں جو کشتیِ ملت کا ناخدا بن سکے۔ وہ تمام حضرات جو شخصی اعتبار سے ان پر فضیلت رکھتے تھے، جن پر اجماع ہو سکتا تھا اور جنھیں خلافت سونپی جاتی تو ہر طرح اس کے اہل ثابت ہوتے، مثلاً: سیدنا سعد بن ابی وقاص، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہم اور خود امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ جن کی خلافت کا عراق میں اعلان بھی ہو چکا تھا، وہ سب کے سب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے صلح ہوتے ہی تمام امت نے آپ سے بیعت کر لی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے ان کے متعلق ہمیشہ سے یہ رہی کہ حکومت چلانے کی جو صلاحیت ان میں ہے وہ ان سے زیادہ کسی میں نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جو شخص فضائل و مکارم اور زہد و اتقا میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے بدرجہا افضل تھے وہ نظم ونسق اور خلافتِ نبوت کے اعتبار سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے سے بدرجہا افضل سمجھتے تھے۔ ان تمام بزرگواروں کے سامنے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تینوں خلفا کا طرزِ عمل تھا اور چوتھے

خلیفہ کی بھی رائے وہ جانتے تھے۔ پھر خود بھی اپنی آنکھوں سے ان کی تمام کارگزاریاں دیکھتے آرہے تھے، اس لیے طبعًا ان پر اجماع کر لیا اور کسی قسم کا تامل وتوقف نہ کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے اوپر مذکور ہوئی کہ کس طرح شام کی تمام ذمے داریاں مستقل طور پر آپ نے ان کے سپرد کر رکھی تھیں اور روز بروز ان پر اعتماد کرتے چلے گئے، جیسا اطمینان آپ کو ان کی طرف سے تھا، ایسے اطمینان کا دعویٰ کسی اور صاحب کے متعلق نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ اپنے اعتماد کا مظاہرہ عملاً وقولاً اس طرح کیا کہ شک وشبہہ کی اس میں قطعاً گنجایش نہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا عمیر بن سعد انصاری اوسی رضی اللہ عنہ کو حمص کی ولایت سے معزول کر کے یہ علاقہ بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے تحت کر دیا تو لوگوں نے کہا: ''دیکھو تو عمیر کو معزول کر کے یہاں کی حکومت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دے دی!'' سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا:

''لا تذكروا معاوية إلا بالخير. سمعت رسول الله ﷺ يقول: اللهم اهد به'' [1] (ترمذي)

''معاویہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ صرف بھلائی کے ساتھ کیا کرو، کیوں کہ میں نے رسول ﷺ کو فرماتے سنا ہے: ''خدایا اسے ہدایت کا ذریعہ بنا۔''

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے: ''ما رأيت رجلا أسود من معاوية'' [2]

---

[1] جامع الترمذي، أبواب المناقب، تحت مناقب معاوية بن أبي سفيان رضی اللہ عنہ. البداية و النهاية (١٣٠/٨) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضی اللہ عنہ، تاريخ كبير للبخاري (٣٢٨/٤) تحت تذكرة معاوية بن أبي سفيان رضی اللہ عنہ.

[2] البداية و النهاية (١٣٥/٨) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضی اللہ عنہ (١٣٥/٨) منقول از العواصم من القواصم.

''میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ کسی شخص میں سرداری نہیں دیکھی۔''

لوگوں نے عرض کی: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں بھی نہیں؟'' فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ ان سے بہتر تھے، مگر سرداری میں معاویہ رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ ہیں۔'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے:

"ما رأيت رجلاً كان أخلق بالملك من معاوية"[1]

''میں نے کسی شخص میں حکومت کی اہلیت معاویہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ نہیں دیکھی۔''

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ما رأيت أحداً بعد عثمان أقضى بالحق من صاحب هذا الباب، يعني معاوية"[2]

''میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کسی شخص کو ایسا سچا فیصلہ کرتے نہیں دیکھا جیسا یہ دروازے والے یعنی معاویہ ہے۔''

نماز کے بارے میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا قول اوپر نقل ہو چکا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے نہایت درجہ مشابہت رکھتی تھی۔[3] سرداری، حکومت سے طبعی مناسبت، معاملات کا بے لاگ تصفیہ کرنے کی عادت، جب ایک شخص میں ہو اور سب سے زیادہ یہ صفات اس میں پائی جائیں اور پھر اس کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ ہو، تو پھر کیسے ممکن ہے کہ امت کے قلوب خلافت کے لیے قدرتی طور پر اس کی طرف مائل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی

---

[1] التاريخ الكبير للبخاري (٣٢٧/٤) باب تذكرة معاوية بن أبي‌سفيان رضي الله عنه، تاريخ ابن عساكر (٧٣٠/١٦) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنه، البداية و النهاية (١٣٥/٨) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنه.

[2] البداية والنهاية (١٣٣/٨) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنه، تاريخ ابن عساكر (٧٢٤/١٦) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنه، تاريخِ الإسلام للذهبي (٣٢١/٢) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنه.

[3] المنتقى للذهبي (ص: ٣٨٨) تحت ثناء الأئمة الأعلام علىٰ معاوية رضي الله عنه ... الخ.

وصیت کا ظہور ان کی خلافت کی شکل میں اہلِ عالم نے دیکھا۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے نہایت قوی سند کے ساتھ جلیل القدر تابعی حضرت ابو وائل شقیق بن سلمہ اسدی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ لوگوں نے امیر المومنین علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے (آپ کے مہلک زخم لگنے کے بعد) عرض کی:

"ألا تستخلف علينا؟" ''آپ ہمارا کوئی خلیفہ مقرر نہیں فرما جاتے؟''

فرمایا:

"ما استخلف رسول الله ﷺ فأستخلف، ولكن إن يرد الله بالناس خيراً فسيجمعهم بعدي على خير كما جمعهم بعد نبيهم على خيرهم"

''رسول اللہ ﷺ نے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا کہ میں کر جاؤں۔ ہاں اگر اللہ کو لوگوں کے ساتھ بھلائی منظور ہو گی تو وہ میرے بعد انھیں اسی طرح اپنے بہترین شخص پر مجتمع کر دے گا جیسے ان کے نبی کے بعد اس نے ان کے بہترین شخص پر مجتمع کر دیا تھا۔''

یہ سب روایتیں ''البدایہ والنہایہ'' کی ہیں اور ''العواصم من القواصم'' سے نقل کی گئی ہیں۔ ان کی چنداں ضرورت نہ تھی، کیوں کہ واقعات سامنے ہیں اور صحابہ و اہلِ بیت کا ان کے ساتھ طرزِ عمل بھی۔ یہی وجوہ تھے جو طبعی طور پر امت کا اجماع سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر ہو گیا اور اس کی ضرورت نہ پڑی کہ عام اجتماع میں باقاعدہ تحریک و تائید کے ذریعے ان کی خلافت کا مسئلہ پیش ہو کر طے پائے۔ جو لوگ اس قسم کا اجتماع نہ ہونے کی دلیل بنا کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی حجیت کو مشتبہ بتاتے ہیں، کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انتخابِ خلیفہ کے لیے ایسا اجتماع حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے حضرت علی مرتضی تک کسی کے لیے ہوا تھا جو یہ نیا سنگِ بنیاد امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافتِ رسالت کو مشتبہ بنانے کے لیے رکھا گیا ہے؟

بیعت تو اربابِ حل و عقد میں سے ایک دو آدمیوں کے کر لینے سے بھی منعقد ہو جاتی ہے۔ ان اربابِ حل و عقد میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون ہوگا اور ان بزرگواروں کے مقابلے میں کسے پیش کیا جا سکے گا جن کے لیے بیعت کر لینے سے اب تک کے تمام خلفاء کی خلافت کی حجیت قائم ہوئی تھی؟ ان سب نے بہ رضا و رغبت ان سے بیعت کی، حالانکہ انہی حضرات نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی تھی۔ مسعودی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر اپنی دانست میں بڑی چوٹ کی ہے کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید بن معاویہ سے کی۔ اس قسم کے لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آئی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے نزدیک خلافت اس وقت مسلم ہوتی ہے جب امت کا اجماع ہو جائے۔ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ پر چونکہ اجماع ہو گیا تھا، اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے اور امیر المومنین یزید رحمہ اللہ سے بیعت کر لی اور پھر امیر المومنین عبدالملک اور الولید رحمہما اللہ سے، لیکن حضرت علی اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے بیعت نہیں کی، کیوں کہ ان دونوں کی خلافت پر امت کا اجماع نہیں ہوا تھا۔

معاویہ رضی اللہ عنہ کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ خاص کوفہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو چاہتے تھے کہ زمامِ امت ان کے ہاتھ آ جائے۔ اسلام کی جب سچی تاریخ مدون کی جائے گی تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام پشتیبانِ امت کی حیثیت سے لیا جائے گا اور یہ نام محسنینِ ملت کی فہرست میں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جگمگاتا ہوا نظر آئے گا۔ صلوات اللہ و سلامه ورضوانه عليه.

قتلِ عثمان کا فتنہ ارتدادِ عرب سے کم نہ تھا اور کشتیِ ملت اس طرح ڈگمگا رہی تھی جس طرح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کا عالم تھا۔ لوگ اپنے مقاصد کے تحت چاہتے ہیں کہ امت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کو بھول جائے، لیکن یہ وہ چیز ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا، کیوں کہ جسمِ ملت پر جو چرکہ لگتا ہے اس سے عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے خون کی بوندیں ٹپکتی

ہیں۔اس عالم میں کامیاب ذات صرف ایک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی تھی جنھوں نے مقدور بھر سبائیہ کی کوششوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور امت نے انھیں اپنا متفق علیہ امام بنا لیا اور اموی خلافت کے استحکام میں بقائے ملت سمجھی۔



الفئة الباغیة (باغی ٹولی)

صفین کا جب ذکر آتا ہے تو مدعیانِ علم کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد سنا دیا جاتا ہے، جو ان لوگوں کی دانست میں ایسی حجت ہے کہ آگے کچھ کہنے کی گنجایش ہی نہیں رہتی۔ یعنی حق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت باغی ٹولی تھی۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"عن عکرمة أن ابن عباس قال له ولعلي بن عبد الله: ائتيا أبا سعيد فاسمعا من حديثه، فأتيناه وهو وأخوه في حائط لهما يسقيانه. فلما رآنا جاء فاحتبى وجلس فقال: كنا ننقل لبنة لبنة وكان عمار ينقل لبنتين لبنتين فمر به النبي ﷺ ومسح عن رأسه الغبار، وقال: ويح عمار تقتله الفئة الباغية، عمار يدعوهم إلى الله، ويدعونه إلى النار" [1]

"عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان سے اور حضرت علی بن عبداللہ (اپنے فرزند) سے فرمایا: "تم دونوں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان کی باتیں سنو۔" ہم دونوں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ اور ان کے بھائی اپنے باغ کو پانی دے رہے تھے۔ ہمیں جو دیکھا تو تشریف لے آئے اور ٹانگوں کے گرد کپڑا لپیٹ کر بیٹھ گئے، پھر دورانِ گفتگو

[1] صحيح البخاري، ج ٢، كتاب الجهاد والسير، ك ٥٦، ب ١٧، طبع مصر.

میں فرمایا: ''مسجد کے لیے ہم ایک ایک اینٹ ڈھو رہے تھے، لیکن عمار دو دو اینٹیں ڈھوتے تھے۔ اتنے میں نبی کریم ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ نے ان کے سر سے خاک جھاڑی اور فرمایا: ''کیا کہنے ہیں عمار کے! انھیں باغیوں کی ایک ٹولی قتل کر دے گی۔ عمار تو انھیں اللہ کی طرف بلا رہے ہوں گے اور وہ انھیں آگ کی طرف دعوت دیتے ہوں گے۔''

سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ حدیث تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے صحاح میں مروی ہے۔ اتنی سندوں سے جو بات کئی صحابہ سے مروی ہو، وہ یقیناً شہرت پا چکی ہوگی اور خصوصیت کے ساتھ اس پر توجہ اس وقت ہوگئی ہوگی جب انھوں نے امت کی عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

امت کی بدقسمتی سے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہو گئے تھے اور اس مخالفت میں کچھ عملی حصہ بھی لیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ قریش کی بالادستی کے خلاف تھے۔ اسی کے نتیجے میں سبائیوں نے ان کا نام بہت اچھالا ہے، لیکن اس بات کا کوئی عملی ثبوت نہیں کہ آپ واقعی حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے اتنے خلاف تھے کہ ان کے قتل کے درپے ہو جائیں یا قریش کو اتنا برا سمجھتے ہوں کہ ان کے خلاف تلوار اٹھائیں۔ معمولی اختلافات جو ہر معاشرے میں ہوتے ہیں، صحابہ کے مابین بھی تھے۔ لیکن فرقہ بازی اور جتھہ بندی ان میں قطعاً نہیں تھی۔ اگر کسی اجتہادی مسئلے میں زبردست اختلاف ہو گیا جیسے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہو گیا تھا اور دشمنانِ ملت کی چالاکی اور مکاری سے شمشیر زنی تک نوبت پہنچ گئی تھی، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے دین کا اختلاف نہیں بنایا اور نہ وہ اپنا سود و زیاں ایک دوسرے سے جدا سمجھتے تھے۔ اختلاف کی حالت میں بھی ایک ہی جماعت رہتے تھے اور اختلاف کے بعد بھی بے تکلف ایک ہو جاتے تھے۔ اوپر غیر مبایعین کے تحت سیدنا عمار رضی اللہ عنہ ہی کی بابت اسی صحیح بخاری سے ہم ایک حدیث نقل کر چکے ہیں، جس

سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلافی مسائل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کی حرمت کس طرح برقرار رکھتے تھے۔

سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کے منہ سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کچھ کلمات بیان کیے گئے ہیں اور ان میں سے بعض نہایت ناشائستہ اور تکلیف دہ ہیں، لیکن چونکہ وہ بااحتیاط لوگوں کے روایت کردہ نہیں، اس لیے ان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا، البتہ بعض حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے اور سب جانتے ہیں کہ قاتلانِ عثمان کی شرارت سے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ بھی جنگوں میں شامل ہوئے اور صفین کے معرکے میں شہادت پائی، اس لیے فتنہ پرداز لوگوں کو آپ کی طرف دعوت دینے کا ذکر ہے، جو اسی موضوع پر دوسری حدیثوں میں نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ اضافہ کسی بعد کے راوی کا ہو۔

بہر حال معاملہ صاف ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور صفین کی جنگ میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ جمہور صحابہ جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو حق پر سمجھتے تھے اور اب تک فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ کس کا ساتھ دیں اور کس کا نہ دیں، ان پر سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت سے مسئلہ واضح ہو جانا چاہیے تھا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے قتال واجب ہو گیا، کیوں کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت سے اُن کے باغی ہونے پر مہر لگ گئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ [الحجرات: ۹، ۱۰]

”اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ

آ ئے، پھر اگر وہ پلٹ آ ئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔''

اس بدیہی حکم کی موجودگی میں سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد تمام شکوک وشبہات رفع ہو جانے چاہئیں تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے جب قرآن بلند کیا گیا تو اس وقت بھی جنگ بند کر دینے کی شرط یہ ہونی چاہیے تھی کہ ہتھیار ڈال کر بیعت کریں اور پھر عدالت میں اپنا قضیہ لائیں، ورنہ قتال جاری رہے گا۔

لیکن جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم نے، ثالثوں نے اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے بالکل برعکس کام کیا، صحابہ اپنی غیر جانبداری پر قائم رہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے معاملہ ثالثوں کے ہاتھ میں دے کر اپنا موقف خود ہی کمزور کر دیا اور اپنا وہ امام ہونا مشکوک بنا لیا جس کی اطاعت واجب ہے۔ اور ثالثوں نے جو فیصلہ کیا وہ یقیناً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے موافق نہیں تھا۔ موافقت کے صرف ایک ہی معنی تھے کہ ثالثوں کی طرف سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے امام برحق ہونے کا اعلان کر دیا جاتا، جو نہیں کیا گیا۔

تاریخی صورتِ حال جو ہمارے سامنے ہے وہ حسبِ ذیل امور بتاتی ہے:

① حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یقین کے ساتھ حق پر ہونا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یقین کے ساتھ باطل پر ہونا مسلم نہ رہا۔

② مسئلہ کا تصفیہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی موافقت میں نہیں کیا گیا، بلکہ اس کا بدستور مشکوک و مشتبہ ہونا تسلیم کر لیا گیا۔

③ متارکۂ جنگ کی مدت ہی میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوگئی تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے ان کی بیعت کر لی۔

④ تمام امت نے اسی شخص پر اجماع کر لیا جسے ان مورخوں اور عالموں کے بقول

لسانِ نبوت نے باغی ٹولی کا سرگروہ بتایا ہے۔

اب اس صورتِ حال سے صرف حسبِ ذیل نتیجہ برآمد ہوتا ہے:

① یہ حدیث باوجود کثرتِ تناقل کے غلط ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسی کسی حدیث سے واقف نہ تھے۔

② اگر یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں شک کی گنجایش نہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سیدنا علی مرتضیٰ کے دین سے قطعاً بیگانہ تھے اور انھیں اس کی کچھ پروا نہ تھی کہ اللہ و رسول ﷺ نے کیا حکم دیا ہے، انھوں نے اللہ اور رسول کے خلاف عمداً اور صراحتاً اجماع کر کے اپنے کفر پر مہر لگا دی۔

③ اگر حدیث بھی صحیح ہے اور صحابہ بھی وہی تھے جو اللہ نے انھیں بتایا ہے اور امت انھیں سمجھتی ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نہ انھوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو قتلِ عمار کا مرتکب گردانا اور نہ انھیں باغی سمجھا، بلکہ صحابہ اور جمہور امت کے نزدیک قتلِ عمار کے مرتکب وہی لوگ تھے جنھوں نے فتنہ وفساد برپا کر کے قتال و جدال کی صورت پیدا کی۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک قول مروی ہے جسے لوگ طنزاً بیان کرتے ہیں کہ آپ نے جب سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سنی تو فرمایا: ''عمار کے قاتل وہ ہیں جو انھیں میدانِ قتال پر لائے۔'' اور اس پر طعن کیا جاتا ہے کہ گویا شہدائے بدر و اُحد کے قاتل سرورِ عالم ﷺ ہیں جو انھیں میدان میں لائے تھے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول اگر صحیح ہے تو آپ نے بالکل درست فرمایا۔ نہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو ظلماً شہید کیا جاتا، نہ سبائی لوگ خلافتِ مرتضوی پر حاوی ہوتے، نہ جمل وصفین میں مصالحت کی فضا پیدا ہونے کے بعد جنگ چھڑتی اور نہ بے وجہ مسلمانوں کا کشت وخون ہوتا۔ بدر و اُحد کے شہیدوں کے بھی قتل کے ذمہ دار وہ کفار تھے جو ان جنگوں کا سبب بنے، نہ کہ سرورِ عالم ﷺ۔ جو صلح و امن اور عدل کے لیے تشریف لائے ہیں اور جن کے ذریعے

مسلمانوں کو جنگ کی اجازت محض اپنی حفاظت کے لیے دی گئی تھی:

﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ ﴾

[الحج: ٣٩۔ ٤٠]

''ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے۔ وہ جنھیں ان کے گھروں سے کسی حق کے بغیر نکالا گیا، صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن حضرات نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی تھی وہ ایک جمِ غفیر تھا اور جمہور امت جمل وصفین کے محاربہ میں غیر جانبدار تھی، محض اس سبب سے کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اصحاب کے موقف میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے اپنا یہ موقف سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے باوجود نہیں بدلا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اجماع کر لیا۔

جنگِ جمل سے پہلے امیر المومنین اور اصحابِ جمل کے مابین صلح کی جو شرط طے ہوئی تھی وہ یہی تھی کہ قاتلانِ عثمان سے قصاص لیا جائے اور انھیں مثل ان مرتدوں کے سمجھا جائے جن کا قتل واجب ہے، چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا تھا کہ جو لوگ قتلِ عثمان میں شریک ہیں وہ ہماری جماعت سے باہر ہو جائیں۔ اس لیے یہ ہزار ہا لوگ لشکر سے باہر چلے گئے۔ سیدنا قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی مساعیِ جمیلہ سے امت کا یہ متفق علیہ مسئلہ طے ہوا تھا۔ صبح کو صلح نامہ پر دستخط ہونے والے تھے اسی لیے مسلمان اس رات چین کی نیند سوئے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

بے چینی اور تشویش سبائیوں کو تھی، اس لیے رات کو اندھیرے میں انھوں نے جنگ

چھیڑ دی، تاکہ قصاص کا یہ اجماعی فیصلہ بروئے کار نہ آسکے۔ جمہور صحابہ اور امت کا یہی متفق علیہ مسئلہ لے کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے تھے، تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انھیں ''باغی ٹولی'' میں کیسے سمجھ لیتے؟ انھوں نے تو شروع سے لے کر آخر تک انھیں بھی ایسے ہی حق پر سمجھا جیسے امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو۔ (1)

---

(1) بعض علما نے ''الفئة الباغية'' کا مصداق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کو قرار دے دیا، جب کہ اگر یہ لوگ اس حدیث کے متن پر غور کرتے تو ایسی بات کبھی نہ کہتے۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمار رضی اللہ عنہ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا، جب کہ عمار رضی اللہ عنہ ان کو جنت کی طرف بلا رہے ہوں گے اور وہ عمار رضی اللہ عنہ کو جہنم کی طرف دعوت دے رہے ہوں گے۔'' اب اگر اس حدیث کا مصداق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے گروہ کو سمجھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہ جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں شامل تھے وہ لوگوں کو جہنم کی طرف دعوت دے رہے تھے، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ. صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک شخص کی بابت بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ اس کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ موجود اکابر صحابہ رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت دی جائے۔

پھر کیا وجہ ہوئی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی موجودگی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ آمادہ تعاون نہ کر سکی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جیسے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دیکھتے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں ہیں وہ فوراً غیر جانبداری یا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو جاتے یا خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ اس حدیث کا حوالہ دے کر لوگوں کو اپنے ساتھ شامل ہونے کی ترغیب دیتے۔ نیز جنگِ صفین سے قبل اور اس کے درمیانی وقفوں میں کتنے ہی وفود صلح کے لیے دونوں کیمپوں میں آتے جاتے رہے، لیکن کسی موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ یا ان کے اصحاب نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے وفد کو یہ بات یاد نہ دلائی کہ عمار رضی اللہ عنہ ہمارے لشکر میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق ان کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا، اب اگر عمار رضی اللہ عنہ ہمارے ساتھ مل کر تمھارے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں تو تم باغی گروہ قرار پاؤ گے، اس لیے تمھیں ہماری مخالفت چھوڑ دینی چاہیے۔ ایسے کسی مراسلے یا بات کا وقوع پذیر نہ ہونا ہی یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ جو احباب اس حدیث کا مصداق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو قرار دیتے ہیں، ان کا یہ عمل خود فہمِ صحابہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ہے۔

مزید برآں یہ کہ یہ روایت جن تیرہ صحابہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ان میں سے چار یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو رافع رضی اللہ عنہ تو جنگِ صفین سے پہلے ←

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں باہمی جنگ نہ ہو اور ان کی مجموعی قوت ان باغیوں کے خلاف صرف ہو، گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ اجماعی مسئلہ تھا کہ ''الفئة الباغية'' یعنی باغی ٹولی ان سبائیوں کی ہے، چاہے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی بن کر جمہور

➔ وفات پا چکے تھے۔ چار حضرات یعنی سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ غیر جانبدار رہے اور ان جنگوں میں کسی فریق کا ساتھ نہ دیا۔ جبکہ تین صحابہ رضی اللہ عنہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور باقی دو صحابی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں موجود تھے۔ جن تین صحابہ نے اس جنگ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، کسی صحیح سند روایت سے یہ ثابت نہیں کہ انھوں نے محض اس حدیث کی بنا پر حق و باطل کا فیصلہ کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں شمولیت اختیار کی ہو اور نہ ہی یہ ثابت ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھوں نے اس حدیث کو استدلال بنا کر فریقِ مخالف کو ان کی ''بغاوت'' سے باز آ جانے کا مشورہ دیا ہو۔ جبکہ غیر جانبدار رہنے والے چار حضرات سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں موجود دو حضرات اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں موجود تین حضرات سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عرصہ دراز تک نہ صرف زندہ رہے، بلکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت بھی کی۔ سو اگر ان کے نزدیک سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے باغی قرار پا جانے کا مصداق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت تھی تو پھر باغیوں سے صلح اور بیعت کیسی؟ جب کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان تمام حضرات کو شہادتِ عمار رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں شامل ہو جانا چاہیے تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غیر جانبدار حضرات اس واقعہ کے بعد بھی غیر جانبدار بنے بالواسطہ باغیوں کے معاون بنے رہے، جبکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں شامل دونوں صحابہ رضی اللہ عنہ بھی بدستور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہمراہی میں ہی رہے۔ پھر اگر سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا گروہ باغی ہے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جنگ بندی قبول کیوں کی، جبکہ قرآن تو کہتا ہے کہ باغی جب تک اپنی بغاوت سے باز نہ آ جائے اس سے قتال جاری رکھنا چاہیے [سورۃ الحجرات] جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خارجیوں کے خلاف نہروان کی جنگ کر کے کیا۔ جنگ بندی قبول کر کے تحکیم قبول کرنا، اس بات کو اظہر من الشمس کر دیتا ہے کہ خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نظروں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا حدیثِ عمار کے تحت باغی ہونا مسلّم نہیں تھا ورنہ باغیوں سے صلح کر کے وہ کبھی تحکیم پر راضی نہ ہوتے۔ پھر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ان کی نظروں میں بھی اس حدیث کا مصداق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نہیں تھے ورنہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ بھی باغیوں سے کبھی صلح نہ کرتے۔ ➔

صحابہ کو گردن زدنی سمجھیں اور چاہے خارجی بن کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی اسی زمرے میں شامل کرنے والے ہوں۔ ان دونوں فرقوں کے خلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہمیشہ جہاد کو واجب جانا۔ شروع سے لے کر آج تک امتِ مسلمہ کا یہی متفق علیہ موقف ہے کہ جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی جماعت سے الگ ہو گئے، ان کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

← اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ کا مصداق کون ہے؟ تو اس بابت وہی رائے درست ہے جو فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت'' (صفحہ: ۳۷۹) میں قائم کی ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والا باغی گروہ وہی تھا جس نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور بعد میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل ہو گیا۔ گھمسان کے رن میں یہ عین ممکن ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل باغی گروہ ہی کے ہاتھوں انھی کی فوج کے چند آدمی بھی مارے گئے ہوں جن میں سیدنا عمار رضی اللہ عنہ بھی شامل ہوں یا پھر ان ہی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے کچھ افراد گروہ معاویہ رضی اللہ عنہ میں محض اس بنا پر شامل ہو گئے ہوں کہ اس طرح ان کی طرف سے لڑتے ہوئے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے گروہِ معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی باور کروانے کی کوشش کریں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کو اس میں کامیابی نہ مل سکی، تاہم بعد میں ان کا مقصد پورا ہو گیا اور بے احتیاط تجزیہ نگاروں نے اس حدیث کا مصداق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو قرار دے دیا۔

جب کہ علامہ محمود احمد عباسی نے ''حقیقتِ خلافت و ملوکیت'' میں اور مولانا اسحاق صدیقی سندیلوی نے ''اظہار حقیقت بجواب خلافت و ملوکیت'' میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو باغیوں نے عہد عثمانی میں اسی وقت شہید کر دیا تھا جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو مصر کے حالات کی خبر لینے بھیجا تھا، لیکن ہم ان کی اس رائے سے متفق نہیں، کیوں کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کا جنگ جمل تک زندہ ہونا تو خود صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہے۔ پھر اس بابت کثیر تاریخی روایات ملتی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ مشاجراتِ صحابہ کے موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ سو اس کے متعلق وہی بات درست ہے جو حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کے حوالے سے اوپر پیش کر دی گئی ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل وہی باغی گروہ تھا جس نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور بعد میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں شامل ہو گیا، اسی لیے حدیث میں ان کے لیے الفاظ ہیں کہ وہ عمار رضی اللہ عنہ کو جہنم کی طرف بلائیں گے جو کہ کسی صحابی کے لیے قطعی نہیں قبول کیے جا سکتے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ [الأنعام: ١٥٩]

''بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر لیا اور کئی گروہ بن گئے تو کسی چیز میں بھی ان سے نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر وہ انھیں بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔''

کسی زمانے میں جماعتِ صحابہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی نہیں سمجھا اور نہ خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے، لیکن سبائیوں کو ہمیشہ سب نے باغی جانا اور خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی۔ اس لیے جنگِ جمل سے پہلے آپ نے انھیں اپنے لشکر سے نکال دیا تھا اور اسی لیے آپ نے خوارج سے جنگ کی۔ وہ لوگ جنھوں نے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہنگانہ برپا کیا اور آپ کو شہید کر دیا اور اس طرح اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے درپے ہوئے ان کے متعلق امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے بھی جذبات وہی تھے جو بقیہ اہلِ بیت اور اصحابِ کرام کے ہمیشہ رہے۔

جنگِ جمل کے موقع پر آپ نے کوفہ میں جو تقریر کی اس کا اقتباس طبری (۱۹۴/۵) نے پیش کیا ہے۔ واقعاتِ ثابتہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے کہ واقعی آپ نے اپنے جذبات کا انہی الفاظ میں اظہار کیا ہو گا۔ آپ نے امت پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بیان کیے کہ کس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی بنائی ہوئی جماعت کی شیرازہ بندی آپ کے خلیفۂ برحق کے ذریعے کی گئی اور خلیفۂ دوم کے ذریعے اور ان کے بعد خلیفۂ ثالث کے ہاتھوں۔ ان ہنگامہ پروروں کے متعلق آپ نے فرمایا:

''ثم حدث هذا الحدث الذي جره على الأمة أقوام طلبوا هذه الدنيا، حسدوا من أفاء الله عليه على الفضيلة وأرادوا ردّ الأشياء على أدبارها''

''پھر یہ حادثہ رونما ہوا۔ اسے امت پر ان لوگوں نے لا ڈالا جو دنیا کے طلبگار تھے اور ان لوگوں سے حسد کرتے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے فضائل کے سبب اپنی نعمتوں سے نوازا (صحابہ کے ان حاسدوں اور باغیوں نے) چاہا کہ حالات کو قدیم دورِ جاہلیت کی طرف لوٹا دیں۔''

نبی کریم ﷺ کی سنت کا اتباع کرنے والی جماعت جو پہلے دن سے آج تک جماعت چلی آتی ہے اور جسے پہلے دن سے آج تک اسلام کی نمایندگی کا شرف حاصل ہے اور سوائے اس جماعت کے کسی دوسری ٹولی کو یہ شرف کسی درجہ میں کبھی حاصل نہیں ہوا، اس جماعت کا مذہب شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''منہاج السنۃ'' (۲/۲۱۹۔۲۲۰) میں بیان فرمایا ہے، اس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اس بیان میں آپ نے اہلِ کلام، اہلِ فقہ اور اہلِ حدیث کے جو مذاہب گنائے ہیں ان میں عمومیت کے ساتھ سب نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو حق پر بتایا ہے، دونوں کو مجتہد کہا ہے اور دونوں کا شمار ائمۂ ہدیٰ میں کیا ہے۔ البتہ بعض ہیں جنھوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خطا اجتہادی بتائی ہے، لیکن اس سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔ یہ سب مذاہب بیان کر کے شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

"ومنهم من يقول: كان الصواب أن لا يكون قتال وكان ترك القتال خيرا للطائفتين، فليس في القتال صواب ولكن علي كان أقرب إلى الحق من معاوية، والقتال قتال فتنة، ليس بواجب ولا مستحب، وكان ترك القتال خيرا للطائفتين، مع أن عليا كان أولى بالحق. وهذا هو قول أحمد وأكثر أهل الحديث وأكثر أئمة الفقهاء، وهو قول أكابر الصحابة والتابعين لهم بإحسان، وهو قول عمران بن حصين رضي الله عنهما، وكان ينهى عن بيع السلاح في ذلك القتال، ويقول: هو بيع السلاح

في الفتنة، وهو قول أسامة بن زيد، ومحمد بن مسلمة، وابن عمر، وسعد بن أبي وقاص، وأكثر من بقي من السابقين الأولين من المهاجرين والأنصار رضي الله عنهم، ولهذا كان من مذاهب أهل السنة الإمساك عما شجر بين الصحابة، فإنه قد ثبتت فضائلهم، ووجبت موالاتهم ومحبتهم"

''ان میں سے بعض کہتے ہیں: بہتر تھا کہ قتال نہ ہوتا اور مناسب تھا کہ دونوں فریق نہ لڑتے، کیوں کہ لڑائی میں کوئی بھلائی نہیں، لیکن معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں علی رضی اللہ عنہ حق کے زیادہ قریب تھے۔ مگر لڑنا فتنے کی بات تھی جو نہ واجب ہے نہ مستحب، بلکہ دونوں کے لیے بہتر تھا کہ نہ لڑیں، اگرچہ حق علی رضی اللہ عنہ کے زیادہ قریب تھا۔ یہ قول احمد، اکثر اہلِ حدیث اور اکثر ائمۂ فقہا کا ہے۔ یہی قول اکابر صحابہ کا، خوبی کے ساتھ ان کا اتباع کرنے والوں کا اور یہی قول ہے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کا، وہ اس جنگ میں ہتھیاروں کی خرید وفروخت کو ناجائز کہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: یہ بیع فتنہ انگیز ہوگی۔ یہی قول ہے اسامہ بن زید، محمد بن مسلمہ، ابن عمر، سعد بن ابی وقاص اور اکثر ان حضرات کا جو قدیم مہاجرین اور انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے اس وقت موجود تھے۔ اسی لیے اہلِ سنت کا یہ مذہب ہے کہ صحابہ کے اختلافات کے ذکر کے وقت اپنی زبان روکیں، کیوں کہ ان کے فضائل ثابت ہیں، ان کا ساتھ دینا واجب ہے اور ان کی محبت فرض ہے۔''

کیوں کہ اس بیان کو شیخ الاسلام نے اس طرح شروع کیا ہے:

"ولم يكن معاوية ممن يختار الحرب ابتداء، بل كان من أشد الناس حرصا على أن لا يكون قتال وكان غيره أحرص على القتال منه"

''معاویہ رضی اللہ عنہ ان میں نہیں جو لڑائی چھیڑنا چاہتے تھے، بلکہ سب سے زیادہ خواہش تو انہی کی تھی کہ لڑائی نہ ہو۔ البتہ دوسرے لوگ جنگ چھیڑنے میں ان سے زیادہ حریص تھے۔ (یعنی سبائی لوگ جنھوں نے صلح کا ہر موقع غارت اور جنگ کا ہر بہانہ پیدا کیا)۔''

کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جنگ کے لیے کبھی پیش قدمی کی ہو۔ ان کے لیے بہت آسان تھا کہ جنگِ جمل کے وقت اپنی فوجیں لے آئیں اور اس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ان کے لیے آسان تھا کہ جنگِ جمل کے ختم ہوتے ہی اپنی فوجیں حرکت میں لے آئیں مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے لیے بہت آسان تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ایک دم اپنی خلافت کا اعلان کر کے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیں، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ہر موقع پر صبر و ضبط سے کام لیا اور کوشش کی کہ جنگ کی آگ نہ بھڑکے۔ انھوں نے صفین کی جنگ میں ابتدا نہیں کی اور نہ اپنی فوجیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوجوں کی حرکت سے پہلے حرکت میں لائے۔ یہ وہی تھے جنھوں نے صفین کی جنگ بندی کرائی۔ گویا انھوں نے ہمیشہ مدافعانہ جنگ کی اور جب تک مجبور نہ ہو گئے، ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ایسا شخص باغی ٹولی کا امام کیسے کہلا سکتا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو تمام احوال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، وہ انھیں فئہ باغیہ میں کیسے سمجھ سکتے تھے؟!

یہی سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ جو ''الفئة الباغية'' کی حدیث کے راوی ہیں، انہی کی روایت خوارج کے متعلق صحیح مسلم میں موجود ہے:

''تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين يقتلها أولى الطائفتين بالحق''

''مسلمانوں کے اختلاف کے زمانے میں ایک ٹولی جماعت سے باہر ہو جائے

گی اور اس کو جماعت کا وہ فریق قتل کرے گا جو حق سے زیادہ قریب ہو گا۔‘‘

خوارج کے اس گروہ نے صفین کے بعد ملت سے علاحدگی اختیار کی اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کیا۔ گویا اس حدیث کے مطابق حق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی تھا اور یہ دونوں فریق جماعتِ حقہ سے تعلق رکھتے تھے، برخلاف خوارج کے جو مسلمانوں کی جماعت سے باہر ہو گئے تھے۔

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اپنے پورے پسِ منظر کے ساتھ صحیحین میں اس طرح ہے:

’’قَالَ: بَعَثَ عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ إِلَی النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم بِذُهَيْبَةٍ فَقَسَمَهَا بَيْنَ الْأَرْبَعَةِ: الْأَقْرَعِ بْنِ حَابِسٍ الْحَنْظَلِيِّ، ثُمَّ الْمُجَاشِعِيِّ، وَعُيَيْنَةَ ابْنِ بَدْرٍ الْفَزَارِيِّ، وَزَيْدٍ الطَّائِيِّ، ثُمَّ أَحَدِ بَنِي نَبْهَانَ، وَعَلْقَمَةَ بْنِ عُلَاثَةَ الْعَامِرِيِّ، ثُمَّ أَحَدِ بَنِي كِلَابٍ، فَغَضِبَتْ قُرَيْشٌ، وَالْأَنْصَارُ، قَالُوا: يُعْطِي صَنَادِيدَ أَهْلِ نَجْدٍ وَيَدَعُنَا، قَالَ: إِنَّمَا أَتَأَلَّفُهُمْ، فَأَقْبَلَ رَجُلٌ غَائِرُ الْعَيْنَيْنِ، مُشْرِفُ الْوَجْنَتَيْنِ، نَاتِئُ الْجَبِينِ، كَثُّ اللِّحْيَةِ، مَحْلُوقٌ، فَقَالَ: اتَّقِ اللّٰهَ يَا مُحَمَّدُ! فَقَالَ: مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ إِذَا عَصَيْتُ؟ أَيَأْمَنُنِي اللّٰهُ عَلَی أَهْلِ الْأَرْضِ فَلَا تَأْمَنُونَنِي؟ فَسَأَلَهُ رَجُلٌ قَتْلَهُ، أَحْسِبُهُ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيدِ، فَمَنَعَهُ، فَلَمَّا وَلَّی قَالَ: إِنَّ مِنْ ضِئْضِءِ هَذَا، أَوْ فِي عَقِبِ هَذَا قَوْمًا يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ، يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ مُرُوقَ السَّهْمِ مِنَ الرَّمِيَّةِ، يَقْتُلُونَ أَهْلَ الْإِسْلَامِ وَيَدَعُونَ أَهْلَ الْأَوْثَانِ، لَئِنْ أَنَا أَدْرَكْتُهُمْ لَأَقْتُلَنَّهُمْ قَتْلَ عَادٍ‘‘ [1]

[1] صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب ذكر الخوارج وصفاتهم، رقم الحديث (٢٤٩٦)

’’فرماتے ہیں: سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھوڑا سا سونا بھیجا۔ آپ نے اسے ان چار آدمیوں پر تقسیم کر دیا: ① اقرع بن حابس حنظلی مجاشعی ② عیینہ بن بدر الفزاری ③ زید طائی نبہانی اور ④ علقمہ بن علاثہ عامری کلبی۔ اس پر قریش اور انصار کو ناگواری ہوئی کہ نجد کے بڑے لوگوں پر تو نوازش ہو رہی ہے اور ہمیں نظر انداز کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو محض ان کی دلجوئی کر رہا ہوں۔ اتنے میں ایک شخص آیا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، کنپٹیاں اٹھی ہوئیں، پیشانی پر گومڑا، خوب گھنی ڈاڑھی اور سر منڈا ہوا۔ آتے ہی کہنے لگا: محمد! خدا سے ڈرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بھلا میں نافرمانی کروں گا تو خدا کی اطاعت کرنے والا کون ہوگا؟ اللہ نے مجھے اہلِ زمین کا امین بنایا ہے، تو کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے؟ اس پر ایک صاحب نے اسے قتل کرنے کی اجازت مانگی۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ شاید وہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔ وہ شخص چلا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی نسل سے، یا فرمایا: اس کی پشت سے ایک گروہ پیدا ہوگا جو قرآن پڑھیں گے، مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے۔ اہلِ اسلام کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔ اگر میرے زمانے میں یہ پیدا ہوئے تو انھیں ایسے قتل کروں گا جیسے قومِ عاد کو فنا کر دیا گیا۔‘‘

اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خوارج کو اسلام دشمنی اور مسلم کشی ورثہ میں ملی تھی اور یہ خوارج اپنی اصل میں سبائی ہی تھے، جنھوں نے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی اور اس فتنے کو فروغ دینے کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہوا خواہ بنے اور جب صلح و آشتی کی فضا پیدا ہونے لگی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بھی خلاف ہو گئے۔ غرض یہ ہے کہ سبائی لوگ

جس رنگ میں بھی ظاہر ہوئے، مآل ہمیشہ نکلا نبی ﷺ کے اصحاب سے عداوت اور جماعت میں انتشار پھیلانے کی کوشش۔ اصحابِ نبی اور اہلِ ایمان کی یہ بات نہیں۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کے بارے میں جو متفق علیہ حدیث ہے اس میں بھی صحابہ اور تابعین کے دونوں گروہوں کو مسلمانوں کا عظیم گروہ بتایا گیا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ سیدنا علی، معاویہ رضی اللہ عنہما اور امت کے غیر جانبدار سوادِ اعظم کے درمیان جو اختلاف تھا وہ اجتہادی تھا اور اجتہادی اختلاف میں فرق حق و باطل کا نہیں ہوتا، بلکہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کا ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ نے، جمہور صحابہ نے اور اصحاب کا اتباع کرنے والی جماعت نے دونوں گروہوں کو ملتِ اسلامیہ کے دو گروہ کہا ہے۔ اخوت کی لڑی میں منسلک بتایا ہے اور ان میں باہمی صلح و آشتی کی فضا قائم رکھنی واجب کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ فتنہ جو لوگوں کی حرکتوں سے جماعتِ اسلام میں جب انتشار ہو اور اس کی لپیٹ میں صلحا بھی آ جائیں تو تم فریق مت بننا، بلکہ اس حیات بخش طریقہ کار پر جمے رہنا جو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کیا ہے اور ان فتنہ جو لوگوں سے ہوشیار رہنا جو دلوں کو اپنی خرافات کے ذریعے خراب کرنے کے درپے ہوں:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسْتَجِيبُواْ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَٱتَّقُواْ فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنكُمْ خَآصَّةً ۖ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ﴾ [الأنفال: ٢٤، ٢٥]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اور رسول کی دعوت قبول کرو، جب وہ تمھیں اس چیز کے لیے دعوت دے جو تمھیں زندگی بخشتی ہے اور جان لو کہ بے شک اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے اور یہ کہ بلاشبہہ حقیقت یہ ہے کہ تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور اس فتنے سے بچ

جاؤ جو لازماً ان لوگوں کو خاص طور پر نہیں پہنچے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا اور جان لو کہ بے شک اللہ بہت سخت سزا والا ہے۔‘‘

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم اکثریت نے اسی حکمِ ربانی کی پیروی کی اور جو حضرات فتنوں میں مبتلا ہوئے وہ بھی فوراً سنبھل گئے اور اس کی تلافی کی کوشش کی۔

ہمارے اس بیان کی توثیق کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل کافی ہے۔ جمل وصفین کی جنگوں میں شرکت سے انھیں گریز تھا۔ جو جنگ میں مبتلا ہوئے انھوں نے اطمینانِ قلب کے ساتھ ذرا سے اشارے پر جنگ بند کر دی، فریقین نے اپنا معاملہ ثالثوں کے سپرد کر دیا، ان کے فیصلے کا اپنے آپ کو پابند بنایا، پھر اطمینانِ قلب کے ساتھ آپس میں صلح کر لی، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اجماع کر لیا اور سب ایسے شیر وشکر ہو گئے جیسے ان رنجشوں سے پہلے تھے۔ وہی محبت، وہی باہمی تعظیم وتکریم اور ایک دوسرے کے جذبات کی پاسداری اور حقوق کی نگرانی۔

برخلاف اس کے صحابہ نے خوارج اور سبائیوں کو ملتِ اسلامیہ کا دشمن اور دعوتِ محمدیہ کا مخالف جانا، انھیں کبھی جماعت میں شامل نہ سمجھا اور ہمیشہ ان کے خلاف شمشیر بکف میدان میں اترنے پر تیار رہے۔ یہی سبب ہے کہ خوارج اور سبائیہ دونوں کو جمہور صحابہ سے نفرت ہے اور ان کی سنت مٹانے کی فکر۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کی شرائط میں یہ بات رکھی تھی کہ اہلِ عراق سے جنگ کا انتقام نہیں لیا جائے گا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ شرط منظور کر لی اور اس کی پوری پاسداری کی، بلکہ ان کے خلاف کبیدگی کو دل سے قطعاً نکال دیا۔ جتنے مسلمان آپ کے خلاف لڑے تھے، ان میں سے نہ کسی کی طرف سے دل میں میل رکھا اور نہ ان اہلِ ایمان نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے اخلاص رکھنے میں کبھی کمی کی۔ تمام صحابہ اور اہلِ بیت اطہار کا رویہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغایت محبت ومودت وعقیدت کا تھا۔ لیکن آپ نے تحقیقات کے بعد چن چن کر سبائی گروہ کے افراد کو قتل کیا۔ اس قتل پر سیدنا حسن اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف

سے قطعاً کوئی احتجاج نہیں ہوا، بلکہ سب نے اسے بنظرِ استحسان دیکھا، کیوں کہ سب کی خواہش تھی کہ یہ مفسد طبقہ ختم کر دیا جائے۔

حُجر بن عدی:

صرف ایک ذات حجر بن عدی کی ہے، ان کے قتل پر ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور بعض دوسرے صحابہ نے اعتراض کیا تھا، ام المومنین نے اپنی طرف سے قاصد بنا کر عبدالرحمٰن بن حارث کو بھیجا، لیکن ان کے دمشق پہنچنے سے پہلے حُجر قتل کیے جا چکے تھے۔

امیر زیاد رحمہ اللہ جمعہ کے دن منبر پر خطبہ دے رہے تھے، حُجر نے آواز دی: "الصلاۃ" یعنی نماز پڑھیے، لیکن امیر زیاد نے اپنا خطبہ جاری رکھا، تو لوگوں نے آوازے کسے اور ان پر کنکریاں پھینکیں۔ امیر زیاد اس جرم کی پاداش میں ان لوگوں کو سخت سزا دے سکتے تھے مگر آپ نے ضروری سمجھا کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان احوال سے مطلع کر دیں۔ ان لوگوں کا باقاعدہ جتھا تھا اور یہ وہی حرکتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے جو اب تک کوفہ کے والیوں کے ساتھ کرتے آئے تھے جس کی تفصیل طولانی ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو آپ کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ ان کے سرکردہ لوگوں کو مع گواہوں کے دمشق بھیج دیا گیا۔ امیر المومنین نے ان کے متعلق تحقیقات کیں اور گواہوں کی گواہیوں سے مطمئن ہو کر حجر اور چار دوسرے آدمیوں کو قتل کرا دیا اور جن پر جرم ثابت نہیں ہوا انھیں چھوڑ دیا۔

حُجر کے قتل کو لوگوں نے بہت اچھالنے کی کوشش کی ہے، بلکہ ایک تاریخی واقعہ بنا کر انھیں اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل کر دیا ہے، تاکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر ایک صحابیِ رسول کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا جا سکے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے لوگ، سیدنا طلحہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہما جیسے اکابر محبوبانِ الٰہی کو شہید کر دیں تو اس

کو اپنا مجاہدانہ فعل گردانیں، اگرچہ ان میں سے کسی کا قتل جنگ میں نہیں ہوا تھا، لیکن حجر بن عدی کو باقاعدہ عدالت کی طرف سے جب فساد فی الارض اور اہانتِ حکومت کے جرم میں قتل کی سزا دی جائے تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام عائد کرنے کی جرأت کی جائے کہ انھوں نے حجر بن عدی جیسے عابد و زاہد صحابی کو قتل کر دیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری اور دوسرے ائمہ نے انھیں تابعی لکھا ہے اور یہی رائے صحیح ہے، اگرچہ بعض حضرات انھیں صحابی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے صحابی اور غیر صحابی ہونے میں اختلاف ہو وہ روایت کے اعتبار سے بہرحال تابعی ہوگا۔ اگر بالفرض صحابیت مسلم بھی ہو جائے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اس پر حدودِ شرعیہ جاری نہ ہوں اور نہ ایسے شخص کی یہ حیثیت ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اور امام الصحابہ کے مقابلے پر کھڑا کر دیا جائے۔ وہ ان کی رعایا میں تھے اور ان مفسدوں میں جو امت کے اندر دوبارہ فتنہ جگانا چاہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ [البقرة: ۱۹۱] ''اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے۔''

اتنے برس کے بعد امت کو یہ دن نصیب ہوئے تھے کہ اختلال رفع ہو، امن قائم ہو، داخلی ترقیوں کے وہ دروازے کھل جائیں جو پانچ برس سے بند پڑے تھے اور جہاد فی سبیل اللہ کی طرف مسلمان یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو سکیں۔ حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو یہ صورتِ حال ناگوار تھی، وہ نظامِ مملکت میں تزلزل پیدا کرنے کے درپے تھے اور چاہتے تھے کہ اُبّہتِ خلافت ماند پڑ جائے۔

انھیں اگر امیر زیاد رحمہ اللہ کے کسی عمل سے اختلاف تھا تو وہ سلامت روی کے ساتھ بھی تو اصلاح کی کوشش کر سکتے تھے، خود امیر المومنین تک ان کی شکایتیں لے جاتے تو کیا ان کی شنوائی نہ ہوتی؟ لیکن علانیہ مجمع میں ان کی بے حرمتی کرنا جو شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے انھوں نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے بے نظیر والیوں کے خلاف

مستقلاً کر رکھی تھیں اور ہر والی کے متعلق یہی مطالبہ کرتے تھے کہ اسے برطرف کر دیا جائے۔ کسی دوسری جگہ اگر ایسا ہوتا جو حجر بن عدی نے کوفہ میں کیا تو شاید اس سے چشم پوشی کر لی جاتی، لیکن عراق میں یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جگہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہوتے تو ان حالات میں وہ بھی حجر کو سخت ترین سزا دیتے۔ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے جس طرح ان لوگوں کی گستاخیوں اور بدتمیزیوں سے چشم پوشی فرمائی اور درگزر سے کام لیا اور ان کے کہنے پر پے در پے اپنے والی بدل دیے، اس کا ہولناک نتیجہ سامنے تھا۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ان کی یہی کیفیت تھی اور آپ ان سے سخت بیزار ہو گئے۔ اب اس غلطی کا اعادہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کیوں کر ممکن تھا۔ حجر کا جتھا نہ ہوتا تو تب بھی شاید ان کے ساتھ رعایت برتی جاتی، مگر وہ تو باقاعدہ عہدِ عثمانی کا فتنہ واپس لانا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کا قتل واجب ہو گیا۔ کوئی دوسری حکومت ہوتی تو غالباً محض قتل پر اکتفا نہ کرتی، بلکہ اور بھی عبرت ناک سزائیں دی جاتیں، بلکہ خود کوفہ کی بستی پر وہ عذاب نازل کیا جاتا کہ پھر سر اٹھانے کی یہ لوگ ہمت نہ کرتے، لیکن امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ راشد ہونے کی بنا پر بس اتنا ہی کیا جو کتاب وسنت کی حدود میں تھا۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جب مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو ام المومنین نے پھر یہ ذکر چھیڑا۔ آپ نے عرض کی: ”دعيني و حجرا حتى نلتقي عند الله“

”مجھے اور حجر کو چھوڑے رکھیے، تا آنکہ ہم اللہ کے حضور اکٹھے ہوں۔“

یہ الفاظ صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو صمیمِ قلب سے اپنے عمل پر مطمئن ہو۔ ہمارا بھی یہی فرض ہے کہ اس معاملے میں امیر المومنین پر طعن سے گریز کریں۔ ہمارے سامنے صرف روایتیں ہیں اور وہ بھی اکثر و بیشتر کذابوں اور دجالوں کی، لیکن ان کے سامنے عینی شہادتیں تھیں۔

اگر ظلم ہوا ہوگا اور حجر واقعی بے گناہ تھے اور ان کے متعلق جو کچھ کہا گیا، جتنی گواہیاں پیش ہوئیں اور مستند حالات بیان ہوئے وہ سب غلط ہیں، تب بھی دونوں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ چکے اور ہمارے کچھ کہنے نہ کہنے سے ان پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ حقیقتاً اس قتل کی ذمے داری ہے تو ان پر جنھوں نے اپنی گواہی سے انھیں بغاوت کا مجرم ثابت کر دیا تھا۔

ذاتی طور پر ہم اس واقعے کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتے اور نہ قانوناً و شرعاً اس کی کوئی اہمیت ہے۔ امام عادل ہو اور وہ بھی امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسا امام مجتہد اور یکتائے روزگار، تو اس کے اجتہاد کے سامنے، کسی ہم عصر کا اعتراض بھی قیمت نہیں رکھتا، چہ جائیکہ بعد کے کسی شخص کی بات، اگرچہ وہ اپنے زمانے کا مجتہد ہی کیوں نہ ہو۔ الحمد للہ کہ اس بارے میں اعتراض کرنے والے لوگ صرف وہی ہیں جنھیں صحابہ پر طعن کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ جنھیں خلیفۂ رسول پر اعتراض ہے کہ انھوں نے مسیلمہ کذاب اور مانعینِ زکات کے خلاف جہاد کیوں کیا، جنھیں اس پر خوشی ہو کہ ابولؤلؤ نے امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، جنھیں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض ہے کہ آپ نے ہرمزان کے قصاص میں سیدنا عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیوں نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے حجر کو قتل کر دیا۔ مسیلمہ کذاب اور مانعینِ زکات مومن ہیں، ابولؤلؤ قاتلِ فاروقِ اعظم مجاہد ہے، ہرمزان جو اس قتل میں شریک تھا بڑا صاحبِ ایمان ہے۔ اور منافق کون ہے، دین کا دشمن کون ہے، ننگِ انسانیت کون ہے؟! ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ اور ہر وہ شخص جس نے جان اور مال اللہ کے نام پر قربانی کے لیے پیش کر دیا اور ظاہری و باطنی ہر تکلیف اٹھا کر ہر مصیبت کا سامنا کر کے کلمۃ اللہ بلند کیا!

﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ﴾

[قٓ: ٣٧]

’’بلاشبہہ اس میں اس شخص کے لیے یقیناً نصیحت ہے جس کا کوئی دل ہو، یا کان لگائے، اس حال میں کہ وہ (دل سے) حاضر ہو۔‘‘[1]



[1] جن احباب کو حجر بن عدی رحمہ اللہ کے قتل کی بابت مفصل ادلہ اور تفصیل درکار ہو، ان کو چاہیے کہ اس متعلق حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کی کتاب ’’خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت‘‘ میں (حجر بن عدی کا واقعہ قتل اور اس کی حقیقت) کی سرخی کے ذیل میں دی گئی تفصیلات ملاحظہ کریں جہاں حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے تاریخی حقائق کے تحت ثابت کیا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے حجر بن عدی کے قتل کا فیصلہ ان کے خلاف ستّر سے زائد اشراف کی شہادتوں کے بعد کیا تھا جن میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گواہیاں بھی شامل تھیں کہ حجر بن عدی علانیہ خلیفہ اور ان کے عمال کو گالیاں دیتے ہیں اور جتھا بندی کر کے حکومت مخالف کاموں میں مشغول ہیں، یہاں تک کہ صحابی رسول سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے بھی برسرِ منبر کافی بدتہذیبی کر چکے تھے لیکن انھوں نے درگزر سے کام لیا اور کچھ نہ کہا۔ تاہم جب حجر بن عدی نے یہی کام امیر زیاد بن ابی سفیان رحمہ اللہ کے ساتھ کیا تو انھوں نے حجر کے خلاف اشراف کی شہادتیں اکٹھی کر کے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھجوائیں۔ عراق سے دمشق گواہان کی یہ رپورٹ اور شہادتیں دو صحابہ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ اور سیدنا کثیر بن شہاب رضی اللہ عنہ لے کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اس کے باوجود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے فطری حلم کے باعث حجر بن عدی کی بابت متردد رہے لیکن جب امیر زیاد رحمہ اللہ نے حجر بن عدی اور ان کے جتھے کی مزید کارستانیاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بتائیں تو آپ نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ قارئین یہ ساری تفصیلات حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کی مذکورہ بالا کتاب (صفحہ: ۴۹۷۔۵۰۵) میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

دورِ خلافت

حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی امت کی داخلی اور خارجی حکمتِ عملی درست کرنے پر توجہ فرمائی۔ ہر قسم کے فتنہ وفساد کا سدِباب کیا اور امت کی حرکت فی سبیل اللہ میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا، اسے دور کر کے کاروانِ ملت کو رواں دواں کر دیا۔

داخلی اصلاحیں:

تمام عالمِ اسلام کو نئے سرے سے منظّم کیا، یعنی ایسے معاشی اور معاشرتی واحدوں میں تقسیم کر دیا کہ بڑی حد تک خود کفیل رہیں اور سیاسی اعتبار سے اس قابل ہوں کہ اپنے علاقے کی اچھی طرح حفاظت کر سکیں۔ عام طور پر واحدے (یونٹ) لسانی بنیاد پر قائم کیے گئے۔

ان سب کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کے لیے شاہراہیں درست کیں اور یوں سب کا تعلق مرکز سے جوڑ دیا۔ ہر انتظامی واحدے کا والی مرکز سے بھیجا جاتا تھا، اس کے عملے کے معمولی کارکنوں کے علاوہ باقی تمام خدمتوں پر مقامی مسلم باشندے فائز ہوتے تھے۔ ہر علاقے کی فوج بھی مقامی لوگوں ہی سے مرتب کی جاتی تھی۔ پولیس کا انتظام بھی سب مقامی تھا۔ فوجی خدمت رضا کارانہ تھی۔ علاقے کی اکثر آمدنی خود اسی علاقے پر صرف ہوتی تھی، صرف ایک مقررہ حصہ ہی مرکز کو بھیجا جاتا تھا۔ زکات کا روپیہ بھی مقامی ضرورتوں پر خرچ ہوتا تھا۔ جس جگہ کے مالداروں سے لیا جاتا وہیں کے ضرورت مندوں پر خرچ ہوتا۔ اس طرح ہر علاقے کے لوگ اندرونی خود مختاری اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ اس دور میں عرب کی زندگی خصوصاً اور دوسری قوموں کی عموماً قبائلی تھی،

اس لیے اس قسم کا سیاسی نظام کامیاب ہوسکتا تھا۔ اس نظام کی اصل فاروقی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو انتظامی اصول مرتب فرمائے تھے، بعد کے خلفا نے انھی پر عمل کیا۔ حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے مزید اصلاحات کیں۔

جناب عبداللہ العمادی صاحب نے تاریخِ اسلام کے نام سے تاریخ طبری کا جو اردو ترجمہ ایک ملخص کی صورت میں شائع کیا جس کا ایک حوالہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے سلسلے میں دیا جا چکا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

''معاویہ نے ہر شہر سے وہ حصہ نکال ڈالا تھا جو ملوکِ فارس، آباد جائیدادوں سے صرفِ خاص کے لیے لیا کرتے تھے۔ معاویہ نے اسے اپنا مخصوص حصہ بنا لیا تھا۔'' (ص: ۲۷۰)

کاش یہ روایت درج کرنے سے پہلے انھوں نے حضرت امام ابو یوسف کی کتاب الخراج ملاحظہ فرما لی ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ ان راویوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام بے بنیاد لگایا ہے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ملوکِ فارس کی چھوڑی ہوئی ''صرفِ خاص'' کی تمام جائیداد کو حکومتِ اسلامیہ کی ملک قرار دے دیا تھا۔ اس زمین کا رقبہ چالیس لاکھ جریب کے قریب تھا، اس کی حیثیت افتادہ زمین کی سی قرار دی گئی تھی اور امام کو اختیار تھا کہ مصلحتِ ملیہ کے تحت مناسب اشخاص کو عشری یا خراجی بنا کر دے دے، جسے یہ زمین دے دی گئی اسی کی ملکیت ہوگئی۔[1]

اسی علاقے کی کچھ زمین سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کو عہدِ فاروقی میں دے دی گئی تھی۔ اسی زمین کے بارے میں امیر کوفہ سیدنا سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے سامنے تذکرہ ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ایسی زمین میرے پاس ہو تو میں بھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرح سخاوت

---

(1) امام ابو یوسف کی بحث کے خلاصہ کے لیے ملاحظہ ہو: الخضری: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، الدولۃ العباسیہ (ص: ۱۴۸)

کروں۔ اس پر ایک صاحب نے عرض کی تھی، آپ بھی درخواست دے کر یہاں کچھ زمین لے لیجیے تو اشترنخعی وغیرہ بگڑ گئے تھے کہ ہماری زمین کے متعلق تم ایسی بات کہتے ہو۔ گویا ان کے نزدیک وہ زمین حکومت کی نہیں تھی، بلکہ ان کی تھی۔ اسی پر جھگڑا ہوا تھا، حتی کہ اہلِ شہر کی درخواست پر امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سبائیوں کو شہر بدر کر کے معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیج دیا تھا جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔ عمادی صاحب کو یہ بھی تو بتانا چاہیے تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس بدعت اور متغلبانہ تصرف پر حضرت ابن عمر اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم نے اعتراض کیا تھا یا نہیں، اور علمائے حدیث و فقہ نے اس بارے میں کیا موقف اختیار کیا؟ محض ہوائی باتیں کرنے سے علمی بحث کا امکان نہیں رہتا۔

رسل و رسائل:

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے نقل و حمل کا خاطر خواہ انتظام درست کرنے کے علاوہ رسل و رسائل کا بھی وہ انتظام کیا کہ باید و شاید۔ تاریخِ اسلام میں اس اعتبار سے اولیت کا شرف آپ ہی کا ہے۔ بارہ بارہ میل کے فاصلے پر چوکیاں قائم کیں، جہاں کوتل گھوڑے اور سوار ہر وقت موجود رہتے تھے۔ علامت کے طور پر ڈاک کے گھوڑوں کی دمیں کاٹ دی گئی تھیں، تاکہ لوگ پہچان لیں کہ ڈاک جا رہی ہے۔ گھوڑوں کی گردنوں میں گھنٹیاں ہوتی تھیں، تاکہ چوکی پر پہنچنے سے پہلے ہی معلوم ہو جائے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ہر قسم کی ڈاک اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی تھی۔ یہ مستقل محکمہ تھا اور ''البرید'' کہلاتا تھا۔[1]

دیوان:

دیوان کا محکمہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے وقت سے جاری تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس میں مزید باقاعدگی پیدا کی۔ ہر سرکاری حکم پر مہر کا انتظام کیا اور ہر حکم کی ایک نقل محفوظ رکھنے کا

---

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلاميه للخضري (۲/ ۱۸۴) تحت البيعة ليزيد لولاية العهد.

بھی۔ اس طرح ناجائز تصرف کے امکانات ختم ہو گئے، دفتری زبان البتہ رومی اور سریانی تھی۔ یہ فخر امیر المومنین عبدالملک کا ہے کہ آپ نے عربی کو دفتری زبان بنا لیا۔[1]

عدلیہ:

اسلام کا نظامِ عدلیہ شروع سے اصیل بنیاد پر قائم تھا اور انتظامیہ سے ہمیشہ بالکل آزاد رہا۔ امتِ مسلمہ کو اپنے نظامِ عدلیہ پر بجا فخر رہا ہے اور دنیا کی کوئی قوم اس بارے میں اس سے بازی نہ لے جا سکی۔ یہی نظام سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی پورے اہتمام سے جاری رکھا۔ عموماً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو منصبِ قضا سپرد کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اس کا اہتمام رکھا کہ انتظامیہ سے عدلیہ بالکل آزاد رہے اور اگر ایسے واقعات فراہم کیے جائیں کہ کس طرح ایک قاضی اپنی عدالت میں حاکمِ وقت کو طلب کر لیتا تھا، بلکہ امیر المومنین کو بھی، تو ایک مستقل اور ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی اور ایسی روح پرور کہ باید و شاید۔

رفاہِ عام:

آپ نے رفاہِ عام کے وہ سب طریقے جاری رکھے جو خلفائے پیشین کے وقت سے چلے آ رہے تھے، کچھ کمی نہیں کی، البتہ اضافہ کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد سے ہر پیدا ہونے والے بچے کی کفالت حکومت کرتی تھی۔ آج کل کی بعض حکومتوں نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا ہے اور اس پر فخر کرتے ہیں مگر ان کے طریقے میں ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سرکاری اداروں میں کی جاتی ہے اور اس طرح بچے کا تعلق اپنے والدین سے اول تو رہتا ہی نہیں اور اگر رہتا بھی ہے تو محض رسمی، لیکن اسلامی معاشرے میں بچے کی تربیت کی تمام تر ذمہ داری والدین کے سپرد ہوتی ہے۔ حکومت سرکاری اداروں یعنی مکاتب و مدارس کے ذریعے والدین کی مدد کرتی ہے اور اس کی بھی نگرانی کرتی ہے کہ

[1] البداية و النهاية (٦٢/٩) تحت ترجمة عبدالملك بن مروان رحمه الله .

اسلامی روایات ضائع نہ ہونے پائیں۔ یعنی کفیل ہوتی ہے حکومت اور پرورش کرتے ہیں والدین۔ اور بچہ اس فطری ماحول میں پل کر دار الاسلام کا شہری اور دعوتِ اسلام کا سپاہی بن کر زندگی بسر کرتا ہے۔

امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ بچوں کے ساتھ مملوکوں کے بھی مخصوص اخراجات کا بار حکومت نے اٹھا لیا اور انھیں خاص وظائف دیے۔ نظامِ اسلامی میں مملوک بھی خاندان کا فرد ہوتا ہے اور احکامِ قرآنی کے مطابق اس کے تمام اخراجات اس کے آقا کے ذمے ہوتے ہیں اور ان کا معیار وہی ہوتا ہے جو خود آقا اور اس کے گھر والوں کا۔ آج کل کی حکومتوں میں جنگی قیدی کو قید میں ہی رکھا جاتا ہے اور ان سے اسی طرح کام لیا جاتا ہے جیسے اسلام سے پہلے غلاموں سے لیا جاتا تھا کہ جانوروں کی طرح ان کی گردن میں جوا ہوتا تھا۔ اسلام میں جنگی قیدیوں کو مسلمانوں کے گھروں پر تقسیم کر کے اس کے گھر کے افراد میں شامل کر دیا جاتا تھا، لیکن امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کا تعلق مرکز سے قائم کر کے ان کی معاشرتی حیثیت اور بھی بڑھا دی۔ یہ تجویز امیرِ کوفہ سیدنا ولید بن عقبہ کی تھی جو امیر المومنین نے پسند فرمائی۔ سیدنا ولید کی دوسری تجویز یہ تھی کہ ہر شہر میں سرکاری اقامت گاہیں قائم کی جائیں، تاکہ باہر سے آنے والوں کو قیام و طعام کی دقت نہ ہو۔ یہ اخراجات بھی حکومت کے ذمہ تھے۔ محدود پیمانے پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی مسافروں کے لیے ایسی سرکاری اقامت گاہیں بنائی تھیں۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ہر شہر میں متعدد سرکاری کارکن مقرر کر دیے جو روزانہ صبح کو اپنے اپنے علاقوں میں گشت کر کے پتا چلاتے تھے کہ کس کے ہاں ولادت ہوئی اور کس محلے میں کوئی مہمان آیا۔ یہ کارکن معلومات حاصل کر کے دفتر کو مطلع کر دیتے تھے اور وہاں سے سب انتظام کر دیا جاتا تھا۔ لوگوں کو راشن کارڈ کے لیے درخواستیں لے کر دفتروں کے چکر نہیں لگانے پڑتے تھے اور نہ اپنے روپے سے اپنی غذائی

ضرورت پوری کرنے کے لیے دکانوں کے سامنے قطار بنانی پڑتی تھی۔ یہ کام حکومت کا تھا کہ اس کے گماشتے شہریوں کی سب ضرورتوں کا انتظام کریں۔

علامہ بغوی نے سوید بن سعید سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ضمام بن اسماعیل نے بیان کیا اور انھوں نے ابوقبیس کا حوالہ دیا، وہ فرماتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہر قبیلے میں ایک شخص کو نمایندہ مقرر کیا تھا۔ ہمارے قبیلے میں ایک صاحب تھے جن کی کنیت ابو یحییٰ تھی۔ وہ ہر صبح مختلف مجلسوں میں گھوم کر دریافت کیا کرتے تھے: رات آپ لوگوں کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ کوئی خاص واقعہ رونما تو نہیں ہوا؟ اور کسی کے ہاں کوئی مہمان تو نہیں آیا؟ لوگ جواب میں کہتے ہیں: ہاں ایک صاحب اپنے اہل و عیال کے ساتھ یمن سے آئے ہیں۔ ان کے نام بھی بتاتے اور اہل و عیال کا شمار بھی۔ جب وہ تمام محلوں کا دورہ لگا کر فارغ ہو جاتے تو دفتر عطیات میں جا کر ان سب کے نام لکھوا دیتے۔''[1]

محمد بن عوف عطائی نے اپنی سند کے ساتھ عطیہ بن قیس کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: میں نے سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو یہ خطبہ دیتے سنا ہے:

''آپ لوگوں کے بیت المال میں آپ سب کا حق ادا کر کے بھی کچھ روپیہ بچ گیا ہے اور میں اسے تقسیم کرنے والا ہوں۔ اگر اگلے سال بھی فاضل روپیہ رہا تو اسے بھی تقسیم کر دوں گا۔ اور نہ بچا تو پھر مجھ پر الزام مت رکھنا، کیوں کہ مال میرا نہیں ہے اللہ کا ہے جو اس نے تمھیں عطا فرمایا ہے۔''[2]

---

[1] تاريخ ابن عساكر (٧٢٩/١٦) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضی اللہ عنہ، منهاج السنة (١٥٨/٣)، البداية و النهاية (١٣٤/٨) تحت ترجمة معاوية بن أبي سفيان رضی اللہ عنہ.

[2] المنتقى (ص: ٣٨٨) المطبعة السلفية، طبع مصر.

شفاخانے اس وقت تک قائم نہیں ہوئے تھے۔ یہ شرف امیر المومنین ولید اول کو ہے کہ آپ نے تمام مملکتِ اسلامیہ میں سرکاری شفاخانے قائم کیے اورمعذوروں کی خدمت کے ادارے بھی، جن کا تمام انتظام حکومت کرتی تھی اور یوں ہر قسم کی طبی امداد ہر شخص کو سرکاری طور پر مفت حاصل تھی۔ مفت طبی امداد مسلم حکومتوں کا ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہا ہے۔ صقلیہ کے شفا خانے اس بارے میں سب پر بازی لے گئے تھے، ان کی تفصیلات سے جہاں روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے وہاں موجودہ صورتِ حال دیکھ کر دل پر چرکہ لگتا ہے کہ اللہ نے ہمیں کیا بنایا تھا اور ہم کیا بن گئے۔ آج اگر وہ باتیں بیان کی جائیں تو افسانے معلوم ہوں کہ طبی امداد کس پیمانے پر مفت میسر تھی اور شفاخانوں کو کس طرح جنت بنا کر رکھا جاتا تھا۔

زرعی اصلاحات:

رعایا کے شخصی آرام و آسایش کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے عہد میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ زرعی اصلاحات کا تھا۔ عہدِ نبوی سے کاشتکاروں کو بٹائی پر زمین دینے کا رواج تھا اوراس پر عمل ہوتا رہا، لیکن مہاجروں کی حالت درست ہو جانے کے بعد اگرچہ آپ نے بٹائی کو ممنوع نہیں کیا تھا، لیکن یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اگر فاضل زمین کاشت کے لیے بلامعاوضہ ہی دے دی جائے تو بہتر ہے۔ صحیح بخاری میں "باب المزارعة" کے تحت آپ کے عہد کی تدریجی اصلاحیں اور ارتقائی تحدیدیں مفصل مذکور ہیں جن پر یہاں بحث خارج از موضوع ہے۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے بٹائی کا یہ سلسلہ موقوف کر دیا۔ تمام زمین سرکاری ملکیت قرار پائی اور جو شخص جتنی زمین کاشت کرے اس سے انتفاع کا حق اسی کا ہے۔ گویا جسے زمین کی ملکیت اور ورثہ میں اس کی تقسیم سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ دراصل وراثت اس حقِ انتفاع کی ہے، ورنہ مملکت کی تمام مزروعہ اور غیر مزروعہ زمین اپنی اصل میں پوری قوم کی ملکیت ہے جس کی متولی حکومت ہوتی ہے۔ مسلمانوں سے عشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ

اور ذمیوں سے خراج وغیرہ سب پیداوار کی شکل میں لیا جاتا تھا۔

زرعی مسائل کی تنقیح کے لیے ملاحظہ ہو:

”عن نافع ان أبن عمر رضی اللہ عنہما كان يكري مزارعه على عهد النبي وأبي بكر وعثمان وصدراً من إمارة معاوية، ثُمَّ حُدِّثَ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ كِرَاءِ الْمَزَارِعِ فَذَهَبَ ابْنُ عُمَرَ إِلَى رَافِعٍ، فَذَهَبْتُ مَعَهُ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ كِرَاءِ الْمَزَارِعِ، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: قَدْ عَلِمْتَ أَنَّا كُنَّا نُكْرِي مَزَارِعَنَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ بِمَا عَلَى الْأَرْبِعَاءِ وَبِشَيْءٍ مِنَ التِّبْنِ“ [1]

”نافع سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی زمین نبی کریم ﷺ، ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں بٹائی پر دیا کرتے تھے، لیکن پھر سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہما کی روایت نے شہرت پکڑی کہ نبی کریم ﷺ نے مزروعہ زمین بٹائی پر دینے کی ممانعت فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما خود حضرت رافع کے پاس تشریف لے گئے اور میں بھی آپ کے ساتھ گیا۔ آپ نے اسی بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے مزروعہ زمین کو بٹائی پر دینے کی ممانعت فرما دی تھی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں چوتھائی بٹائی اور کچھ بھوسے پر اپنی زمینیں دے دیا کرتے تھے۔“

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس طرح اپنا عمل بتا کر جواب تو دے دیا مگر پھر آپ نے اپنے موقف سے رجوع فرما لیا۔

”عن أبن شهاب أخبرني سالم أن عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہما قال:

---

[1] صحيح البخاري (٢٢١٨)، صحيح مسلم (٥١٤٧)

كنت أعلم في عهد رسول الله ﷺ أن الأرض تكرى، ثم خشي عبد الله أن يكون النبي ﷺ قد أحدث في ذلك شيئا لم يكن يعلمه، فترك كراء الأرض“

”ابو شہاب (امام زہری) سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: مجھ سے سالم (فرزندِ ابن عمر) نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مجھے علم ہے کہ زمین بٹائی پر دی جاتی تھی۔ پھر حضرت عبداللہ نے یہ سوچ کر کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم میں کوئی تبدیلی کر دی ہو جس کا انھیں علم نہ ہو سکا۔ اس لیے بٹائی پر زمین دینی آپ نے موقوف کر دی۔“

یہ سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہما، امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے قاضی تھے۔ آپ ہی کے فتوے پر عمل ہوا۔ اگرچہ یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا اور بعد میں یہ طریقہ چھوڑ دیا گیا۔ مگر آپ تو اپنے عہد میں یہ اہم کام کر ہی گئے۔ اگر اب علمائے امت نے اس بارے میں کوئی زرعی دستور مرتب کیا تو ناممکن ہے کہ وہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرز سے ہٹنے کی جرات کر سکیں۔ [1]

دفاع:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد تک فوجی خدمت رضا کارانہ تھی، بلکہ آخر عہدِ اموی تک یہی حالت رہی، لیکن آپ نے مرکز کے تحت بھی ایک باقاعدہ فوج کی تشکیل کی تھی اور جب وہ اہم مواقع پر حرکت میں آتی تو کار آزمودہ لوگ اس میں رضا کارانہ شریک ہو سکتے

[1] صحیح مسلم کی احادیث میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ ٹھیکے پر زمین دینے کی ایک مخصوص صورت کی ممانعت کی گئی تھی اور وہ یہ کہ زمین میں جس جگہ فصل کی پیداوار حاصل ہونے کا غالب امکان ہوتا، مالک زمین اسے اپنے لیے مخصوص کر لیتا اور باقی زمین کاشت کار کو دے دیتا۔ اسی صورت سے منع کیا گیا کہ اس میں کاشت کار کو نقصان پہنچنے کا زیادہ امکان ہوتا تھا۔

تھے۔ یہ فوج عموماً رومی حکومت سے برسرِ پیکار رہتی تھی۔ اس کے دو حصے تھے جو فوج جاڑوں کے زمانے میں جہاد کرتی اس کو ''شتائیہ'' (جاڑوں کی فوج) کہتے تھے اور جو فوج گرمیوں میں مصروفِ عمل رہتی تھی وہ ''صائفہ'' (گرمیوں کی فوج) کہلاتی تھی۔ دونوں قسم کی فوجوں کے لیے الگ الگ انتظام تھے۔

غزوۂ روم:

بحریہ کی تشکیل ہی اس غرض سے کی گئی تھی کہ حکومتِ اسلامیہ کو بحری حملہ آوروں سے بچایا جا سکے۔ یہ شعبہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کی تحریک و انتظام سے وجود میں آیا تھا۔ اپنے دورِ خلافت میں آپ نے اسے بہت ترقی دی۔ جزیرہ رہوڈس وغیرہ آپ ہی کے زمانے میں فتح ہوئے۔

آپ کے عہد کا سب سے بڑا فوجی کارنامہ قسطنطنیہ پر حملہ تھا۔ اس کے لیے بری اور بحری فوجیں حرکت میں آئی تھیں۔ جزیرۂ قبرص کے جہاد کی طرح اس غزوے کا منظر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھا دیا گیا تھا۔ یہ دونوں منظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی رؤیا میں دیکھے تھے اور دونوں پر فخر کا اظہار کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی تھی کہ ان دونوں غزوات میں جو لوگ شریک ہوں گے وہ سب کے سب جنتی ہیں اور ان کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیے جائیں گے۔

اس بشارتِ نبویہ کا مورد ہونے کے لیے اجلّہ صحابہ نے غزوۂ روم میں شرکت کی تھی، مثلاً: ابو ایوب انصاری، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہم۔ بعض صحیح روایات کے مطابق سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی اس غزوے میں شریک تھے۔ فوج کی کمان امیر المومنین کے فرزند امیر یزید رحمہ اللہ کے ہاتھ میں تھی۔

امیر یزید رحمہ اللہ کے ہاتھ میں اس فوج کی کمان ہونا ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا اور غزوۂ قسطنطنیہ کے شرکا کا جنتی ہونا بھی ایسا ہی یقینی ہے کہ اس کی تکذیب کی

گنجایش نہیں، لیکن جس طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتبِ وحی ہونے کے بارے میں یہ شیطانی باریکی نکالی گئی ہے کہ قرآن کے علاوہ باقی چیزوں کی کتابت آپ کے سپرد تھی، اسی طرح امیر یزید رحمہ اللہ کا اس غزوے میں شریک ہونا اور عساکرِ اسلامیہ کی کمان ان کے ہاتھ میں ہونا بھی معرضِ بحث بنا دیا گیا ہے۔ لیکن جو حقیقت ہو اس کا انکار کیونکر چل سکتا ہے اور قسطنطنیہ کی فصیل سے سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار شریف کس طرح ہٹایا جا سکتا ہے۔

متفق علیہ ہے کہ اپنے دفن کے متعلق سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اپنی وصیت امیر یزید رحمہ اللہ کو کی تھی کہ آپ کا جنازہ جتنی دور دشمن کی زمین میں لے جا سکتے ہوں، لے جا کر دفن کریں۔ یہ واقعہ اس درجہ قطعی ہے کہ ناسخ التواریخ کا غالی مورخ بھی اسے کسی طرح نہ چھپا سکا۔ کہتا ہے:

''چوں ابو ایوب درگذشت او سوار شد و نعش او را مشایعت نمودند''

''جب ابو ایوب کا انتقال ہو گیا تو یزید سوار ہوئے اور ان کا لشکر بھی سوار ہوا اور ان کی نعش کو لے کر چلے۔''

پھر کہتا ہے کہ جب رومیوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تو امیر یزید رحمہ اللہ نے جواب دیا:

''يا أهل قسطنطنية! هذا رجل من أكابر أصحاب محمد نبينا وقد دفن حيث ترون والله لئن تعرضتم له، لاهدمنّ كل كنيسة في أرض الإسلام ولا يضرب ناقوس بأرض العرب أبدا''[1]

''اے اہلِ قسطنطنیہ! یہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر اصحاب میں سے ایک بزرگ ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم نے انھیں کہاں دفن کیا ہے۔ بخدا! اگر تم نے ان کی بے حرمتی کی تو میں عالمِ اسلام کا ایک ایک گرجا منہدم کر دوں گا اور

[1] ناسخ التواریخ: کتاب دوم (ص: ٤٤)

پھر سرزمینِ عرب پر کہیں ناقوس نہیں بجایا جائے گا۔‘‘

اب یہ معمولی عقل کی بات ہے کہ اگر عساکرِ اسلامیہ کی کمان امیر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ اس وصیت کے لیے انھیں خاص کیوں کرتے؟ فوجی پیش قدمی کی وصیت تو اسی کو کی جا سکتی ہے جس کے حکم سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔ امیر یزید رحمہ اللہ ہی نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی جس میں سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام مجاہدین شریک تھے اور فوجی اہتمام کے ساتھ جنازہ اٹھایا گیا۔ اگر فوجوں کی کمان امیر یزید کے ہاتھوں میں نہ ہوتی تو اس جماعت کی امامت وہ کیسے کرتے۔ قلعہ کی فصیل کے عین نیچے قبر کھودی گئی اور یوں سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا مزار شریف تک زبانِ حال سے امیر یزید رحمہ اللہ کے اس کارنامے کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ان کے اور فضائل تو مٹانے کی سعیِ بلیغ ہوتی رہی، مگر اس فضیلت کو کوئی نہ مٹا سکا اور نہ مٹا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا جوش اور جذبہ اس وقت انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ امیر یزید رحمہ اللہ کی کیفیت یہ تھی کہ بار بار قلعہ کے دروازے پر گرز مارتے تھے۔

اگرچہ شہر فتح نہ ہو سکا اور صدیوں تک مسلمانوں کی کوششیں ناکام رہیں، لیکن کام کی ابتدا ہو گئی اور اس کا سہرا امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند یزید رحمہ اللہ کے سر ہے، جن کی معیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے بہترین حضرات اس میں شریک ہوئے، تا آنکہ جس کی قسمت میں تھا اس نے یہ مہم سر کر لی، یعنی شیر بیشۂ جلالت، سلطان محمد الفاتح جنھیں لسانِ نبوت نے بہترین فوج کا بہترین امیر قرار دیا ہے۔

بہرحال ان دونوں بحری غزوات میں اولیت کا شرف امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے اور آپ ہی کے زیرِ اہتمام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت پوری ہوئی۔ ملاحظہ ہو:

’’حَدَّثَتْنَا أُمُّ حَرَامٍ، أَنَّهَا سَمِعَتِ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ: أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ الْبَحْرَ قَدْ أَوْجَبُوا، قَالَتْ أُمُّ حَرَامٍ: قُلْتُ يَا رَسُول

اللّٰهِ! أَنَا فِيهِمْ؟ قَالَ: أَنْتِ فِيهِمْ، ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ، فَقُلْتُ: أَنَا فِيهِمْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: لَا“[1]

”ہم سے سیدہ امِ حرام رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے: میری امت کی پہلی فوج جو بحری جہاد شروع کرے گی ان پر جنت واجب ہوگئی۔ امِ حرام رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں ان میں ہوں؟ فرمایا: تم ان میں ہو۔ پھر فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے دار الحکومت پر حملہ کرے وہ سب کے سب بخش دیے گئے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں ان میں ہوں؟ فرمایا: نہیں۔“

امِ حرام رضی اللہ عنہا نے غزوۂ قبرص میں شرکت کی۔ آپ کے شوہر سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی اس لشکر میں تھے۔ جب جہاز سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہونے لگیں تو گر گئیں اور شہادت پائی، آپ کا مدفن قبرص میں ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ غزوۂ قسطنطنیہ میں بھی شریک ہوں، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ اس میں شریک نہ ہوسکیں گی۔

لوگ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ اور امیر یزید رحمہ اللہ کے فضائل کم کر کے دکھانے کی کتنی ہی کوشش کرلیں اور جتنی برائیاں اپنی طرف سے وضع کر کے ان میں ثابت کرنے پر دلیر ہوں، وہ اس حقیقت کو نہیں مٹا سکتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمۂ اسلام نے ان دونوں غزوات کی بشارت کا مورد ان دونوں باپ بیٹے ہی کو سمجھا اور اس بشارت کو ”دلائل النبوۃ“ میں جانا۔

یہ باب جس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ خلفائے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا کیسا بلند مقام ہے اور آپ کی شخصی اور ملی عظمت کس درجے کی ہے، اسے ختم کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ خود آپ کا ایک ارشاد نقل کر دیا جائے۔ اسی کو آپ کے

[1] صحيح البخاري (٤٠٩/١، ٤١٠) باب قتال الروم، طبع أصح المطابع.

مقاصد، آپ کی حکمتِ عملی اور آپ کی سیرت کا مختصر لیکن جامع لبِ لباب سمجھا جائے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البداية والنهاية" (۸/ ۱۳٤) میں اسے ایک قوی سند سے بیان کیا ہے، نیز ابن سعد نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے مولیٰ ثابت کے حوالے سے نقل کیا ہے:

"عن العتبي أن معاوية خطب فقال: يا أيها الناس ما أنا بخيركم وإن منكم لمن هو خير مني عبد الله بن عمر و عبد الله بن عمرو وغيرهما من الأفاضل، ولكن عسىٰ أن أكون أنفعكم ولاية، وأنكاكم في عدوكم، وأدركم حلباً"

"عتبی سے مروی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ میں فرمایا: حضرات! میں آپ میں سب سے بہتر نہیں ہوں، آپ کے درمیان مجھ سے بہتر لوگ موجود ہیں، جیسے: عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور ان جیسے دوسرے بزرگ، لیکن امید ہے کہ میں حکومت کے اعتبار سے آپ کے لیے زیادہ سود مند رہوں گا، آپ کے دشمنوں کے لیے زیادہ تکلیف دہ اور مالی اعتبار سے آپ کے لیے زیادہ منفعت بخش ثابت ہوں گا۔"

اور الحق کہ آپ نے امت سے جو وعدہ کیا تھا اُسے حرف بحرف پورا کر دکھایا۔ انہی صفات کی بنا پر اکابر صحابہ نے آپ کی بیعت پر اجماع کیا تھا۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ جن کی خلافت کا اعلان ہو چکا تھا اور باقی حضرات جنھیں منتخب کیا جا سکتا تھا وہ سب آپ کی طرف جھک گئے۔ صلوات الله وسلامه عليه وعليهم أجمعين.



خلافتِ نبوت

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ خلافتِ نبوت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ پر ختم ہوگئی اور اس کے بعد سے ملوکیت کا دور رہا۔ اس تصور کو آلِ بَو یہ کے وقت سے اتنا اچھالا گیا ہے کہ جیسے یہ بھی شریعتِ اسلامیہ کا کوئی مسئلہ اور عقائد کا کوئی جزئیہ ہو۔ بے شک امت میں یہ تصور پہلے سے موجود تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک عرصے تک خلافتِ نبوت کا دور رہے گا، پھر ملوکیت آجائے گی اور اس کے بعد پھر آخر میں خلافتِ نبوت کا قیام عمل میں آئے گا۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کو لوگوں نے اپنے اپنے وقت پر منطبق کرنے کی کوششیں کیں اور چونکہ بات بے جوڑ تھی، نصوصِ صریحہ کے خلاف تھی، اس لیے محض بعض شخصیتوں سے مرعوب ہو کر امت بلاوجہ الجھنوں میں گرفتار ہوگئی۔ کاش اسے شریعت کا مسئلہ بناتے وقت ان بزرگواروں سے پوچھ لیا گیا ہوتا جنھوں نے شریعت قائم کی، جان و مال قربان کر کے دین برپا کیا اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا اہلِ عالم کو سمجھایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی راہ سے ہٹ کر جو بات پیدا کی جائے گی اور جو نظریہ بنایا جائے گا وہ کبھی موجبِ طمانیت نہ ہوگا اور ہرگز تعمیری نہ بن سکے گا۔

اہلِ تشیّع کا خیال، بلکہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بھی بنیادی کہ خلافتِ نبوت سرے سے قائم ہی نہیں ہوئی اور اگر ہوئی تو اسی وقت جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے اور نظمِ امت درہم برہم ہوگیا، یعنی ان کے نزدیک امت کے افتراق و انتشار اور اختلال کا جو زمانہ ہے وہ تو صحیح معنی میں خلافتِ نبوت کا دور ہے، لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد کا

زمانہ غاصبوں اور ظالموں کی مستبدانہ حکومتوں کا دور رہا جس میں دین غارت ہوا، کتاب ضائع کر دی گئی اور مقصدِ نبوت فنا ہو گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد خلافتِ نبوت پھر زاویۂ خمول میں چلی گئی اور اس کا ظہور ان کے اس امام غائب کے زمانے میں ہو گا جس کا یہ لوگ انتظار اسی طرح کر رہے ہیں جس طرح قرونِ ماضیہ میں اقوامِ عالم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا انتظار تھا۔ اسی لیے ایک ہزار برس کی اس مدت میں انھیں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوا اور ان کی زندگی کا مقصد یہ رہا کہ صحابہ اور خلفائے اسلام پر لعنت کریں اور مسلم حکومتوں کو زیر و زبر کرنے کی کوششوں میں مشغول رہیں۔

خوارج کا خیال ہے کہ خلافتِ نبوت کا دور امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے یہ امت گمراہی اور باطل پرستی میں مبتلا ہے۔ انھوں نے بطور خود اپنے چند آدمیوں کو ''امیر المومنین'' کہا، جو سب کے سب مارے گئے۔ اس طرح دعوتِ محمدیہ کا کوئی نظام دنیا میں رہا ہی نہیں اور اسی لیے ان کا مقصدِ حیات بھی یہی رہا کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد جتنے صحابہ زندہ رہے اور اسلام میں جتنے خلفا ہوئے ان پر لعنت کریں اور ہر مسلم کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے رہیں۔

پھر کچھ لوگ جو کہتے چلے آرہے ہیں، اپنے آپ کو سنت کا پابند اور جماعت سے وابستہ، لیکن ان کا خیال ہے کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ''اس امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی'' یعنی دورِ ملوکیت شروع ہو گیا۔ ان لوگوں کی حیثیت رہی ہے تو ہر زمانے میں انفرادی، لیکن چونکہ یہ اصحابِ تصنیف ہیں، اس لیے ان کی تحریروں کا زہر امتِ مسلمہ میں پھیلتا چلا گیا اور اب اکثر ناواقف مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ خلافتِ نبوت کا دور صرف تیس برس رہا جس کے پورے پانچ برس اختلال کی نذر ہو گئے اور جس میں تین خلفا کے گلوں میں چھری پھیر دی گئی۔ ان لوگوں کا ایک طرف تو دعویٰ ہے کہ جس نبی کے یہ نام لیوا ہیں وہ آخری نبی ہے اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اس کی لائی ہوئی

کتاب آخری کتاب ہے کہ اب کوئی کتاب نہیں آئے گی اور اس کی برپا کی ہوئی امت آخری امت ہے، اب کوئی امت ایسی پیدا نہیں ہوگی جس کا تعلق سلسلۂ نبوت سے ہو اور اس کا لایا ہوا نظامِ حیات آخری نظام ہو۔ اب اس نظام کی علمبردار کوئی قوم نہیں ہوگی، لیکن پھر ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جس امت کو اللہ تعالیٰ نے خیرِ امت کہا ہے اور جس گروہ کو اس نے زمین پر اپنا گواہ بنایا ہے، اس بہترین امت اور اس گروہ باصفا نے اپنے آخری نبی کا لایا ہوا نظام تیس برس بھی قائم نہ رکھا اور اپنے ہی ہاتھوں اپنا نظام تباہ و برباد کر ڈالا، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس دین کو غالب کرنے کا دعویٰ کیا تھا وہ غلط نکلا اور اپنے جن بندوں کو اس نے کہا تھا:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الأنفال: ٤] ''یہی لوگ سچے مومن ہیں۔''

وہ سب اپنا دین کھو بیٹھے اور ایک ایسے نظامِ حیات پر راضی ہو گئے جو ان کے نزدیک اللہ و رسول کے منشا کے خلاف تھا اور مقاصدِ نبوت کے منافی۔ نعوذ باللّٰہ من شرور الناس.

معلوم نہیں اس ناپاک تصور کی بنیاد دین کے کس اصول پر ہے۔ باقی معاملات میں تو یہ لوگ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماعِ صحابہ اور قیاس ہی پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے ہیں، لیکن خاص اس اہم ترین مسئلے میں انھوں نے سب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ایک خود ساختہ تصور کو پے در پے بیان کر کے اس بدعت و ضلالت کو اتنا رواج دیا کہ اب یہ مسلمات میں سے ہے، بلکہ اس سے اختلاف کرنے والا شاید مبتدع کہلائے، حالانکہ ان کا وضع کردہ یہ تصور قطعاً بے بنیاد ہے، بلکہ عیاناً کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ، اجماعِ صحابہ اور قیاس کے خلاف ہے۔ اور اسی لیے اس کا مآل بھی ایک درجہ میں وہی نکلا جو روافض اور خوارج کے تصورات کا ہے کہ امت آج اپنے اسلاف کرام سے سوئے ظن میں مبتلا ہے اور اپنی تاریخ پر فخر کرنے کے بجائے مایوسیوں کا شکار ہے اور دل کی گہرائی سے یہ سمجھتی ہے کہ دین فرسودہ ہو گیا، امت کا دور ختم ہو گیا اور اس کی نشاۃِ ثانیہ کے اب امکانات نہیں۔

بات یہ ہوئی کہ جب آلِ بُویہ نے عروج پکڑا اور نظامِ خلافت پر اتنے حاوی ہو گئے کہ جیسے انھی کے ہاتھ میں امتِ محمدیہ کے امور کا انصرام آ گیا ہو تو جہاں اور قسم قسم کی بدعات انھوں نے پھیلائیں اور اسلامی معاشرے میں زندقہ و الحاد کو فروغ دینا چاہا، اس کے لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ اس یاس انگیز تصور کو امت کے دلوں میں القا کریں، تاکہ تاریخِ اسلام مسخ ہو اور ائمۂ اسلام کے اجتہاد کی حجیت ختم ہو جائے۔

چونکہ عباسیوں کی خلافت تھی اور آلِ بویہ اپنے آپ کو ان کی بیعت میں اسی طرح کہتے تھے جیسے ان کے متقدمین نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دامن پکڑ رکھا تھا، اس لیے انھیں علانیہ ملوک کہنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ادھر جمہور اہلِ اسلام کو خلفائے ثلاثہ سے عقیدت تھی، اس لیے ان لوگوں کو اپنا نظریہ کھل کر سرکاری بنانے کی ہمت نہ ہوئی۔ انھوں نے جب لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ شروع کرنا چاہا اور اس سے مسلمان برافروختہ ہوئے تو اس سے بھی یہ لوگ ایک درجہ میں باز آ گئے، لیکن مسئلہ بہرحال اٹھا دیا کہ خلافتِ نبوت کو چاروں اصحاب پر ختم سمجھ لیا جائے۔

امویوں کی خلافت جاتی رہی، لہٰذا انھیں جباروں میں شامل کرنا چنداں دشوار نہ تھا اور نہ ان کی خلافت کے مبارک دور کو جاہلیت کا تسلط بتا دینا مشکل تھا۔ روایتوں کی ٹکسال ان کے ہاتھ میں تھی اور جس قسم کی جو بات رائج کرنا چاہتے تھے، اس کی حمایت میں جیسی نص کی ضرورت ہوتی وہ تیار کر لی جاتی تھی۔ اپنے انھی مقاصد کے تحت انھوں نے یہ بات طے کر دی کہ خطبوں میں صرف چار خلفا کا نام لیا جائے اور باقی عشرہ مبشرہ کا ذکر اجمالاً ہو۔ ناموں کی تصریح نہ کی جائے۔ خلیفۂ عصر کے لیے البتہ دعا کی اجازت تھی مگر اس طرح کہ ساتھ ساتھ خود ان کا مردود نام بھی لیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بناتِ طاہرات میں سے صرف سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ ہو اور آپ کی اولاد کی اولاد میں سے صرف سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا ذکر خلفائے عباسیہ کے مورث ہونے کی بنا پر روکا

نہیں جا سکتا تھا۔ اسی لیے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا نام بھی شامل کر دیا۔ اگرچہ ان کے خطابات ''اسد اللہ'' اور ''سید الشہداء'' ان سے چھین لیے گئے۔ سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ میں چونکہ ان لوگوں کے نزدیک جاہلیت کی رگ تھی اور وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے تھے، اس لیے ان کا نام لینا ممنوع ٹھہرا اور اس کی پاداش میں سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا مبارک نام بھی ساقط کر دیا گیا۔

غرض یہ ہے کہ آلِ بُویہ اور مسلمانوں کے درمیان یہ ایک قسم کا غیر مکتوب سمجھوتہ تھا جس پر عمل شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے بھی بزرگانِ پیشین کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے اس بدعت کو برداشت کر لیا کہ بہرحال خلفائے اربعہ کا نام لینے کی سبیل تو نکلی۔ ورنہ بغداد کا حال تو یہ تھا کہ علانیہ مساجد کے دروازوں پر خلفائے اسلام کے نام لے لے کر لعنت لکھی جاتی تھی، جسے رات کو مسلمان مٹا دیا کرتے تھے۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، الدولۃ العباسیہ (ص:۳۸۲)
آلِ بُویہ کے تسلط سے پہلے عباسی امامت میں سنت کا اتباع کیا جاتا تھا اور جماعت کی حرمت برقرار تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ یکساں عقیدت ومحبت کا عالم تھا۔ پھر احوال بدل گئے۔ محاضرات کے حوالے سے جو کچھ یہاں بیان کیا جا رہا ہے وہ اس عہد کی معتبر تاریخ میں ہر جگہ بیان کیا گیا ہے:

"فقد كان أهل بغداد الدولة البويهة على مذهب أهل السنة والجماعة ويفضلون الشيخين أبا بكر و عمر على سائرهم ولا يقدحون في معاوية ولا غير من سلف المسلمين. فلما جاء ت هذه الدولة وهى متشيعة غالية نما مذهب الشيعة ببغداد و وجد له من قوة الحكومة أنصارا فقد كتب على مساجد بغداد ۳۵۱ھ ما صورته:

"لعن الله معاوية بن أبي سفيان، ولعن من غصب فاطمة رضي الله عنها فدكاً ومن منع أن يدفن الحسن عند قبر جده عليه السلام ومن نفى أبا ذر الغفاري ومن أخرج العباس من الشورىٰ"

والخليفة كان محكوماً عليه لا يقدر على المنع، وأما معز الدولة فبأمره كان ذلك.

فلما كان الليل حكه بعض الناس. فأراد معز الدولة إعادته فأشار عليه وزيره أبو محمد المهلّبي بأن يكتب مكان ما محي: لعن الله الظالمين لآل رسول الله ﷺ ولا يذكر أحداً في اللعن إلا معاوية. فعل ذلك" ←

لوگوں کی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آتی کہ کسی کا خلیفہ ہونا یا نہ ہونا اعتقادی مسئلہ نہیں ہے کہ لوگ جب چاہیں اور جس قسم کا نظریہ چاہیں بنا لیں۔ ایسے امور کا فیصلہ ہم عصر

➔ ''بو یہی حکومت سے پہلے اہلِ بغداد سب مذہب اہل السنۃ والجماعت کے پیرو تھے۔ تمام صحابہ کی عزت کرتے تھے اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں بزرگواروں کو سب سے افضل جانتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جناب میں سوئے ادب سے احتراز تھا اور نہ کسی دوسرے گزرے ہوئے مسلمان پر طعن کرتے تھے۔ لیکن جب یہ فرقہ پرست غالی حکومت آئی تو بغداد میں شیعہ مذہب پروان چڑھا اور حاکمانہ اقتدار کے بل پر اس کے مددگار پیدا کیے گئے۔ ۳۵۱ھ میں بغداد کی مسجدوں پر یہ عبارت لکھوائی گئی:

''خدا معاویہ بن ابی سفیان پر لعنت کرے اور اس شخص پر لعنت کرے جس نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کا فدک کا حصہ غصب کیا اور جس نے حسن کو ان کے نانا علیہ السلام کے پاس دفن نہیں ہونے دیا، نیز اس پر جس نے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو شہر بدر کیا اور اس پر جس نے عباس رضی اللہ عنہ کو شوریٰ سے خارج کر دیا۔''

خلیفہ وقت بے دست و پا تھے اور اسے روکنے کی ان میں قدرت نہ تھی۔ یہ صرف معزالدولہ تھا جس کے حکم سے یہ حرکت کی گئی۔ جب رات ہوئی تو بعض لوگوں نے اسے مٹا دیا۔ معزالدولہ نے چاہا کہ اس کا اعادہ کرے، لیکن اس کے وزیر ابومحمد مہلبی نے مشورہ دیا کہ جو عبارت مٹا دی گئی ہے اس کے بجائے صرف حسبِ ذیل عبارت لکھ دی جائے:

''خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جنھوں نے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کیا۔ نام لے کر کسی پر لعنت نہ کی جائے، سوائے معاویہ کے۔'' چنانچہ اس نے اس پر عمل کیا۔

یہ جن حضرات پر لعنت کی گئی ان میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ فدک کے غاصب سے مراد حضرت صدیق اکبر ہیں، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو روضہ شریف میں دفن نہ ہونے دینے والے سیدنا مروان بن الحکم ہیں، سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کو شہر بدر کرنے والے سے مراد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ہیں اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو شوریٰ میں شامل نہ کرنے والے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا نام محض خلیفۂ وقت کا غصہ دھیما کرنے کے لیے ٹانک دیا گیا ہے، ورنہ سب جانتے ہیں کہ ان کے ہاں کتنی عزت ہے۔ (ملاحظہ ہو: نواب محسن الملک کی آیاتِ بینات، ص: ۱۸۰، طبع دارالاشاعت، کراچی) ہم یہ عبارت نقل کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتے، البتہ اہلِ ایمان کو بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے اپنے بعد جن چھ حضرات کو نامزد کیا تھا، ان میں سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو تعظیماً شامل نہیں کیا۔ سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں عباس رضی اللہ عنہ کی ➔

لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، بعد کے لوگوں کی رائے کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر کسی شخص کے خلیفہ اور امام ہونے پر ہم عصر امت نے اجماع کر لیا تو وہ خلیفہ اور امام ہے، ورنہ نہیں۔ یہ

← اتنی عظمت و عقیدت تھی کہ جب قحط پڑتا تو انہی کے وسیلے سے دعا مانگا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرتا تھا۔ ملاحظہ ہو: صحیح البخاری (۲/۳۰۱) طبع مصر:

"عن أنس رضي الله عنه أن عمر بن الخطاب كان إذا قحط استسقىٰ بعباس بن عبد المطلب فقال: اللهم إنا كنا نتوسل إليك بنبينا صلى الله عليه وسلم فتسقينا وإنا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا. قال: فيسقون"

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب قحط پڑتا تو سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بارش کی دعا کرتے تھے اور عرض کرتے: خدایا ہم پہلے تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دعا کیا کرتے تھے، اب اپنے نبی کے چچا کے ساتھ دعا کرتے ہیں: ''سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بارش ہو جاتی تھی۔''

اسی طرح جب وظائف کا دیوان مرتب ہوا ہے اور صحابہ نے چاہا کہ اول امیر المومنین سے ابتدا کریں تو آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے ابتدا کرو اور عمر کو وہیں رکھو جہاں اس کا مقام ہے۔'' چنانچہ سب سے پہلے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی لکھا گیا، پھر بقیہ بنو ہاشم کا۔ بہرحال ہمیں اور امت کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ خلفائے عباسیہ کی موجودگی میں اور ان کا مذہب جانتے ہوئے معز الدولہ یا اس کے کسی پیروکار کو اس سے کیا مطلب تھا کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو شوریٰ میں شامل کیا یا نہیں؟!

رہا فدک کا مسئلہ تو ہم بحث میں پڑنے کے بجائے اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ اگر فدک پر اہلِ بیت کا مالکانہ کوئی حق تھا تو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں اس پر ذاتی قبضہ کر سکتے تھے، لیکن آپ نے نہیں کیا تو اس کے بعد پھر کسی کو بولنے کا یارا ہی کیسے ہو سکتا ہے؟!

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی تدفین کے بارے میں انہی صفحات میں روشنی ڈال دی گئی ہے اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کو شہر بدر کرنے کا جو افسانہ تراشا گیا ہے اس کی بھی قلعی کھول دی گئی ہے۔

آلِ بویہ کی اسی ناپاک حرکت کا ردِ عمل تھا جو امام ابوبکر ابن العربی نے بیان فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام کو آلِ بویہ کے تسلط سے نجات دی تو مسلمانوں نے بغداد کی مسجدوں کے دروازوں پر یہ عبارت لکھ دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین ہستی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تھی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اور پھر اہلِ ایمان کے ماموں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی۔ ورنہ مسجدوں پر یہ کلمات لکھنے کی کیا ضرورت ہوئی؟! ←

کوئی خیالی اور نظری بات نہیں ہوئی، واقعی حسی ہوئی ہے۔عقل اگر خبط ہو جائے اور واقعات کی دنیا سے نکل کر آدمی خیالی فضاؤں میں پرواز شروع کر دے تب البتہ یہ کر سکتا ہے جو

➔ یہ معز الدولہ ہی ہے جس نے عشرۂ محرم کو ماتم کرنے کا حکم دیا اور پھر جشنِ غدیر منانے کا۔ یہی خاندان ہے جس نے اپنے خوشامدیوں سے ایسی کتابیں لکھوائیں جو سلف صالحین پر طعن سے مملو ہیں۔مسعودی اسی دربار کا وظیفہ خوار تھا۔

محمد خضری کی بیان کردہ اس تفصیل میں ایک بات البتہ تعجب انگیز ہے کہ انھوں نے آلِ بویہ کو زیدی مذہب کا متبع بتایا ہے اور کہتے ہیں:

”وكان يخطر ببال معز الدولة أن يزيل اسم الخلافة أيضاً عن بني العباس ويوليها علوياً لأن القوم كانوا شيعة زيدية لأن التعاليم الإسلامية وصلت إليهم على يد الحسن بن زيد ثم على يد الحسن الأطروش وكلاً منهما زيدي“

’’معز الدولہ کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ بنوعباس کے نام سے خلافت کا نام مٹا دے اور کسی علوی کو قائم کرے، کیوں کہ یہ لوگ زیدی شیعہ تھے اور اسلامی تعلیمات ان تک حسن بن زید کے ذریعے پہنچی تھیں اور پھر حسن الاطروش کے ذریعے اور یہ دونوں زیدی تھے۔‘‘

ان دونوں ہاشمیوں کا زیدی ہونا مسلم ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ انھی کے ذریعے آلِ بویہ تک اسلام پہنچا۔لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ مذہباً آلِ بویہ زیدی شیعہ تھے۔ اقتدار جب ان کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے زیدی مذہب کو خیر باد کہا، بلکہ اس صحیح النسب فاطمی خاندان سے اپنا ظاہری تعلق بھی توڑ دیا۔ ۳۵۵ھ تک آلِ اطروش کا وجود جبالِ دیلم میں موجود تھا اور یہ زمانہ آلِ بویہ کے انتہائی عروج کا ہے۔ ایک طرف ان لوگوں کی اتنی طاقت تھی کہ اگر چاہتے تو خلیفہ عباسی کی امامت ہی ختم کر دیتے۔ چنانچہ پہلا کام معز الدولہ نے یہ کیا کہ اپنے برسرِ اقتدار آنے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر امیر المومنین کو پابہ جولاں معز الدولہ کے گھر تک لایا گیا اور ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انھوں نے ان بدباطنوں کا غلبہ برداشت نہیں کیا۔

اگر ان لوگوں کے دل میں اپنے ان ائمہ کی کوئی قدر ہوتی جنھوں نے انھیں کلمہ شریف پڑھایا تھا تو ان کی سسکتی ہوئی حکومت کو بحال کرتے اور نہیں کیا تھا تو کم از کم ان کے عقائد ہی کی پیروی کرتے۔ زیدی مذہب میں خلفائے ثلاثہ پر طعن حرام ہے۔ ان کی خلافت کو وہ درست سمجھتے ہیں اور جمہور صحابہ کی تعظیم ان کا شعار ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور اموی سادات کے ساتھ جو ان میں سے بعض کی بے ادبی کا ثبوت ملتا ہے تو یہ بعد کی باتیں ہیں۔ خود خضری نے امام زید کے خروج کے ➔

ایک صاحبِ تصنیف صوفی صاحب نے کیا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ شہید مظلوم کے اسمِ گرامی کے ساتھ موٹے موٹے حروف میں ''امیر المومنین'' لکھ دیا۔

➔ کوائف بیان کرتے وقت یہ متفق علیہ بات بیان کی ہے کہ جب امام زید نے خروج کی تیاری مکمل کر لی تو آپ کے ہاتھ پر جان دینے کی بیعت کرنے والوں نے آپ سے دریافت کیا تھا: ''ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بابت آپ کی رائے کیا ہے؟'' آپ نے جواب دیا تھا:

"رحمهما الله وغفرلهما ما سمعت أحدا من أهل بيتي يقول فيهما إلا خيرا وإن أشد ما أقول فيما ذكرتم إنا كنا أحق بسلطان من رسول الله ﷺ من الناس أجمعين فدفعونا عنه فلم يبلغ ذلك عندنا بهم كفراً وقد ولّوا فعدلوا في الناس وعملوا بالكتاب والسنة" (محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية: ٢/١٩٥)

''اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ان کی خطائیں بخشے، میں نے اپنے گھر والوں میں کسی کو ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی دوسری طرح کرتے نہیں سنا۔ تم نے جو کچھ کہا اس پر میں جو سخت سے سخت بات کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ سب لوگوں کے مقابلے میں رسول ﷺ کی خلافت کے حق دار ہم تھے، لیکن انھوں نے ہمیں اس سے دور رکھا۔ یہ بات ہمارے نزدیک کچھ کفر کی نہیں، کیوں کہ یہ لوگ جب حاکم ہوئے تو انھوں نے لوگوں کے ساتھ عدل کیا اور کتاب وسنت پر عمل رکھا۔''

جو لوگ زید کے مذہب پر ہیں ان کی زبان وقلم سے یہ کلمات ہرگز نہیں نکل سکتے جو معز الدولہ نے مسجدوں کے دروازوں پر لکھوائے۔ چنانچہ یہاں ہم زیدی مذہب کے ایک بڑے عالمِ دین محمد بن الحسن دیلمی یمانی کی کتاب ''قواعد عقائدِ آلِ محمد'' کے وہ ابتدائی کلمات نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ کے مذہب کے بطلان پر لکھی ہے۔ یہ کتاب مرحوم یحییٰ حمید الدین کے کتب خانہ میں محفوظ تھی اور ۱۹۵۰ء میں ''مطبعۃ السعادۃ مصر'' سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ابتدا ان کلمات سے ہوتی ہے:

"بسم الله الرحمن الرحيم. قبل الاشتغال ببيان مذهب الباطنية نذكر طرفاً من مذهب الغلاة والمفوضة لأنهم منهم أيضا. وذلك لأن أصول مذهب الغلاة والمفوضة والباطنية من الإسماعيلية والإمامية الإثني عشرية مختلط بعضها ببعض في كثير من المسائل ولذلك قيل الإمامية دهليز الباطنية لأن الكل دخلوا في الشيعة من جهتهم وكلهم يدعون التشيع ويغلون في الدين ويخرجون من طريق المسلمين"



امیر المومنین ایک شرعی اور سیاسی اصطلاح ہے، اور سوائے اس شخص کے جو امتِ مسلمہ کا حاکمِ اعلیٰ ہو، کسی دوسرے کے لیے مستعمل نہیں ہوسکتی۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ

← ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ باطنیوں کا مذہب بیان کرنے سے پہلے ہم غالیوں اور مفوضوں کی بعض باتیں کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ وہ لوگ بھی انہی میں سے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غالی ہوں یا مفوّضی، اسماعیلی باطنی ہوں یا اثنا عشری امامی، ان سب کے مذہبی اصول بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ امامیہ کا مذہب باطنی مذہب کی دہلیز ہے۔ انہی کے ذریعے لوگ شیعیت میں داخل ہوتے ہیں اور سب کے سب تشیع کے مدعی ہوکر دین میں غلو کرتے ہیں اور مسلمانوں کے طریق سے نکل جاتے ہیں۔

مفوضہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے کاروبارِ عالم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اور ان کی اولاد کے سپرد کر رکھا ہے:

"إن اللّٰه تعالىٰ فوض أمر العالم إلى الأئمة إلى علي والحسن والحسين عليهم السلام وباقي الأئمة من بعدهم وهم يخلقون ويرزقون ويميتون ويحيون ويبعثون ويعاقبون ويثيبون" (ص: ۱)

''اللہ تعالیٰ نے کارِ جہاں ائمہ کے سپرد کر رکھا ہے، یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اور اسی طرح ان کے بعد آنے والے باقی اماموں کے، یہی لوگ پیدا کرتے ہیں، رزق دیتے ہیں، مارتے ہیں، زندہ کرتے ہیں، قیامت کے دن اٹھائیں گے اور پھر سزا و جزا دیں گے۔''

پھر آگے چل کر (ص: ۱۰۵) باطنیوں کے کفر کی دسویں وجہ بتاتے ہیں:

"منها أنهم يكفرون الأمة المسلمة بأجمعها ويسمونهم الأمة المنكوسة أي عن رشدها ويسمون الأئمة والعلماء والفضلاء من لدن النبي ﷺ إلى يومنا الطواغيت والأصنام ..... فأول صنم من أصنام الطاغوتية أبو بكر ثم عمر ثم عثمان ومن كان مثلهم في كل وقت و زمان ..... وهل هذا إلا كفر صراح وشر محض"

''علاوہ ازیں یہ لوگ (باطنیہ) تمام امتِ مسلمہ کی تکفیر کے قائل ہیں اور انھوں نے ان کا نام ''امت سرنگوں'' رکھا ہے، یعنی راہِ ہدایت چھوڑ دینے والی امت۔ پھر یہ لوگ نبی کریم ﷺ کے عہد سے لے کر آج تک کے ائمہ، علما اور فضلا سے امت کو شیاطین اور اصنام کہتے ہیں .....(ان کے نزدیک) شیطانی بتوں میں پہلے بت ابوبکر ہیں، پھر عمر ہیں، پھر عثمان ←

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور امت نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے جب بیعت کی تو انھوں نے یہ بیعت کن الفاظ میں کی اور کس خطاب سے آپ کو مخاطب کیا۔

دورِ خلافت ختم ہو کر دورِ ملوکیت شروع ہونے کے معنی ہیں اسلام کے سیاسی نظام میں ایک بنیادی تبدیلی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی اس بنیادی تبدیلی کا اعلان کیا؟ یا بیعت کے الفاظ میں، یا حاکمِ اعلیٰ کے خطاب میں کوئی ترمیم کی، جس سے معلوم ہو کہ منصب کی نوعیت بدل گئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ''خلیفۃ رسول اللہ'' کہا اور حضرت فاروقِ اعظم کو ''خلیفۃ خلیفۃِ رسول اللہ'' گویا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو کہتے: ''خلیفۃ خلیفۃِ خلیفۃِ رسول اللہ'' اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے لفظ ''امیر المومنین'' تجویز کیا اور یہی لفظ تمام خلفا کے لیے رائج ہو گیا۔ اب صحاح کی کسی ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو

← ہیں اور انھی کی قسم کے دوسرے سب حضرات ہیں جو کبھی اور کسی وقت پیدا ہوئے ہوں ..... یہ خیال صریح کفر اور شرکِ محض ہے۔''

غرض یہ ہے کہ خضری کا یہ بیان کسی درجے میں درست نہیں کہ آلِ بویہ زیدی مذہب پر تھے اور نہ ان لوگوں کا قول درست ہے جو انھیں معتزلی المذہب کہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ سلف صالحین کا منہاج چھوڑ چکے تھے۔ انھیں امام زید، یا ان زیدی ائمہ سے کچھ علاقہ نہ تھا جن کے ہاتھ پر ان کا مسلمان ہونا بتایا جاتا ہے۔ یہ تو سبائیوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔ اگر انھیں ادنیٰ ترین درجہ میں بھی حسن الاطروش سے کچھ عقیدت ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے زیرِ نگیں علاقوں میں ان کا مذہب اور ان کی نسل دونوں کو ختم کر دیں۔ زیدی مذہب کا احیاء تو آلِ بویہ کے ختم ہو چکنے کے بہت بعد کیا گیا۔ اگرچہ بعض زیدی لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مذہب سے دور جا پڑے ہیں، لیکن اصولاً ان کے ہاں جماعت کی حرمت ہے، جمہور صحابہ کی تعظیم کرتے ہیں، کتابِ مبین پر ان کا ایمان ہے اور سنت کے ساتھ تمسک کرتے ہیں۔ مرحوم امام یحییٰ حمید الدین ایسے جامع الکمالات شخص تھے کہ زیدی مذہب کے علاقہ فقہ حنفی و شافعی و مالکی و حنبلی پر انھیں عبور تھا اور چلتے پھرتے بھی وہ ہر مذہب والے کو اس کے مذہب کے مطابق فتویٰ دے دیا کرتے تھے۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زیدی لوگ اپنی اصل میں جماعت سے کس درجہ قریب ہیں۔ آلِ بویہ اور دوسرے سبائیوں کو زیدیوں سے کیا علاقہ؟ (مولف)

''امیر المومنین'' کے علاوہ کسی دوسرے خطاب سے یاد کیا ہو۔ وہ تو آپس میں بھی ان کا ذکر امیر المومنین ہی کہہ کر کیا کرتے تھے:

"قيل لابن عباس: هل لك في أمير المومنين معاوية فإنه ما أوتر إلا بواحدة؟ قال: أصاب، إنه فقيه" [1]

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کی گئی: ذرا دیکھیے تو امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے کیا کیا! انھوں نے وتر کی ایک ہی رکعت پڑھی۔ فرمایا: اچھا کیا۔ انھیں دین کی سمجھ ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب جلوت وخلوت میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ اسی خطاب سے یاد کیا جو حضرت فاروقِ اعظم کا تھا تو کیسے سمجھ لیا جائے کہ ان کی منصبی حیثیت کو وہ کچھ اور سمجھتے تھے۔ پھر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان کے حقوق کی رعایت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا فرق برتا؟ وہ تو ان کے احکام کے ایسے ہی پابند تھے جیسے صدیق اکبر اور فارق اعظم رضی اللہ عنہما کے احکام کی پابندی کیا کرتے تھے۔ ان کے اجتہاد پر ایسے ہی عمل ہوتا تھا جیسے خلفائے پیشین کے اجتہاد پر۔ ان کے جھنڈے کے نیچے جہاد کو اسی طرح افضل العبادات سمجھا جاتا تھا، ان کا حاصل کیا ہوا مالِ غنیمت اسی طرح طیب اور نعمتِ الٰہی کہلاتا تھا۔ زکات اور عشر انھیں اسی اولِ دین کے تحت ادا کیا جاتا تھا جس طرح پہلے خلفا کو۔

زندگی کے چھوٹے بڑے مسئلے میں اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فاروقِ اعظم اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت میں کوئی فرق کیا ہوتا تو اس تصور کی گنجایش تھی جو لوگوں نے بے دریغ وضع کر لیا ہے، ورنہ قطعاً نہیں۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر امت کا ایسا ہی اجماع ہوا جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہوا تھا۔ ان کے خلاف کھڑے ہونے والوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طرح باغی اور واجب القتل جانا جس طرح صدیق اکبر کے خلاف کھڑے ہونے

---

[1] صحيح البخاري، كتاب فضائل أصحاب النبي، باب ذكر معاوية بن أبي سفيان، (٣٧٩٤)

والوں کو۔ یہ وہ امور ہیں جن کا انکار آفتابِ نصف النہار کے انکار کے مرادف ہے۔

اب ہم آتے ہیں نصوصِ شرعیہ اور آثارِ صحابہ کی طرف کہ ایک صاحبِ ایمان کے نزدیک صرف وہی حجت ہیں۔

کتاب اللہ:

آیتِ استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو زمین پر خلافت دینے کا جب وعدہ کیا تو اس میں مطلقاً اس کا اشارہ نہیں کہ یہ وعدہ صرف تیس برس کے لیے ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْــــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [النور: ۵۵]

''اللہ نے ان لوگوں میں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور ہی جانشین بنائے گا، جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور ہی اقتدار دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ہر صورت میں انھیں ان کے خوف کے بعد بدل کر امن دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جس نے اس کے بعد کفر کیا تو یہی لوگ نافرمان ہیں۔''

اب یہ کیسا غضب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس عام وعدے کو جو قیامت تک کے لیے پوری امت سے ہے، صرف تیس برس کے لیے سمجھ لیا جائے، جس میں پانچ برس خالص اختلال کی نذر ہو جائیں اور فتنہ پر فتنہ بپا ہو کہ وہ اپنے آخری نبی ﷺ کا لایا ہوا نظام پورے تیس برس بھی نہ چلا سکے اور یہ توفیق نہ ہو کہ اگر گردابِ فتن میں مبتلا ہو جائے تو اس

سے نکل کر وعدۂ الٰہی کا مورد بن سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ہمیشہ ان کا دین برپا رکھے گا اور ہر خوف کے بعد امن سے نوازے گا، لیکن یہ مجدد و مجتہد بننے والے لوگ باور کرانا چاہتے ہیں کہ تیس برس کے بعد سے نہ دین برپا رہا، نہ خوف کے بعد امن نصیب ہوا اور نہ اختلال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کی کوئی سبیل پیدا کی۔ گمراہی کا جو نظام امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد سے قائم ہوا، اسی پر یہ امت چل پڑی۔ اب یا تو انھیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کو غلط یا عارضی قرار دیں (نعوذ باللّٰه من ذلك) یا پھر سمجھیں کہ خود یہ غلطی پر ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کا اتباع کرنے والی جماعت حق پر تھی اور جو منہاج انھوں نے قائم کیا وہ صواب تھا۔

دراصل لوگوں نے خلافتِ نبوت کے متعلق خیالی اور وضعی باتیں پیدا کر لی ہیں اور خلفائے رسول کی زندگی کے منہاج کی حقانیت اپنے خود ساختہ تصورات کے تحت ظاہر کرنے کے لیے ایسی ایسی احمقانہ روایتیں گھڑی ہیں کہ ان کی عقلوں پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی بابت مسعودی کا بیان ہے:

”لم يلبس عليه السلام في أيامه ثوباً جديداً ولا اقتنى ضيعة ولا ربعا، إلا شيئا كان له ينبع مما تصدق به وحبسه“[1]

”سیدنا علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کی پوری مدت میں نیا کپڑا نہیں پہنا اور نہ کوئی گاؤں خریدا اور نہ زمین رکھی، سوائے ینبع کی کچھ جائیداد کے جو آپ نے صدقہ اور وقف کر دی تھی۔“

گویا آپ کے لیے کارگاہ میں پہلے ہی سے پرانا کپڑا بنا جاتا تھا یا دوسروں کی اترن پہنا کرتے تھے۔ یعنی اوروں کے لیے نیا کپڑا پہننا جائز تھا مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے ناجائز۔ یہ فرضی اور خیالی بات جو مدح سے زیادہ ذم ہے، اس شخص کے متعلق کہی گئی ہے

[1] مروج الذهب (٢/ ٤٣١)

جس کے سامنے قرآن مجید کی ایک ایک آیت اتری اور جو تئیس برس تک جلوت وخلوت میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہا۔ جس نے زندگی میں نو نکاح کیے اور ان کے علاوہ کئی اولاد والی لونڈیاں (امہات الاولاد) چھوڑ دیں، جس کے تیس سے زیادہ اولادیں ہوئیں، جس پر ان کا نان ونفقہ فرض تھا، جس کی محض زکات کی رقم ہزاروں دینار ہوتی تھیں ۔صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔ ایسی ہی فضول اور لغو باتیں فاروقِ اعظم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہما، بلکہ خود سرورِ معلمین ﷺ کی بابت وضع کی گئیں جن کا نہ سر ہے نہ پیر۔

پھر ان لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ خلافت یا ملوکیت یا بادشاہت یا ریاست یا مملکت، یا جو بھی اس کا نام رکھا جائے، اس کا انحصار سرِحکومت کی شخصیت یا کارکنوں کی ذاتوں پر نہیں ہوتا، اس سے مراد ہوتا ہے وہ اجتماعی سیاسی نظام جو رائج الوقت ہو، وہ قوانین جن پر حکومت کی بنیاد ہو اور وہ دستور جس کے تحت سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام چلایا جائے۔[1]

[1] دراصل یہ ساری غلط فہمیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب اسلام کے سیاسی نظام کو موجودہ زمانے میں چلتے سیاسی چلن سے زبردستی نتھی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ دین کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ عادات و معاملات و معاشرت میں اصل مباح کی ہے ۔شریعت کو اس سے قطعی بحث نہیں کہ نظامِ سیاسی کی ہیئت ترکیبی کیا ہوگی، سرِحکومت کیسے برسر اقتدار آئے گا اور مختلف النوع معاشروں کو اسلامی برادری کے ایک رشتے میں کیسے منسلک کیا جائے گا۔ اللہ نے مسلمانوں سے جس خلافت کا وعدہ کیا تھا، اس میں یہ نہیں بتایا کہ اس کا دستور اساسی کیا ہوگا، وہاں الفاظ ہیں: ﴿ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ﴾ [النور: ٥٥] ’’جیسے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔‘‘ دنیا میں حکومت کی جتنی اور جیسے بھی صورتیں رائج چلی آرہی ہوں گی، ویسی ہی مسلمانوں کی حکومت بھی ہوگی، فرق صرف اتنا ہوگا کہ اس حکومت کا مقصد دین برپا کرنا ہوگا اور اس کے قوانین ایسے لچک دار ہوں گے کہ دنیا کی ہر قوم ان کے تحت زندگی بسر کر سکے۔ نبی ﷺ کے زمانے میں عرب کی زندگی قبائلی تھی اور ہر قبیلہ اپنے اصول و رواج کے مطابق اپنا سردار مقرر کرتا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ سلسلہ ایسے ہی قائم رہنے دیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے جو والی مقرر کر کے بھیجا ہو یا جو نمایندہ تبلیغ و اشاعت اور اجرا قوانین کی طرف سے گیا ہو، اس نے قبائل کا اندرونی نظام مختل کرنے کی کوشش کی ہو۔ ←

اللہ تعالیٰ نے اسلامی حکومت اور خلافتِ نبوت کے مقاصد بتا دیے ہیں جن کی تاویل و تفصیل کے لیے رازی و زمخشری سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر عربی دان عیاناً جانتا اور سمجھتا ہے۔ ارشاد ہے:

➜ مکہ کے قرب و جوار میں شخصی حکومتیں قائم تھیں، انھیں جب آپ ﷺ نے دین کی دعوت دی تو صراحت کر دی کہ اگر وہ اسلام لے آئیں تو ان کی حیثیت عرفی برقرار رہے گی اور جس سیاسی نظام کے وہ لوگ عادی ہیں اسے توڑا نہیں جائے گا۔ چنانچہ ہرقل کو جو نامہ مبارک بھیجا اس میں صراحت تھی کہ ''اسلام لے آؤ محفوظ رہو گے۔'' (صحیح بخاری) یہاں ''محفوظ رہو گے'' کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں زوال و عذاب سے محفوظ رہو گے، ہرقل اگر مسلمان ہو جاتا تو کیا اس کو اسلام لانے کی یہ سزا ملتی کہ اپنا تخت چھوڑ کر وہ کسی فرضی شوریٰ و جمہوری حکومت کا پابند ہو جاتا؟ یقیناً اس کی حکومت برقرار رہتی جیسی کہ نجاشی کی حکومت برقرار رہی۔ نجاشی سے نبی ﷺ نے مطالبہ نہیں کیا کہ فی الحال حکومت چھوڑ دو، پھر استصواب رائے کے بعد اگر تم صدر منتخب ہو گئے تو رہو گے ورنہ نہیں۔ اسی طرح باذان رضی اللہ عنہ جو کسریٰ کی طرف سے یمن کے حاکم تھے انھیں بھی نبی ﷺ نے یہی پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ اسلام لے آئیں تو یمن کی حکومت پر بدستور فائز رہیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

آج اگر امریکہ یا برطانیہ میں اسلام آجاتا ہے تو وہاں کا سیاسی نظام جمہوریت ہی ہوگا، کیوں کہ وہاں کا پہلے سے موجود سیاسی انفراسٹرکچر جمہوری ہے، بس زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا اس جمہوری نظام میں جو باتیں غیر اسلامی ہوں گی ان کو نکال دیا جائے گا اور اصل سیاسی نظام اپنی جگہ رہے گا۔ اسی طرح سے اگر آج پاکستان کے قبائلی علاقوں میں صحیح اسلامی نظام آتا ہے تو وہاں بھی قبائلی نظام ہی سیاسی انفرااسٹرکچر کے طور پر رہے گا البتہ اس کی اسلامی قواعد کی روشنی میں تطہیر کر دی جائے گی۔

پھر یہ کہنا کہ شروع کے چاروں خلفا جمہوری طرز پر منتخب ہوئے تو یہ ایک خلاف حقیقت بات ہے۔ ہم جب خاصِ تاریخ خلافت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں کسی طرح یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نصبِ امام کا کوئی خاص طریقہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں اچانک اٹھ کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کو خلیفہ بنانے پر پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو محض اپنے ذاتی اجتہاد سے خلیفہ مقرر کیا اور اس سلسلے میں کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد محض اپنی مرضی سے پوری امت مسلمہ میں سے صرف چھے آدمیوں کا انتخاب بغیر کسی مشورہ کے کیا۔ یہ چیز تو صاف بتاتی ہے کہ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کا کوئی واحد طریقہ مقرر ہی نہیں ہے۔ جمہوریت یا ملوکیت بذات خود کوئی بھی بری چیز نہیں ہے۔ یہ بری چیز اس وقت بنتی ہے جب اس کے ➜

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ [الحج: ۴۱]

چلانے والے ان کے ذریعے اسلام کے اصولوں سے انحراف کرتے ہیں۔ جس حکومت میں قانون سازی کا حق سرِحکومت یا قوم کے نمائندوں کو ہو ایسی حکومت خلافت نہیں مذموم ملوکیت کہلائے گی جیسے دنیا کی اور حکومتیں ہوتی ہیں، وہ حکومت شخصی ہو، آمرانہ ہو، جمہوری ہو یا اشتراکی ہو اسے مذموم ملوکیت کہا جائے گا اور اگر ایسی حکومت کتاب وسنت پر مبنی ہو اور وہاں قانون سازی کتاب وسنت کے تحت ہو تو وہ خلافت کہلائے گی، اگرچہ اس کی شکل کچھ ہو اور کسی زمانے میں ہو۔ مذموم ملوکیت صرف وہ حکومت کہلائے گی جو کتاب وسنت پر مبنی نہ ہو، ایسی حکومت کا سربراہ خلیفہ نہیں بادشاہ کہلائے گا۔ اس حساب سے مذموم ملوکیت کی ابتدا تو اوائل دور عباسی کے بعد ہی ہوئی اور پھر نبی ﷺ نے تو خود خلافت کو قریش میں سے یکے بعد دیگرے بارہ خلفا تک لازم کر دیا اسی لیے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے لے کر بنو امیہ کے آخری عہد تک کو تو خلافت ماننا ہی پڑے گا اور تاریخی حقائق بھی نبی ﷺ کی بارہ خلفا والی حدیث کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

سو اوپر کے مبحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر زمانے کے حساب سے جو طرزِ حکومت عام اور قابلِ قبول ہو گا اس کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں نافذ کر دیا جائے گا۔ اب چاہے وہ جمہوریت ہو یا پھر ملوکیت۔ اگر جمہوریت میں سربراہِ مملکت عام کرپٹ حکمرانوں جیسے ہوں اور ملوکیت میں عمر بن عبد العزیز جیسا لائق ومتقی حکمران ہو تو ہماری نظر میں ایسی ملوکیت جمہوریت سے کروڑ ہا درجہ بہتر اور لائقِ تحسین ہو گی اور اسی مثال کو آپ الٹا بھی کر سکتے ہیں۔ دراصل اسلام کو کسی بھی نظامِ حکومت سے کوئی مسئلہ نہیں جب تک کہ وہ اسلامی اصولوں سے نہ ٹکرائیں۔ نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں چونکہ قبائلی نظام تھا اس لیے وہاں جمہوریت اس شکل میں رائج نہ تھی، جس شکل میں آج مغربی ممالک میں رائج ہے، اس لیے تمام خلفا کا تقرر اس طرز پر قطعاً جمہوری نہ تھا جس طرز پر آج جمہوری تقرر ہوتے ہیں، سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے لے کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تک کا تقرر کُل مسلمانوں کے مشورے یا ووٹنگ سے نہ ہوا تھا بلکہ اربابِ حل وعقد کے مشورے سے ہوا تھا جو آج کی جمہوریت کے قطعی منافی ہے۔ تعینِ حاکم "أمرهم شوریٰ بينهم" کا حکم استحبابی پہلو میں تو اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کو وجوبی ماننے کی کوئی دلیل قرآن وسنت میں منقول نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے دور میں جہاں قبائلی نظام کامیابی سے چل رہا تھا وہاں قبائلی نظام چلنے دیا اور جہاں بادشاہت تھی وہاں بادشاہت کو برقرار رکھا۔

جمہوریت موجودہ شکل میں اُن ملکوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے جہاں کے لوگ پولیٹیکلی و دینی ایجوکیٹڈ ہوں، پولیٹیکلی اور دینی ایجوکیٹڈ کی قید لگانے کی دو وجوہات ہیں، پولیٹکلی ایجوکیٹڈ

''وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکات دیں گے اور اچھے کام کا حکم دیں گے اور برے کام سے روکیں گے، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔''

← ہونے کی بات اس لیے کی کہ اگر لوگ پولیٹکلی ایجوکیٹڈ نہ ہوتو جمہوریت کے نام پر بغاوتیں وہی گل کھلائیں گی جو عرب اسپرنگ کے بعد عرب ملکوں میں فساد اور انارکی کی صورت میں نظر آرہا ہے اور دینی ایجوکیٹڈ کی قید اس لیے لگائی کہ اگر لوگ دینی ایجوکیٹڈ نہیں ہوں گے تو بعض مغربی ممالک کی طرح ہم جنس پرستی اور جسم فروشی بھی مسلمان ملکوں میں جمہوریت کی بنیاد پر حلال کر لی جائے گی۔ کس ملک میں کیا نظامِ حکومت ہوگا؟ اس کا فیصلہ وہاں کے حالات کے تحت ہوگا، جیسا کہ متحدہ عرب امارات میں ایک خاص خاندان حکومت کر رہا ہے اور اس ملک کے سارے شہری اس خاندان کی سربراہی میں خوش ہیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہاں خواہ مخواہ میں جمہوریت لانے کے لیے جدوجہد کی جائے اور ملک میں سیاسی انارکی پھیلائی جائے۔ اصل مقصود کوئی مخصوص نوعیت کا نظامِ حکومت نہیں ہے، بلکہ عوام کی فلاح و بہبود ہے اور اگر ملک اسلامی ہے تو وہاں عوام کی فلاح و بہبود کے ساتھ دین برپا کرنا بھی ہے۔ اب یہ مقاصد چاہیں جمہوریت سے حاصل ہوں یا پھر ملوکیت سے یا پھر آمریت سے۔ سو نہ ہی اسلام جمہوریت کا مخالف ہے اور نہ ہی ملوکیت کا۔ ہر نظامِ حکومت مباح ہے، صرف اس کا استعمال اس کو جائز و ناجائز بناتا ہے، کیوں کہ نظامِ حکومت کا تعلق چونکہ معاملات و معاشرت و عادات سے متعلق ہے اور معاملات و معاشرت و عادات میں اصل حلت کی ہوتی ہے یعنی ہر چیز ان سے متعلق حلال ہے جب تک کہ ان کا حرام ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ اسی لیے ملوکیت، جمہوریت یا کسی بھی نظام حکومت کی اصل کو حرام کرنے کی کوئی دلیل اس احقر کو تو قرآن و حدیث میں نہ مل سکی۔

اس لیے اس سلسلے میں گزارش یہی ہے کہ اسلام کو کسی بھی زمانے چلتے نظام حکومت سے نتھی نہ کریں، یہی کام بہت سے علماء ماضی قریب میں کرتے آئے ہیں، جب سوشلزم کا بازار گرم ہوا تو اسلام کا مرغوب نظامِ حکومت سوشلزم بنا دیا گیا، کمیونزم نے دنیا میں پاؤں جمائے تو اسلامی نظامِ حکومت کمیونزم کا حامی بنا دیا گیا، جب بادشاہت کا دور دورہ تھا تو نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی صورت میں سب کو ایک عادل بادشاہ نظر آنے لگ گیا اور اب چونکہ جمہوری دور ہے تو اسلام جمہوریت کا دلدادہ ہوگیا۔ اسلام کوئی مخصوص نظامِ حکومت نہیں دیتا، اسلام میں جمہوریت کے بعض اصول بھی ملتے ہیں تو کمیونزم کی بعض جائز باتیں بھی اسکی تعلیمات میں پائی جاتی ہیں، سوشلزم کے مباح قوانین بھی اسلامی مزاج رکھتے ہیں تو داود اور سلیمان علیہما السلام جیسے عادل بادشاہ بھی اسلام میں گزرے ہیں۔

اولی الامر:

قرآن حکیم میں جابجا اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے، مثلاً:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء: ۵۹]

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔‘‘

یہاں اور ایسے ہی دوسرے مقامات پر اس کی قطعاً کوئی تحدید نہیں کہ اولوالامر فلاں طبقے اور فلاں حیثیت کے ہوں گے، فلاں زمانے سے ان کا تعلق ہوگا یا فلاں طریقے پر برسرِ اقتدار آئیں گے یا اس حکم کا اطلاق فلاں وقت تک ہوگا اور اس کے بعد اولوالامر کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت نہیں رہے گی۔

صرف ایک آیت ہے:

﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ [الشوریٰ: ۳۸]

’’اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے۔‘‘

لیکن کسی زمانے میں اور کسی صاحبِ عقل نے اس کا مطلب یہ نہیں لیا کہ اپنے گھر کے معاملات میں اپنے محلّہ والوں سے مشورہ لیا کریں، یا مریض کی بابت انجینئر سے رائے لی جائے، یا طبیعات کا مسئلہ اور عملِ کیمیاوی کی کوئی الجھن ہو تو اس کا حل فقیہ سے دریافت کیا جائے، یا علمِ عروض کی بات ہو تو درزی سے اس کی تحقیقات کی جائیں۔ زندگی کے ہر شعبے کے لوگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ سیاست کا تعلق اربابِ حل و عقد سے ہے، یعنی ان

لوگوں سے جو عملی سیاست کے ماہر ہوں، یا معاشرے میں ان کی حیثیت ہو کہ اجتماعی مسائل میں رائے دیں تو اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا جا سکے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴾ [النساء: ۸۳]

''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بہت تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔''

اس آیتِ مبارکہ میں ایک اہم دستوری مسئلہ بیان ہوا ہے کہ امورِ سیاسی پر غور وفکر اور رائے زنی کا حق اربابِ سیاست کو ہے۔ عسکری امور سے باخبر رہنا اور خطرناک نتائج سے بچنے کی تدبیریں کرنا امرائے عساکر کا کام ہے۔ نظری حیثیت سے مسئلہ کا مالہ وما علیہ دریافت کرنا فقہا اور قانون دان لوگوں کے ذمے ہے۔ یہ شرط کہ بات اُن تک پہنچائی جائے جو مسئلے کا حل دریافت کر سکتے ہیں، اس سے ان سب لوگوں کی تردید ہوگئی جو اس بات کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہر قسم کا مسئلہ ہر کس و ناکس کے سامنے رکھ دیا جائے اور جو بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کی بھی رائے لی جائے۔

دوسرا اہم معاشرتی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ افواہیں پھیلانا اور بے تحقیق باتوں کو ایک کان سے دوسرے کان میں پہنچانا شیطانی فعل ہے۔ اس کے ذیل میں وہ سب لوگ آجاتے ہیں جنھوں نے مجہول راویوں کی روایتیں اپنی کتابوں میں بھر دی ہیں اور درایت وعدل کو خیر باد کہہ کر امت کو گمراہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا۔ ان کی بیان کردہ

باتوں کو جب تک سند بنا کر لوگ پیش کرتے رہیں گے، ان سب کی گمراہی کا وبال ان مصنفوں پر پڑے گا اور ان کے نامہ اعمال کی سیاہی قیامت تک بڑھتی چلی جائے گی۔

تیسرا اہم بنیادی مسئلہ یہ بیان ہوا کہ جو لوگ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے ہٹ کر یا ان کے اجماع کی توہین کر کے کوئی دوسری راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ عیاناً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کتاب و سنت کا علم اصحابِ رسول ﷺ کو نہیں تھا، انھیں ہے۔اس طرح یہ سب لوگ شیطان کے پیرو بن گئے۔

اہلِ عالم پر یہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ کی بنائی ہوئی جماعت کو ہمیشہ جماعت رکھا اور ہر زمانے میں اسلام کی نمایندگی کا شرف اس متبعِ سنت جماعت کے ہاتھ میں رکھا۔ یہ برکت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قائم کیے ہوئے نظامِ خلافت کی ہے اور اسی کا مآل یہ نکلا ہے کہ آج تک کبھی اور روئے زمین کے کسی گوشے میں اہلِ عالم نے یہ نہیں سمجھا کہ اسلام کے متعلق صحیح معلومات پیش کرنے کا حق کسی درجہ میں انھیں بھی ہے جو جماعت سے کٹ گئے اور اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر اپنا سود و زیاں جماعت سے جدا کر لیا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جب بات ہوگی، شمال میں، جنوب میں، مشرق میں، مغرب میں، مسلمانوں کے حلقے میں یا کافروں کے اداروں میں، وہ بات ہمیشہ اسی قرآن مجید سے ہوگی جو امتِ محمدیہ کے ہاتھ میں ہے، اسی نظامِ خلافت سے ہوگی جو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور آپ کے خلفا کا ہے اور اسی نظامِ فقہی سے ہوگی جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے لے کر امام احمد رحمہ اللہ کے عہد تک مدون ہوا۔

امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے جتنے خلفا ہوئے، ان کے برسرِ اقتدار آنے کے طریقے مختلف رہے، کسی کے طریقۂ انتخاب میں سے دوسرے کے طریقۂ انتخاب سے مماثلت نہیں۔ اس اختلاف میں وجہ اتفاق ایک ہے، یعنی امت کا اجماع اور یہی اصلِ اصول ہے۔ یہ کہنا کہ انتخاب کا فلاں طریقہ درست ہے اور فلاں غلط، فلاں صواب ہے اور فلاں

مشتبہ، یہ لوگوں کی اپنی خیالی باتیں ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ گستاخی پر مبنی۔ یہ لوگ جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگاتے ہیں، اگر یہ اپنے ہی زمانہ کو دیکھیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک لفظ جمہور کی کتنی تعبیریں موجود ہیں، انگلستان، امریکہ، فرانس، روس، چین اور ہندوستان سب جگہ جمہوریت ہی کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ دعویٰ سب کو تسلیم بھی ہے تو ان کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ اسلام میں جمہوریت کا جو تصور ہے اس کی بھی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ویسے اگر انصاف اور اخلاص سے دیکھا جائے کہ صحیح معنی میں کسی شخص کو اپنے منتخب ہونے سے پہلے ہی جمہور اہلِ اسلام کی تائید حاصل تھی تو تاریخِ اسلام میں ایسا سب سے پہلا شخص امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں، باقی سب کے لیے محدود استصواب ہوا تھا اور بعض کے لیے استصواب قطعاً نہیں ہوا اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیوں کہ اسلام صرف جمہوریت کا قائل ہے کہ جو شخص برسرِ اقتدار آئے اسے امت قبول کر لے اور اس کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت جانے، اس کے خلاف کھڑے ہونے والوں کا ساتھ نہ دے، بلکہ انھیں باغی اور واجب القتل سمجھے۔[1]

---

[1] اس بابت تفصیلی ادلہ جاننے کے لیے مناسب ہے کہ قارئین فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کی کتاب ''اسلامی خلفا و ملوک اور تاریخِ سلام سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ'' کا مطالعہ کریں جس میں حافظ صاحب نے مختلف ادلّہ سے ثابت کیا ہے کہ کوئی بھی نظامِ حکومت مطلوب یا نا مطلوب نہیں ہوتا۔ نظامِ حکومت کا مطلوب و نا مطلوب ہونا، حکمران مقرر کرنے کے طریقے میں مضمر نہیں، بلکہ اس نظامِ حکومت کے نتائج میں مضمر ہے۔ اس کتاب میں ''دورِ حاضر کے مفکرین کا نقطہ نظر اور اس کے خطرناک نتائج'' کی سرخی قائم کرے حافظ صاحب ثابت کرتے ہیں کہ ان اصحاب کا قائم کردہ مقدمہ اس بات پر منتج ہوتا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت ایک طرح کا ناقابلِ تنفیذ نظامِ حکومت ہے جو صرف تیس سال میں ہی غیر پائیدار ثابت ہوگیا اور جو نبی یہ نظامِ حکومت لایا تھا اس کے اپنے تربیت یافتہ اصحاب نہ صرف اس کو چلانے میں سخت ناکام رہے، بلکہ ان کے ہاتھوں ہی یہ نظامِ حکومت اپنی موت مرکر ملوکیت جیسے ''مذموم'' نظام میں تبدیل ہوگیا۔ اسی منطقی سوچ کا نتیجہ ہے کہ یہ مفکرین پوری بے باکی و دلیری کے ساتھ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، ←

سنت:

نبی کریم ﷺ نے متعدد مواقع پر اپنے بعد خلافت کے بارے میں تصریحات کی ہیں، وہاں بھی کوئی ایسی بات نہیں جس سے زمانے کی قید نکالی جا سکے، بلکہ زمانے کی قید نکالنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کا لایا ہوا دین، آپ کی بنائی ہوئی امت اور آپ کا برپا کردہ نظام تھوڑی مدت کے لیے ہے۔ ارشاد ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ قَالُوا: فَمَا تَأْمُرُنَا قَالَ فُوا بِبَيْعَةِ الْأَوَّلِ فَالْأَوَّلِ، أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ، فَإِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ" [1]

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے نبی کریم ﷺ کے حوالے سے فرمایا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: بنو اسرائیل کی سیاست ان کے انبیا کے ہاتھ میں تھی۔ ایک نبی کا جب انتقال ہوتا تو اس کی جگہ دوسرے نبی کا تقرر ہو جاتا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے (یا ایک وقت میں کئی کھڑے ہو جائیں گے) صحابہ نے عرض کی: پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا: جو بھی پہلے آتا جائے اس کی بیعت پوری کرو اور ان کے حقوق ادا کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ ان کی رعایا کے بارے میں ان سے خود ہی

← سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہم کے کردار کو مجروح تاریخی روایات کے تحت بری طرح مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ جبکہ مستشرقین یہ باور کروانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ جب نبی کے اصحاب اسلامی نظام قائم نہیں کر سکے تو آج کے یہ داعی بھلا کیا کر سکیں گے۔ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کی یہ مختصر سی کتاب اپنے موضوع پر بہت ہی وقیع و جامع ہے جس کا مطالعہ دین کے ہر طالب علم کو لازمی کرنا چاہیے۔

[1] متفق علیه

باز پرس کر لے گا۔“

اس متفق علیہ حدیث کی موجودگی میں خلفا کی تعداد مقرر کرنا انتہائی جراَت کا کام ہوگا۔ دین کی شوکت اور تمام عالمِ اسلام میں ایک مستحکم امامت کے قیام کے متعلق آپ نے پیشین گوئی فرمائی:

”عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: يَكُوْنُ اثْنَا عَشَرَ أَمِيرًا، فَقَالَ كَلِمَةً لَمْ أَسْمَعْهَا، فَقَالَ أَبِي: إِنَّهُ قَالَ: كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ“ (1)

”حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ بارہ امیر ہوں گے۔ پھر آپ ﷺ نے کچھ فرمایا جو میں سن نہ سکا تو میرے والد نے بتایا: فرما رہے ہیں کہ سب قریش میں سے ہوں گے۔“

اس کے بعد مسند احمد میں نہایت قوی سند سے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

”عَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَهُوَ يُقْرِئُنَا الْقُرْآنَ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ! هَلْ سَأَلْتُمْ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَمْ تَمْلِكُ هَذِهِ الْأُمَّةُ مِنْ خَلِيفَةٍ؟ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ: مَا سَأَلَنِي عَنْهَا أَحَدٌ مُنْذُ قَدِمْتُ الْعِرَاقَ قَبْلَكَ ثُمَّ قَالَ: نَعَمْ، وَلَقَدْ سَأَلْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: اثْنَا عَشَرَ كَعِدَّةِ نُقَبَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ“ (2)

”حضرت مسروق بن اجدع ہمدانی سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ہم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھے اور آپ ہمیں قرآن مجید پڑھا

---

(1) الصحيح للبخاري كتاب الأحكام، صحيح مسلم كتاب الإمارة

(2) مسند أحمد (١/٣٩٨)

رہے تھے۔ ایک صاحب نے دریافت کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! کیا آپ حضرات نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ اس امت میں کتنے خلیفہ بااختیار ہوں گے؟ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب سے میں عراق آیا ہوں تم سے پہلے کسی شخص نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا۔ پھر فرمایا: ہم نے واقعی رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا تھا اور آپ ﷺ نے فرمایا تھا: بارہ، جتنے بنو اسرائیل کے نقیب تھے۔''

یہ حدیث عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد کی ہے اور اسی وقت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے امت کو بتا دیا تھا کہ ان کے دور میں بارہ بااختیار خلیفہ ہوں گے۔ گویا یہ اختتام خلافتِ امویہ تک کی بشارت ہے۔ یہ شرف اموی خلفا کو حاصل رہا کہ تمام عالمِ اسلام کا ایک سیاسی مرکز تھا اور صرف ایک امام ہوتا تھا جس کا حکم پوری اسلامی دنیا پر چلتا تھا اور یہ شرف بھی صرف اموی خلفا کو حاصل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان سے بیعت کی، بعد کے خلفا زمانہ گزر جانے کی بنا پر اس شرف سے محروم رہے۔ یہ سعادت بھی اموی خلفا ہی کو حاصل تھی کہ ان کی مملکت کے کارکنوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوتے تھے۔ آخری عہدِ اموی تک کا زمانہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے اور جو نظامِ مملکت تھا وہ صحابہ ہی چلا رہے تھے اور انہی کی رائے اور منشا کے مطابق کاروبارِ جہاں بانی قائم تھا۔

ایک اہم حدیث:

سیاساتِ اسلامیہ کے متعلق صحاح میں ایک نہایت اہم حدیث ہے جس پر عموماً توجہ نہیں کی جاتی اور اگر کسی نے اس پر توجہ کی بھی تو تعبیر میں غلطی کی:

''كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْخَيرِ وَ كُنتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ أَنْ يُدرِكَنِي، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّا كُنَّا فِي جَاهِلِيَّةٍ وَ شَرٍّ فَجَاءَ نَا اللّٰهُ بِهَذَا الْخَيرِ فَهَلْ بَعْدَ هَذَا الْخَيرِ مِنْ شَرٍّ؟ قَالَ:

نَعَمْ، قُلْتُ: وَهَلْ بَعْدَ ذَلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، وَفِيهِ دَخَنٌ، قُلْتُ: وَمَا دَخَنُهُ؟ قَالَ: قَوْمٌ يَهْدُونَ بِغَيْرِ هَدْيِي، تَعْرِفُ مِنْهُمْ، وَتُنْكِرُ، قُلْتُ: فَهَلْ بَعْدَ ذَلِكَ الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ، دُعَاةٌ إِلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! صِفْهُمْ لَنَا، فَقَالَ: هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا وَيَتَكَلَّمُونَ بِأَلْسِنَتِنَا، قُلْتُ: فَمَا تَأْمُرُنِي إِنْ أَدْرَكَنِي ذَلِكَ؟ قَالَ: تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ وَإِمَامَهُمْ، قُلْتُ: فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلَا إِمَامٌ؟ قَالَ: فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا، وَلَوْ أَنْ تَعَضَّ بِأَصْلِ شَجَرَةٍ حَتّٰى يُدْرِكَكَ الْمَوْتُ وَأَنْتَ عَلَى ذَلِكَ"[1]

''لوگ تو رسول اللہ ﷺ سے خیر کی بابت پوچھا کرتے تھے،لیکن میں شر کے متعلق بات کیا کرتا تھا کہ کہیں میرے زمانے میں بپا نہ ہو۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم جاہلیت اور شر میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ ہمارے پاس خیر (اسلام) لے آیا تو کیا اس خیر کے بعد کچھ شر آ جائے گا؟ فرمایا: ہاں میں نے کہا کیا اس شر کے بعد بھی کچھ خیر ہوگا؟ فرمایا: ہاں، مگر اس میں کمزوری رہے گی۔ میں نے عرض کی: کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا: ایسے لوگ ہوں گے جو میری ہدایت کا خیال کیے بغیر عمل کریں گے،کوئی بات تمھیں ان کی گوارا ہوگی اور کوئی ناگوار۔ میں نے عرض کی: پھر اس خیر کے بعد تو شر نہیں آئے گا؟ فرمایا: ہاں جہنم کے دروازوں پر بلانے والے کھڑے ہوں گے جو بھی اس طرف ان کے کہنے سے جھکے گا وہ اسے اس (جہنم) میں دھکیل دیں گے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ان کی علامت تو بتائیے۔ فرمایا: ہم ہی میں سے ہوں گے اور

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الفتن، باب كيف الأمر إذا لم تكن جماعة

ہماری ہی زبان بولیں گے۔ میں نے عرض کی: اگر ایسا وقت مجھ پر آجائے تو پھر میرے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے وابستہ رہنا۔ میں نے عرض کی: اگر ان کی جماعت اور امام نہ ہو تب؟ فرمایا: تو پھر ان سب فرقوں سے الگ ہو کر بیٹھ رہنا، اگرچہ کسی درخت کی جڑ کو دانتوں سے پکڑنا پڑے، تا آنکہ تمھیں موت آجائے اور تمھیں اس حال میں پائے۔''

امامت کے بارے میں یہ حدیث بڑی اہم نص ہے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ پر اللہ کی یہ بڑی رحمت تھی کہ فتنہ پھیلنے سے پہلے ہی آپ کو اٹھا لیا گیا۔ امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے کچھ ہفتے بعد مدائن میں وفات پائی اور ان ہنگاموں کا آپ پر کچھ اثر نہ ہوا جو مرکزِ اسلام میں برپا تھے۔

اس ارشادِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے اور حقیقت بھی یونہی ہے کہ اسلام کے بعد جو شر آیا وہ تمام عالم کو محیط ہو جاتا، اگر اللہ تعالیٰ ارتدادِ عرب کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو قائم کر کے آپ کو وہ عزیمت نہ بخشتا جس نے اسلام کو معجزانہ بچا لیا۔

اس کے بعد خیر کا زمانہ ہے اور وہ صدیوں تک کا ہے۔ یعنی اس وقت تک کا جب مسلمانوں کی جماعت اور اس کا امام نہ ہو۔ اس دورِ خیر میں اس جماعت اور اس کے ائمہ کے حلقے سے باہر وہ لوگ ہوں گے جو جہنم کے دروازوں پر کھڑے بلا رہے ہوں گے۔ کسی ایک دروازے پر نہیں، بلکہ سب دروازوں پر اور قسم قسم کی گمراہیاں اور عقائدِ باطلہ لے کر امتِ محمدیہ کو تباہ کرنے کے درپے ہوں گے۔ اس صورت میں پناہ کی ایک سبیل ہو گی کہ آدمی جماعت اور اس کے امام سے وابستہ رہے۔ ہر وہ تحریک جو جماعت کو کمزور اور امامِ جماعت کی فاعلیت کم کرنے کے لیے چلائی جائے گی، وہ جہنم میں دھکیل دینے کے مترادف ہو گی۔

یہ کمزوری خود مسلمانوں میں بھی ہو گی، وہ اور ان کے امام سب کے سب یک گونہ اس کمزوری میں مبتلا ہوں گے، ان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو دین سے عقیدتاً

وابستہ اور جماعت میں شامل رہنے کے باوجود معیاری زندگی بسر نہیں کریں گے۔ ان کی بعض باتیں اچھی ہوں گی اور بعض بری۔ ہر بڑی قوم میں جس کا حلقۂ اثر ونفوذ وسیع اور مدتِ بقا طویل ہو، اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر تو ممکن ہے کہ ہر شخص معیاری زندگی بسر کر لے اور تعلیمات میں پورا رچا ہوا ہو، لیکن یہ امر فطرتِ انسانیہ کے خلاف ہوگا کہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد جب ہو اور ملک کے ملک ان کے تصرف میں ہوں تو ان کے اندر کوئی خرابی اور کمزوری نہ آئے۔

دعوتِ محمدیہ کی بنیاد فطرۃ اللہ پر ہے جس کا ایک بنیادی اصول ہے:

﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ﴾ [بني إسرائيل: ٨٤]

''ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے۔''

غلطیاں ہوتی ہیں، گناہ ہوتے ہیں، خرابیاں آتی ہیں، کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود چونکہ وہ اپنی زندگی کا معیار عقیدتاً وہی رکھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر فرمایا ہے، اس لیے دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ انھیں نوازتا ہے۔ انھیں سزائیں ملتی ہیں، لیکن ہر خوف کے بعد امن اور ہر ذلت کے بعد انھیں سربلندی عطا ہوتی رہتی ہے، کیوں کہ دعوتِ نبوت کا علمبردار ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا رتبہ بلند ہے اور تمام اقوامِ عالم کے مقابلے میں حق کی گواہی کا شرف انھی کو حاصل ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۖ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾ [فاطر: ٣٢]

''پھر ہم نے اس کتاب کے وارث اپنے وہ بندے بنائے جنھیں ہم نے چن لیا، پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے اور ان میں سے کوئی

میانہ رو ہے اور ان میں سے کوئی نیکیوں میں آگے نکل جانے والا ہے، اللہ کے
حکم سے۔ یہی بہت بڑا فضل ہے۔''

جب تک جماعت اور اس کا امام موجود ہے وہ خیر کا مرکز اور رحمتِ الٰہی کا مورد ہے، اگرچہ اس امام یا اس کی جماعت کے افراد کے افکار و اعمال معیاری نہ ہوں۔ وجہ ظاہر ہے کہ کتاب کی وراثت نے انھیں سب کو برگزیدہ کر دیا ہو گا اور چونکہ نظام بہرحال برپا ہو گا، اس لیے اس کی یہ برکت بھی مشہور ہو گی کہ اصلاح کے امکانات قوی رہیں۔ جب تک جماعت اور اس کا امام ہے اس وقت تک کسی قسم کا اتار چڑھاؤ مہلک نہیں ہو سکتا اور نہ جماعت پراگندہ ہو سکتی ہے۔ ہر ٹھوکر کے بعد سنبھلیں گے اور ہر انتشار کے بعد مرکزیت کی طرف دوڑیں گے۔

لیکن جب وہ وقت آ جائے کہ نہ مسلمانوں کی جماعت ہو اور نہ اس کا امام تو پھر وقت ہو گا، اپنے اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر کا۔ مسلمانوں میں اگر کچھ جان ہو گی تو پھر وہ قرونِ اولیٰ کی طرف لوٹنے کی کوشش کریں گے کہ نئے سرے سے امت کی شیرازہ بندی ہو اور اس میں مرکزیت پیدا کر کے امام کے نصب کا انتظام کیا جائے۔

امت کی پوری تاریخ میں یہ منحوس زمانہ ہمارا ہے کہ عالمِ اسلام کا کوئی امام نہیں اور نہ جماعت کا کوئی نظام ہے۔ سب کے سب جغرافیہ، نسل اور فرقہ بازی کے شرک میں مبتلا ہیں اور محض ادنیٰ زمینی اور مادی منافع کے درپے۔ وہ مقصدِ عُلیا جس کے لیے اس امت کی تشکیل کی گئی تھی، سب نے پسِ پشت ڈال دیا۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں اور حکومتیں موجود ہیں، لیکن سب کی سب آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں، لیکن جو طاقتیں حقیقتاً اور عقیدتاً اسلام کی دشمن اور مسلمانوں کو فنا کرنے کے درپے ہیں، ان کے سامنے سب کے سرخم ہیں۔ ان کفار نے اور ان مکذبانِ دعوتِ محمدیہ نے عالمِ اسلام کو آپس میں بانٹ رکھا ہے اور ان کی کوشش ہے کہ مسلمان کسی طرح ایک جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہونے پائیں۔

عالمِ اسلام کی اس صورتِ حال سے دعوتِ محمدیہ کے مقاصد ضائع ہو رہے ہیں اور مسلمانوں میں روز بروز اپنے دین سے بیگانگی بڑھ رہی ہے۔ اگر کسی طرف سے کوئی آواز اٹھتی ہے اور کسی طبقے میں جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اپنوں ہی کے ہاتھوں وہ بار آور نہیں ہو پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو امامتِ عالم کا منصب عطا فرمایا تھا، لیکن مسلمانوں کا عالم یہ ہے کہ کسی کے گلے میں صلیب ہے اور کسی کے سر پر درانتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جو ملک جماعت سے کٹ کر امام کے حلقۂ اثر سے باہر ہوا اسی پر کفر نے چھاپہ مارا۔ سب سے پہلے اندلس نے علاحدگی اختیار کی تھی، وہی سب سے پہلے دار الکفر بنا اور ایسا کہ اب اسے دار الاسلام بنانا خواب و خیال ہو گیا۔ ہندوستان نے بھی امیر المومنین کی بیعت سے انکار کیا، اس پر انگریز مسلط ہو گیا، یہی حال مصر کا ہوا، بخارا کا ہوا، تا آنکہ آخری چرکہ عرب نے لگایا۔

حدیثِ بالا میں یہ الفاظ بہت غور طلب ہیں: ''وہ ہماری ہی نسل اور ہماری ہی زبان کے ہوں گے۔'' ہوتے تو رہے سب ہی شر کے داعی نام کے مسلمان اور عربی بولنے والے، کیوں کہ عربی ہی سرکاری زبان تھی، لیکن یہ کارنامہ صرف عربوں کا ہے اور وہ بھی ہاشمیوں کا جو ملک ڈیڑھ ہزار برس سے دار الاسلام تھے، یعنی عراق و شام، ان پر نصاریٰ مسلط ہو گئے اور ساتھ ہی فلسطین میں ''اسرائیل'' کا مستقل ناسور جسدِ اسلام کو کھا جانے کے لیے جڑ پکڑ گیا۔

یہ خمیازہ اس جرمِ عظیم کا ہے کہ عربوں نے امیر المومنین کے خلاف بغاوت کی اور اس کے لیے سہارا لیا ان کا جن کے متعلق صریح حکم ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴾ [المائدۃ:۵۱]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس

میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

جس امت کے نبی کی آخری وصیت تھی:

"أخرجوا اليهود والنصارىٰ من جزيرة العرب"

''یہود و نصاریٰ کو عرب کے جزیرے سے نکال دینا۔''

اس ہادیِ برحق کی اولاد میں سے ایک شخص نے جان بوجھ کر یہود و نصاریٰ دونوں کو سرزمینِ عرب پر مسلط کر دیا۔ اشتر نخعی سے لے کر شریف حسین تک، سب وہی لوگ امت کو تباہ کرنے کے درپے رہے جو اسلام کا جامہ پہنے رہتے تھے، نسلاً عرب تھے یا عربی بولتے تھے۔ إنّ في ذلك لعبرة لأولي الأبصار ۔ کافروں سے کھلی جنگ میں مسلمانوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ ہر میدان انھوں نے مارا، البتہ ہر فتح کو شکست میں تبدیل کرنے والے وہ نام نہاد مسلمان تھے جو کافروں سے مل گئے، اور ان میں اکثر و بیشتر سبائی گروہ کے لوگ ہی ہوئے ہیں۔ تیرہ سو برس کی اس تاریخ سے بے اعتنائی برتنا انتہائی حماقت اور بدترین جہالت ہوگی۔

ایک اور حدیث:

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کو ایک اور طرح نقل کیا ہے۔ اگرچہ حدیث کا ماخذ قوی نہیں، لیکن واقعات کے مطابق ہے اور اس میں ایک بات بہت غور طلب ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یوں بیان کیا گیا ہے:

''تم میں نبوت کا وجود اس وقت تک باقی رہے گا جب تک خدا چاہے گا، پھر اللہ تعالیٰ نبوت کو اٹھا لے گا اور اس کے بعد نبوت کے طریقے پر خلافت ہوگی، جب تک خدا چاہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ خلافت کو اٹھا لے گا اور اس کے بعد ملوکیت ہو جائے گی کاٹنے والی۔ جب تک خدا چاہے گا اسے قائم رکھے گا۔

پھر اس کے بعد نبوت کے طریقے پر خلافت ہو گی۔ اتنا فرما کر آپ خاموش ہو گئے۔'' (مسند احمد و سنن بیہقی)

اس حدیث کے راوی کا بیان ہے کہ جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو میں نے ان کو یہ حدیث لکھ کر بھیج دی اور امید ظاہر کی کہ آپ ہی وہ خلیفہ ہیں جن کا ذکر اس حدیث میں کاٹنے والے بادشاہ اور جبر کی حکومت کے بعد آیا ہے۔ (امیر المومنین) عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس سے بہت خوش ہوئے۔

مقدس نوشتوں کی اسی قسم کی تاویل سے پیچیدگی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ راویِ حدیث نے اسے اس زمانہ پر منطبق کر دیا جو اسلام کی عظمت و عروج کا زمانہ تھا اور پھر ارشادِ نبوی کو اشخاص کے بارے میں سمجھ لیا، حالانکہ صراحتاً ذکر نظام کا ہے۔ کسی صرفی اور نحوی اصول یا علمِ معانی کے اعتبار سے اسے خلفا کی شخصیتوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پانچ قسم کی حکومتوں کے دور بیان کیے گئے ہیں:

① حکومتِ نبویہ:

جہاں اختلاف و اجتہاد کا کوئی سوال نہیں۔ محض سننا اور اطاعت کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی حکم دیں، اس کی تعمیل بے چون و چرا واجب ہے۔ اختلاف صرف ان امور میں تھا جو آپ بحیثیت بشر یا فردِ ملت کے بیان فرمائیں اور اجتہاد صرف ان امور میں جب آپ امام کی حیثیت سے کوئی رائے دیں۔ نبی کی حیثیت سے جو فرمائیں اس کی اطاعت فرض تھی۔ مثال کے طور پر غزوۂ احد کا ذکر کرنا کافی ہو گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کی حیثیت سے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ حملہ آوروں کا مقابلہ شہر میں رہ کر کیا جائے، لیکن صحابہ میں سے وہ حضرات جو شوقِ شہادت سے سرشار تھے وہ باہر نکل کر لڑنا چاہتے تھے اور یہی اکثریت کی رائے ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مآل عیاناً دیکھ چکنے کے باوجود اکثریت کے اس فیصلے کو قبول کر لیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہے، اسی پر عمل کیا جائے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو

سب نے معافی مانگی اور عرض کی کہ حضور جس طرح فرماتے ہیں، اسی پر عمل فرمائیں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: نبی جب ہتھیار لگا لیتا ہے تو پھر مہم سر کیے بغیر نہیں اتارتا۔

پہلا حکم بحیثیت امام کے تھا جس سے اختلاف کیا جا سکتا تھا، لیکن دوسرا حکم بحیثیت نبی کے تھا جس سے سرتابی کی مجال نہیں۔ فردِ ملت ہونے کی حیثیت سے آپ کے بہت سے مشورے آپ کے اصحاب رد کر دیا کرتے تھے۔ نظامِ اسلامی میں فرد آزاد ہے اور اپنی رائے کا مختار۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ خود قرآن مجید میں موجود ہے کہ انھیں آپ ﷺ نے بار بار مشورہ دیا کہ اپنی زوجۂ محترمہ کو طلاق نہ دیں، مگر انھوں نے دے دی۔ یہ ان کا حق تھا جو انھوں نے استعمال کیا، کیوں کہ میاں بیوی میں ایک دن نہ نبھی۔ بہرحال اس نہج کی حکومت نبی کریم ﷺ کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اب کوئی انسان ایسا نہیں آ سکتا جس کی بات محض اس لیے مانی جائے کہ اس کی ہے اور نہ کسی کا ایسا حکم چل سکتا ہے جو اللہ و رسول ﷺ کے منافی ہو، یا شخصی آزادی پر اس سے حرف آتا ہو، جس کا بھی حکم چلے گا وہ اسی وقت جب شریعت کے مخالف نہ ہو۔

② خلافتِ نبوت:

یہ دور ہے کتاب و سنت کے مطابق دنیوی حکومت کا۔ اس حکومت کے چلانے والوں میں کوئی شخص مطاع مطلق نہیں۔ اصل مطاع صرف اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہے۔ خلفا اور ائمہ کا کام ہے اللہ و رسول ﷺ کے احکام کا نفاذ۔ قانوناً کسی اصلِ دینی اور حکمِ صریح کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ اس حکومت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ایک مرکز کے تحت ایک جماعت کی صورت میں امامتِ عالم کے فرائض انجام دیں اور اقوامِ عالم میں وہ نظامِ عدل برپا رکھیں جو منشائے بعثتِ انبیا ہے۔ اس حکومت میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں اور نہ کسی کا یہ منصب ہے کہ وہ قوانین بنائے، اختیاراتِ شخصِ واحد کے ہاتھ میں

ہوں، یا ایک بااثر حلقہ کے۔ یہ حلقہ امام نے چُنا ہو یا رعایا نے منتخب کر کے امام کی مدد کے لیے بھیجا ہو۔ یہ انتخاب محدود استصواب میں مبنی ہو یا رائے عامہ لی جائے۔ یہ لوگ اپنی طرف سے خود کوئی قانون نہیں بنا سکتے، البتہ اللہ و رسول کے عطا کیے ہوئے احکام کے نفاذ اور ان احکام کی روح اور منشا کو بروئے کار لانے کے لیے اجتہاد کر سکتے ہیں۔ اسی لیے فقہائے اسلام نے یہ شرط رکھی ہے کہ جو لوگ کاروبارِ حکومت چلائیں ان میں اجتہاد کی قابلیت ہونی چاہیے، تاکہ ماحول کے مطابق احکامِ الٰہی کو زیادہ موثر اور فعال بنا کر معاشرے میں زندگی اور ارتقا برقرار رکھ سکیں۔ خامیاں سب میں ہوتی ہیں اور غلطیاں سب سے ہوتی ہیں، لیکن چونکہ مرجع موجود ہے، لہٰذا اصلاح ہر وقت ہوسکتی ہے۔

③ ملک عضوض:

نظامِ خلافت ختم ہونے کے بعد کٹکھنی حکومت قائم ہوگئی۔ ہر حکومت کی اپنی وفاداری، اپنا دستور اور اپنا منہاج ہو گا۔ سب ایک دوسرے کو حریفانہ دیکھیں گے اور اگر آپس میں ملیں گے بھی تو چند ادنیٰ مادی اور دنیوی مفاد کے لیے۔ مسلمانوں کی ایسی حکومتیں بھی قائم ہوں گی جو صراحت کر دیں گی کہ ان کی حکومت دینی نہیں ہے اور نہ مملکت کا مذہب اسلام ہے۔

اور ایسی حکومتیں بھی ہوں گی جو کہلاتی تو ہوں گی مسلم اور اس انتساب پر انھیں فخر بھی ہو گا، لیکن اللہ کی حرام کی ہوئی چیزیں ان کے ہاں قانوناً حلال ہوں گی اور ان کبائر کے ارتکاب کے لیے سرکاری طور پر آسانیاں فراہم کی جائیں گی۔ عدالتوں میں سودی کاروبار کے فیصلے ہوا کریں گے، سود خوروں کو سرکاری حمایت حاصل ہو گی، زنا کے لیے سرکاری اجازت نامے دیے جائیں گے اور شراب خانوں کو سرکاری ٹھیکے ملیں گے۔ آبکاری کا محکمہ حکومت کا ایک مستقل شعبہ ہو گا اور اس کے افسروں اور کارکنوں میں وہ لوگ ہوں گے جو بظاہر نماز روزہ کے پابند ہوں گے، خود نشہ نہ کرتے ہوں گے اور اسے حرام بھی جانتے ہوں گے، لیکن ان ملازمتوں کو حلال اور اپنی آمدنی کو طیب جانیں گے۔ نماز کا

انتظام انفرادی ہو گا، جس کا جی چاہے پڑھے اور جو چاہے نہ پڑھے۔ زکات کی وصول یابی کا ان کے ہاں کوئی بندوبست نہیں ہو گا، لیکن ٹیکس لگانے پر یہ حکومتیں دلیر ہوں گی۔ جب یہ جنگ کریں گی تو مقصد اعلائے کلمۃ اللہ نہیں ہو گا، بلکہ ان کا جہاد ہوا کرے گا فی سبیل الوطن۔

غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکومتِ اسلامیہ کے جو فرائض بتائے ہیں وہ سب ان حکومتوں میں غارت کیے جائیں گے۔ اقامتِ صلات، ایتائے زکات، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسی ایک بات کو بھی سرکاری حیثیت نہیں دی جائے گی اور پھر بھی دعویٰ ہو گا مسلم حکومت ہونے کا، اور بات بات میں اسلام اور سلف صالحین کا نام لیا جائے گا۔ ان ملکوں کے عضوض ہونے کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ انھوں نے عربی کو فروغ دینے کے بجائے اسے ملک بدر کر رکھا ہے۔ اللہ نے اپنی مصلحتوں کی بنا پر انسان کی اس فطری اور قدیم ترین زندہ و پایندہ زبان کو اپنی آخری کتاب کے لیے چُنا اور صرف یہی وہ زبان ہے جو مسلمانانِ عالم کو ذہنی طور پر قریب لاسکتی ہے، لیکن اب سیاست کے معنی ہیں کہ اس زبان کے الفاظ اپنی زبان سے نکال دیے جائیں، تاکہ مسلمانوں کی اجنبیت مکمل ہو جائے اور جب وہ اپنے سالانہ بین الاقوامی اجتماع میں اپنے مرکز پر جمع ہوں تو ایک دوسرے کا منہ تکیں۔ عربی زبان سے بے نیازی بالآخر حج کو ختم کر کے رہے گی، جسے بے روح تو پہلے ہی کر دیا گیا ہے، عنقریب اس کا تصور بھی سرد ہو جائے گا۔

④ جبر کی حکومت:

جب مسلمانوں کی یہ حالت الم نشرح ہو جائے گی تو پھر انھیں مجبوری کی زندگی بسر کرنے کا عذاب دیا جائے گا، ان پر کفار مسلط ہوں گے اور معمولی فرائضِ دینیہ ادا کرنے کے لیے مسلمان اپنے ان کافر آقاؤں کے چشم و ابرو کو دیکھا کریں گے۔ جیسے ہندوستان کے مسلمان ۱۹۴۷ء سے پہلے تھے یا جیسے آج کے مسلمان کسی ایک کافر کے جتھے کے خیمے بردار بنے ہوئے ہیں یا کسی دوسرے کافر کے جتھے کے کہ اپنی سیاست، اپنی معاش اور اپنی

معاشرت سب دوسروں کے ہاتھ میں دے کر عملاً ان کے محکوم بنے ہوئے ہیں۔ سب سے نمایاں مثال چین اور روس کے کروڑوں مسلمانوں کی ہے، جو مجبوری کی زندگی ان کی ہے ایسی حالت شاید ہی کسی جگہ کے مسلمانوں کی ہوئی ہو۔ جبر اپنی پوری شان سے وہاں ہو رہا ہے۔

یہ حالت جب انتہا کو پہنچ جائے گی تو پھر بطور ردِ عمل کے یا تو خود مسلمانوں میں آزادی کی حرکت ہو گی یا اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق نظامِ خلافت کے احیاء کے لیے کسی دوسری قوم کو حلقہ بگوش اسلام بنا کر اپنے کام لے گا۔ اس نے پہلے بھی ایسا کیا ہے، ''پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے'' اور آیندہ بھی ایسا کرنے کی اسے قدرت ہے، وہ قوموں کا محتاج نہیں، قومیں اس کی محتاج ہیں۔

اقوامِ عالم کی تاریخ میں ایک دور کے بعد اچانک دوسرا شروع نہیں ہوتا، بلکہ آثار پیدا ہوتے ہیں اور ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، تا آنکہ ایک دور بالکل ختم ہو جائے اور دوسرا دور بالکلیہ نمودار ہو جائے۔ اگر حدیث زیرِ نظر پر غور کریں تو واقعات کے بالکل مطابق ہے، تسبیح کے دانوں کی طرح ایک کے بعد دوسرا واقعہ رونما ہوتا رہا۔ اندلس اور ہندوستان وغیرہ کی علاحدگی سے لے کر عربوں کی بغاوت تک پہلا دور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد خلافتِ اسلامیہ کا کہیں وجود نہیں، نہ مسلمان سیاسی حیثیت سے ایک جماعت ہیں اور نہ ان کا کوئی امام ہے اور نہ خلافت کے احیا کے فی الحال امکانات ہیں۔

البتہ حریف مسلم ممالک ہیں جو کسی طرح وحدانی نظام میں منسلک ہونے پر آمادہ نہیں۔ ان ممالک نے کفر کے دو حلقوں کے تحت مجبوری کی زندگی شروع کر دی ہے، تا آنکہ وہ وقت آجائے جب تمام عالمِ اسلام مجبور و مقہور ہو اور ان کا یہ تصور مٹ جائے کہ کفر کے سہارے کے بغیر بھی زندہ رہنے کا امکان ہے۔ جسے دیکھو عذر پیش کرتا ہے کہ فی الحال بالکل غیر جانبدار رہنے کی سبیل نہیں۔ کسی نہ کسی جتھے میں شامل ہونا پڑے گا، ورنہ ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔

﴿فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسٰرِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ

تُصِيبَنَا دَآئِرَةٌ ﴾ [المائدة: ۵۲]

''پس تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں ایک بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان میں جاتے ہیں، کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی چکر آ پہنچے۔''

ابھی تو کفر کے اصرار پر یا اہلِ کفر کی خوشامد میں بعض ''مسلم'' حکومتوں نے ''اسرائیل'' کو تسلیم کیا ہے، پھر حکماً ایسا کرنا ہوگا۔ جب ذہنی غلامی اور سیاسی پستی انتہا کو پہنچ جائے گی تو غیرتِ حق کو حرکت ہوگی اور خلافتِ نبوت برپا کرنے کا وقت آ جائے گا۔ وما ذلك على الله بعزيز.

﴿ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴾ [المائدة: ۵۲]

''تو قریب ہے کہ اللہ فتح لے آئے، یا اپنے پاس سے کوئی اور معاملہ تو وہ اس پر جو انھوں نے اپنے دلوں میں چھپایا تھا، پشیمان ہو جائیں۔''

اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو ﴿ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ بنایا ہے (درمیانی امت) یہ ہر اعتبار سے درمیانی ہے۔ جغرافیائی حیثیت سے یہ کفر کے دونوں جتھوں کے درمیان حجابِ حاجز ہے اور غیر جانبدار رہ کر تصادم کو روک سکتی ہے۔ معاشی اعتبار سے بھی درمیانی چال چلتی ہے، نہ اس کے ہاں سرمایہ داری ہے اور نہ شخصی ملکیت کی نفی، معاشرتی امور میں اس کا موقف فطری اور عادلانہ ہے، نہ اس کے ہاں طلاق حرام ہے اور نہ آسان کہ خاندان کی وحدت برقرار نہ رہ سکے، دین اس کا دنیوی ہے، یعنی تمام امور دینی ادا کرنے کے لیے اسے دنیا میں منہمک ہونا پڑتا ہے۔ یہ بالکل مادی طرزِ زندگی ہے اورنہ مادہ کی نفی کر کے خالص روحانی۔ اس کی آخرت کا انحصار اس کی دنیا پر ہے۔ اس میں طبقاتی کشمکش کے امکانات نہیں، اس کی حکومت میں نہ فرد اتنا آزاد ہے کہ جو چاہے نظریات رکھے اور جس قسم کے چاہے اعمال رکھے اور نہ فرد اتنا مجبور اور مقہور ہے کہ بطور خود نہ کچھ سوچ سکے اور نہ اپنی

ذمے داری پر کچھ کر سکے۔

غرض یہ ہے کہ ظاہراً و باطناً اس کے پاس وہ تمام وسائل موجود ہیں کہ اگر یہ دین کو پکڑے تو جغرافیہ، نسل اور زبان کی افتراق انگیزیوں سے نجات پا کر ایک عادلانہ وحدت بن سکتی ہے اور جب اللہ چاہے گا کہ خلافتِ نبوت قائم ہو تو اسے وحدت بن کر رہنا پڑے گا۔ بہرحال مسلمانانِ عالم اگر اپنے دین سے اسی طرح بیگانہ رہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے پر مائل نہ ہوئے تو پھر جب تک چاہے گا اللہ ڈھیل دے گا اور جب پکڑے گا تو پھر اس کے چنگل سے یہ نکل نہ سکیں گے۔

﴿ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴾ [الأعراف: ۱۸۳]

''اور میں انھیں مہلت دوں گا، بے شک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔''

آخری فتح ہمیشہ اللہ اور رسولوں کی ہوتی ہے:

﴿ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ﴾ [المجادلة: ۲۱]

''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بالضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔''

سطورِ بالا سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث کا جو مطلب اس کے راوی نے لیا تھا وہ کس درجہ بے اصل تھا اور منشائے نبوت کے کتنے خلاف۔

حدیثِ سفینہ:

صحیح مسلم [1] کی ایک حدیث ہے جسے ایک منکرِ حدیث مورخ نے بطورِ حجت پیش کر کے ''تاریخ الامت'' میں یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ خلافت ختم ہو گئی ہے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد سے ملوکیت کا دور شروع ہو گیا۔ جو لوگ حدیث سے استناد کرتے ہیں، انھوں نے نقد و جرح کے تمام اصول بالائے طاق رکھ کر اس حدیث کو صحیح سمجھ لیا۔ محض اس لیے کہ اس

[1] یہ مؤلف کا سہو ہے۔ حدیثِ سفینہ رضی اللہ عنہ صحیح مسلم میں نہیں، بلکہ جامع ترمذی میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے۔

کی روایت امام مسلم رحمہ اللہ نے کی ہے، حالانکہ پیشِ لفظ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ صحیحین کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ ان میں وارد شدہ حدیثوں کو بے چون چرا تسلیم کر لیا جائے۔[1]

حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جیسے امامِ حدیث کا قول وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حدیث کے الفاظ ہیں: ''خلافت تیس برس رہے گی اور پھر ملک ہو جائے گا۔'' اسی حدیث کو لوگوں نے اس موضوع پر حرفِ آخر قرار دے کر تمام نصوص کے مقابلے میں اسے کھڑا کر دیا۔ گویا وہ دین جو قیدِ زمانی و مکانی سے آزاد ہے، اس کا نظام صحیح بنیاد پر صرف تیس برس رہا۔ اہلِ تاریخ جانتے ہیں کہ یہ تیس برس کس طرح پورے ہوئے، پھر بھی اس حدیث کو حجت بنایا جاتا ہے۔

اس تحدیدِ زمانی کے معنی یہ ہوئے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اگر شہید نہ ہوتے تو ۴۱ھ سے وہ خلیفۂ راشد رہنے کے بجائے بادشاہ بن جاتے، بلکہ کٹکھنے بادشاہ۔ یا اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بجائے اجماعِ امت سیدنا سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص پر ہو جاتا جو ایک وقت میں خلافتِ راشدہ کے لیے نامزد کیے جا چکے تھے تو انھیں ۴۱ھ تک زندہ رہنے کی یہ سزا دی جاتی کہ ان کی بیعت ہوتے ہی خلافت ختم اور کٹکھنا ملک شروع۔

دراصل یہ حدیث محض اموی خلفا کی بے حرمتی کے لیے وضع کی گئی ہے۔[2] اسی لیے سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ جیسے غیر سیاسی مرنجاں و مرنج صحابی کی زبان سے امویوں کو مہذب گالی دلوائی گئی ہے: ''کنجی آنکھ والی کی اولاد''۔[3]

دریافت طلب ہے کہ سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کی تھی، یا نہیں؟ اگر کی تھی تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جس شخص کی اطاعت کا انھوں نے

---

[1] مولف کا بیان کردہ یہ موقف محلِ نظر ہے جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

[2] اگرچہ بعض اہلِ علم نے اس حدیث کی صحت پر کلام کیا ہے، لیکن اس روایت پر وضع کا حکم تجاوز ہے۔

[3] حدیث میں وارد الفاظ ''بنو زرقاء'' کی طرف اشارہ ہے۔

عہد کیا تھا، اس امام کے متعلق یہ ناشائستہ الفاظ کس حد تک درست ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس طرح بیعت کیا کرتے تھے اس کے الفاظ صحاح میں مروی ہیں، مثلاً سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ سے ان الفاظ کے ساتھ بیعت کی تھی۔

”إلیٰ عبد اللّٰہ عبد الملك أمیر المؤمنین إني أقر بالسمع و الطاعة لعبد اللّٰہ عبد الملك أمیر المؤمنین علی سنة اللّٰہ و سنة رسوله فیما استطعت وإن بني قد أقروا بذلك“ [1]

”اللہ کے بندے امیر المومنین کی جناب میں! میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے بندے عبدالملک امیر المومنین کا حکم میں سنوں گا اور اطاعت کروں گا (میرا یہ اقرار) اللہ کی سنت اور اس کے رسول کی سنت کی پیروی میں ہے جس حد تک بھی میرا مقدور ہو گا (میں کوتاہی نہ کروں گا) یہی اقرار میرے بیٹوں نے بھی کیا ہے۔“

اب سوچنا چاہیے کہ ان الفاظ کے ساتھ جس شخص سے بیعت کی جائے گی وہ ”کٹکھنا بادشاہ“ شر الملوک (بدترین بادشاہ) ہو گا یا خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امام المسلمین؟ امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ [2] بہت بعد آئے ہیں اور تابعی ہیں۔ سیدنا ابن عمرؓ نے اسی قسم

---

[1] صحیح البخاري، کتاب الأحکام، باب کیف یبایع الإمام الناس (٤/٢٤٥) طبع مصر

[2] ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر محمود احمد غازی دونوں امیر عبدالملک بن مروان کے بارے میں تصریح کرتے ہیں کہ بڑے پائے کے صاحب علم انسان اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔ جب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے وقت ان سے پوچھا گیا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے بعد فتاویٰ کے لیے کس سے رجوع کیا جائے تو انھوں نے عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کا نام لیا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی ان عبدالملک بن مروان کی بابت اپنے محاضراتِ سیرت کے تیسرے لیکچر میں بتاتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان علمی اور دینی اعتبار سے اس درجہ اور مقام و مرتبہ کے انسان تھے کہ امام مالک نے موطا میں کئی جگہ کسی چیز کا سنت ہونا عبدالملک کے طرزِ عمل کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے کہ فلاں چیز سنت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اہلِ علم نے عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کو اس طرح ←

کے الفاظ کے ساتھ ان سے پہلے خلفا کی بیعت کی تھی، بلکہ خود نبی اکرم ﷺ سے بھی۔

کرتے دیکھا ہے۔ گویا امام مالک نے عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے طرز عمل کو سنت کی دلیل قرار دیا۔ امیر عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ سیرت سے متعلق معلومات کے لیے اکثر و بیشتر عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کو سوالات بھیجا کرتے تھے اور عروہ ان سوالات کا تفصیلی جواب دیا کرتے تھے۔ الغرض عبدالملک رحمہ اللہ بن مروان رضی اللہ عنہ ایک صاحبِ علم خلیفہ تھے۔ اگر یہ مسندِ خلافت پر نہ بیٹھتے تو فقہائے سبعہ میں سے ہوتے۔ ان کے علمی کمالات کا مختلف حضرات نے اعتراف کیا ہے جس کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ "البداية و النهاية" (۹/۷۷۔۸۲) میں درج کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ امیر عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کا شجرہ لکھنے کے بعد بیان کرتے ہیں کہ ان کا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان سے سماع ثابت ہے اور یہ وہ پہلے شخص ہیں جو لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر ۴۲ھ میں روم کے علاقوں میں چل پھر کر آئے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو امیرِ مدینہ مقرر کیا۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا فقہا، علما اور عابد و زاہد لوگوں میں ہوتا تھا۔ اپنے والد سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کے علاوہ انھوں نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ، ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ، سیدہ امِ سلمہ رضی اللہ عنہا اور بریرہ رضی اللہ عنہا سے حدیث کی سماعت اور روایت کی۔ جبکہ خود ان سے ایک عظیم جماعت نے روایتِ حدیث کی جن میں خالد بن معدان، عروہ بن زبیر، امام زہری، عمرو بن الحارث، رجاء بن حیوۃ اور جریر بن عثمان شامل ہیں۔

عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کی ولادت ۲۶ھ میں ہوئی۔ خلیفہ بننے سے قبل ان کا شمار عباد و زہاد میں ہوتا تھا اور یہ ان فقہا میں شمار ہوتے تھے جو ہر وقت مسجد میں قائم اور تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول رہتے تھے۔ امام نافع رحمہ اللہ مولیٰ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ میں نے مدینہ میں عبدالملک بن مروان سے زیادہ چاق چوبند سیر و سیاحت کرنے والا اور کتاب اللہ کا قاری کسی کو نہیں دیکھا۔ امام اعمش رحمہ اللہ ابو الزناد سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ کے فقہا چار اشخاص تھے: ایک سعید بن المسیب رحمہ اللہ، دوسرے عروہ رحمہ اللہ، تیسرے قبیصہ بن ذؤیب رحمہ اللہ اور چوتھے عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ۔ دور خلافت میں یہ قبیصہ بن ذؤیب عبدالملک بن مروان کے وزیر تھے۔

امیر عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ اس پائے کے انسان تھے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے زاہد و عابد صحابی نے ان کے متعلق فرمایا کہ لوگوں نے بیٹے جنے ہیں جبکہ مروان رضی اللہ عنہ نے باپ جنا ہے یعنی عبدالملک۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن جب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کا عبدالملک کی امارت میں اختلاف دیکھا تو کہا کہ کاش! اس لڑکے کی امارت پر سب کا اتفاق ہوتا۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے

ظاہر ہے کہ سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طریقے پر بیعت کی ہوگی تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ان کی زبانِ مبارک سے وہ الفاظ نکلے ہوں جو اس حدیث کے مختلف طرق میں مذکور ہیں، مثلاً: مصنف ابن ابی شیبہ میں۔

← عبدالملک کی بابت فرمایا کہ میں نے کسی مجلس میں اپنے سے زیادہ فضیلت والا کسی کو نہیں پایا سوائے عبدالملک بن مروان کے، اس لیے کہ جب بھی میں کوئی بات کرتا تو وہ اس میں اضافہ کرتے اور جب بھی کوئی شعر کہتا تو وہ اس میں اضافہ کرتے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۵۰ھ میں امیر مدینہ سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ کی معیت میں جو وفد مغرب کے شہروں کی طرف جا رہا ہے اس میں اپنے بیٹے عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کو بھی شامل کر دو، نیز اس خط میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبدالملک بن مروان کی ان علاقوں میں مجاہدانہ صلاحیت و اہلیت کا بھی ذکر کیا تھا۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علم عنقریب اٹھ جائے گا، جس شخص کے پاس ہے جلدی سے پیش کرے، نہ خیانت کرے اور نہ پہلوتہی کرے۔ اس کے علاوہ عبدالملک کے خطبہ میں وعظ و نصیحت کی باتیں ہوتی تھیں۔'' امام اعمش رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے امیر عبدالملک رحمہ اللہ کو خط لکھا جس میں خود کا خادمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونا بتا کر فرمایا کہ مجھے حجاج نے تکلیف پہنچائی اور ایسا ایسا کیا۔ عبدالملک رحمہ اللہ خط پڑھ کر رونے لگے اور غصہ ہوئے، پھر ایک سخت خط حجاج کو لکھا جس کی وجہ سے حجاج نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے معذرت کی اور اپنے فعل پر نادم ہوا۔ ایک شخص عبدالملک کے پاس آیا اور ان سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہا تو عبدالملک نے فرمایا کہ جو چاہو کہو، مگر تین باتیں مت کرنا، پہلی میری تعریف، دوم مجھ سے جھوٹ مت بولنا اور سوم میری رعایا کے خلاف مجھے مت بھڑکانا۔''

امام اصمعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے سامنے ایک شخص لایا گیا، جس نے ان کے خلاف خروج کیا تھا۔ اس کی بابت قتل کا فیصلہ ہوا۔ اس شخص نے عبدالملک سے کہا کہ آپ کی طرف سے میرا یہ بدلہ ہے؟ عبدالملک نے اس سے پوچھا: پھر کیا بدلہ ہونا چاہیے؟ اس شخص نے کہا کہ میں جس کے ساتھ بھی نکلا ہوں وہ ناکام ہوا اور شکست کھائی اور ان کا لشکر منتشر ہوا۔ یہ بات سن کر عبدالملک کو ہنسی آ گئی اور اس کو چھوڑ دیا۔ عبدالملک سے کسی نے پوچھا کہ کون سا شخص سب سے بہتر ہے؟ فرمایا کہ جو بلندی کے بجائے تواضع اختیار کرے اور قدرت کے باوجود زہد اختیار کرے اور انتقام پر قدرت رکھنے کے باوجود انتقام نہ لے۔ بہترین مال وہ ہے جو قابل تعریف ہو یا مذمت کو دور کرے۔ یہ کبھی نہ کہو کہ کون پالے گا کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ اور عیال ہے۔'' ←

امام ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ نے العواصم من القواصم (ص: ۲۰۱) میں مسلم شریف[1] کی اس حدیث کو غیر صحیح بتایا ہے۔ ویسے بھی اس کی سند میں کوئی صاحب ایسے نہیں جن کا معتبر ہونا معرضِ بحث نہ ہو۔ پھر امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کیا عمدہ بات فرمائی ہے: ''اگر بالفرض یہ حدیث صحیح ہو تب بھی قابلِ قبول نہیں، کیوں کہ نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے۔'' دیکھا جائے تو محض دوسری احادیث صحیحہ ہی کے نہیں، جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئیں،

← امام اصمعی رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں: ''ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ خطبہ دے رہے تھے، اچانک خطبہ روک کر رونے لگے اور پھر کہا: "یارب! ان ذنوبي عظيمة و ان قليل عفوك اعظم منها، اللهم فامح بقليل عفوك عظيم ذنوبي" یعنی ''اے میرے رب! میرے گناہ بہت زیادہ ہیں اور یقیناً تیرا کم از کم معاف کرنا ان گناہوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اے میرے اللہ! اپنے قلیل عفو سے میرے عظیم گناہوں کو معاف فرما دے۔'' راوی کا کہنا ہے کہ جب حسن رحمہ اللہ کو یہ خبر ملی تو وہ رونے لگے اور پھر کہا: "لو كان كلام يكتب بالذهب لكتب هذا الكلام" یعنی ''اگر کوئی کلام سونے سے لکھنے کے قابل ہوتا تو یہ کلام سونے سے لکھا جانا چاہیے۔'' حسن رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر لوگوں نے بھی اس دعا کے بارے میں یہی رائے دی۔ ان کی خلافت کی بیعت ۶۵ھ میں کی گئی جو مصر و شام تک محدود تھی، جب کہ دوسرے علاقوں پر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت قائم تھی لیکن ۷۳ھ میں سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد پورے بلادِ اسلامیہ میں ان کا اقتدار قائم ہو گیا۔ دمشق میں ان کا انتقال ہوا جب کہ ان کی عمر ۶۰ برس کے آس پاس تھی۔ ان کے جانشین امیر ولید بن عبدالملک نے ان کی صلاۃ المیت ادا کی۔ ان کی ایک بیوی بنومخزوم سے تھی جن کے بطن سے ہشام بن عبدالملک پیدا ہوا تھا جو بعد میں جا کر خلیفہ بنا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی ایک صاحبزادی بھی ان عبدالملک بن مروان رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں اس لحاظ سے یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے داماد اور حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما کے بہنوئی تھے۔ امیر یزید بن معاویہ کی صاحبزادی عاتکہ بھی ان عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کی زوجیت میں تھیں۔ عبدالملک کی کل مدتِ خلافت ۲۲ سال تھی جس میں سے نو سال سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ حکومت میں شامل تھے جبکہ تیرہ سال تین ماہ مستقل حکومت کی۔ دیکھیں: "البداية و النهاية" (۹/۷۷۔۸۲)

[1] جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ روایت صحیح مسلم کی نہیں، جامع ترمذی کی ہے، یہاں مولف کو سہو ہوا ہے۔

بلکہ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ، اجماعِ صحابہ اور قیاس سب کے خلاف ہے۔

علاوہ ازیں سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ کو اگر واقعی خلافت جیسے اہم ترین اجتماعی مسئلے کی بابت جمہور صحابہ سے ہٹ کر کوئی مخصوص علم دیا گیا تھا کہ خلافت تیس برس رہے گی اور پھر ملک ہو جائے گا تو انھوں نے جمعیتِ صحابہ کو کیوں متنبہ نہیں کیا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تیس برس کے اندر قائم ہوئی ہے، اس لیے ان سے اختلاف کی گنجائش نہیں اور جو ان کے خلاف کھڑا ہو گا وہ خلیفہ راشد کے خلاف کھڑا ہونے کی بنا پر مثل مرتد کے ہو جائے گا اور جو ان کی بیعت نہیں کرے گا وہ بھی حلال الدم ہو گا۔

پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو پسِ پشت برا کہنے سے تو بہتر یہ تھا کہ خود انھی سے صاف کہہ دیتے کہ تم خلیفہ نہیں ہو، اس لیے تمھیں اللہ اور رسول کی بیعت لینے کا حق نہیں۔ ہم تمھارے ملک میں رہتے ہیں، تمھارے قوانین کی پابندی کریں گے، مگر یہ نہیں ہے کہ تم سے اختلاف کو عصیان سمجھیں اور تمھاری اطاعت کو موجبِ رضائے الٰہی جانیں، کیوں کہ تم محض بادشاہ ہو۔

کیسی عجیب بات ہے کہ بیعت تو کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی سنت پر اور اس کی پیروی میں بات سننے اور اطاعت کرنے کی، لیکن سمجھتے ہیں بادشاہ، جو خود قانون ساز ہوتا ہے، قانون سے بالا ہوتا ہے اور الٰہی قانون کا لازماً پابند نہیں ہوتا۔

عقلاً و نقلاً ہم یہ کبھی باور نہیں کر سکتے کہ سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی ہو گی جو تمام نصوصِ صریحہ اور اجماعِ صحابہ کے خلاف ہے۔[1]

---

[1] مولفِ کتاب کا حدیثِ سفینہ کی صحت سے متعلق تجزیہ بالکل درست ہے کہ یہ حدیث روایت و درایت دونوں کی روشنی میں پایۂ صحت کو نہیں پہنچتی، تاہم مؤلفِ کتاب نے اس حدیث پر روایتاً کوئی بحث نہیں کی، سو ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قارئین کی تشفی کے لیے اس حدیث کی صحت سے متعلق علم الروایت کے تحت چند گزارشات نقل کر دی جائیں۔۔ جامع ترمذی کے علاوہ یہ روایت ابو داود، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی موجود ہے جن میں سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں خلافت تیس سال رہے گی، پھر اس کے بعد ملک ہو گا۔ سعید بن جمہان کا بیان ←

الراشدون:

سنن ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے:

← ہے کہ پھر سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو دیکھ لے تو تجھے صاف نظر آ جائے گا کہ یہ تیس سال ہوتے ہیں اور ایک روایت میں مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ حسن رضی اللہ عنہ کے چھ ماہ بھی شمار کر لو۔ سعید بن جمہان راوی کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ سے عرض کی: بنو امیہ تو یہ گمان کرتے ہیں کہ خلافت ان کے پاس ہے۔ وہ بولے: بنو زرقا جھوٹ بولتے ہیں، بلکہ وہ تو بادشاہ ہیں اور بادشاہ بھی بدترین بادشاہ۔ (ترمذي)

یہ ایک ایسی روایت ہے جس پر خلافت راشدہ اور بنو امیہ کی ملوکیت کی پوری عمارت قائم ہے۔ آج تک جس شخص نے بھی خلافت وملوکیت پر کچھ قلم اٹھایا، اس نے سب سے اول اس روایت کو پیش نظر رکھا ہے اور اس روایت کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے گویا یہ روایت ایک ایسا مسلمہ اصول ہے کہ جسے دورِ صحابہ سے آج تک ہر فرد تسلیم کرتا آیا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، کیونکہ خیر القرون کے اپنے لوگوں نے اس روایت کو اپنے عمل سے قابلِ احتجاج نہ سمجھا۔ اگر یہ تیس سالہ خلافت والی روایت درست ہوتی اور صحابہ رضی اللہ عنہ کے مابین اس کی صحت مسلّم ہوتی تو سارے کے سارے صحابہ رضی اللہ عنہ پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت نہ صرف واجب ہو جاتی، بلکہ وہ جنگ جمل وصفین میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیتے۔ کیونکہ یہ روایت ان کی خلافت کے حق ہونے پر دلیل ہے، لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بقول امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی آدھی یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اکثریت نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی اور نہ ہی جنگ جمل وصفین میں ان کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ نے بھی جنگ جمل وصفین میں حصہ نہیں لیا۔ حالانکہ باقی صحابہ رضی اللہ عنہ کا تو چھوڑیے لیکن کم از کم سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ کو تو میدانِ جمل وصفین میں آگے آگے ہونا چاہیے تھا۔ گویا صحابہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک تو یہ روایت ثابت تھی ہی نہیں۔ اگر یہ روایت درست تھی تو سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند امیر یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کی بیعت کیسے کر لی، جبکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو وہ الگ بیٹھے رہے۔ محدثین کے ایک گروہ کا یہ اصول ہے کہ اگر ایک راوی حدیث بیان کرے اور خود اس کا عمل اس حدیث کے خلاف ہو تو وہ اس روایت کے مشتبہ ہونے کی دلیل ہوتی ہے، سو اس لحاظ سے بھی یہ روایت ناقابلِ احتجاج ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت سے متعلق علما کی تصریحات اور اصول الحدیث کے تحت گفتگو کر لی جائے۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ اپنی تاریخ کی جلد دوم کے آخر میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ←

”عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي،
تمسكوا بها و عضوا عليها بالنواجذ“ (سنن ابن ماجه)

➔ کی خلافت کے ضمن میں بحث کرتے ہوئے اس روایت کے غیر صحیح ہونے کی بابت اشارہ کرتے ہیں:

”مناسب یہ ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت اور ان کے حالات ان سے ماقبل خلفا کی حکومت و واقعات کے ساتھ ذکر کیے جائیں، کیونکہ شرف و فضل، عدالت وصحابیت میں وہ ان ہی کے بعد ہیں اور اس بارے میں حدیث ”میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی۔“ کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی، کیوں کہ وہ صحیح نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے پیش رو خلفا کے ساتھ شامل ہیں۔“

قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی رحمہ اللہ (المتوفی: ۵۴۳) اپنی کتاب ”العواصم من القواصم“ (صفحہ: ۲۰۱) میں اس روایت کے غیر صحیح ہونے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ صحیح نہیں اور اگر یہ صحیح بھی ہوتی تو اس صلح کے معارض ہے، جس پر سب کا اتفاق ہو چکا، لہٰذا اس صلح کی جانب رجوع کرنا واجب ہے۔“

مشہور سلفی عالم علامہ محبّ الدین خطیب المصری العواصم من القواصم کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں:

”حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ سفینہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کرنے والا سعید بن جمہان ہے اور اس کے سلسلے میں محدثین میں اختلاف ہے۔بعض محدثین کہتے ہیں اس میں کوئی برائی نہیں، بعض کہتے ہیں ثقہ ہے لیکن امام ابو حاتم رازی فرماتے ہیں کہ ایک شیخ ہے لیکن اس کی حدیث کو ہرگز حجت نہ مانا جائے۔ سعید بن جمہان سے نقل کرنے والا حشرج بن نباتہ الواسطی ہے جسے اگرچہ بعض نے ثقہ کہا ہے لیکن نسائی کہتے ہیں یہ قوی نہیں۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے اس روایت کو سوید الطحان سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر ”تقریب التهذیب“ میں لکھتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے اور یہ روایت اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جو صحیح مسلم کتاب الامارہ میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ امر (خلافت) اس وقت تک منقطع نہ ہوگا جب تک کہ بارہ خلیفہ نہ گزر جائیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ سے کوئی بات فرمائی جو میں نہ سن سکا۔ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ”یہ بارہ خلفا قریش میں سے ہوں گے۔“ آپ اس حدیث کو بخاری میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔“ ➔

''اپنے اوپر میری سنت اور میرے بعد ان خلفا کی سنت کی پابندی لازم سمجھو جو ہدایت یافتہ اور ہدایت بخش ہوں گے، اسی سے وابستہ رہنا اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑنا۔''

محبّ الدین خطیب آگے مزید لکھتے ہیں:

''یہ ۱۲ خلفا والی روایت ''مجمع الزوائد'' (۵/۱۹۰)، ''مسند احمد'' (۵/۸۶، ۸۷) پر تین سندات سے، صفحہ (۸۸۔۹۰) پر تین سندات سے، صفحہ (۹۲) پر تین سندات سے، صفحہ (۹۳) پر دو سندات سے، صفحہ (۹۴، ۹۵) پر دو سندات سے صفحہ (۹۷) پر دو سندات سے صفحہ (۹۸) پر تین سندات سے، صفحہ (۹۹) پر تین سندات سے، صفحہ (۱۰۰، ۱۰۱) پر دو سندات سے، صفحہ (۱۰۷) پر دو سندات سے، صفحہ (۱۰۸) پر دو سندات سے اور مسند ابی داود طیالسی میں (حدیث: ۷۶۷) اور (حدیث: ۱۲۷۸) موجود ہے۔ دیکھیں: ''العواصم من القواصم'' صفحہ (۲۰۱۔۲۰۲)

قارئین کرام آپ نے دیکھا کہ محبّ الدین خطیب مصری نے حوالہ جات پر کتنا زور صرف کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام انھوں نے بلاوجہ انجام نہیں دیا، بلکہ صرف یہ دکھانے کے لیے انجام دیا ہے کہ جس تیس سالہ روایت کے بل بوتے پر خلافت راشدہ اور ملوکیت کے چکر چلائے گئے ہیں، جہاں وہ ضعیف ہے وہاں وہ صحیح احادیث کے بھی معارض ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اس بارہ خلفا والی روایت کو امام ترمذی بھی اپنی کتاب میں لائے ہیں اور اس بارہ خلفا والی روایت کو صحیح اور تیس سالہ والی روایت کو حسن کہا ہے اور اہلِ علم یہ بات جانتے ہیں کہ ترمذی جس روایت کو مطلق حسن کہیں تو وہ ان کے نزدیک ضعیف کے درجے میں بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ حافظ ابو یحیٰی نور پوری نے شمارہ السنہ میں اپنے مضمون میں بدلائل ثابت کیا ہے۔

اس تیس سالہ روایت کی تردید سنن ابوداؤد کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جو انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز ارشاد فرمایا: ''اگر تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو تو بیان کرو۔'' ایک شخص بولا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو آیا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تولا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھاری رہے، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو تولا گیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ بھاری رہے، پھر عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کو تولا گیا تو عمر رضی اللہ عنہ بھاری رہے، اس کے بعد ترازو اٹھالی گئی۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر کچھ ناگواری کے اثرات دیکھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا: ''یہ خلافتِ نبوت

معلوم نہیں عربی زبان کے کن قواعد کے تحت اور دین کے کس اصول کے مطابق اس حدیث سے چار کی تخصیص کر دی گئی، حالانکہ الفاظ اور جملوں کی ترکیب میں ادنیٰ ترین اشارہ بھی اس کا نہیں کہ پانچواں خلیفہ راشد نہیں ہوگا یا یہ کہ راشد صرف چار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اور پھر ان کا اتباع کرنے والے تمام امتیوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

﴿وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ⑦ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۚ

➔ ہے، پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا خلافت عطا فرمائے گا۔''

اسی روایت پر کلام کرتے ہوئے فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن محدث مدنی کے داماد اور مشہور اہلِ حدیث عالم ابوالحسن حافظ محمد زبیر حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''پھر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ والی روایت میں ہے کہ خلافت جب تک اللہ چاہے گا، اس وقت تک باقی رہے گی اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ والی روایت میں ہے کہ تیس سال تک باقی رہے گی۔ یہ بھی ان روایات کا باہمی ''اضطراب'' ہے کہ اللہ کی مشیت کو تیس سال سے متعین کر دیا گیا۔ اللہ جو چاہیں گے، اور تیس سال، دونوں ایک بات نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روایت سفینہ رضی اللہ عنہ ''مضطرب'' ہونے کے ساتھ ''شاذ'' اور ''منکر'' بھی ہے۔ ''شاذ'' تو اس لیے کہ متفق علیہ روایات یہ بیان کر رہی ہیں کہ اسلامی خلافت بارہ خلفا تک جاری رہے گی اور روایت سفینہ رضی اللہ عنہ کے مطابق خلافت تیس سال میں ختم ہو جائے گی اور جب ثقہ راوی اوثق کی مخالفت کرے تو روایت ''شاذ'' کہلاتی ہے، جو ضعیف ہی کی ایک قسم ہے۔

جہاں تک اسناد کی بحث ہے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا مدار داود بن ابراہیم الواسطی العقیلی پر ہے جو ''متروک الحدیث'' ہے، لہٰذا روایت ضعیف ہے اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی بنیاد سعید بن جمہان پر ہے کہ جس کے بارے ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا کہ ''لا يحتج به'' یعنی قابلِ اعتماد نہیں ہے، جب کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے ''صدوق له أفراد'' کہا ہے جو توثیق کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔ یہ ''صدوق'' کا وہ تیسرا درجہ ہے کہ جس کے بارے علما نے کہا: ''كتب حديثه ولا يحتج به'' بس اس کی حدیث لکھ لی جائے گی، لیکن اس پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ اور یہی وہ ''صدوق'' ہے کہ جس پر کثرت وہم غالب ہو۔ ابن عدی نے ''الكامل في الضعفاء'' میں اس روایت کو ''منکر'' کہا ہے۔'' (مکالمہ، صفحہ: ۱۶۳)

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [الحجرات: ۷، ۸]

''اور لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔ اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کی وجہ سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس توصیف میں ان کا راشدون ہونا اور ان کے احوالِ قلبیہ کا مزکی ومطہر ہونا بطور امر واقعہ بیان کیا ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ مذہب ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول ہیں اور بعد کے اصحابِ رجال کی جرح وتعدیل سے بالا۔ یعنی ایک حدیث کی روایت میں سند کے ہر شخص کو پرکھا جائے گا، لیکن جب صحابی تک سند بطریق صحیح پہنچ جائے تو اس صحابی کی عدالت میں شک نہیں کیا جائے گا۔ اگر ان کے اجتہاد سے اختلاف ہو تو انفرادی طور پر ہر صحابی کا فتویٰ یا مذہب قابلِ استدلال ہے اور مجموعی طور پر جب وہ کسی امر میں متفق ہو جائیں، یعنی بھاری اکثریت سے تو ان کا موقف ایسا ہی حجت ہے جیسے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کا منکر نفسِ دین کا منکر ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے اس انکار کے ذریعے اس گروہ کی حجیت ختم کر دے، جن سے ہمیں دین ملا ہے، جنھوں نے دین قائم کیا ہے اور جنھیں اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا گواہ بتایا ہے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا صحابی اور مجتہد ہونا مسلم ہے۔ اب بڑی دلچسپ بات ہو گی کہ آپ جو کچھ صحابی اور مجتہد ہونے کی حیثیت سے حکم دیں وہ قابلِ پذیرائی ہو۔ لیکن امت کے حاکمِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے جو فرمائیں اور حکم نافذ کریں اس کی تعمیل واجب نہ رہے اور موجبِ رضائے الٰہی نہ ہو، کیوں کہ وہ حکم ہو گا ایک غیر راشد، بلکہ کٹکھنے بادشاہ کا۔ ایسا حکم سنت بھی نہیں کہلائے گا، کیوں کہ یہ ۴۱ھ کے بعد کا ہو گا اور اس وقت خلافتِ راشدہ کا

دور ختم ہو چکا ہوگا۔

موطا شریف، صحیح بخاری اور صحاح کی دوسری کتابوں میں امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے کے جو فتاویٰ مذکور ہیں اور آپ کے فقہی اجتہادات بیان ہوئے ہیں، وہ اب فقہا کے لیے نظیر نہیں رہیں گے اور کسی اسلامی حکومت کی دفعات میں انھیں بار نہیں ملے گا، کیا کبھی تیرہ سو برس کی اس مدت میں کسی صاحبِ ایمان نے ایسی بات کہی ہے یا کہہ سکتا ہے؟

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی جو حیثیتِ امامت تھی وہ صحابہ کرام اور اموی دور میں تو تھی ہی، لیکن بعد میں بھی یعنی خلافتِ عباسیہ میں بدستور قائم رہی۔ موطا کی تدوین امیر المومنین عبداللہ المنصور رحمہ اللہ کے فرمان کے مطابق کی گئی تھی۔ امیر المومنین محمد المہدی، امیر المومنین ہارون الرشید، امیر المومنین محمد الامین اور امیر المومنین عبداللہ المامون کو خود حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے اس کی سماعت کا شرف حاصل ہے۔ یہ سب ائمہ دین اس مبارک اور عظیم ترین کتاب الآثار میں امیر المومنین سیدنا معاویہ، امیر المومنین سیدنا مروان اور امیر المومنین سیدنا عبدالملک رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ اور فیصلے اور مرویات پڑھتے اور ان پر عمل کرتے تھے۔[1]

---

[1] وضعی روایات کے تحت عموماً یہ باور کروایا جاتا ہے کہ گویا پہلی صدی کے اختتام سے پہلے ہی عمالِ حکومت اور علمائے اسلام میں کافی بُعد پیدا ہو چکا تھا اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے دوری بنائے رکھتے تھے، جب کہ درست تاریخی حقائق اس بات کی کلیتاً نفی کرتے ہیں۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل پہلی مدون کتاب موطا امام مالک رحمہ اللہ کی بابت صاف تصریح موجود ہے کہ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور رحمہ اللہ کے کہنے پر امام مالک نے اس کی تدوین کا آغاز کیا تھا۔ حیات امام مالک میں علامہ ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ کا موطا جمع کرنا خلیفہ ابوجعفر المنصور عباسی رحمہ اللہ کے کہنے پر مبنی تھا، جس میں انھوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے درخواست کی تھی:

"حدیث کی ایک ایسی کتاب مدون کیجیے جس میں نہ تو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے شدائد ہوں، نہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شذوذ اور نہ ہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی رخصتیں۔ اس میں اوسط امور اور وہ باتیں جس میں صحابہ کا اجماع ہے درج کیجیے۔" ←

امیر المومنین عبداللہ المنصور رحمہ اللہ نے موطا کی تدوین کے متعلق جو فرمان حضرت امام مالک رحمہ اللہ کو بھیجا تھا، اسے علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنے مقدمہ میں نقل کیا ہے:

← اس مشورے کی بابت ابن خلدون رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

"فو اللّٰه لقد علمني التصنيف يومئذ"

''اللہ کی قسم! (ابوجعفر المنصور نے) مجھے اسی وقت تصنیفِ کتاب کا طریقہ سمجھا دیا۔''

بیان کیا جاتا ہے کہ امام مالک نے موطا کی تدوین مکمل کر کے اپنی کتاب عباسی خلیفہ ہارون الرشید عباسی رحمہ اللہ کے سامنے پیش کی جس پر انھوں نے کتاب کی کافی تعریف کی اور تجویز سامنے رکھی کہ اس کو کعبہ میں لٹکا دیا جائے، تاکہ تمام بلادِ اسلامیہ میں اس مجموعۂ حدیث کے تحت فقہ اسلامی پر عمل کروایا جا سکے، جس پر امام مالک رحمہ اللہ نے علمی توسع کے پیش نظر ہارون الرشید رحمہ اللہ کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔

پھر یہ بات بھی غور کرنے لائق ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید رحمہ اللہ اس کتاب کو پوری بلادِ اسلامیہ کا فقہی ماخذ بنانے کی بات کرتے ہیں، جس میں امام مالک رحمہ اللہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، سیدنا مروان رضی اللہ عنہ اور امیر عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ جیسے اموی اساطین کے فتاویٰ اور تعامل درج کیے ہیں۔ گویا سیاسی اختلاف اپنی جگہ لیکن علمی طور پر بنو امیہ اور بنو عباس میں کوئی باہمی تعصب نہیں تھا کیونکہ دونوں ہی قرآن وسنت کو دین کا ماخذ ماننے کے دعویدار تھے۔ پھر چار عباسی خلفا نے خود امام مالک رحمہ اللہ سے موطا امام مالک کی سماعت کی، یعنی امیر مہدی عباسی، امیر ہارون الرشید عباسی، امیر محمد الامین عباسی اور امیر عبداللہ المامون عباسی۔ علامہ سیوطی "تاريخ الخلفاء" (صفحه: ٣٩٤) میں لکھتے ہیں:

''قاضی فاضل نے ایک رسالے میں کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی بادشاہ نے طلبِ علم کے لیے سفر کیا ہو سوائے ہارون الرشید کے۔ وہ اپنے دونوں فرزندوں الامین اور المامون کے ساتھ موطا کی سماعت کے لیے امام مالک کے پاس گئے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے جس نسخے سے سماعت کی وہ مصریوں کے خزانے میں محفوظ تھا، پھر کہتے ہیں کہ اس کی سماعت کے لیے سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسکندریہ کا سفر کیا اور طاہر بن عوف سے اس کی سماعت کی۔ ایسے کسی تیسرے کو میں نہیں جانتا۔''

اسی طرح جب یحییٰ مصمودی رحمہ اللہ موطا امام مالک رحمہ اللہ کو لے کر مغرب گئے تو وہاں اموی حکومت کی سرپرستی میں موطا کو مقبولیت نصیب ہوئی اور یوں مالکی فقہ ان علاقوں کا دستور قرار پایا۔ گویا مشرق کے عباسی ہوں یا مغرب کے اموی، سب سیاسی اختلافات کے باوجود ایک دین کے پابند تھے۔ جس طرح عباسیوں نے موطا میں سیدنا مروان رضی اللہ عنہ اور امیر عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے فتاویٰ کو دین کی ←

”يا أبا عبد الله إنه لم يبق علىٰ وجه الأرض أعلم مني ومنك، وإني قد شغلتني الخلافة، فضع أنت للناس كتاباً ينتفعون به،

بابت حجت باور کیا، اسی طرح مغرب کے اموی امرا نے بھی اس کا خیال نہیں کیا کہ موطا کی تدوین عباسیوں کی زیرِ سرپرستی اور تجویز کے تحت ہوئی ہے۔ اسی طرح سے امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”الأم“ (٤/١٥٨) میں دیوانِ فاروقی کے سلسلے میں امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ عباسی خلیفہ المہدی عباسی کا تعامل بھی بطور نظیر شرعی درج فرمایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد کبیر جناب امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو خلافتِ عباسیہ میں جو مقام و مرتبہ حاصل تھا وہ کس سے مخفی ہے کہ دولت اسلامیہ کے پہلے قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے۔ بقول علامہ ابوزہرہ مصری کہ خلافتِ عباسیہ کا استحکام بھی ایک سبب تھا فقہ حنفی کی اشاعت اور فروغ میں۔ (حیات ابوحنیفہ للمولف ابوزہرہ مصری) بعینہٖ اسی طور سے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے مذاہب کو بھی مکمل فروغ اس وقت حاصل ہوا جب کہ عباسی خلفا نے ان کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کر لیا۔ امیر القادر باللہ عباسی رحمہ اللہ فقہ شافعی کے ائمہ میں سے تھے اور ساتھ ہی ایک اور عباسی خلیفہ امیر المسترشد باللہ رحمہ اللہ جو عمدۃ الدنیا و الدین کہلاتے تھے وہ بھی فقہ شافعی کے پیروکار تھے اور ان کے اسی لقب کی مناسبت سے امام ابوبکر الشاشی نے اپنی کتاب ”العمدۃ“ تحریر کی تھی۔ دیکھیں: ”طبقات الشافعیہ الکبریٰ“ (٤/٢٩١)۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امیر ہارون الرشید عباسی رحمہ اللہ کے کافی قریبی تعلقات کا مورخین وفقہا نے ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون الرشید امام مالک کے ساتھ ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ کے بھی کافی معتقد تھے۔ اسی طرح سے مامون اور مابعد کے معتزلی عباسیوں کے ظلم کے بعد جب متبع سنت عباسی خلیفہ جعفر المتوکل علی اللہ عباسی رحمہ اللہ برسرِ اقتدار آئے تو نہ صرف انھوں نے امام احمد رحمہ اللہ کو خلق قرآن کے مسئلے کی بابت صعوبتوں سے مکمل نجات دلوائی بلکہ ان کے مخلص معتقد رہے۔ یہی وجہ رہی کہ مابعد کے ادوار میں آنے والے عباسی خلیفہ امیر الناصر لدین اللہ اور امیر المستضی باللہ نے حنبلی مذہب اختیار کر کے اپنے عہدِ حکومت میں اس کی اشاعت کی۔

الغرض ایسا قطعی نہیں تھا کہ خلفائے اسلام اور علمائے اسلام میں کوئی مشرق و مغرب کا بُعد تھا بلکہ ہمارے اکثر خلفا و عمال امورِ دین کے ماہر بھی ہوتے تھے۔ محمد بن قاسم رحمہ اللہ جب سندھ فتح کرنے آئے تو اس وقت علومِ اسلامیہ کی کافی شد بد رکھتے تھے اور جس حجاج بن یوسف رحمہ اللہ نے انھیں سندھ فتح کرنے بھیجا اس کی قرآن فہمی اور ذوق قرآنی سے کس کو مجالِ انکار ہے۔ قرآن کی رکوعوں میں تقسیم اور ان پر حرکات و اعراب لگوانے کا کام امیر حجاج رحمہ اللہ نے ہی کروایا تھا۔ اسی طرح

تجنب فيه رخص ابن عباس و شدائد ابن عمر، و وطئه للناس توطئة" [1]

"اے ابوعبداللہ! روئے زمین پر اس وقت مجھ سے اور آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں رہا۔ مجھے خلافت نے مشغول کر رکھا ہے، لہٰذا آپ لوگوں کے لیے ایک ایسی کتاب مرتب کیجیے جس سے وہ فائدہ اٹھائیں۔ اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نرمی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سختی سے پرہیز کیجیے اور لوگوں کے لیے خوب خوب روندیئے (یعنی بغایت تحقیق کیجیے)۔"

"قال مالك: فو الله لقد علمني التصنيف يومئذ"

"حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بخدا اس فرمان کے ذریعے انھوں نے مجھے تصنیف کا طریقہ سکھلا دیا۔"

اسی لیے آپ نے اپنی کتاب کا نام "الموطا" (خوب روندی ہوئی یعنی بغایت محقق) رکھا۔ یہی کتاب مشرق و مغرب میں تمام اسلامی حکومتوں کا دستور اساسی قرار پائی۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خلفائے اسلام اور ائمۂ عظام کے ہاں امیر المومنین

← "الجوهر المضية في طبقات الحنفية" میں یہ تصریح ہے کہ سلطان محمود غزنوی فقہ میں کافی درک رکھتے تھے اور کئی فقہی مسائل کی تنقیح ان سے ثابت ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا تھا جنھوں نے طاہر بن عوف سے موطا کی سماعت کے لیے اسکندریہ کا سفر کیا۔ المختصر اسلامی تاریخ کے بیشتر خلفا و امرا اور سلاطین عام طور پر اصحابِ علم و فضل تھے جن کی زندگی علم سیاست کے ساتھ ساتھ علم دوستی میں بھی صرف ہوئی۔

نوٹ: بعض خلفا اور علمائے وقت کے مابین اختلافات اور باہمی نزاعات کے واقعات بھی ملتے ہیں، جن سے ہمیں مجال انکار نہیں، تاہم ایسے واقعات کافی کم ہیں اور چند علما تک ہی محدود ہیں۔ جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور معتزلی خلیفہ مامون عباسی کا اختلاف جس کی پاداش میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو سخت صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

[1] (ص: ۱۸) طبع مصر

معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ راشد اور امام برحق ہونے پر کس طرح اجماع رہا۔

چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام کو آلِ بُوَیہِ کے تسلط سے نجات دی تو مسلمانوں کے جذبات اور عباسی خلفا کے نظریات و معتقدات کا جو نظارہ امام ابو بکر بن العربی رحمہ اللہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تمام اہلِ اسلام کے لیے دیدنی ہے۔

”وهذه مدينة السلام دار خلافة بني العباس، وبينهم وبين بني أمية مالا يخفىٰ على الناس، مكتوب على أبواب مساجدها: خير الناس بعد رسول الله ﷺ أبو بكر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم علي، ثم معاوية خال المؤمنين“ [1]

”اور یہ ہے مدینۃ السلام (بغداد شریف) بنو العباس کا دارالخلافہ اور ان کے اور بنو امیہ کے درمیان جو کچھ ہے وہ لوگوں سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی مسجدوں کے دروازوں پر لکھا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد بہترین شخص ابو بکر ہیں، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی اور پھر معاویہ اہلِ ایمان کے ماموں رضی اللہ عنہم۔“

یہ ردِ عمل تھا آلِ بویہ کی شیطنت اور خبثِ نفس کا کہ انھوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر صراحتاً لعنت لکھوائی تھی اور اصحابِ ثلاثہ پر اجمالاً، چونکہ مسلمان اس وقت سیاسی اعتبار سے مغلوب تھے اور خلفا کے اختیارات سلب کیے جا چکے تھے، اس لیے وہ کچھ نہ کر سکے، لیکن جب وہ آزاد ہو گئے اور خلفا کی امامت واقعی ہو گئی تو جماعت کے عقائد کا اس طرح اعلان کیا گیا۔

اب عجیب تر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن حضرات کے متعلق بطور امرِ واقعہ اور نہایت زور دے کر فرمایا ہے: ﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ﴾ [الحجرات: ۷] ”یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔“ انھوں نے جب حضرت خلیفہ رسول اللہ ﷺ پر اجماع کر لیا تو وہ خلیفہ راشد ہو گئے اور ان کی خلافت کی حجیت قائم ہو گئی۔ پھر انھوں نے حضرت امیر المومنین عمر الفاروق رضی اللہ عنہ

---

[1] العواصم من القواصم (ص: ۲۱۳) طبع مصر

پر اجماع کیا تو وہ بھی خلیفہ راشد ہو گئے اور ان کا عمل سنت ٹھہرا۔ پھر انھوں نے امیر المومنین عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر اجماع کیا تو وہ بھی خلیفہ راشد ہو گئے اور ان کے خلاف کھڑے ہونے والا گروہ باغی اور واجب القتل ٹھہرا، لیکن جب انھوں نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اختلاف کیا اور نصف امت کے قریب ان کی بیعت سے محترز رہی تو اس اختلاف کے باوجود وہ خلیفہ راشد رہے، کیوں کہ ان کی خلافت تیس برس کے اندر تھی، البتہ جب انھی راشدوں نے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ پر اجماع کیا اور اس طرح کہ ساری امت میں ایک آدمی بھی نہ تھا، جو ان کی بیعت سے خارج ہو تو رشد و ہدایت کے سوتے بند ہو گئے۔ نہ خلیفہ راشد رہا اور نہ اس کی خلافت پر اجماع کرنے والے۔ نعوذ باللہ من شرور أنفسنا و من سیآت أعمالنا.[1]

---

[1] اسلامی شریعت پر مبنی مسلمانوں کی ہر حکومت، خلافت راشدہ ہی ہوگی، وہ الگ بات ہے کہ کسی خلافت میں رشد کا پہلو زیادہ ہوگا اور کسی میں کم، اور آخر میں یہ پہلو کم ہوتے ہوتے اس خلافت کو خلافت کے منصب سے اتار کر دنیاوی حکومت کے منصب پر فائز کر دے گا۔ سو جب ہم خلافت کی بات کرتے ہیں تو قرآن کی اصطلاح میں اس سے مطلب خلافتِ راشدہ ہی ہوتا ہے۔ قرآن کی زبان میں استخلاف فی الارض، وراثتِ ارضی، تمکن فی الارض اور ملوکیت ایک ہی معنی میں ہیں جیسا کہ سورۃ الحج میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ [الحج: ٤١]

''وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکات دیں گے اور اچھے کام کا حکم دیں گے اور برے کام سے روکیں گے، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔''

اور جیسا کہ داود علیہ السلام وغیرہ کے بارے میں ملک سے متعلق آیت آتی ہے، یعنی ایک ایسی حکومت جو اللہ کی عدالت کو دنیا میں قائم کرے، ظلم وطغیان سے اس کی زمین کو پاک کرے اور عام امن وسکون اور راحت وطمانیت کی ضامن ہو۔ قرآن میں اللہ نے کہیں بھی خلافت اور خلافت راشدہ میں تمیز نہیں کی، بلکہ اگر اپنے انبیا کی حکومتوں کا بھی ذکر کیا ہے تو ان کو صرف خلافت یا ملک ہی ←

فرمایا ہے، اور یہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انبیا سے بڑھ کر کسی اور انسان کی برپا کردہ خلافت، خلافتِ راشدہ نہیں ہوسکتی۔ مندرجہ ذیل آیات اس طرف رہنمائی کرتی ہیں:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ﴾ [الأنعام: ٦٥]

''اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین کے جانشین بنایا۔''

﴿يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ﴾ [ص: ٢٦]

''اے داوٗد! بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔''

اسی کو ملوکیت و مملکت فرمایا ہے:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ [ص: ٢٠]

''اور ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی اور اسے حکمت اور فیصلہ کن گفتگو عطا فرمائی۔''

اسی حکومت کی سلیمان علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی:

﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي﴾ [ص: ٣٥]

''اس نے کہا اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔''

شریعتِ اسلامیہ کے مطابق امت کا سیاسی نظام بغرض حفظ الدین و سیاست الدنیا جو ایک دنیوی صورت میں کتاب و سنت پر مبنی ہو خلافت راشدہ کہلاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ "إزالة الخفاء" میں خلافت کی مختصر الفاظ میں تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''خلافت کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ریاست عامہ ہوتی ہے جو دینی علوم کے رائج کرنے میں، اسلام کے ارکان قائم رکھنے، جہاد اور اس کے متعلقات برپا کرنے یعنی لشکروں کی تربیت اور مجاہدین کو وظائف دینے اور مالِ غنیمت تقسیم کرنے میں، قاضیوں کو مقرر کرنے، سزائے جرم کے اجرا اور مظالم کے دور کرنے میں نیز اچھے کاموں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے میں نبی ﷺ کی نیابت کی حیثیت میں ان امور کو انجام دے۔'' (۳/۱)

سو اس بابت اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ نبی علیہ السلام کے بعد جتنے خلفا آئے، کیا ان کی خلافت میں [سورۃ الحج: ۴۱] میں وارد صفات موجود تھیں، یعنی کیا انھوں نے صلاۃ کو قائم کیا، زکات کا ادارہ مستحکم رکھا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وجوب کا اعادہ کیا۔ اگر یہ ساری خصوصیات بعد کے خلفا کی حکومتوں میں پائی جاتی ہیں تو بلاشبہہ ان کی خلافت خلافتِ راشدہ ہی قرار دی جائے گی، البتہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ہر خلافت میں رشد کا پہلو کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

کی خلافت میں رشد کا پہلو بہت زیادہ تھا جو اس خلافت کو خلافت علی المنہاج النبوۃ تک لے جاتا ہے، یہی کچھ حال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تھا البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے زمانی دوری کے سبب رشد کے پہلو میں کچھ کمی واقع ہوئی لیکن اس قدر زیادہ نہیں، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آتا ہے، جو بقول امام مالک بن انس رحمہ اللہ خلافت علی المنہاج النبوۃ کا آخری دور قرار پاتا ہے۔اس کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوتا ہے جو آپسی خانہ جنگیوں اور اسلامی علاقوں پر غیر مکمل تسلط کی بنا پر خلافت علی منہاج النبوۃ کی دہلیز سے اتر کر خلافت راشدہ کے مقام تک آجاتا ہے۔سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں ایک خلیفہ راشد کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں، البتہ ان کو وہ موافق سیاسی حالات نہیں مل سکے جو ان کی خلافت کو خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا ہم پلہ بنا سکتے لیکن چونکہ ان سب خانہ جنگیوں کے باوجود سورۃ الحج میں بیان کردہ ساری شرائط سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں موجود تھیں یعنی صلاۃ کا قیام، زکوٰۃ کا نظام اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر، سو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت خلافت راشدہ قرار پائی اور صحابی وعشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہ ہونے کی حیثیت سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد۔

اس کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور آتا ہے جو خانہ جنگیوں سے پاک اور ایک انتہائی پرامن دور ہوتا ہے، جس میں اسلامی جہاد کا رکا سلسلہ دوبارہ سے شروع ہوجاتا ہے اور پوری مملکتِ اسلامیہ ایک جھنڈے تلے جمع ہوکر کفار کے خلاف جہاد کا علم بلند کرتی نظر آتی ہے۔سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں خلافت راشدہ کے لیے لازم سارے عناصر پائے جاتے ہیں جو صلاۃ کے قیام سے لے کر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر تک زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہیں اور بقول شاہ ولی اللہ جس میں جہاد بھی موجود ہے جس کا سلسلہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں آپسی خانہ جنگیوں کی وجہ سے موقوف ہو گیا تھا۔عملاً حکومت کے تمام عہدے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی اکثریت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور بقول عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ امور جہانبانی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔سو صحابی ہونے کی حیثیت سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد اور ان کی خلافت خلافت راشدہ تھی۔ ذاتی فضائل میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ وسیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کوئی مقابلہ نہیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے بہت بڑھ کر تھا، لیکن ایک بے لاگ مورخ کی نظروں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے زیادہ مستحکم اور خلافتِ راشدہ کی شرائط پر اترنے والی تھی جس کی سب سے مستند دلیل دورِ علی و معاویہ رضی اللہ عنہما میں موجود جمہور صحابہ رضی اللہ عنہ کا طرز عمل ہے کہ وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم جنھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے توقف کیا اور نہ ہی قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، ان سب نے بخوشی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے برسر اقتدار آتے ہی ان کی خلافت کی بیعت کر لی، جبکہ یہی

⬅ اصحابِ رسول ﷺ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور میں خانہ جنگی کے فتنوں سے علاحدہ رہے اور انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔ ان اصحاب میں ممتاز نام عشرہ مبشرہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ، زاہد صحابی سید نا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور تیس سالہ خلافت والی ضعیف حدیث کے راوی صحابی سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ وغیرہ شامل تھے۔

سخت تعجب کی بات ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایک ''خلیفہ راشد'' یعنی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں ''الراشدون'' یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے بیعت خلافت کرنے کے باوجود انھیں زمرۂ خلفائے راشدین سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ بقول علامہ عبدالشکور لکھنوی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو استخلاف فی الارض کی نعمت بھی حاصل ہوئی کہ انصار و مہاجرین کے ایک گروہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور تمکین دین بھی ان کو حاصل تھی کہ دین ان کا وہی تھا جو خلفائے ثلاثہ کا تھا اور وہ دین تمکین پاچکا تھا، تاہم ایک نعمتِ امن ان کو حاصل نہ تھی، کیوں کہ ان کے عہد میں مسلمانوں میں لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ ''تحفہ خلافت'' (صفحہ: ۲۵)

جب کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو استخلاف فی الارض کی نعمت بھی حاصل رہی کہ اربابِ حل و عقد یعنی انصار و مہاجرین نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ تمکینِ دین بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو حاصل رہی کہ ان کا دین وہی تھا جو خلفائے خمسہ کا تھا، ساتھ ہی ان کو کامل نعمتِ امن بھی حاصل رہی کہ ان کے بیس سالہ عہد میں مسلمانوں نے آپسی لڑائیوں سے نجات پا کر چین کا سانس لیا اور جہادی سرگرمیوں میں واپس مشغول ہو گئے، یہی وجہ تھی کہ جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو ''خلافتِ راشدہ'' منتقل کر دی تو اس اتمام امن پر اس سال کو ''عام الجماعۃ'' قرار دے دیا گیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سیدنا علی و سیدنا حسن رضی اللہ عنہما کی خلافتیں تو نعمتِ امن نہ ہونے کے سبب بھی خلافت راشدہ کہلائیں (اور بے شک وہ خلافت راشدہ تھیں) لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی امن و سکون اور تمکین دین و تمکن فی الارض والی خلافت، خلافت نہیں ملوکیت کہلائے۔ فیا للعجب!

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر تیمی صاحب ایک سائل کے جواب میں فرماتے ہیں:

① ''خلافتِ راشدہ کو چار خلفا تک محدود کرنا درست نہیں ہے اور کسی بھی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ چار کے عدد ہی کو محدود ہے۔ اس بارے جو روایات نقل کی جاتی ہے، وہ نہ صرف ضعیف ہیں بلکہ صحیح روایات کے خلاف بھی ہیں۔ اور اگر ان کو صحیح مان بھی لیا جائے تو بھی ان سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ خلفائے راشدین چار ہی ہیں، بلکہ اہلِ سنت کا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور امام مہدی رحمہ اللہ کے خلیفہ راشد ہونے پر اتفاق ہے۔'' ⬅

② دوسری بات یہ ہے کہ خلیفہ راشد کی اصطلاح سلف میں نہیں تھی بلکہ یہ بعد میں متعارف ہوئی ہے۔ کتاب وسنت کی اصطلاحات خلافت اور خلفاء ہیں جیسا کہ متفق علیہ روایت میں ہے: "وأنه لا نبي بعدي، وسيكون الخلفاء فيكثرون" ''میرے بعد نبی کوئی نہیں ہے لیکن خلفا بہت سے ہوں گے۔'' البتہ کتاب وسنت میں بعض خلفا کو ناخلف کہا گیا ہے اور بعض کو راشد۔

③ تیسری بات یہ ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بلاشبہہ خلیفہ راشد تھے لیکن سلف میں چونکہ خلیفہ راشد کی اصطلاح مروج نہیں تھی، لہٰذا براہِ راست تو ایسی کوئی عبارت آپ کو نہیں ملے گی، لیکن ایسی عبارات ضرور مل جائیں گی کہ جن کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خلیفہ راشد تھے جیسا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے: "لو رأيتم معاوية لقلتم هذا المهدي" ''اگر تم معاویہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے تو یہ کہتے کہ یہ امام مہدی رحمہ اللہ ہی ہیں۔'' اور امام مہدی کا خلیفہ راشد ہونا اہلِ سنت اور اہلِ تشیع دونوں میں متفق علیہ ہے۔'' (مکالمہ، صفحہ: ۱۶۵)

مقامِ حیرت تو یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز جنھیں خلیفہ راشد باور کروایا جاتا ہے وہ اسی ''ملوکیت'' کے تحت اقتدار میں آئے جس کا بانی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو قرار دیا جاتا ہے اور پھر جاتے جاتے عمر بن عبدالعزیز نے اقتدار اسی ملوکیت کے تحت یزید بن عبدالملک کو سونپنے کا سوچا جو اسی ''مذموم'' نظام حکومت کا پروردہ تھا۔ اگر یہ ملوکیت اتنی ہی بری شے تھی تو ''خلیفۂ راشد'' عمر بن عبدالعزیز اس کے ''شر الملک'' جناب سلیمان بن عبدالملک کے مشیر کیونکر رہے اور نہ صرف مشیر رہے، بلکہ ولی عہد بھی مقرر ہو گئے۔ چلو سلیمان نے بہت زور زبردستی کر کے آپ کو ولی عہد بنا بھی دیا تھا تو اس کے انتقال کے بعد عمر بن عبدالعزیز کو معاویہ بن یزید بن معاویہ کی طرح سے اقتدار چھوڑ کر ''شوروی انتخاب'' کا مشورہ دے دینا چاہیے تھا اور پھر اگر لوگ ان کو خلیفہ منتخب کر لیتے تو وہ خلیفہ بن جاتے۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز نے یہ بھی نہ کیا بلکہ ''کاٹ کھانے والی ملوکیت'' کے ذریعے اقتدار میں آئے، پھر اسی ملوکیت کو ''کمزور'' کرنے کے لیے سارے اقدامات کیے۔ لیکن اس کی سرکوبی کا سب سے بڑا قدم یعنی جاتے جاتے ولی عہد مقرر کرنے کے بجائے ملوکیت کو ''شوروی انتخاب'' کے ذریعے دوبارہ خلافت میں بدلنے کے بجائے پھر سے بنو امیہ سے ولی عہد مقرر کر کے اسی ملوکیت کے ہاتھ مضبوط کر بیٹھے۔

اب اس کے دو ہی مطلب لیے جا سکتے ہیں: یا تو عمر بن عبدالعزیز کے سارے اقدامات معاذ اللہ منافقانہ تھے کہ اسی نظام کا حصہ بنے رہے جس کو برا سمجھتے تھے اور اسی کو مزید مضبوط کر کے چلتے بنے، یا پھر یہ مان لیا جائے کہ ان کے نزدیک ملوکیت کبھی منبع فساد تھی ہی نہیں، ان کو اپنے پیشرو چند خلفا سے انتظامی وحکومتی اختلاف تھا جس کی اصلاح کی اپنے تئیں انھوں نے کوشش کی، تاہم یہ



اختلاف اسی نوعیت کا تھا جس نوعیت کا اختلاف امور جہانبانی میں ایک سلطان کو دوسرے سلطان سے عموماً ہوتا ہے۔اس سے کوئی ایک صحیح و ''راشد'' اور بقیہ غیر صحیح و ''غیر راشد'' نہیں ٹھہر جاتے۔

پھر حیرت کی بات تو یہ بھی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کو نامزد کرنے والے اصحاب رسول نہیں، بلکہ ملوکیت کے سرکردہ جناب سلیمان بن عبدالملک تھے اور ان کے ہاتھ پر بیعت بھی ''غیر قرآنی راشدین'' نے کی تھی اور ان کی حکومت کے عمال بھی یہی لوگ تھے، پھر بھی عمر بن عبدالعزیز خلیفہ راشد، جبکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو برسراقتدار لانے والے انصار و مہاجرین اور ازروئے قرآن ''الراشدون'' تھے اور ان کے حکومتی عمال کی اکثریت بھی انھیں راشدین پر مشتمل تھی، لیکن پھر بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد نہیں، جب کہ قرآنی نص سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ''راشد'' ہیں، جب کہ ایسی کوئی چیز نص سے عمر بن عبدالعزیز کے لیے ثابت نہیں۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

دین کی حفاظت

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے جتنے کارنامے گذشتہ صفحات میں مذکور ہوئے، وہ اگرچہ بغایت درجہ درخشاں اور امت کے لیے موجبِ فخر اور لائقِ اتباع ہیں، لیکن یہ سب باتیں وہ ہیں جنھیں ہر مخلص صاحبِ عزیمت وقوت کیا کرتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ ایسی قابلِ فخر اور مایہ ناز ہستیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے خلفا وامرا وسلاطین میں ایسی بڑی بڑی اور پرعظمت شخصیتیں پیدا ہوئیں اور پے بہ پے کثیر تعداد میں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ جسے دیکھو آفتابِ جلالت اور ماہتابِ رفعت ہے۔

لیکن یہاں ہم سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس حکمتِ عملی سے بحث کرنا چاہتے ہیں، جس کے سبب وہ واقعی کشتیِ ملت کے ناخدا ثابت ہوئے۔ انھوں نے محض سیاسی نظام ہی مستحکم نہیں کیا۔ بلکہ دین کو خالص رکھنے کا بھی نہایت موثر بندوبست کر گئے۔ ان کے عہدِ خلافت سے پہلے تین عظیم الشان تحریکیں اسلام پر اثر انداز ہونی شروع ہوگئی تھیں۔ ان تحریکوں کا اگرچہ منبع ایک ہی ہے، یعنی ایران لیکن اہمیت اور فاعلیت کے اعتبار سے ان میں فرق ہے۔

① عجم کی سیاسی حرکت:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے ایران کو دار الاسلام بنا دیا تو انھوں نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سر اٹھایا اور کوشش کی کہ مسلمانوں کے اندرونی اختلال سے فائدہ اٹھا کر ''عربوں'' کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور اپنی مستقل حکومت قائم کر لیں۔ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اپنی داخلی مشکلات کے باوجود اس تحریک

کو پوری قوت سے کچل دیا اور یوں ایران میں دوبارہ امن قائم کر دینے اور اسلام کی حکومت مضبوط کر دینے کا سہرا امیر زیاد رضی اللہ عنہ کے سر رہا۔ جس کا تذکرہ مسعودی نے اسی تلبیس کے انداز میں کیا ہے جو اس کا وتیرہ ہے اور ''امیر زیاد'' کے عنوان کے تحت اس کتاب میں ملے گا۔

اس قسم کی سیاسی تحریکیں بعد میں بھی اٹھیں، مثلاً: امیر المومنین ہشام رحمہ اللہ کے زمانے میں بربروں کی بغاوت، لیکن سوائے سیاسی انتشار کے مسلمانوں پر اور کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہر بڑی اور وسیع حکومت کو ایسے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر حکومت طاقتور ہوئی تو ایسی بغاوتیں فرو کر دی جاتی ہیں۔ جیسے امیر المومنین ہشام رحمہ اللہ نے بربروں کی سرکوبی کر دی، ورنہ پھر مملکت کے حدودِ اربعہ سے کچھ علاقے نکل جایا کرتے ہیں، جیسے یہی بربروں کا علاقہ عباسیوں کے دور میں سبائیوں کی سازش سے نکل گیا، لیکن دین کے اعتبار سے ان تحریکوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ [آل عمران: ۱٤۰]

''ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔''

② سبائی تحریک:

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام کے ''خطرہ'' کا سب سے پہلے احساس ایران کو ہوا۔ چنانچہ دعوتِ محمدیہ کو ناکام کرنے کے لیے ایران ہی کے زیرِ اثر علاقوں میں مدعیانِ نبوت کھڑے کیے گئے، جنھیں حضرت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم کر دیا۔[1] امتِ مسلمہ کا یہ

---

[1] قتالِ مرتدین کے سلسلے میں مورخین نے عموماً سب تفصیلات دی ہیں، لیکن زیادہ حسن اور اجمال کے ساتھ ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو محمد خضری، محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ (۱/۱۷۳) لیکن ان تفصیلات میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا کہ مرتدین کا مسئلہ طے کر چکنے کے بعد ایران کے خلاف فوجی اقدامات کی فوری ضرورت کیوں پیش آئی، حالانکہ تاریخی حیثیت سے یہ نہایت اہم مسئلہ تھا اور اس کی صفائی ضروری تھی۔ ←

اجماعی مسئلہ ہے کہ نبوت ختم ہو گئی۔ قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ میں اس مسئلے کو نہایت صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے اور مسلمانوں نے بے تکلف ہر اس شخص کی تکذیب کی جو

اب ہم تاریخی حیثیت سے اس کا پسِ منظر معلوم کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں دیکھنا ہے کہ ایران کے خلاف فوجوں کی حرکت محض جذباتی تھی یا اس کا کوئی فوری محکم سبب بھی تھا۔

۷ھ میں نبی کریم ﷺ نے شاہانِ عالم کو دعوتِ اسلام دی تھی اور اپنے قاصد بھیجے تھے، کسریٰ کے پاس سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا۔ نامۂ مبارک پڑھ کر کسریٰ اتنا برافروختہ ہوا کہ اسے چاک کر کے پرزے پرزے کر دیا اور اپنے نائب کو حکم بھیجا کہ اس حجازی مدعیِ نبوت کو گرفتار کر کے یہاں بھیج دو۔ اس زمانے میں ایران کی طرف سے یمن کی حکومت سیدنا باذان رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی جو اس وقت کافر تھے۔

نبی کریم ﷺ پر کسریٰ کے ''فرمان'' کی تعمیل کرنے کے لیے دو قوی ایرانیوں کو مدینہ بھیج دیا۔ کسریٰ کی حکومت کے احساسِ برتری اور طاقت کے غرور کا یہ عالم تھا کہ عرب کے ایک طاقتور حکمران کی گرفتاری کے لیے دو آدمیوں کا بھیج دینا کافی سمجھا گیا۔ یہ دونوں جب حاضر ہوئے تو رعبِ نبوی سے ان کے سب دم خم فنا ہو گئے اور انھوں نے عاجزی کے ساتھ صورتِ حال عرض کر دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمھارا مقصد پورا نہیں ہوگا، تمھارا بادشاہ مارا جا چکا ہے اور عنقریب میرا دین اور میرا تسلط تمھاری مملکت پر ہو جائے گا۔ اس پرعظمت اور نورانی ماحول نے ان کے دلوں کو متاثر کیا۔ وحی کی صداقت کا یقین لے کر وہ واپس ہوئے اور سیدنا باذان رضی اللہ عنہ کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا۔ یہاں پہلے ہی خسرو پرویز کے قتل کی اطلاع آ چکی تھی اور نئے بادشاہ شیرویہ کا فرمان بھی کہ نبیِ عربی ﷺ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے قاصدوں کے ذریعے سیدنا باذان رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام بھجوایا تھا کہ اگر انھوں نے دینِ اسلام قبول کر لیا تو یمن کی حکومت پر بدستور فائز رہیں گے۔ ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ سیدنا باذان رضی اللہ عنہ اور ان کے سب ایرانی ساتھی صدقِ دل سے مسلمان ہو گئے اور یوں یمن کا علاقہ بطور خود دارالاسلام بن گیا۔

گویا دینی اور سیاسی حیثیت سے بظاہر اب کوئی بات ایسی نہ تھی جو حکومتِ اسلامیہ اور سلطنتِ ایران کے درمیان مسلمانوں کے نزدیک مابہ النزاع ہو۔ مگر ایران کے نزدیک سیدنا باذان رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام موجبِ تشویش تھا اور عجمی سیاست و ثقافت کے لیے سخت خطرناک۔ لہٰذا ان کے اہلِ تدبیر نے ایک نہایت موثر چال چلی کہ اپنے زیرِ اثر علاقوں میں مدعیانِ نبوت کو کھڑا کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ دینِ اسلام کی عالمگیری کی روک تھام اگر نہ کی گئی تو پھر عجم کی قوت اس سیل میں بہ جائے گی اور قومی

اپنے اوپر وحیِ الٰہی کا دعویٰ لے کر اٹھا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے بطور پیش بندی کے امت کو متنبہ کر دیا کہ تیس کے قریب دجال کذاب پیدا ہوں گے، جن میں ہر شخص نبی اللہ ہونے کا

← عصبیت کے تحت قاطبتاً تمام عرب اس نئے نبی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائے گا جس کی دعوت کا توڑ نہیں۔ چنانچہ اہلِ عرب میں قبائلی عصبیت کو زیادہ موثر انداز میں ابھارنے کے لیے طاقتور قبیلوں میں حریف جھوٹی نبوتیں برپا کی گئیں۔ ''سر مار بدستِ دشمن کوب'' اہلِ کفر کا قدیم شعار ہے۔ انھیں مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے ہر جگہ یہ نسخہ آزما کر کامیابی ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ اسی اصول کے تحت اسود عنسی یمن میں، مسیلمہ کذاب یمامہ میں اور طلیحہ اسدی کو بنو اسد اور طے میں کھڑا کیا گیا۔ لوگوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ جھوٹی نبوتیں قریش کی نبوت کے جواب میں عصبیت جاہلیہ کے تحت کھڑی کی گئیں۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ انھیں کھڑا کس نے کیا ہے اور نہ اس پر توجہ کی کہ جن علاقوں میں یہ جھوٹے مدعی کھڑے ہوئے ہیں وہ انہی علاقوں میں کیوں کھڑے ہوئے جہاں ایرانی سیاست چل رہی تھی۔

ان مدعیانِ نبوت میں سب سے زیادہ اہمیت مسیلمہ کذاب کی ہے کہ وہ بڑے طمطراق سے قریش کی نبوت کو چیلنج دینے کھڑا ہوا تھا۔ خلیفۂ رسول نے تمام مرتدوں سے قتال کے لیے فوجیں روانہ کیں۔ مسیلمہ کے مقابلے پر سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا اور آپ کو ہدایت دی کہ یمامہ کو زیر کرنے کے بعد ایران کی سرکوبی کے لیے آگے بڑھیں اور اس کا خیال رکھیں کہ جو لوگ ارتداد سے توبہ کر کے دوبارہ مسلمان ہوئے ہوں، ان میں سے کوئی شخص اسلامی فوج میں شامل نہ ہونے پائے۔

یہ تحدید صرف سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے لیے تھی۔ باقی مجاہدوں پر اس کی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ طلیحہ اسدی جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور اپنی حرکت پر منفعل رہے، ان کی سرکوبی کے لیے جب لشکرِ اسلام بنی طے کے علاقے کی طرف چلا تو سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ طیبہ میں موجود تھے اور آپ نے حضرت خلیفۂ رسول ﷺ سے خاص طور پر اس کی اجازت لے لی تھی کہ اپنے قبائل کی حفاظت اور اصلاح کے لیے جائیں۔ آپ نے اجازت دے دی اور سیدنا عدی رضی اللہ عنہ بڑی تیزی کے ساتھ کہیں لڑتے اور کہیں سمجھا کر اصلاح کرتے ہوئے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ سے جا ملے اور درخواست کی کہ تین دن کی مہلت دیں اور فوجی پیش قدمی روک دیں۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے منظور کر لیا اور یوں سیدنا عدی رضی اللہ عنہ نے ان قبائل کے لوگوں کو اسلام پر قائم رکھنے میں کامیابی حاصل کی اور ایک ہزار کے قریب جانباز تائبوں کو لے کر سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔

گویا جب تک جنگ عربی قبائل سے تھی، حضرت خلیفۂ رسول کو اس پر اعتراض نہ تھا کہ توبہ کرنے والوں کو اپنی توبہ کی صداقت کے ثبوت میں جہاد کی اجازت دی جائے، لیکن جونہی ایران کے خلاف پیش قدمی کا وقت آیا تو آپ نے طریقہ کار بدل دیا اور اس کی اجازت نہ دی کہ توبہ کرنے ←

دعویٰ کرے گا۔ اب عجیب بات ہے کہ بعد میں جتنے لوگ بھی یہ دعویٰ لے کر اٹھے ان سب کی اصل ایرانی ہے، اگرچہ نسلاً وہ عرب ہوں، جیسے: مختار ثقفی یا حبشی، مثلاً: بہبوذ زنگی، کیوں کہ

➜ والے لوگ مجاہدین کے لشکر میں شامل ہوں۔ یہ محض اس لیے تھا کہ ایرانی حکومت نے اپنے زیرِاثر علاقوں کو ذہنی طور پر مغلوب کر لیا تھا اور یمامہ وغیرہ کے لوگ اس ناپاک اتحاد میں شریک تھے جو دعوتِ محمدیہ کو شکست دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ عرب کا نقشہ سامنے رکھ کر اس صورتِ حال کو سمجھنا چاہیے کہ تغلب وطے اور یمامہ کے تمام ساحلی علاقوں کے مقابل ایران کی چھاؤنیاں قائم تھیں۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے یمامہ سے فارغ ہو کر ایران کے ایک طاقتور سرحدی قلعہ دار ہرمز کو اسلامی شعار کے مطابق دعوتِ مبارزت بھیج دی۔ مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ طریقہ ہے کہ سخت سے سخت دشمن کے خلاف بھی فوجی کارروائیوں میں پیش قدمی نہیں کرتے، اگرچہ دنیا کا اور اربابِ سیاست کا یہ وتیرہ نہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے کفار حربی سے مقابلے کے وقت بھی توبہ کا آخری موقع دیا جاتا ہے کہ اسلام لاؤ یا جزیہ دو ورنہ پھر جنگ ہے۔ مرتدوں کو بھی اسی انداز میں دعوت دی گئی تھی، سوائے اس کے کہ جزیہ کا ذکر نہ تھا، کیونکہ وہ مرتد تھے۔ ان کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے یا اسلام لائیں یا جنگ کریں۔

سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کو یہ چیلنج دینے کی ضرورت اصولاً نہیں تھی، کیوں کہ ایران جنگ میں کود چکا تھا۔ دشمن کا حلیف اور پشت پناہ بھی دشمن ہی ہوتا ہے۔ اب یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ہرمز کے ساتھ اسلامی فوجوں کا پہلا تصادم کاظمہ پر ہوا تھا جو عرب کے حدود میں ہے۔ گویا وہ عرب میں داخل ہو کر مسلمانوں کے مقابلے پر آیا تھا۔ پھر بھی کیا یہ سمجھنے میں دشواری ہے کہ ان تمام مدعیانِ نبوت کو شہ دینے اور وسائل مہیا کرنے کی باگ ایرانی مدبروں کے ہاتھ میں تھی؟ اس لیے حضرت خلیفۂ رسول کے لیے واجب تھا کہ اندرونی اختلال رفع کر کے اس بڑے دشمن کی سرکوبی کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی اور بے سروسامان مسلمانوں نے قلتِ تعداد کے باوجود تھوڑی سی مدت میں ایران کو دارالاسلام بنا دیا۔

لیکن ایران کی اس سیاسی مغلوبیت سے عجمی ذہن پر وطن پرستی برابر مستولی رہی۔ بالآخر یہ ترکیب چلی گئی کہ سیدنا علی زین العابدین کو ان کی حقیقی والدہ سے چھین کر ایک فرضی ماں کا بیٹا بنا دیا گیا اور اس کا خیالی نام شہر بانو بھی تجویز کر لیا گیا۔ اس فرضی وجود اور خیالی نام کو طرح طرح سے شہرت دی گئی، اس کی شان میں قصیدے کہے گئے، منقبتیں لکھی گئیں اور جس طرح ممکن ہو سکا اسے حقیقی وجود بنانے کی کوشش کی گئی، تاآنکہ یہ انتساب اب گویا حقیقتِ ثابتہ ہے اور جسے دیکھو وہ یہ سمجھتا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے یہ فرزند اور ''ائمہ'' کے یہ مورث ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد کے نواسے تھے۔

یہ محض اس لیے ہے کہ ایرانی عوام کو بہکایا جا سکے کہ مسلمان ہو جانے سے ہمارا رشتہ تختِ کیانی ➜

نبوت کا دعویٰ جس شخص نے بھی کیا، سبائی تحریک کا متبع ہونے کے بعد کیا، حتی کہ آخر زمانے میں بہائی تحریک بھی سرزمینِ ایران ہی سے اٹھی۔ جس کے قیام کا مقصد خود اس تحریک کے داعی بتاتے ہیں کہ قرآن مجید کو منسوخ کر کے نیا دین برپا کرنا ہے۔ برکوچک پاک و ہند میں بھی ایک صاحب نے دعویٰ کیا تھا۔ اب یہ بات کتنی دلچسپ ہے کہ خود ان کے اپنے اعتراف کے مطابق ان کے آبا و اجداد میں کسی نے فارسی الاصل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن ان صاحب کی ''نبوت'' کی تکمیل اس وقت نہ ہوسکی جب تک ان پر ''وحی'' نہ آ گئی کہ ان کی اصل ایرانی ہے۔

عجم پر سب سے زیادہ شاق ہے نبی کریم ﷺ کی خاتمیت، قرآن حکیم کی قطعیت، کعبۃ اللہ کی مرکزیت اور عربی زبان کی جامعیت۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری اور دائمی عالمگیر دین کی جتنی اساسی باتیں رکھیں انھی کو فنا کرنے کی سب ترکیبیں ان مدعیانِ نبوت کی قسمت میں لکھی گئیں۔ عربی رسم الخط بدلنے اور اپنی اپنی زبانوں سے عربی الفاظ نکال دینے کی غایت یہی ہے، کیوں کہ عربی الفاظ و محاورات تمام مسلم زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے اور وحدتِ ملیہ کو موثر بنانے کا ذریعہ ہیں، ان سے ''نجات دلا کر'' مسلم قوموں کو ایک دوسرے سے اجنبی بنا دینا آسان ہو جائے گا۔

اسی سرزمینِ ایران سے اجلّہ علما وفقہا وصوفیہ اٹھے، نورِ محمدی پوری طرح پھیلا لیکن

← سے ٹوٹا نہیں ہے، بلکہ ہم کسریٰ کے نواسوں کی امامت میں ہیں اور ان کے مذہب کے پیرو۔ اس طرح عربوں کے خلاف عموماً اور اموی خلفا کے خلاف خصوصاً جو محاذ قائم کیا گیا تھا اسے یوں تقویت کی۔ علامہ شبلی رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ اچھی طرح صاف کر دیا ہے، بلکہ ابھی حال میں ایرانی محقق پروفیسر سعیدی غریب نے بھی تو یہ سچی بات کہہ دی تھی: ''سیدنا زین العابدین کی والدہ کا یہ نسب وضعی ہے، تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔'' تو ان کے گھر پر پتھراؤ کیا گیا، تاآنکہ حکومت نے ان کی حفاظت کا انتظام کر دیا۔

علمائے انساب کے نزدیک سیدنا علی زین العابدین رحمہ اللہ کی والدہ ماجدہ کا اسمِ گرامی سلافتہ یا غزالہ تھا۔ معارف، مولفہ ابن قتیبہ میں پہلا نام دیا گیا ہے، اور طبقات ابن سعد میں دوسرا۔ (ملاحظہ ہو: شاہ معین الدین ندوی کی تابعین، ص: ۲۹۶)۔ (مولف)

اس نور کو ماند کرنے کی سب تحریکیں بھی یہیں سے پروان چڑھیں اور یہیں سے پرچمِ اسلام کو سرنگوں کرنے کی بھی جدوجہد ہمیشہ ہوتی رہی۔ ان تحریکوں کا صحیح اور موثر نقطہ آغاز ہے عبداللہ بن سبا (ابن السواء) جس کا مقصد تھا دینِ مبین کو مسخ اور امتِ محمدیہ کو باہمی افتراق و انشقاق کے ذریعے پست کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے چار کام کیے، تین نمایاں اور ایک خفیہ۔

پہلا نمایاں کام تھا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے عمال کے خلاف امت کو ابھارنا۔ اسی کے نتیجے میں امیر المومنین کی شہادت کا المناک ترین حادثہ رونما ہوا جس نے تمام عالمِ اسلام کو ہلا ڈالا، لیکن امت اس تحریک میں ملوث نہیں۔ چند شریر النفس دشمنانِ دین کے ہاتھوں یہ ظلمِ عظیم ہوا اور محض اس لیے کہ امیر المومنین نے ان باغیوں کے خلاف حرکت کرنے والوں کو اپنی بیعت سے خارج کر دینے کی دھمکی دے دی تھی، ورنہ ان کی سرکوبی چنداں مشکل نہ تھی۔ آخر زمانے میں آپ کی خواہش ہوئی تھی کہ ان کا مقابلہ کیا جائے، لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا، مشیت یونہی تھی۔

﴿لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ [الأنفال: ٣٧]

''تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے۔''

ابن سبا کا دوسرا مقصد تھا قریش کو نامقبول بنانا اور تیسرا نصب العین تھا کسی ایک کا نام لے کر باقیوں کو دین کا دشمن ثابت کرنا۔ یہ بالکل اتفاق ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے کے لیے تیار ہو گئے، ورنہ ان لوگوں نے اول سیدنا طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو تاکا تھا۔ یہ سب حضرات تو اپنے آپ کو صاف بچا لے گئے، لیکن امت کی بدقسمتی تھی کہ اول خود بار بار انکار کر چکنے کے باوجود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تمام مخلصوں بلکہ فرزندوں اور بھائیوں تک کی رائے ٹھکرا کر محض امت کی خیر خواہی میں امامت قبول فرما لی، اگر آپ یہ نہ کرتے تب بھی ممکن تھا کہ اس ٹولی کے عزائم کو خاک میں ملا دیا جاتا۔

لیکن اب انھیں سہارا مل گیا تھا اور یوں ان لوگوں نے آپ کی جناب میں غلو کر

کے دوسروں کی بے حرمتی کا کام شروع کر دیا۔ اگلوں پچھلوں سب کو لپیٹ لیا، کسی کو نہ چھوڑا جس پر طعنہ زن نہ ہوئے ہوں اور پھر نئے نئے عقیدے ایجاد کیے۔ چونکہ ابن سبا اپنی اصل میں یہودی تھا اور اپنی تحریک میں مجوسی، اس لیے دینِ اسلام میں اس نے دونوں طریقوں کی پیروی کی۔ کم سے کم بات جو اس نے ایجاد کی وہ یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو معصوم قرار دے کر انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے ہی ''وصی'' بنا دیا جیسے سیدنا یوشع بن نون علیہ السلام کو یہودی لوگ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا وصی کہتے ہیں۔ چنانچہ مسعودی نے آپ کی شہادت کی تاریخ بھی وہی متعین کر دی جو انھوں نے بطور خود سیدنا یوشع علیہ السلام کی وفات کی فرض کر رکھی ہے۔ یہ شخص امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے کہلواتا ہے اور وہ بھی قسمیہ:

''ثم قال: أما واللّٰه أنها الليلة التي ضرب فيها يوشع بن نون ليلة سبع عشرة''[1]

''پھر آپ (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: بخدا یہی ہے وہ رات جس میں یوشع بن نون کو شہید کیا گیا تھا، یعنی سترھویں شب۔''

ناظرین کرام کو غالباً کتابِ مقدس کے اس بیان سے دلچسپی ہوگی کہ سیدنا یوشع علیہ السلام شہید نہیں ہوئے تھے، بلکہ انھوں نے ایک سو دس برس کی عمر میں طبعی طور پر وفات پائی تھی۔ (کتاب مقدس، صحیفۂ یوشع: باب ۲۴، آیت ۲۹)

''وصی'' ہونے کے معنی ہیں خلفائے پیشین کو غاصب اور متغلب بتانا اور معصوم ہونے کا مطلب ہے کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی، جو کریں سو صواب ہے، نکتہ چینی کی گنجایش نہیں، حالانکہ سب سے زیادہ نکتہ چینی کرنے والا یہی گروہ تھا۔ قدم قدم پر ان کی راہ میں رکاوٹیں انھی نے ڈالیں، جیسا کہ گذشتہ اوراق سے ثابت ہو چکا۔

بہرحال یہ سب سے ہلکی بات ہے جو انھوں نے کہی، ورنہ ان میں تو یہاں تک

---

[1] مروج الذهب (٤٢٦/٢)

کہنے والے بھی موجود ہیں کہ نبوت کے لیے فی الحقیقت انتخاب ہوا تھا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا، لیکن جبرائیل علیہ السلام دھوکا کھا گئے اور غلطی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے آئے۔ پھر اللہ نے بھی کہا، چلو کوئی بات نہیں کہ ایک بھائی نبی نہ ہوا دوسرا ہو گیا۔ اس غلطی کا سبب انھوں نے یہ بتایا تھا کہ ''دونوں آپس میں ایسے مشابہ تھے جیسے کوا کوے کے'' تشبیہ کے الفاظ کے اس دلنشین انتخاب کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی عقل کی خیرگی دیدنی ہے کہ صورتاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی مشابہت نہ تھی، دونوں کا حلیہ کتابوں میں مرقوم ہے اور بسند صحیح امت کو پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ ایک صاحب چالیس برس کی پختہ عمر کے تھے اور دوسرے نوعمر لڑکے۔ ایسی دو ہستیوں میں ایک جانور کو بھی دھوکا نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ ناموسِ اکبر کو۔ مگر بات تو کچھ نہ کچھ کہنی ہی چاہیے۔

اس احمقانہ بلکہ خبیثانہ تصور و تشبیہ کے علاوہ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہتے ہیں اور ایسے لوگ بکثرت ہیں جو آپ کی اولاد میں سے بعض کے اندر الٰہی صفات کے قائل ہیں اور انھیں مافوق البشر جانتے ہیں۔

امام ابو الحسن الاشعری رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''مقالات الاسلامیین'' میں ان کے عجیب وغریب عقائد بیان کیے، فرماتے ہیں:

> ''بعض غالیوں میں وہ لوگ ہیں جن کا گمان ہے کہ روح القدس ہی اللہ ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں حلول کیا، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ میں، پھر حسن رضی اللہ عنہ میں، تا آنکہ باقی دس اماموں میں ان کے امام منتظر تک حلول کرتی چلی گئی۔ ان سب کو یہ لوگ معبود ہونے کا درجہ دیتے ہیں۔
>
> ''بعض کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی خدا ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ لوگ برا جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ نے تو انھیں اپنے متعلق وضاحت کرنے کے لیے بھیجا تھا، لیکن وہ کر بیٹھے اپنی نبوت کا دعویٰ۔

"بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ ہستیوں میں حلول کیا، یعنی نبی کریم ﷺ میں، علی میں، حسن میں، حسین میں اور فاطمہ رضی اللہ عنہم میں۔ ان کے مقابلے میں پانچ شیطان ہیں، یعنی ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ اور عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہم)۔"[1]

منصبِ نبوت کے اس استخفاف کے ساتھ، قرآن حکیم پر بھی انھوں نے حرف رکھا اور کہا کہ یہ اصل قرآن نہیں جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر اتارا تھا، بلکہ ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم نے اس میں کمی بیشی اور تغیر و تبدل کیا ہے۔ یہ مسئلہ ان کے ہاں اس درجہ مسلم ہے کہ ان کے ایک مجتہد اور صاحبِ کلام لکھنوی صاحب نے ایک عجیب استدلال پیش کیا ہے اور اپنی دانست میں قلم توڑ دیے ہیں۔ فرماتے ہیں: ہم نے جو یہ کہا ہے کہ صحابہ نے قرآن میں تبدیلی کی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ابوبکر نے فلاں آیت بڑھائی اور عمر نے فلاں آیت نکال دی، بلکہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے قلوب نے جب حق کو قبول نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ آیتیں نازل نہیں کیں جو وہ کرنا چاہتا تھا، اس لیے کہ ان تعلیمات کو ان لوگوں کے قلوب قبول نہ کرتے۔ اس طرح یہ اصل قرآن نازل نہ ہو سکنے کا سبب بنے۔

یہ عقیدہ محض برائے گفتن نہیں ہے، بلکہ امیر المومنین القادر باللہ رحمہ اللہ کے زمانے میں انھوں نے ایک مصحف نکالا اور دعویٰ کیا کہ یہ مصحف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ہے، چونکہ یہ مصحف قرآن حکیم سے بہت مختلف تھا اور ان لوگوں کا اپنا وضع کردہ، اس لیے اس حرکت سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ امیر المومنین نے علما و فقہا کی مجلس طلب کر کے اسے ان کے سامنے پیش کیا۔ امام احمد بن محمد اسفرائینی نے اسے آگ لگا دینے کا فتویٰ دیا اور یوں یہ فتنہ دبا۔ یہ واقعہ ۳۹۸ھ کا ہے۔ آلِ بویہ اپنے عروج پر تھے اور امیر المومنین اپنے تمام فضائلِ ذاتیہ کے باوجود ان لوگوں پر حدِ شرعی جاری نہ کر سکے اور محض مصحف جلانے پر اکتفا کر لیا۔ (طبقات الشافعیة الکبریٰ: ۳/ ۲۶، طبع مصر)

[1] المنتقٰی (ص: ۱۰۰۔۱۰۱)

ان کے ہاں صحیح ترین ماخذ کلینی کی الکافی ہے جس کا درجہ وہی ہے جو اہلِ ایمان کے ہاں صحیح بخاری کا ہے۔ اس میں جابر الجعفی سے روایت ہے جو اس نے محمد الباقر رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کی:

''جس شخص کا یہ دعویٰ ہو کہ پورا قرآن اسی طرح جمع کیا گیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے تو وہ شخص جھوٹا ہے۔ اللہ نے اسے جس طرح اتارا ہے اسی طرح جمع کر کے کسی نے حفظ نہیں کیا۔ سوائے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اور ان کے بعد کے ائمہ کے۔'' (کلینی، ص: ۵۴، طبع ۱۲۸۸ھ)

پھر اسی کتاب کے صفحہ (۵۷) پر ابو بصیر کی روایت ہے:

''میں ابو عبداللہ (جعفر الصادق) کے پاس گیا...... تا آنکہ ابو عبداللہ نے دعویٰ کیا: ''ہمارے پاس مصحفِ فاطمہ علیہا السلام ہے۔'' میں نے پوچھا: ''مصحفِ فاطمہ کیا ہے؟'' تو جواب دیا: ''وہ ایسا مصحف ہے کہ تمھارے اس قرآن سے تین گنا ہے اور بخدا اس میں تمھارے اس قرآن کا ایک حرف بھی نہیں۔''

قرآن مجید کے متعلق اس تصور کی ضرورت ان لوگوں کو اس لیے پیش آئی کہ اپنے مخصوص عقائد کو یہ کتابِ مبین سے ثابت نہیں کر سکتے، بلکہ اپنے ہر خاص مسئلے میں اسے عیاناً اپنے خلاف پاتے ہیں، لہٰذا ان کا گمان ہے کہ اصل قرآن ان کے امامِ غائب لے کر آئیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے یہی قرآن حفظ کیا، اپنے دور میں اسی کی اشاعت کی اور تراویح میں اسی کو پڑھا اور سنا، وہی تراویح جو سبائیوں کے ہاں حرام ہے۔

رسول اور کتاب کو اس طرح ختم کر دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اصحابِ رسول اور اہلِ بیتِ اطہار کے متعلق جھوٹی روایتوں کا وہ جال پھیلایا کہ اچھے اچھے سمجھ دار لوگ ان کے چکر میں آ گئے۔ گویا کتاب اور رسول کے ساتھ امت بھی غائب۔ علامہ محبّ الدین الخطیب نے المنتقیٰ کے صفحہ (۲۳) میں حاشیہ میں یہ واقعہ بیان کیا ہے:

''اہل السنۃ کے ایک عالم حضرت ابراہیم الراوی نے ایک شیعہ مجتہد محمد مہدی سبزواری کے نام ۱۴ صفر ۱۳۴۷ھ کو ایک مراسلہ بھیجا، جس میں انھوں نے ایک شیعہ عالم بہاء الدین عاملی کی اس حرکت پر اظہارِ افسوس کیا تھا کہ قرآن پاک کی جو آیت ہے: ﴿ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ ﴾ [التوبة: ٧٤] ''وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے بات نہیں کہی، حالانکہ بلاشبہہ یقیناً انھوں نے کفر کی بات کہی اور اپنے اسلام کے بعد کفر کیا۔'' اس آیت کی تفسیر انھوں نے بیضاوی شریف کے حاشیے پر لکھ دی کہ یہ آیت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما صحابہ کے بارے میں اتری ہے۔''

اب حضرت ابراہیم الراوی پوچھتے ہیں کہ اگر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور باقی صحابہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ایک لاکھ سے زیادہ تھے، اب ان میں پانچ یا چھے یا سات کو چھوڑ کر باقی سب کے سب کافر ہو گئے یا منافق تھے، یا ایسے ہی مرتد ہو گئے جیسے عرب کے قبائل ہو گئے تھے تو انھیں چاہیے تھا کہ دینِ جاہلیت کا اعلان کرتے اور مرتدوں سے قتال نہ کرتے۔ پھر یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیئیس برس کی مدت ان کافروں کے ساتھ رہے اور اس طویل عرصے میں ایک کافر بیوی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہیں اور آپ کو ان کا علم نہ ہو سکا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگلوں اور پچھلوں کا علم دے دیا تھا۔''

اس کے جواب میں سبزواری صاحب نے ۴ ربیع الاول کا لکھا ہوا مراسلہ بھیجا، جس میں فرماتے ہیں:

''خدا آپ کا سایہ قائم رکھے، آپ فرماتے ہیں کہ اگر ارتدادِ صحابہ کے بارے میں جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، شیعوں کا یہ قول صحیح ہے کہ استثنا صرف پانچ چھے سات کا ہے، حالانکہ صحیح استثنا صرف تین کا ہے تو پھر ابوبکر نے

اہلِ ارتداد سے جہاد کیوں کیا اور اسلام کی طرف انھیں واپس کیوں لائے؟ تو بات یہ ہے کہ ان کا کفر حکمی ہے، ایسا واقعی کفر نہیں جیسا دیوی اور بتوں کے پوجنے والوں کا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ہے کہ شیعہ لوگ صحابہ اور عائشہ کے کفر کا عقیدہ نبی کی زندگی میں نہیں رکھتے، بلکہ وہ تو صرف یہ کہتے ہیں کہ نبی کی وفات کے بعد یہ سب مرتد ہو گئے۔''

گویا ارتدادِ صحابہ کا عقیدہ اس بیسویں صدی تک متواتر چلا آ رہا ہے اور کلینی کی کتاب الکافی جب تک موجود ہے اس وقت تک قرآن کے محرف اور مفقود ہونے کا عقیدہ بھی قائم رہے گا۔

دراصل یہ تحریک ویسی ہی ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کے دین کو مسخ کرنے کے لیے پولوس یہودی نے شروع کی تھی۔ یہ شخص یہودیوں کے سامنے اپنے آپ کو یہودی کہتا تھا، یونانیوں کے سامنے یونانی اور رومیوں کے سامنے رومی۔ اس طرح وہ نصرانیت کو ایک مشرکانہ دین بنا کر ایسی شکل دے دینے میں کامیاب ہو گیا جسے سیدنا مسیح علیہ السلام سے ظاہری و باطنی کوئی تعلق نہیں۔ آپ کی بھی کتاب غائب کر دی گئی اور اس کی جگہ لوگوں کی تصنیف کی ہوئی متضاد قسم کی کتابیں رکھ دی گئیں جن کے مصنفوں کے بارے میں بھی حتمی علم نہیں کہ کون تھے۔ ان کے ہاں بھی اصحابِ رسول کی بے حرمتی کا یہ عالم ہے کہ ہر وہ شخص جس سے پولوس کو اختلاف ہوا، اسے شیطان بنا دیا گیا، حالانکہ خود پولوس نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ظاہر میں دیکھا بھی نہیں تھا، چہ جائیکہ آپ سے اخذِ نور کیا ہو۔ اس نے آپ کے اصحاب کو دیکھا تھا، مگر ان سب کو اس نے گمراہ قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ شریعتِ موسوی کے پابند تھے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام خود فرماتے ہیں: ''یہ خیال کبھی نہ کرنا کہ میں شریعت یا انبیا کی تعلیمات کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ میں ضائع کرنے نہیں آیا، بلکہ ان تعلیمات کو پورا کرنے آیا ہوں۔ میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ آسمان و زمین ٹل جائیں، لیکن شریعت کا ایک شوشہ بھی

ضائع نہیں کیا جا سکتا، جب تک سب کا سب پورا نہ ہو جائے۔'' (عہدِ جدید: متی: باب، آیت ۱۷۔۱۸) اس کے مقابلے میں پولوس کہتا ہے: ''ہم شریعت کے تحت پیدا نہیں ہوئے، بلکہ لطفِ مسیح میں پرورش پاتے ہیں۔''

اس طرح اول یہ دلنشین بات کہی کہ ہمیں قانون کے الفاظ کے بجائے اس کی روح پر جانا چاہیے۔ پھر آخر میں کہہ دیا کہ ''شریعت لعنت ہے۔'' اسی ذیل میں سیدنا مسیح علیہ السلام کی ابنیت، کفارہ اور صلیب کے متعلق عقائد ایجاد کیے اور رفتہ رفتہ اپنے متبعین کو سنتِ انبیا سے ہٹا دیا۔

آج خود نصرانی مفکر مثلاً ڈبلیو ریڈ (W. Wrede) یہ کہنے پر مجبور ہیں:

''پولوس اور مسیح دونوں کو بیک وقت قبول نہیں کیا جا سکتا، اگر رہنما پولوس ہے تو مسیح نہیں اور اگر مسیح ہیں تو پولوس نہیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا ۱۷/۳۹۳، زیرِ عنوان پال)

اسی عزیمت کے ساتھ ابن سبا نے بھی اپنی تحریک شروع کی اور پولوس ہی کے قدم بقدم چلا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول، آخری کتاب اور آخری امت کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو توفیق دی کہ وہ اپنے نظامِ خلافت کو اس نہج پر قائم کریں کہ دشمنانِ دین و ملت کو نفسِ دین پر دسترس نہ ہو سکے اور اگر کبھی انھیں سیاسی بالادستی حاصل ہو جائے تو جماعت کی اتنی قوت ہو کہ یہ لوگ کھل کر کام نہ کر سکیں۔ اس انتظام کا سہرا امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سر ہے، جیسا کہ آگے بیان ہو گا۔

③ خوارج:

تیسری تخریبی تحریک خارجیوں کی تھی۔ اپنی اصل میں تو یہ بھی سبائی تھے، لیکن صرف اس حد تک جو سبائیہ کی ظاہری تحریک تھی۔ یعنی قریش کے خلاف نفرت اور اسی کے ضمن میں جمہور صحابہ پر طعن۔

یہ لوگ بہت قرآن پڑھتے تھے اور نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ طویل نمازیں

پڑھنا ان کا شعار تھا۔ شریعت کے احکام پر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے۔ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے ان کے نزدیک آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ان کا نام قراء پڑ گیا تھا (یعنی بہت قرآن پڑھنے والے)۔ ان کا اصل مطمحِ نظر اتنا تھا کہ امت کی قیادت قریش سے چھین کر تمام امت پر عام کر دی جائے۔ نفسِ دین کے عقائد و اعمال میں امت کو ان سے چنداں اختلاف نہیں۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہایت اصیل بنیاد پر ان کے سیاسی مطالبے کی پذیرائی نہیں کی۔ اگر اس وقت خوارج کی بات مان لی جاتی تو دین محفوظ نہ رہتا اور معلوم نہیں اس کی صورتِ نوعیہ کیا ہوتی۔

ان خوارج میں سے کسی نے نہ قرآن اترتا دیکھا تھا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی تھی۔ مگر قرآن اور سنت کے مفسر بہرحال بن بیٹھے اور جمہور امت کی تکفیر کے قائل ہو گئے۔ جیسے آج کل فلاں صاحب اور فلاں صاحب اپنے آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ دین کا عالم اور امت کا خیرخواہ باور کر کے یہ خیال قائم کیے بیٹھے ہیں کہ تیرہ سو برس سے یہ امت اپنے مسائل میں گمراہ چلی آ رہی ہے اور اس بارے میں کسی قسم کی گستاخی بلکہ دریدہ دہنی سے بھی انھیں گریز نہیں۔ یہی کیفیت خوارج کی تھی۔ امت کو ان سے جو اختلاف تھا وہ ان کے غلو سے تھا، ان کی فرقے بازی سے تھا اور ان کے اس ادعا سے تھا کہ ان میں دین کی سمجھ صحابہ سے زیادہ ہے۔

اگر یہ لوگ میانہ روی اختیار کرتے، ملت سے اپنا رشتہ جوڑے رکھتے تو ان کی قوت دین کی حمایت میں صرف ہوتی اور ان کی کارروائیاں اس طرح تخریبی نہ ہوتیں جس طرح ہوئیں کہ جب تک عملاً انھیں فنا نہ کر دیا گیا، امت کو ان کی چیرہ دستیوں سے نجات نہ ملی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان خوارج کو دین سے باہر سمجھا اور ان کے خلاف جہاد کو لازم جانا۔ اتنی رعایت کی کہ جب تک یہ جمعیت بنا کر مقابلے پر نہ آئیں انھیں چھیڑا نہ جائے، لیکن اگر جنگ ہو تو پھر ان کے ساتھ معاملہ کفر کا سا کیا جائے۔

نہروان کی جنگ میں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے جب ان لوگوں کو قتل کیا تو ان کی نعشیں بے گور و کفن چھوڑ دی گئیں اور ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ ان کے ساتھ یہی طرزِ عمل امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کا رہا، بلکہ بعد کے تمام خلفا کا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک طرزِ عمل یہ تھا اور ایک وہ تھا جو شہدا جمل وصفین کے ساتھ آپ کا اور اہلِ جمل وصفین کا رہا۔

مسعودی نے یہ بالکل افترا کیا ہے کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا برتاؤ جمل وصفین اور نہروان تینوں میں مختلف رہا۔ وہ کہتا ہے کہ شہدائے صفین کی آپ کے ہاں وہ حرمت نہ تھی جو شہدائے جمل کی تھی کہ طرفین نے سب کی نمازِ جنازہ بلاامتیاز پڑھی اور یکساں عزت و احترام کے ساتھ ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اس کا خیال نہیں کیا جاتا تھا کہ آدمی شہید کس طرح سے ہوا ہے۔

ہم کہتے ہیں اور یہی امرِ واقعہ ہے کہ شہدائے صفین کے ساتھ بھی یہی طرزِ عمل تھا اور مسعودی نے جو غلط بیانیاں کی ہیں وہ سب بے سروپا ہیں۔ ہر شخص کی سمجھ میں یہ بات آ سکتی ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا برتاؤ شہدائے صفین کے بارے میں جانبدار نہ ہوتا یا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنا طرزِ عمل معاندانہ رکھا ہوتا تو پھر متارکۂ جنگ کی کوئی سبیل نہ تھی۔ جیسے خوارج کے مقابلے میں قتال ترک نہیں کیا گیا۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ (۸/۲۰) میں حافظ عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی روایت نقل کی ہے کہ صفین کے موقع پر ایک شخص نے کہا:

''اَللّٰھُمَّ الْعَنْ أَھْلَ الشَّامِ'' ''اے اللہ! اہلِ شام پر لعنت کر۔''

تو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لا تسبّ أهل الشام فإن بها الأبدال، فإن بها الأبدال، فإن بها الأبدال''

''اہلِ شام کو برا مت کہنا، کیوں کہ ان میں ابدال ہیں، ان میں ابدال ہیں،

ان میں ابدال ہیں۔''

اور پیچھے ''البدایہ والنہایہ'' ہی سے ہم امیر المومنین کا وہ خطبہ نقل کر آئے ہیں جس میں آپ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کارکنوں کے کردار کی رفعت اور اپنے نام نہاد کارکنوں کی پستی بیان فرمائی تھی۔

بہرحال دینِ مبین اور امتِ مسلمہ کے خلاف یہ تین تحریکیں تھیں جن میں سے ایک کو ایک عرصۂ دراز کے لیے کچل دیا گیا، یعنی ایران کی بغاوت کو۔ ایک کو عملاً ختم کر دیا گیا، یعنی خوارج کو۔ جنگِ نہروان کے بعد ان کی حیثیت ایک جداگانہ اقلیت کی ہوگئی اور گو ان سے بڑے ہولناک معرکے ہوئے، حتی کہ امیر المومنین ہشام کے عہد تک، مگر یہ مسلمانوں کے اندرونی مسائل پر اثر انداز نہ ہو سکے اور مسلم معاشرہ ان کے اثر سے محفوظ رہا۔

پھر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بیعت کر لینے کے بعد سبائی لوگ بھی کچھ پست ہو گئے۔ اس طرح زمامِ کار پھر قریش کے ہاتھ میں آ گئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہی مقام مل گیا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقرر کیا تھا کہ تمام امور میں امت کی قیادت وہی کریں اور انھی کا منہاج معیاری قرار پائے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھی کی راہ کو سبیل المومنین بتایا ہے۔

مصلحتِ ملیہ کا بھی اصولی تقاضا یہی تھا، تاکہ دعوتِ محمدیہ اپنے اصل خدوخال کے ساتھ قائم رہے اور اس میں غیر عناصر کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ چنانچہ آخر عہدِ اموی تک عموماً مناصبِ حکومت و عدالت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کو فائز رکھا جاتا تھا اور فوجوں کی قیادت بھی وہی کرتے تھے۔ جن بعض مناصب پر تابعین کو رکھا گیا تو اس میں بھی یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ اجلّہ صحابہ کی انھوں نے صحبت اٹھائی ہو۔ غرض یہ ہے کہ زندگی کے چھوٹے بڑے ہر مسئلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی امت کی رہنمائی فرماتے تھے جن میں سے بعض اہم شخصیتوں کے نام انھی صفحات میں ملیں گے۔

دین کے اولین علمبردار قریش ہیں جنھوں نے پورے غور و خوض کے بعد ایک

مخالف ماحول میں دین قبول کیا تھا اور پھر ظاہری و باطنی ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر اسے برپا رکھا، حتی کہ اس کی خاطر وطن بھی چھوڑ دیا۔ ان کے بعد درجہ ہے انصار کا، مرتبے کے اعتبار سے نہیں، کیوں کہ مرتبے میں دونوں طبقے برابر ہیں اور دونوں لازم و ملزوم ہیں، بلکہ افادیت کی حیثیت سے۔

انھوں نے ایمان قبول کر کے مہاجروں کو ٹھکانا دیا اور یوں دعوتِ محمدیہ کو ایک مرکز مل گیا۔ یہی مہاجر و انصار ہیں جنھیں بارگاہِ احدیت سے ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الأنفال: ٤] ''یہی لوگ سچے مومن ہیں۔'' کا صداقت نامہ ملا، یعنی یہی ہیں صحیح معنی میں اہلِ ایمان۔ انھی کی راہ میں ہدایت محصور کر دی گئی۔ ان کے منہاج سے ہٹ کر جو راہ اختیار کی جائے گی وہ اہلِ ایمان کی نہ ہوگی:

﴿وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ [النساء: ١١٥]

''اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے۔''

قیادت کی شرط:

تمام اہلِ فکر متفق اللسان ہیں اور ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ تحریک کی قیادت اس کے داعیوں اور بانیوں ہی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے، ورنہ وہ اپنی اصل سے ہٹ جائے گی۔ دین قائم کیا تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے، اس لیے سبائیہ اور خوارج کی یہ بات قبول نہیں کی جا سکتی کہ قیادت قریش کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اس کا نظام بالکل وہی ہونا چاہیے تھا جو مہاجر و انصار تجویز کریں۔

جن لوگوں نے اہلِ عالم کی تحریکوں کا علمی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے، ان پر یہ

حقیقت کھل گئی ہوگی کہ ہر وہ تحریک جس کا دائرۂ عمل وسیع اور پھر سرعت کے ساتھ مقبولیت حاصل کر لے، اس میں اگر انحطاط آتا ہے تو ان لوگوں کی وجہ سے جو اجتماعی حیثیت سے اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں اور انھیں اتنا موقع نہیں ملتا کہ انفرادی طور پر تحریک کا بغائر مطالعہ کریں، اسے پرکھیں اور اس کے نظریات و اعمال براہِ راست ان لوگوں سے لیں جو تحریک کے اصل داعی ہیں اور جنھوں نے جان و مال قربان کر کے اس کی آبیاری کی ہے۔

اجتماعی طور پر تحریک میں شامل ہونے والے لوگ ایک وقتی اور ظاہری تاثر کے تحت شامل ہوتے ہیں اور جونہی انھیں کچھ اہمیت حاصل ہونے لگتی ہے تو پھر اس کے درپے ہو جاتے ہیں کہ اپنے قدیم نظریات کو نئی تحریک میں سمو دیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خام تصورات کے تحت لوگ ایک تحریک میں شامل ہوتے ہیں اور پھر خام ہی تصورات کے تحت چاہتے ہیں کہ تحریک کی قیود سے اپنے آپ کو آزاد کر لیں، یعنی فی الحقیقت خود تحریک میں شامل نہیں ہوتے، بلکہ تحریک کو اپنے مقاصد کے لیے کام میں لانا چاہتے ہیں۔

ہر بڑی تحریک کے ساتھ یہی ہوتا ہے اور معمارانِ عالم سمجھتے ہیں کہ دعوت کے تحفظ و کارگری کے لیے وہ کیا ذرائع کام میں لائیں۔

فتوحاتِ اسلامیہ کے نتیجے میں قومیں کی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔ ان کے سامنے مقابلے کے لیے صرف دو باتیں تھیں۔ ایک پرانی غلامی اور نئی آزادی کا فرق اور دوسری چیز تھی فاتحوں کا بلند کردار اور نظامِ اسلام کی راحتیں۔ ان لوگوں نے بس یہ ظاہر دیکھا اور مسلمان ہو گئے۔ خلفائے اسلام کی نگرانی میں علما و فقہائے ملت نے نومسلموں کی تربیت کی ذمے داری اٹھائی اور ہر جگہ تعلیم کے دائرے قائم کیے۔ یہ سلسلہ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک سے باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوا اور سنتِ نبویہ کے آداب کے مطابق ان اداروں کی تشکیل کی گئی۔ امیر المومنین ولید اول کے زمانے میں اتنی ترقی ہو گئی کہ ہر وہ عرب جو قرآن مجید حفظ کر لیتا تھا اس کا سرکاری وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا اور اس کا

کام یہ تھا کہ نومسلموں میں تعلیماتِ قرآنیہ پھیلائے۔ ان بزرگوں کی چونکہ زبان عربی تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا تابعینِ عظام سے بلاواسطہ فیض ہوتا تھا اس لیے ان حضرات کو قرآن کی خالص تعلیمات پیش کرنے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں وہ تفسیری پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوئیں جو عجمی مفسروں کی پیدا کردہ ہیں، بلکہ آج تک جتنے لوگوں نے قرآن مجید میں عجیب وغریب معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان سب کی اصل غیر عربی ہے اور چونکہ زبان پر عبور نہیں اس لیے ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اکثر و بیشتر معانیِ قرآن مسخ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ایک ایسے مفسرِ قرآن بھی پیدا ہوئے ہیں جو خیر سے صرف پنجابی جانتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ نے نومسلم افراد کی تربیت تو خوب کی اور ان میں سے ایسے بڑے ائمہ پیدا ہوئے کہ جس قوم میں بھی ایسے لوگ ہوں وہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، چہ جائیکہ اس کثرت سے ہوں جتنے مسلمانوں میں پیدا ہوئے، لیکن اجتماعی پیمانے پر ایسا نہیں ہوتا کہ پوری قوم کا ذہنی رجحان فوراً بدل جائے اور قدیم نسلی ثقافت کے اثرات بالکلیہ نئے قالب میں ڈھل جائیں۔ یہ کام کئی نسلوں میں پورا ہوتا ہے، اس لیے تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ اور ان تربیتی اداروں کے باوجود اس کی سخت ضرورت رہتی ہے کہ جو لوگ اجتماعی حیثیت سے تحریک میں شامل ہوئے ہیں، ان کے حقیقی رجحانات کا جائزہ لیا جاتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نفسیاتی تجزیے کا کتابِ مبین میں حکم دیا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ﴾

[الممتحنة: ١٠]

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمھارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کی جانچ پڑتال کرو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جاننے والا ہے۔ پھر اگر تم جان لو کہ وہ مومن ہیں تو انھیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔“

یہ ایسا واضح اور تعمیری حکم ہے کہ اس کی حکمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ہوسکتا ہے کہ ایک زبردست خاتون اپنے گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے نیا دین قبول کر کے آزادی حاصل کرنا چاہے یا کوئی دوسرا سبب ہو، اس لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ واقعی اس نے یہ اقدام حق پرستی کے تحت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ محض اس عورت کا اقرار اور زبانی بیان تو کافی نہیں اور نہ ظاہر میں اسلامی معاشرے کی پابندی کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اچھی طرح تحقیقات کرنی چاہیے تاکہ پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں۔ ''اللہ ان کے ایمان کا بہتر علم رکھتا ہے'' اس آیت کا ایسا زبردست ٹکڑا ہے کہ باید و شاید۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک عورت سچے دل سے مسلمان ہوئی ہو لیکن تحقیقات کرنے والے لوگ اس کے ایمان کو نہ پہچان سکیں اور دار الکفر کی طرف لوٹا دیں تو ان پر کوئی الزام نہیں، کیوں کہ ان کا مقصد تعمیر تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اسلامی معاشرے کو اندرونی اختلال سے محفوظ رکھیں۔

بعینہٖ اسی اصول کی پابندی ان نومسلموں کے بارے میں بھی لازمی ہے جو اجتماعی طور پر مسلمان ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سفلی جذبہ کام کر رہا ہو، یا تبدیلِ مذہب محض سطحی ہو۔ اس تعمیری اصول کے تحت امیر المومنین ہشام نے ان نومسلموں پر جزیہ قائم رکھا جو اجتماعی حیثیت سے مسلمان ہوئے تھے۔ اس جزیے کی شرح سالانہ کم ہوتی چلی جاتی تھی اور اس کا انحصار ان لوگوں کے ثباتِ قلب پر تھا۔

اس حکمتِ عملی سے وہ لوگ برافروختہ ہو گئے جو ظاہر دین دیکھتے تھے اور انھوں نے اسے دنیا طلبی پر محمول کیا اور یہ معنی دیے کہ چونکہ لوگوں کے بکثرت مسلمان ہو جانے سے حکومت کو جزیے کی کم آمدنی ملنے لگی، اس لیے خلافت کی طرف سے یہ حرکت ہوئی۔ واقعی حجروں میں بیٹھ کر چلے کھینچنے والے یا درسی کتابیں پڑھ کر دستارِ فضیلت حاصل کرنے والے حضرات ان مصالح پر کیا نگاہ ڈال سکتے ہیں جو قوم کے معماروں کے سامنے ہوتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی ایک ''بڑے عالم'' نے ''مجددانہ تبحر'' کے ساتھ اس جزیہ قائم رکھنے کو

اسلام کی اشاعت میں رکاوٹوں سے تعبیر کیا ہے اور فرماتے ہیں: ''جس کی بدترین مثال نومسلموں پر جزیہ لگانے کی صورت میں ظاہر ہوئی۔'' اب ان صاحب سے پوچھا جائے کہ جزیہ لگانا اور جزیہ اس طرح قائم رکھنا کہ سالانہ اس کی شرح گھٹتی رہے، یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے مترادف ہیں؟ پھر ان سے پوچھا جائے کہ تاریخی تجربہ کیا کہتا ہے؟ یہ لوگ جن پر جزیہ قائم رکھا گیا، وہ پھر اپنے دین پر لوٹ گئے یا مسلمان رہے؟ اگر اپنے دینِ قدیم پر واپس ہو گئے تو معلوم ہوا کہ مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے اور اگر دینِ اسلام پر قائم رہے تو جزیہ قائم رکھنے سے اشاعتِ اسلام پر کیا اثر پڑا؟ یہ صاحب جو صرف نسلی تعصب اور برہمنی تصور میں مبتلا ہیں اور اسی لیے اپنا حق سمجھتے ہیں کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے متعلق جس قسم کی لغو بات چاہیں کہہ دیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے تاریخ کا مطالعہ مسعودی اور طبری کی کتاب سے کیا ہو تو کیا ہو، لیکن روایات کی تنقیح اور دعوت کی غایت کے زاویۂ نگاہ سے نہیں کیا۔

ایک واقعہ علامہ خضری نے امیر المومنین یزید ثانی کے عہد کی تفصیلات میں نقل کیا ہے، اس سے سب صورتِ حال سامنے آ جاتی ہے:

''امیر المومنین ہشام نے خراسان کی ولایت اَشرس بن عبداللہ سلمی کے سپرد کی اور حکم دیا کہ اس بارے میں (اپنے بھائی) خالد کو مراسلہ بھیجیں۔ یہ اشرس بڑے فاضل تھے اور خوبیوں کے مالک، اسی لیے ان کے فضائل کی بنا پر انھیں ''کامل'' کہا جاتا تھا۔ جب آپ خراسان آئے تو لوگوں کو مسرت ہوئی۔ آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ اہلِ سمرقند و ماوراء النہر کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ اسلام لے آئیں تو ان پر سے جزیہ اٹھا لیا جائے گا۔ چنانچہ لوگ اسلام کی طرف دوڑ پڑے۔ صاحبِ خراج نے اشرس کو خط لکھا کہ اب کے خراج بہت کم ہو گیا۔ اشرس نے اس پر امیرِ سمرقند کو خط بھیجا کہ خراج مسلمانوں کی قوت کا سبب ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہلِ صغد وغیرہم نے رغبتِ دلی کے سبب اسلام

قبول نہیں کیا، بلکہ صرف جزیہ سے بچنے کے لیے مسلمان ہوئے ہیں، لہٰذا دیکھو کہ جس نے ختنہ کرائی ہے، فرائض ادا کرتا ہے اور قرآن کی کوئی سورت یاد کر لی ہے تو اس پر سے جزیہ اٹھا دو۔

امیر اشرس نے اہلِ صغد کو اسلام کی تبلیغ کرنے کے لیے جن صاحب کو بھیجا تھا ان کا نام تھا ابو صیداء صالح بن طریف۔ انھوں نے جب دیکھا کہ عمال ان لوگوں سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں جو اسلام لے آئے ہیں تو انھیں اس بات سے روکا۔ وہ اپنی بات پر اڑے رہے اور یہ اپنی بات پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ صغد نے (جزیہ دینے کا) حکم ماننے سے انکار کر دیا اور ابو صیداء اور ان کے ساتھیوں نے اس بارے میں ان کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ امیر اشرس کے سپہ سالار نے ابو صیداء اور ان ذی اثر لوگوں کو گرفتار کر لیا جو اس بارے میں ان کی مدد پر تھے اور انھیں قید کر دیا۔ پھر عجمی روسا اور زمینداروں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کیا۔ نتیجے میں اہلِ صغد پھر مرتد ہو گئے، ترکوں سے فوجی امداد طلب کی اور ان کے ساتھ ہو گئے۔

امیر اشرس کو جب اس بات کا علم ہوا تو اپنے لشکر کے ساتھ ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنے چلے۔ نہر عبور کر کے آمل پہنچے تھے کہ صغد اور ترک مل کر مقابلے پر آ گئے۔ فریقین میں سخت جنگ ہوئی اور مسلمانوں کو شکست سی ہونے لگی، لیکن وہ پلٹ پڑے اور جم کر لڑے، تا آنکہ اپنے دشمن کو مار بھگایا۔''[1]

اگر واقعی یہ لوگ مسلمان ہوئے تھے اور محض جزیہ سے چھٹکارا پانے کے لیے دین نہیں بدلا تھا تو ان کا طرزِ عمل یہی ہوتا جو ہوا؟ جزیہ کی ایسی کونسی بڑی رقم ہوتی ہے۔ انھیں چند درہم سالانہ دینے اتنے بھاری تھے کہ اس کی خاطر اپنا دین چھوڑ دیا۔ حقیقتاً انھوں نے قدیم دین

[1] محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ (۱۹۱/۲)

چھوڑا ہی نہ تھا اور اشرس نے جو شرط جزیہ اڑانے کی عائد کی تھی وہ صحیح تھی۔ رہا یہ ہنگامہ تو محض ابو صیداء کی کج فہمی سے ہوا۔ اگر وہ حائل نہ ہوتے تو امیر اشرس کی بات پوری ہو جاتی۔

راقم الحروف کو یاد پڑتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کے زمانے میں ڈاکٹر امبیڈکر نے یہ پیش کش کی تھی کہ وہ اپنی پوری قوم کے ساتھ مسلمان ہو جائے۔ اس طرح مسلمان اور نومسلم اچھوت مل کر بڑی زبردست اور موثر قوت بن جاتے، بلکہ ہندوستان میں اکثریت انھی کی ہوتی اور یوں ہندو اکثریت کا خواب دیکھنے والوں کی سیاست غارت ہو جاتی، لیکن قائد اعظم نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور فرمایا: ہم اجتماعی تبدیلیِ مذہب کے قائل نہیں۔ ہم سے قدیم مسلمان ہی نہیں سنبھالے جاتے تو پھر ان کروڑوں (پشیتنی کافروں) کی تربیت کا بوجھ کیسے اپنے سر لے لیں۔ امبیڈکر کی نیت للہ نہیں تھی اور اس کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ اگر اسے آخرت مطلوب ہوتی اور وہ صحیح معنی میں اپنی قوم کی فلاح اسلام میں سمجھتا تو بطور خود ان میں تبلیغِ اسلام کے ذرائع اختیار کرتا، لیکن وہ محض سیاسی الجھنوں میں گرفتار تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی قیادت کسی برخود غلط اور جذباتی شخص کے ہاتھ میں نہ تھی۔ مسلمانوں کی قیادت وہ شخص کر رہا تھا جس کی فراست وبصیرت اور تفقہ بڑے بڑوں کی پہنچ سے بالا تھی۔

ایسے ہی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ روس کا پیٹر اعظم مسلمان ہونے کو تیار تھا، بشرطیکہ اسے سور کھانے اور شراب پینے کی اجازت دے دی جائے۔ شیخ الاسلام نے فرمایا: ''ہمیں تمھارے اس طرح مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں'' ایک فاضل مورخ نے خود راقم الحروف کے سامنے بڑی حسرت سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا: ''شیخ الاسلام نے مصلحتِ ملیہ نہیں دیکھی، پیٹر اگر مسلمان ہوتا تو تمام روس کو آج دار الاسلام پاتے۔'' ممکن ہے ایسا ہوتا، لیکن سور کھانے والا اور شراب پینے والا دار الاسلام ہمارے کس کام کا ہوتا؟ ان حقائق پر نگاہ خلیفہ رسول کی تھی کہ آپ نے مانعینِ زکات کو مرتد قرار دے کر ان کے

خلاف جہاد کیا، حالانکہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو زکات کی فرضیت اور رکنِ اسلام ہونے کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ انھوں نے یہ تاویل کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں زکات کی رقم اس شخص کو ادا کرنے کا حکم دیا تھا جو یہ رقم وصول کر کے ہمارے لیے دعا کرے اور اس دعا سے ہمیں تسکین ہو۔ نبی کریم ﷺ کے بعد یہ تسکین ہمیں کسی دوسرے شخص کی دعا سے نہیں ہو سکتی، اس لیے ہم زکات نہیں دیں گے۔

اسلام ایک دین ہے، ایک نظامِ حیات ہے، اسے اسی طرح قبول کرنا ہوگا جس طرح وہ ہے ورنہ ضرورت نہیں۔ سیاسی فوائد اور عددی قوت مطلوب ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے آخری رسول ﷺ سے یہ نہ فرماتا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ۝ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ﴾ [القلم: ۸، ۹]

’’پس تو ان جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مان۔ وہ چاہتے ہیں کاش! تو نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کریں۔‘‘

راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ مشہور نومسلم انگریز ڈاکٹر خالد شیلڈ ریک نے جب ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنے اس دورے کی خوب نشر و اشاعت کی کہ جیسے اسلام قبول کر کے مسلمانوں پر کوئی احسان کیا ہو، وہ طبیہ کالج دہلی میں بھی آیا تھا اور راقم الحروف اس محفل میں موجود تھا جس میں اس نے تقریر کی تھی۔ وہاں اس نے سرورِ عالمیان ﷺ کی جناب میں اپنی عقیدت کا خوب خوب مظاہرہ کیا اور ہم سمجھے کہ واقعی اس کے اندر کوئی حقیقی فکری تبدیلی پیدا ہوئی ہے، لیکن ایک نجی مجلس میں اس کے سیکرٹری سے گفتگو کا موقع ملا جو خود بھی نومسلم تھا اور ڈاکٹر خالد شیلڈ ریک ہی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے سور کا گوشت کھانے کی اجازت دے رکھی ہے اور کہا ہے جو سور حرام ہوا تھا وہ عرب کے گندے ماحول میں پلنے والا تھا۔ انگلستان کے صاف ستھرے سور اس حکم کے تحت نہیں آتے۔

یہی حال ہے ان ذی اثر نومسلموں کا جو اس طرح حکمتِ شرعیہ کو اپنے نظریے سے

دیکھ کر دین کو مسخ کرتے ہیں۔ یہی نتائج ان صوفیہ کی جلد بازی سے مرتب ہوئے جنھوں نے اسلام میں باقاعدہ داخل کیے بغیر کفار کو ذکر و شغل اور مراقبات کی تلقین کی، یا انھیں مسلمان تو کرلیا، لیکن شریعت سکھائے بغیر طریقت پر ڈال دیا۔ ایسی مثالیں بھی راقم الحروف کے ذاتی علم میں ہیں کہ کس طرح ان نومسلم صوفیوں کے ہاتھوں دین مسخ ہوتا ہے۔ میں خود ایسے نومسلم صوفیوں کو جانتا ہوں جو صاحبِ کیفیت ہیں، لیکن شریعت سے بالکل کورے۔ اسی لیے ان کی کیفیت میں اثر تو ہے لیکن لطائف و نورانیت نہیں۔ ان کے مریدوں نے دین کو ایک تحریک سمجھنے کے بجائے کشف و کرامات کا ادارہ بنا دیا جس میں اوامر و نواہی سے بحث نہیں۔ سب روا ہے بشرطیکہ ذکرِ قلبی اور مراقبات جاری رہیں اور جسے یہ لوگ فیض کہتے ہیں وہ آتا رہے۔ ان بزرگ صاحب نے اپنے ایک مرید سے ملاقات کرائی جو بڑے کٹر آریہ سماجی تھے اور مسلمانوں کے سخت مخالف، لیکن ان بزرگ صاحب نے اپنے تصرف سے انھیں بزرگانِ اسلام کا عقیدت مند بنا دیا تھا اور اسے اپنا تعمیری کارنامہ سمجھے، حالانکہ یہ مرید بھی دین سے ایسے ہی کورے تھے جیسے ان کے نومسلم پیر۔ مگر مراقبات کے پابند تھے اور وارداتوں سے بہرہ ور۔

ان کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آئی کہ جسے یہ فیض کہتے ہیں وہ خاص اوراد و آداب کا نتیجہ ہے جو ہر نفسِ انسانی پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کے لیے کفر و اسلام کی کوئی شرط نہیں، کیوں کہ کمالات نفسِ انسانیہ کا کرشمہ ہے، جیسے ہر مومن و کافر جسمانی حیثیت سے پہلوان ہوسکتا ہے اور ذہنی حیثیت سے عالم متبحر، ایسے ہی ریاضات و اذکار سے اس کے اندرونی احوال میں بھی کیف آ سکتا ہے اور تصرف فی القلوب کی طاقت نصیب ہو جاتی ہے۔ مشکاۃِ نبوت کے نور سے اور ان تماشوں سے کیا نسبت۔

صوفیوں کی ایسی ہی ایک غلط روی کا نتیجہ سکھوں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے کہ مسلم بننے کے بجائے یہ ہندوؤں کا ایک فرقہ بن کر رہ گئے، بلکہ اسلام دشمنی میں غالباً یہود سے بھی آگے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان صوفیوں نے دین کو نہیں سمجھا اور اپنے

زہد و ریاضت کے باوجود اسلام کے دوست بننے کے بجائے دشمن ثابت ہوئے۔

ایک متفق علیہ حدیث ہے جو تواتر کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے اور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اس کے مطابق دین کے تین شعبے ہیں: ایمان، اسلام اور احسان۔ صوفیہ کا تعلق اس گروہ سے ہے جو دائرۂ احسان میں قدم رکھیں، لیکن یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ایمان اور اسلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے منہاج پر درست نہ کرلیا جائے۔

اس دائرے میں قدم رکھنے والوں کے لیے کتاب اللہ اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سب آداب مقرر کر دیے ہیں، اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ایمان جو علما کے فیض سے استدلالی ہوتا ہے وہ وجدانی ہو جائے اور اسلام جو فقہا کی کوششوں سے منضبط اور مدوّن ہوا ہے اس کے اعمال کی نورانیت و غایت مکشوف ہو۔ گویا طریقت دراصل شریعت کی مصدق و موید ہے۔ تمام اکابر اولیا اور مرشدانِ راہِ طریقت کا یہی طریقہ کار رہا ہے کہ وہ مرید کو شریعت کے لوازمات کا پابند بناتے ہیں اور اپنے ہر کشف کو کتاب و سنت پر پیش کر کے دیکھتے ہیں کہ موافق ہے یا مخالف۔ موافق ہو تو اللہ کا شکر کرتے ہیں اور مخالف ہو تو ''کشف را بر کفش میزنند'' لیکن افسوس کہ یہ عظیم ترین راہِ عمل جو نبوت کے اعلیٰ ترین فیوض میں ہے، لوگوں نے اس کا نام لے کر اپنے سفلی مقاصد بر لانے کی کوشش کی۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی ورطۂ ہلاکت میں ڈالا۔ کبھی غلط فہمی سے کبھی غلط روی سے اور اکثر و بیشتر بدنیتی سے، حتی کہ تصوف بھی سبائی تحریک کی ایک شاخ بن کر رہ گیا۔ وہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جناب میں بے جا غلو، وہی بارہ اماموں کا تصور، وہی شریعت کو قشر کہنا کہ محض خول ہے اور اصل سے بے تعلق، وہی کرامات و تصرفات کا ذکرِ لاطائل، نظامِ خلافتِ اسلامیہ کی توہین اور دین و دنیا میں مغائرت، خلفا و امرائے اسلام کی اہانت اور فلاں زاویہ نشین اور سبحہ خواں صاحب کو خاصانِ خدا کا صدر نشین اور محورِ دین بتا کر القاب و آداب میں ناجائز اور مضحکہ خیز غلو۔

یہ ہے روداد حال ماضی قریب کی اور کچھ ماضی بعید کی، ایسی ہی کچھ روداد قرونِ اولیٰ

کی تاریخ کی بھی ہے۔ انفرادی حیثیت سے جو لوگ مسلمان ہوئے اور انھیں صحابہ و تابعین کی صحبت میسر آئی وہ امامت کے درجے تک پہنچ گئے اور امت ان کے فیوض سے بہرہ ور ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان اقوام کے جاہلی تصورات کا بھی قلع قمع کر دیا گیا تھا۔

عربوں میں حیث القوم یہ تبدیلی اس لیے آسان ہوئی کہ نبی کریم ﷺ سے بلاواسطہ اکتسابِ نور کے مواقع تھے۔ پھر ان پر کسی نام نہاد تمدن و تہذیب و ثقافت کا سایہ نہ پڑا تھا۔ سادہ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں مثبت صفاتِ انسانیہ کی پوری جلوہ گری تھی۔ اس لیے ان کے اندر ذہنی انقلاب آسان ہو گیا اور جب وہ مسلمان ہوئے تو حقیقتاً ہوئے۔ یہی کیفیت ہمیں ترکوں میں نظر آتی ہے۔ ان کی صفات بھی عربوں کی سی تھیں، اس لیے ان کی ذہنی تبدیلی بھی اصیل ثابت ہوئی اور یہی حالت ہمیں پٹھانوں میں بھی ملتی ہے۔ عربوں میں اور دونوں قوموں میں دین سے بے رغبتی کے جو آثار اب پیدا ہوئے ہیں وہ اقوامِ مغرب کے تسلط اور تہذیبِ مغرب کے چھا جانے کا نتیجہ ہیں اور اس کا کہ مسلمانوں کا کلمہ متفرق ہے، پھر بھی سب قوموں سے زیادہ انھی قوموں سے توقع کی جاتی ہے کہ یہ دوبارہ اپنی اصلاح پر مائل ہوں گے۔

برخلاف ان قوموں کے جو متمدن کہلاتی تھیں جنھیں اپنے ثقافتی سرمائے پر فخر تھا اور جو چاہتے تھے کہ اپنا یہ ورثہ من وعن اسلام میں داخل کر دیں، ان کی کیفیت اب تک حریفانہ ہے اور یہی لوگ ہیں جن کی بدولت دینِ اسلام میں مختلف قسم کی نظری اور عملی بدعتیں رائج ہوئیں اور فرقے بنے۔

اب اس حقیقت کو بھی دیکھنا چاہیے کہ عرب کے جو قبائل پے در پے مسلمان ہوئے اور اجتماعی حیثیت سے انھوں نے دین قبول کیا تو نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ان میں کیسی ارتداد کی ہوا پھیلی اور وہ کس طرح اسلام کے لیے نہایت زبردست خطرہ بن گئے۔ ان کی قسمت تھی، خدا کا وعدہ تھا اور نبی کریم ﷺ کی برکت تھی کہ زمامِ امت خلیفۂ رسول کے ہاتھ میں آئی، جنھوں نے سرزمینِ عرب کو پھر دار الاسلام بنا دیا۔

بے شک دعوتِ محمدیہ کوئی انقلابی تحریک نہیں جیسا کہ لوگ بے خیالی میں الفاظ کے صحیح انتخاب کے بغیر کہہ دیا کرتے ہیں۔ دعوتِ محمدیہ فرمانِ الٰہی کے مطابق ارتقائی تحریک ہے، اور نبی کریم ﷺ کی بعثت کی غایت یہ نہیں کہ آپ قوموں کی ثقافتوں کو منسوخ کریں۔ آپ ﷺ تو تکمیلِ ادیان کے واسطے تشریف لائے ہیں، تاکہ اقوامِ عالم کے حریفانہ جذبات میں وجۂ مشارکت دکھلا کر نظامِ عدل قائم کریں جو شریعتِ مطہرہ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے اور جس سے اکتساب کر کے دنیا کی ساری قومیں رفتہ رفتہ اپنے نظریات اور معاشرتی و سیاسی تصورات میں اصلاحیں کرتی چلی جا رہی ہیں۔

اسی لیے مسلمانوں نے پوری رغبت کے ساتھ ایک فرضِ دینی سمجھ کر اقوام و ملل کے ثقافتی سرمایوں کی حفاظت کی اور انھیں آدابِ قرآنیہ کے مطابق اسلامی قالب دے کر اپنا لیا۔ جس کے نتیجے میں وہ ثقافت رونما ہوئی جو اپنی اصل میں نہ عربی ہے نہ عجمی، نہ مشرقی ہے نہ مغربی، نہ شمالی ہے نہ جنوبی، نہ نسلی ہے اور نہ جغرافیائی، بلکہ اس میں اتنی لچک ہے کہ ہر ماحول اور ہر زمانے میں اسے بے تکلف اپنایا جا سکتا ہے اور ساتھ ساتھ خود اس کے اپنے ارتقا کے لیے بھی وسائل اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی اس کی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زمانی اور مکانی قیود سے آزاد کر دیا ہے۔ وہ تمام عالم کا مشترک ورثہ ہے، لیکن یہ کام ہے عرق ریزی کا، بے محابا فراخ دلی نہیں برتی جا سکتی۔

اگر مسلمان فراخ دلی برتتے جو ان مہذب اقوام کی دلی خواہش تھی اور دین کے اصول کی پروا کیے بغیر محض مسلمانوں کی عددی قوت اور سیاسی شوکت پر نگاہ رکھتے تو اسلام وہی کچھ بن جاتا جو یہ ذی اثر نومسلم بنانے کے درپے تھے۔

ہر عالمگیر تحریک کا سب سے خطرناک پہلو یہی ہے کہ بااثر لوگ جب تبدیلِیِ قلب کا اعلان کرتے ہیں تو ان کا مقصد فی الحقیقت یہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو تحریک کا تابع بنانے کے بجائے تحریک کو اپنا تابع بنا لیں۔ اسلام کی تاریخ میں ان تمام امور کا نقشہ موجود ہے اور

اگر ہم فکرِ صحیح کے ساتھ سطورِ بالا کا جائزہ لیں تو جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی تصدیق ہو گی۔ اس کا چھوٹا سا تجربہ خود پاکستان کے پچھلے دور میں ہمیں بھی ہو چکا ہے۔

یہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت ہے کہ اسلام اپنی اصل صورت میں محفوظ ہو گیا۔ ان کے دلوں میں دعوت رچ چکی تھی۔ انھیں ثباتِ قلب کے ساتھ اس ذمے داری کا احساس تھا کہ جس طرح انھوں نے اس دین کو قائم کیا ہے، اسی قوت کے ساتھ اسے محفوظ و کارگر رکھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پورے عرب میں ایک بھونچال آ گیا تھا۔ لیکن بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر وقتی تاثر کے علاوہ کوئی خوف و ہراس طاری نہیں ہوا۔ ان کی عزیمت کوہِ تمثال تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر شخص نے خوب جانچ کر کھلا مقابلہ کر کے دین قبول کیا تھا اور بلاواسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ تربیت سے منور تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف مہاجرین و انصار کو یہ حیثیت دی ہے کہ ان کا اتباع کیا جائے، انھی کا اجماع حجت ہے اور ہر مسئلے کی تعبیر وہی درست ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان فرمائی ہے۔ اسلام کا سیاسی نظام اگر ان کے ہاتھ سے نکل جاتا اور ان کی آواز بے حیثیت ہو جاتی تو دین اسلام کا بھی وہی حشر ہوتا جو نصرانیت کا ہوا۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی احتیاط تھی کہ انھوں نے اجتماعی طور پر مسلمان ہونے والوں کو مناصبِ حکومت عطا نہیں کیے۔ تحریک کی قیادت چن چن کر خاص خاص حضرات کے ہاتھ میں رکھی، یعنی صرف انھیں تفویض کی جو بلاواسطہ فیضانِ نبوی سے مستفیض تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوتِ تصرف سے ان کے قلوب کو منور کر چکے تھے۔ چنانچہ ہم عیاناً دیکھتے ہیں کہ ارتدادِ عرب کے موقع پر ان کے قبائل کے وہ سردار مستقیم الحال رہے، جن کا تقرر خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔

امامتِ قریش:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد دفعہ اسلام کے مستقبل کے بارے میں پیشگوئیاں کی ہیں۔ منجملہ ازاں یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت کی امامت قریش کے ہاتھ میں رہے گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان پیشگوئیوں کو شرعی حکم نہیں سمجھا، بلکہ وہ حیثیت دی جو دوسری پیشگوئیوں کی تھی، مثلاً کسریٰ کا ملک فتح ہونا، قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانا، گویا یہ حکم نہیں تھا، بلکہ اطلاع تھی کہ ایسا ہوگا اور یوں ہوگا۔ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک قریش کی امامت کا کوئی حکم ہوتا اور اس کی حیثیت شرعی قرار دی جاتی تو پھر سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع کا کوئی امکان نہ تھا۔

صرف صدیقِ اکبر اور دوسرے مہاجروں نے انصار کے اس اقدام پر دینی حیثیت سے قطعاً حرف گیری نہیں کی اور ان کی یہ حیثیت تسلیم کی کہ زمامِ کار ان کے ہاتھ میں ہو، کیوں کہ وہ ہر طرح اس کے اہل تھے اور ہر اعتبار سے دین کے محافظ اور قائد ثابت ہوئے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی تقریر کا لبِ لباب یہ تھا کہ عرب جو ہمیشہ سے قریش کی قیادت کے عادی ہیں، وہ غیر قرشی امام کی امامت قبول نہیں کریں گے۔ گویا قریش کی امامت کا قیام مصلحتِ ملیہ کے تحت عمل میں آیا، نہ کہ اصولِ شرعی سمجھ کر۔ جو بے ادب لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع پر طعن کرتے ہیں، ان کا یہ طعن انصار پر نہیں ہے، بلکہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم پر ہے، جنھوں نے انصار کا یہ حق تسلیم کیا کہ اگر قیادت انھیں ملے تو درست ہوگی۔

چونکہ مدتِ مدیدہ تک خلافت کا نظام قریش کے ہاتھ میں رہا، اس لیے بعد کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ امامت کا حق صرف قریش کو ہے۔ بلکہ بعض تو ایسے تیز نکلے جیسے سیوطی رحمہ اللہ وغیرہ ان کے نزدیک امام کا عباسی ہونا اولیٰ ہے۔ وجہ محض یہ ہے کہ عباسیوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آئی تو صدیوں تک رہی۔

امامتِ قریش کی بابت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات سامنے رکھے جائیں تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ مراد عرفی نہیں ہے، بلکہ لغوی ہے۔ چنانچہ تیرہ سو برس کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں پر جب کوئی مشکل وقت پڑا اور وہ کسی مشکل میں گرفتار ہوئے تو اس گردابِ بلا سے نکالنے کے لیے ایک قرشی ہی آگے بڑھا اور یہ مقبولیت حاصل کی کہ باقی امت بھی اس کی بات اٹھالے۔ مسلمانوں نے جب زندگی کے کسی چھوٹے بڑے مسئلے میں تعلیماتِ قرآنیہ

کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہا تو قیادت کا سہرا ہمیشہ ایک قرشی کے سر رہا۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، علمی، فنی، اخلاقی اور روحانی دائرہ ہائے عمل ہر جگہ اور ہر موقع پر قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک قائدانہ سرگرمیوں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہر تعمیری کام میں سرِ فہرست ایک قرشی ہی کا نام ملتا ہے۔ اگر اس زاویۂ نگاہ سے مختلف شعبہائے زندگی کی تدوین پر نگاہ ڈالی جائے اور تلاش کی جائے کہ اس خاص موضوعِ فکر میں قدمِ اول کس نے اٹھایا تو قرشیوں کے ناموں اور کاموں کی ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ یہ ہے ''الأمامة في قريش'' کا مطلب اور ''الأئمة من قريش'' کا مفہوم۔

لیکن جس طرح زندگی کے اور شعبوں میں غیر قرشی بھی بکثرت نمایاں ہیں، بلکہ غیر عرب بھی، ایسے ہی خلافت کی زمام قریش کے ساتھ مختص نہیں کی جا سکتی، بلکہ عربوں اور غیر عربوں میں کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مصر کے آخری عباسی خلیفہ نے برضا و رغبت امرِ خلافت کو ترکوں کی طرف منتقل کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں خلافتِ آلِ عثمان کی پوری تاریخ مرتب ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی خلافت میں عباسی امام کو وہ وسائل میسر نہ تھے جو حقیقی خلیفہ کے لیے ضروری ہیں اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس رسمی امامت سے ملت کو چنداں فائدہ نہیں۔ برخلاف اس کے ترکوں کی نئی اٹھتی ہوئی قوم میں دین کی والہانہ محبت اور اس کی خاطر سرفروشی کا جذبہ پوری طرح پیدا ہو گیا تھا اور دعوت کی روح ان میں اچھی طرح رچ گئی تھی۔ فرقے بازی کے اس شرک سے وہ پاک تھے، پھر انھیں مادی وسائل بھی حاصل تھے اور ان میں پوری صلاحیت تھی کہ خلافت کی کارگری اور عظمت و شان کو برقرار رکھ سکیں۔ چنانچہ امیر المومنین سلطان المعظم سلیم خان اول رحمہ اللہ اس منصب پر فائز ہو گئے اور الحق کہ انھوں نے ان کارہائے نمایاں کی طرح ڈال دی، جنھوں نے عثمانی خلفا کو زندہ جاوید بنا دیا۔

بہر حال سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ نے امامتِ قریش سے مراد عرفی امامت، یعنی خلافت نہیں لی اور

جب قریش کی خلافت پر ان کا اجماع ہوا تو محض اس مصلحت کے تحت کہ دنیائے عرب میں کسی اور قبیلے کی امامت تسلیم نہیں کی جائے گی۔ اسی مصلحتِ ملیہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بعد میں محفوظ رکھا اور جس اصیل بنیاد پر انھوں نے خلافت کو قریش میں محصور کیا تھا، اسی مقصد کے پیشِ نظر اسی دائرے کو تنگ تر کر کے خلافت کے لیے بنو عبد مناف کو خاص کر دیا گیا، اس کی ضرورت پچھلے دس برس کے احوال نے پیدا کی تھی۔

بنو عبد مناف:

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنے مقدمے میں ولایتِ عہد کے عنوان کے تحت مختصر الفاظ میں صورتِ حال کا لب لباب پیش کر دیا ہے، فرماتے ہیں:

"إن عصبية مضر كانت في قريش، وعصبية قريش في عبد مناف، وعصبية عبد مناف إنما كانت في أمية، تعرف ذلك لهم قريش وسائر الناس ولا ينكرونه"[1]

''مضر کی عصبیت قریش میں تھی اور قریش کی عصبیت عبدِ مناف میں اور عبدِ مناف کی عصبیت صرف امیہ میں تھی، جسے قریش اور سب لوگ جانتے تھے اور کسی کو اس پر اعتراض نہ تھا۔''

عصبیت کے معنی ہیں وہ جذبہ جو ایک دوسرے کے قریب کر دے اور غیروں کے مقابلے میں ساتھ لا کھڑا کر دے۔ عرب اگر مجتمع ہو سکتے تھے تو مضر کی قیادت میں اور مضر اگر اکٹھے ہوتے تو قریش کی قیادت میں اور قریش سرداری قبول کرتے تو عبدِ مناف کی اولاد میں یہ حیثیت امیہ کی تھی کہ ان کے جھنڈے کے نیچے سب جمع ہوں اور ان کی آواز پر لبیک کہیں۔

اس کے بعد علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے خیال ظاہر کیا ہے:

"وإنما نسي ذلك أول الإسلام لما شغل الناس من الذهول

---

[1] مقدمه، ولایت عهد (ص: ١٥٢)

بالخوارق وأمر الوحي و تردد الملائكة لنصرة المسلمين وأغفلوا أمور عوائدهم و ذهبت عصبية الجاهلية ومنازعها ونسيت، ولم يبق إلا العصبية الطبيعية في الحماية والدفاع، ينتفع بها في إقامة الدين وجهاد المشركين الدين فيها محكم والعادة معزولة حتى إذا انقطع أمر النبوة والخوارق المهولة تراجع الحكم بعض الشيء للعوائد فعادت العصبية كما كانت ولمن كانت وأصبحت مضر أطوع لبني أمية من سواهم بما كان لهم من ذلك قبل“

”لیکن اسلام کے ابتدائی دور میں لوگ اسے بھول گئے تھے، اس لیے ان کی توجہ معجزات پر تھی، وحی آ رہی تھی اور فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لیے اتر رہے تھے، اس لیے پچھلی منفعتوں سے (یعنی عکاظ کے میلوں میں جو اپنے آبا پر فخر اور قبیلوں کی برتری کی داستانیں بیان کی جاتی تھیں ان سے) لوگ غافل ہو گئے اور جاہلیت کے عہد کی عصبیت جاتی رہی، جھگڑے مٹ گئے اور ذہنوں سے بات اتر گئی۔ اس میں سے کچھ باقی نہ رہا، سوائے اس فطری عصبیت کے جس کا تعلق تحریک کی حمایت اور مسلمانوں کے دفاع سے تھا، اس طرح وہ عصبیت اب دین قائم کرنے اور مشرکوں سے جہاد کرنے میں کام آتی تھی۔ امت کے دلوں میں دین مضبوطی سے قائم تھا اور پچھلی عادتیں معطل ہو چکی تھیں، یہاں تک کہ نبوت کا معاملہ ختم ہو گیا اور وہ معجزات بند ہو گئے جو دلوں کو دہلاتے رہتے تھے۔ اس طرح پرانی عادتوں کی طرف طبائع کچھ راغب ہو گئیں اور وہی تعصب ابھر آیا جو شروع میں تھا اور جن لوگوں کے حق میں تھا۔ چنانچہ قبیلہ مضر دوبارہ دوسروں کے مقابلے میں بنو امیہ کی طرف پہلے ہی کی طرح جھک گیا۔“

یہ تجزیہ اگرچہ بعض اعتبارات سے صحیح ہے، لیکن بالکلیہ درست نہیں۔ پہلی عصبیت

ماند نہیں پڑی تھی۔ خود سرورِ عالم ﷺ کا منشا یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ آپ اس عصبیت پر حرف لانا چاہتے تھے۔ آپ کی دعوت کے بقا کا انحصار ہی اس عصبیت پر تھا۔

دعوت کے اولین علمبردار قریش تھے۔ اکابرِ بنو عبدالشمّس کا مسلمان ہونا اور حکومتِ نبویہ میں اہم ترین مناصب پر فائز ہونا، یعنی نبی کریم ﷺ کا ان کی قیادت کو بدستور قائم رکھنا اور پھر ان کی یہی حیثیت عہدِ صدیقی و فاروقی میں جاری رہنا، پھر امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کا خلیفہ منتخب ہونا ایسے قدرتی اسباب تھے کہ سیاساتِ اسلامیہ میں بنو امیہ کی قائدانہ حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ قریش کے کسی گھرانے کو یہ شرف حاصل نہیں کہ اس کے اتنے بہت سے افراد نبی کریم ﷺ کی حکومت کے کارکن ہوں جتنے بنو امیہ میں تھے۔ گویا اسلام کی جو پہلی حکومت مدینہ طیبہ میں قائم ہوئی اس کو چلانے والے اموی سادات نمایاں ہو چلے تھے اور جس طرح جاہلیت میں قریش کی قیادت کا شرف امویوں کو حاصل تھا، اسی طرح اسلام میں بھی رہا اور نبی کریم ﷺ نے ان کی یہ قائدانہ حیثیت برقرار رکھی۔ اموی سادات میں سے پانچ حضرات نبی کریم ﷺ کی حکومت کے والی تھے اور ان میں سے چار آخر عہدِ نبوی تک ان مناصب پر فائز رہے:

والیِ مکہ: سیدنا عتاب رضی اللہ عنہ بن اُسید بن ابی العاص بن امیہ۔

والیِ نجران: سیدنا ابو سفیان رضی اللہ عنہ بن حرب بن امیہ۔

والیِ یمن و مذحج: سیدنا خالد رضی اللہ عنہ بن سعید بن العاص۔

والیِ تیما و خیبر: سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بن سعید بن العاص۔

والیِ بحرین: سیدنا ابان رضی اللہ عنہ بن سعید بن العاص۔ (ان کا تقرر سیدنا علاء الحضرمی کے بعد ہوا تھا جو بنو امیہ کے حلیف تھے۔

اس کے مقابلے میں بنو ہاشم کی حیثیت جاہلیت میں کعبہ شریف کی خدمت کی وجہ سے احترام کی تھی اور اسلام میں ان کا احترام نبی کریم ﷺ سے رشتے کے سبب اور بھی بڑھ گیا، مگر نہ جاہلیت میں بنو ہاشم کی حیثیت سیاسی تھی اور نہ اسلام میں۔ نبی کریم ﷺ نے کسی

ہاشمی کو کوئی سیاسی منصب عطا نہیں فرمایا۔ صرف ایک واقعہ خیبر کے ایک قلعے کی فتح کا ہے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے زیر کیا تھا۔ باقی متعدد قلعے اور اہم مورچے دوسرے بزرگواروں نے فتح کیے تھے۔ خیبر کوئی گاؤں نہیں تھا ایک بڑا علاقہ تھا جہاں کئی مضبوط قلعے تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی کا ایک واقعہ ہے کہ غزوۂ تبوک پر روانہ ہوتے وقت اہل و عیال کی نگرانی کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینے میں چھوڑا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اس کا سخت رنج تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے بجائے انھیں عورتوں، بچوں اور معذوروں میں چھوڑا گیا، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسکین فرما دی:

”عَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ خَرَجَ إِلَى تَبُوكَ وَاسْتَخْلَفَ عَلِيًّا، فَقَالَ: أَتُخَلِّفُنِي فِي الصِّبْيَانِ وَالنِّسَاءِ؟ قَالَ: أَلَا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى، إِلَّا أَنَّهُ لَيْسَ نَبِيٌّ بَعْدِي“[1]

”حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے اپنے والد ماجد کے حوالے سے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک کے لیے نکلے تو آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنی نیابت سپرد کی۔ انھوں نے عرض کی: کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھیں پسند نہیں کی کہ تمھاری قدر میرے ہاں وہی ہو جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاں ہارون علیہ السلام کی تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔“

پھر جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا ہے اور اس کے بعد سورت براءت نازل ہوئی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت سنانے کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا اور آپ نے امیرِ حج کے نائب کی حیثیت سے یہ سورت سنائی، جس میں اگر ایک طرف مشرکوں

[1] صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب غزوة تبوك وهي غزوة العسرة، رقم الحديث (٤٤٥٠)

کوحرم شریف میں حج کے لیے آنے کی ممانعت تھی تو اس میں دوسری طرف آیتِ غار بھی تھی، جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظیم ترین منقبت ہے کہ آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ معیتِ خاصہ حاصل ہے جس میں کوئی مرد آپ کا شریک نہیں۔

پس بنو ہاشم میں سے قابلِ ذکر صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی یہ خدمات ہیں۔ ان کی جلالت مسلّم ہے اور ان سے آپ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، لیکن ان کو صحیح معنی میں سیاسی کہنا مشکل ہے۔ لوگوں نے ان امور سے جو معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ سب عجمی دماغ کی پیداوار ہیں۔ عربوں نے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے اور خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت نے یہ معانی مراد نہیں لیے۔

پھر خلافتِ صدیقی و فاروقی وعثمانی میں بھی امت کی عملی سیاست میں ہاشمیوں کی کچھ موثر خدمات نہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عہدِ فاروقی میں رکنِ شوریٰ ہونا یا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا آخر عہدِ عثمانی میں امیرِ حج مقرر ہونا کچھ ایسے امور نہیں کہ ان کی بنا پر امویوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ یعنی بنو ہاشم کو نہ جاہلیت میں حکومت کا کوئی تجربہ تھا اور نہ اسلام میں۔

ادھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد تک پہنچتے پہنچتے ایک دشمنِ ملت ٹولی کے ہاتھوں ایسی سخت اور اندوہ ناک باتیں رونما ہوگئی تھیں کہ خود بنو ہاشم کا یہ نظریہ ہوگیا کہ امت کی قیادت مستقل طور پر امویوں کے سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے تمام ہاشمی سادات کے مشورے اور حمایت سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے بیعت کر لی۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جو مقام حاصل ہوا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کافر و مومن سب کی نگاہیں انہی کی طرف اٹھتی تھیں اور سب جانتے تھے کہ نبی کے بعد انہی کا درجہ ہے تو یہ بات ان دونوں کے ساتھ خاص تھی۔ چنانچہ احد کے دن حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جو اس وقت کافر تھے اور مسلمان فتح

پا چکنے کے بعد ایسی حالت میں تھے جو مثل شکست کے تھی تو انھوں نے فخریہ بلند آواز سے پوچھا تھا ''تم میں محمد ﷺ ہیں؟'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جواب مت دینا'' پھر انھوں نے پوچھا: ''تم میں ابو قحافہ کے بیٹے ہیں، یعنی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ؟'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جواب مت دینا'' پھر تیسری مرتبہ انھوں نے پوچھا: ''تم میں خطاب کے بیٹے ہیں، یعنی عمر فاروق رضی اللہ عنہ؟ اس پر بھی نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جواب مت دینا'' چنانچہ جواب نہ پا کر حضرت ابوسفیان نے اپنے کافر ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''لو بھئی ان کا تو تم فیصلہ کر چکے'' اب سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ ضبط نہ کر سکے اور فرمایا: ''او اللہ کے دشمن! ہم سب زندہ ہیں۔''

یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کافر بھی جانتے تھے کہ دعوت جن کے بل بوتے پر چل رہی ہے وہ یہ تین ہیں۔ کسی چوتھے کا انھوں نے نام نہیں لیا اور مسلمانوں میں جو ان دونوں بزرگوں کی حیثیت تھی وہ ظاہر ہے، لیکن ان دونوں کی یہ حیثیت محض ان کی شخصیتوں کی بنا پر تھی اور انھیں خلافت بھی محض اس شخصی عظمت و جلالتِ قدر کی بنا پر ملی، ورنہ قریش میں تیمیوں اور عدویوں کو اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی کہ بنو عبد مناف کے مقابلے میں ان کی قیادت تسلیم کی جائے۔

لہٰذا امت کے ان دونوں باپوں کے اٹھ جانے کے بعد یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ سیاسیاتِ اسلامیہ پر بنو عبدِ مناف جلوہ گر ہوں۔ انھیں امور کو دیکھ کر نہایت صحیح اور موزوں اقدام تھا، ان چاروں حضرات کا خلافت سے دستبردار ہو جانا، جنھیں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد نامزد کیا تھا اور یوں معاملہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر آن پڑا۔

اہلِ مدینہ نے بظاہر دو مقبول شخصیتوں میں سے ایک کا انتخاب کیا تھا اور اتفاق سے وہ صاحب اموی تھے جو منتخب ہوئے، اس لیے امویوں کو خود بخود وہ مقام مل گیا جو جلد یا بدیر انھیں ملنا تھا۔ اگر اس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہو جاتا تو شاید تاریخ کچھ اور ہوتی اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہوتی۔ ممکن تھا کہ قیادت بنو ہاشم ہی کے ہاتھ میں رہتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ دن بعد امویوں کی طرف منتقل ہو جاتی، البتہ یہ ناممکن تھا کہ امویوں اور ہاشمیوں سے نکل سکے۔

سیوطی رحمہ اللہ جیسے مورخین نے یہ خیالی باتیں کہی ہیں کہ اگر امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی زندگی میں اپنے فرزند کی ولایتِ عہد کی بیعت نہ لیتے تو خلافت کے لیے ایسے ہی شوریٰ ہوا کرتا، جیسے اس وقت تک ہوتا رہا تھا اور خلافت قریش کے سب بطون میں آتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا اس وقت انتخاب نہ ہوتا تو خلافت بنوامیہ میں نہ جاتی۔ یہ سب فرضی باتیں ہیں جو نہ اسلامی معاشرے کے سیاسی مطالعہ پر مبنی ہیں اور نہ ان احوال پر جو نفسِ دین کو پیش آئے۔

خلافت کو یقیناً بنوعبدِ مناف میں آنا تھا اور شوریٰ کی نوعیت یہی رہنی تھی جو ہزار برس سے امت کی تاریخ میں نظر آتی ہے، کیوں کہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ جیسا ہونا ممکن نہیں، اسی طرح حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروقِ اعظم جیسی ہستیوں کا پیدا ہونا مستبعد ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت کے ان دونوں باپوں کے بعد سب کو یکساں نظر سے دیکھتے تھے اور اگر کسی تیسرے کا نام لیا بھی جاتا تھا تو وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ہی کا تھا۔ اس لیے اس خیال کی قطعاً کوئی گنجایش نہیں رہتی تھی کہ نظامِ خلافت غیر خاندانی رہے۔ عربی ماحول کے لیے ایسے سب اقدامات موجبِ فتنہ ہوتے اور نہایت تباہ کن اور کبھی کوئی مستحکم سیاسی نظام برپا نہ ہوسکتا۔

لہٰذا اس موضوع پر جتنے اوراق سیاہ کیے گئے ہیں اور واقعات دیکھنے کے بجائے تصورات کی دنیا میں کھو جانے کی کوشش کی گئی وہ محض لایعنی ہیں اور اپنے آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ عقل مند اور دین دار سمجھنے کے مرادف۔ اپنے احوال سے وہ حضرات جتنے واقف تھے ایسی واقفیت بعد کے لوگوں کو کس طرح ہوسکتی ہے اور دین کے جتنے وفادار وہ تھے اس سے زیادہ وفادار ہونے کا دعویٰ کون کرسکتا ہے؟ اگر کوئی کرے تو جھوٹا ہے اور راندۂ درگارِ خداوندی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے وقت میں جو کچھ کیا، اس سے بہتر حل کی تلاش ان حالات میں ممکن نہ تھی۔ یہ ہے ایک توجیہ جس کی بنا سیاسی ہے اور اسی کا نتیجہ ہوا کہ پورے عرب کی طاقت خلافت کی پشت پر ہوگئی اور یہ بالکل درست ہے کہ امویوں کی خلافت عربی خلافت

تھی اور صحابہ کی قیادت میں چلتی تھی۔

دوسری توجیہ ہے دعوت و تحریک کے اعتبار سے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے زمامِ کاران کے ہاتھ میں دے دی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کی امامت پر اجماع کیا تو یہ نقلِ حکومت نہ محض ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف تھا اور نہ ایک خاندان سے دوسرے خاندان کی طرف، بلکہ یہ دعوتِ محمدیہ کی حفاظت کی نہایت اہم اور موثر ترین تدبیر تھی۔ نہایت اصیل بنیاد پر اس انتقال کو لازم سمجھا گیا تھا۔ اس کا فوری اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سبائیوں کو اور ان نومسلموں کو جو اجتماعی حیثیت سے مسلمان ہوئے تھے، حکومت کے کلیدی مناصب پر دسترس نہیں رہی۔

ہاشمیوں نے برضا و رغبت جب امرِ خلافت کو امویوں کی طرف منتقل کیا تو یہ کسی وقتی مغلوبیت کی بنا پر نہیں تھا، جیسا کہ بعض مفتری کہتے ہیں، بلکہ ہاشمی سادات کے نزدیک یہ موقف اتنا اصیل تھا کہ وہ پوری قوت اور یکجہتی کے ساتھ اس پر قائم رہے۔ چنانچہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد سیاسی اختلال کی جتنی صورتیں پیدا ہوئیں ان میں تمام بنو ہاشم کی ہمدردیاں بنو امیہ سے وابستہ رہیں، سخت ترین حالات میں بھی انھوں نے اپنا موقف نہیں بدلا۔ یہی حال دوسرے اکابرِ قریش اور سابقون الاولون کا تھا، یعنی سب سے پہلے مسلمان ہونے والوں کا جنھوں نے دین قائم کیا تھا۔

امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے خلیفہ ہونے پر جب کوفیوں کی شرارت سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے حصولِ خلافت کی کوشش کی تو کسی صحابی نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور نہ بنو ہاشم کے اہل الرائے نے ان کے موقف کی تائید کی۔ خود آپ پر بھی جب حقیقت کھل گئی کہ کوفیوں نے محض دشمنِ ملت ہونے کے سبب غداری کی ہے اور دوستی کے پردے میں اہلِ بیت سے اپنی دشمنی نکالی ہے اور یہ کہ امت سب کی سب امیر المومنین یزید بن معاویہ کی خلافت پر متفق ہے اور عراق پر بالکلیہ ان کا قبضہ ہے تو آپ نے بھی اپنے موقف سے

رجوع کا اعلان کر دیا۔ اس کی کچھ تفصیل ولایتِ عہد کے عنوان کے تحت بیان ہو گی۔

پھر امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جب سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو کسی ہاشمی نے آپ سے بیعت نہیں کی اور اکابرِ قریش بھی آپ سے محترز رہے۔ اسی زمانے میں سبائیوں نے زور پکڑا اور مختار ثقفی نے اس امر کی خوب تشہیر کی کہ حضرت محمد بن علی بن ابی طالب ہمارے ساتھ ہیں (جنھیں سبائیہ کی شرارت سے عموماً ابن الحنفیہ کہا جاتا ہے) اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں انھی کے حکم سے کر رہے ہیں، لیکن ہاشمی سادات نے مطلقاً اس تحریک کی طرف توجہ نہیں کی، جلوت وخلوت میں اس سے براءت کا اعلان کیا اور ظاہراً و باطناً مختار ثقفی سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما پر یہ وقت سخت تھا۔ آپ کو مختار ثقفی سے بڑی تکلیفیں پہنچی تھیں، حتی کہ اس کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی اور سیدنا مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں وہ قتل ہوا، لیکن مختار کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بنو ہاشم کی خلافت کے لیے کر رہا ہے، آپ نے اس کی تحریک کی ذمے داری بنو ہاشم پر نہیں رکھی۔ اسی طرح جب امیر المومنین عبدالملک رضی اللہ عنہما کامیاب ہو گئے اور سبائیوں سے آپ کے معرکے ہوئے تو آپ نے بھی بنو ہاشم کا دامن اس سیاسی اختلال اور دینی اختلاف سے پاک سمجھا۔

مورخ خضری نے "محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیة" (۲/ ۱۴۰) میں یہ بیان ناقابلِ قبول دیا ہے:

"كان عمل المختار سبباً لتغيير ابن الزبير على محمد بن الحنفية ومن معه من أهل بيته، فدعاهم ليبايعوه فأبوا عليه محبسهم فأرسل إليهم المختار من خلصهم من سجنه"

"مختار کی حرکات اس کا سبب بنیں کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا دل محمد بن الحنفیہ اوران کے گھر والوں سے پھر گیا۔ انھوں نے ان سے بیعت کا مطالبہ کیا اوران

کے انکار پر انھیں قید کر دیا، اس پر مختار نے اپنے آدمی بھیج کر انھیں رہا کرا لیا۔''

اگر واقعہ یوں ہی ہوتا تو بیعت سے انکار پر محض اتنا ہی نہ کیا جاتا کہ انھیں قید کر دیں اور اگر قید کیا تھا تو مختار کی کیا مجال تھی جو انھیں قید سے رہا کرا سکتا۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما صاحبِ طاقت تھے اور مکہ پر ان کی حکومت تھی۔ یہ حکومت انھوں نے عراقیوں کے بل پر حاصل نہیں کی تھی کہ اپنے امام کی ہر بات رد کر دیں اور اس کے مخالفوں کا فروغ ہونے دیں۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے ان بزرگواروں کو ہرگز قید نہیں کیا اور اگر کرتے تو پھر اس کا امتیاز کیوں، کہ صرف سیدنا محمد اور ان کے گھر والے قید کیے جائیں۔ بیعت تو کسی ہاشمی نے نہیں کی تھی تو پھر سب کو قید کیوں نہیں کیا۔

اور اگر بالفرض آپ نے انھیں قید کیا تھا اور مختار نے اپنے آدمی بھیج کر انھیں چھڑا لیا تھا تو وہ تو اس کا ثبوت ہو گیا کہ سیدنا محمد سے مختار کا تعلق تھا اور وہ جو اس سے اپنی براءت کا اظہار کرتے تھے وہ منافقت سے کرتے تھے۔ پھر جب ان کا تعلق ثابت ہو گیا تو سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے یہ کیسے برداشت کر لیا کہ وہ ان کی مملکت میں بدستور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ کہتے ہیں کہ آپ نے انھیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہم کو طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا تو طائف بھی آپ ہی کے قبضے میں تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مختار سے جنگ ہو رہی ہے اس کے ساتھیوں کو قتل کیا جا رہا ہے، لیکن جو شخص اس فتنے کا بانی ہے وہ آرام سے ہے اور اس سے کوئی تعرض نہیں۔

لہٰذا یہ سمجھنا قطعاً ممکن نہیں کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے نزدیک سیدنا محمد بن علی یا کسی دوسرے ہاشمی کا مختار کی تحریک سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا۔ یہ حضرات طائف میں اپنی مرضی سے مقیم تھے۔ ان کا موقف واضح تھا۔ وہ اموی خلافت کی حمایت میں تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت کتنی ہی مضبوط ہو جائے اس کی بقا ناممکن ہے اور نہ اس کے قیام سے اقوامِ عالم میں ملت کی کچھ عظمت بڑھے گی۔[1] خود خضری ہی آگے کہتے ہیں:

---

[1] امیر یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد جب ایک سال کے اندر سیدنا مروان رضی اللہ عنہ بھی ←

’’قید سے نکل کر محمد رحمہ اللہ شام کی طرف (امیر المومنین) عبدالملک کے پاس جانے کے لیے چلے، لیکن ایلہ تک پہنچنے کے بعد پھر واپس آ گئے۔‘‘ اس بیان سے انھوں نے اپنی پہلی بات خود رد کر دی۔ محمد رحمہ اللہ کو تو چاہیے تھا کہ قید سے نکل کر سیدھے مختار کے پاس جاتے۔ شام کی طرف تو وہی جا سکتا تھا جس کی ہمدردیاں امویوں کے ساتھ ہوتیں۔ ایلہ سے آپ کی واپسی مکہ کو اس وقت ہوئی جب مکہ عبدالملک کی حکومت میں آ گیا۔

← وفات پا گئے اور عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے درمیان خلافت کے لیے کشمکش شروع ہوئی تو ان دونوں اصحاب نے سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے بھائی جناب محمد بن علی رحمہ اللہ کو اپنی بیعت کرنے کے لیے لکھا۔ جناب محمد بن علی رحمہ اللہ نے اس وقت دونوں سے فرداً فرداً معذرت کر لی اور دونوں کو الگ الگ لکھ بھیجا کہ جب آپ کے لیے لوگ مجتمع ہو جائیں گے اور آپ کی خلافت اجماعی طور پر منعقد ہو جائے گی تو میں آپ کی بیعت کر لوں گا۔ (طبقات ابن سعد: ۱۰۳/۷)

کچھ عرصے بعد سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک بار پھر جناب محمد بن علی رحمہ اللہ کو اپنے بھائی عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کے ذریعے اپنی بیعت کرنے کا پیغام بھیجا جس کو جناب محمد بن علی رحمہ اللہ نے اس دفعہ اپنا واضح سیاسی جھکاؤ دکھاتے ہوئے احسن طریقے سے یہ کہہ کر ٹال دیا:

”عبد الملك بن مروان والله لكأنك بجيوشه قد أحاطت برقبة أخيك وإني لأحسب أن جوار عبد الملك خير لي من جوار أخيك ولقد كتب إلي يعرض علي ما قبله ويدعوني إليه. قال عروة: فما يمنعك من ذلك؟ قال: أستخير الله وذلك أحب إلى صاحبك قال أذكر ذلك له“ (طبقات ابن سعد: ۱۰۷/۷)

’’عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ اور ان کے لشکر کو گویا آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے بھائی (یعنی ابن زبیر رضی اللہ عنہما) کی گردن کو گھیرے ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کے بھائی کے پڑوس سے زیادہ عبدالملک رحمہ اللہ کا پڑوس میرے لیے بہتر ہے۔ انھوں (عبدالملک) نے خط لکھ کر جو کچھ ان کے پاس ہے، میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اپنے پاس بلایا ہے۔ عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے پوچھا کہ پھر آپ کو اس (یعنی عبدالملک کی بیعت) سے کون سا امر مانع ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں اللہ سے اس کا استخارہ کرتا ہوں، یہی تمھارے صاحب (یعنی ابن زبیر رضی اللہ عنہما) کو زیادہ پسند ہے۔ عروہ رحمہ اللہ نے کہا کہ میں یہ ان سے بیان کر دوں گا۔‘‘

سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو جو وقتی کامیابی حاصل ہوئی تو محض اپنی شخصیت کی بنا پر، چنانچہ سیدنا ضحاک بن قیس اور سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہم جو امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ اور امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے عمائد میں تھے، وہ خلافتِ شام میں اس اختلال کے سبب جو امیر المومنین معاویہ بن یزید کے دستبردار ہونے کی بنا پر پیدا ہو گیا تھا، سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہو گئے تھے اور ایسے ہی بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم۔ ویسے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے کو فتنے کا زمانہ کہا جاتا ہے اور کتبِ حدیث میں ان کے دور کا تذکرہ عموماً "فتنة ابن الزبیر" کے نام سے کیا جاتا ہے، کیوں کہ ناممکن تھا کہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے بعد ان کے خاندان میں خلافت قائم رہتی یا اس کا امکان پیدا ہو جاتا کہ خلافت غیر خاندانی ہو۔ خود ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے گھر کے لوگ عرب کی قدیم عصبیت کے تحت بنو امیہ کی طرف مائل تھے، حتی کہ ان کے فرزند اور بھائی بھی امیر المومنین عبدالملک سے جا ملے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف صحیح بخاری میں مذکور ہے:

"حَدَّثَنَا حَجَّاجٌ، قَالَ ابْنُ جُرَيْجٍ: قَالَ ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ، وَكَانَ بَيْنَهُمَا شَيْءٌ فَغَدَوْتُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، فَقُلْتُ: أَتُرِيدُ أَنْ تُقَاتِلَ ابْنَ الزُّبَيْرِ فَتُحِلَّ حَرَمَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ: مَعَاذَ اللّٰهِ! إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ ابْنَ الزُّبَيْرِ وَبَنِي أُمَيَّةَ مُحِلِّينَ، وَإِنِّي وَاللّٰهِ لَا أُحِلُّهُ أَبَدًا، قَالَ: قَالَ النَّاسُ بَايِعْ لِابْنِ الزُّبَيْرِ، فَقُلْتُ: وَأَيْنَ بِهَذَا الْأَمْرِ عَنْهُ؟ أَمَّا أَبُوهُ فَحَوَارِيُّ النَّبِيِّ ﷺ، يُرِيدُ الزُّبَيْرَ، وَأَمَّا جَدُّهُ فَصَاحِبُ الْغَارِ يُرِيدُ أَبَا بَكْرٍ، وَأُمُّهُ فَذَاتُ النِّطَاقِ يُرِيدُ أَسْمَاءَ، وَأَمَّا خَالَتُهُ فَأُمُّ الْمُؤْمِنِينَ يُرِيدُ عَائِشَةَ، وَأَمَّا عَمَّتُهُ فَزَوْجُ النَّبِيِّ ﷺ يُرِيدُ خَدِيجَةَ وَأَمَّا عَمَّةُ النَّبِيِّ ﷺ فَجَدَّتُهُ يُرِيدُ صَفِيَّةَ، ثُمَّ عَفِيفٌ فِي الْإِسْلَامِ قَارِئٌ لِلْقُرْآنِ، وَاللّٰهِ إِنْ وَصَلُونِي وَصَلُونِي مِنْ قَرِيبٍ وَإِنْ رَبُّونِي رَبُّونِي أَكْفَاءٌ، كِرَامٌ فَآثَرَ التُّوَيْتَاتِ

وَالْأُسَامَاتِ وَالْحُمَيْدَاتِ يُرِيدُ أَبْطُنًا مِنْ بَنِي أَسَدٍ بَنِي تُوَيْتٍ وَبَنِي أُسَامَةَ وَبَنِي أَسَدٍ إِنَّ ابْنَ أَبِي الْعَاصِ بَرَزَ يَمْشِي الْقُدَمِيَّةَ، يَعْنِي عَبْدَ الْمَلِكِ بْنَ مَرْوَانَ وَإِنَّهُ لَوَّى ذَنَبَهُ يَعْنِي ابْنَ الزُّبَيْرِ" [1]

''ہم سے حجاج نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں: ان سے ابن جریج نے ابن ابی ملیکہ کی بات یہاں بیان کی اور ان دونوں کے مابین کچھ اختلاف تھا (یعنی ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا ساتھ دینے یا نہ دینے کے بارے میں) ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں گیا اور کہا: کیا آپ ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے جنگ کر کے حرم کی بے حرمتی کرنا چاہتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: معاذ اللہ! کعبہ کی بے حرمتی تو اللہ نے ابن زبیر اور بنو امیہ کی قسمت میں لکھی ہے، بخدا! میں اس کی بے حرمتی کبھی نہیں کروں گا۔ پھر فرمایا: لوگوں نے کہا تھا کہ ابن زبیر سے بیعت کر لو۔ میں نے کہا: ان سے زیادہ اس امر کا حق دار کون ہوگا۔ ان کے باپ کو دیکھو تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری ہیں، یعنی سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ، ان کے نانا کو دیکھو تو وہ ''صاحبِ غار'' ہیں، یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ، ان کی والدہ کو دیکھو تو وہ ''ذات النطاقین'' ہیں، یعنی سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا، ان کی خالہ کو دیکھو تو ام المومنین ہیں، یعنی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، ان کی پھوپھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہیں، یعنی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ان کی دادی ہیں، یعنی سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا، پھر اسلام میں وہ پرہیز گار ہیں، قرآن کے بڑے عالم ہیں۔ بخدا اگر (بنو امیہ) میرے ساتھ صلہ رحمی کریں تو یہ صلہ رحمی قریبی رشتے داروں کی طرف سے ہوگی۔ اور اگر وہ میری پرورش کریں تو یہ پرورش ذی احترام ہم چشموں کی طرف سے ہوگی۔ پھر میں تویتات، اسامات اور حمیدات کو ترجیح دوں۔

[1] صحيح البخاري، ج ٢، كتاب التفسير، باب قوله ثاني اثنين إذ هما في الغار.

آپ کی مراد بنوتویت، بنو اسامہ اور بنو اسد سے تھی۔ اور یہ جو ابو العاص کے فرزند ہیں (یعنی عبدالملک بن مروان) تو مردانہ وار بڑھ رہے ہیں اور یہ صاحب جو ہیں (یعنی ابن زبیر رضی اللہ عنہما) تو انھوں نے اپنی دم سکیڑ رکھی ہے۔''

اس حدیث سے سب صورتِ حال سامنے آ گئی۔ شخصی حیثیت سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما خلافت کے اہل تھے، لیکن خاندان کی مقبولیت کے اعتبار سے وہ بنو امیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک ان میں وہ قائدانہ صلاحیتیں نہیں تھیں جن کے ذریعے وہ پیش آمدہ مشکلات پر قابو پا لیتے۔ یہ صفات اموی سادات میں تھیں اور یہ مقام امیر المومنین عبدالملک کا تھا کہ قلوب ان کی طرف جھکیں اور کامیابی کے ساتھ وہ امامت کے فرائض ادا کر سکیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ آپ کی وفات کے بعد سب کے سب فوراً بنو العم کے پاس شام چلے جائیں۔ چنانچہ سیدنا علی بن عبداللہ نے اس وصیت پر عمل کیا اور قصبہ حمیمہ چلے گئے۔ ساداتِ امویہ کے دشمنوں نے اس نقل مکانی کی یہ تعبیر کی ہے کہ عباسی سادات کو اموی خلفا نے یہاں نظر بند کر دیا تھا، حالانکہ یہ اصل بات ہے۔ ان حضرات کا حمیمہ میں قیام سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی وصیت کے مطابق تھا۔

اموی حکمتِ عملی کے نتائج:

اموی حکمتِ عملی سے سیاسیاتِ اسلامیہ پر جہاں یہ اثر پڑا کہ عربی ثقافت سے عجمی ممالک متاثر ہوئے اور یوں مختلف قوموں میں مستحکم ربط کی صورت پیدا ہوگئی، وہاں سب سے بڑا سیاسی فائدہ یہ ہوا کہ تمام عالمِ اسلام ایک مرکز کے تحت آ گیا اور اندرونی اختلال کی صورتیں کم ہوگئیں۔ اس سے بھی بڑا فائدہ جس کے سامنے سب فوائد ہیچ ہیں وہ یہ ہوا کہ دین اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ فگن رہا اور نفسِ دین میں کسی قسم کی ماندگی نہیں آئی۔ اموی دور میں عالمِ اسلام فرقہ بازی سے پاک تھا اور کسی بدعت و زندقہ اور الحاد

کے فروغ کے امکانات نہ تھے۔

امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وجہ سے امامتِ امت کا بنو عبدِ مناف میں محصور ہو جانا، اور ان میں سے بھی بنو امیہ میں، یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نہایت اصیل کارنامہ تھا اور اس کا اعتراف نہ کرنا دعوتِ محمدیہ کے ساتھ غدر کے مرادف ہے۔ ہمارے سامنے پوری تاریخ موجود ہے اور ہاشمی خاندان کی حکومتوں کا دور بھی۔

عباسیوں کے دور میں سبائی تحریک نے پھر قوت پکڑی، محض اس لیے کہ ان کی خلافت بپا کرنے میں عجم کا ہاتھ تھا۔ عجیب وغریب قسم کے فرقے نمودار ہوئے، جن کی سمیت سے امت کو محفوظ رکھنے میں عباسی خلفا کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اگرچہ بعض دفعہ انھیں بڑے سخت اقدامات کرنے پڑے۔ مثلاً ملاحظہ ہو یاقوت حموی: معجم الأدباء (۱/ ۲۳۸) جہاں امیر المومنین الراضی باللہ رحمہ اللہ کا وہ فرمان مذکور ہے جو آپ نے محمد بن علی الشلغمانی کو سولی دینے کے بعد جاری کیا۔ یہ شخص ابن ابی العزاقر کے نام سے مشہور تھا۔ اس فرمان میں آپ نے اس کے عقائد و اعمال پر مکمل تبصرہ فرمایا ہے۔ اس کا ایک جملہ ہے:

"وينتحل الثقة في دين آل محمد ﷺ وهو يضمر التبرء منها و يشنؤه"[1]

"وہ دعویٰ تو کرتا تھا عقیدتاً آلِ محمد ﷺ کے دین سے ہونے کا، لیکن دراصل اپنے دل میں اس سے تبرا کرتا تھا اور اسے اس سے عداوت تھی۔"

عباسیوں پر ڈیڑھ سو برس کے قریب ایسے گزرے کہ امت پوری طرح خطرے میں گھر گئی تھی وہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آلِ بویہ اور مصر کے عبیدی دونوں مل کر دینِ متین کو ختم کر دیں گے۔ امیر المومنین القادر باللہ رحمہ اللہ کے عہد میں قرآن مجید کا جو حشر انھوں نے کرنا چاہا تھا اس کا حال اوپر گزر چکا۔ شریعتِ مطہرہ کے معمولی مسائل میں جو حال ہوگا اس

[1] معجم الأدباء (۱/ ۲۳۸)

کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سلطان طغرل بیگ رحمہ اللہ کی قبر نور سے بھرے کہ انھوں نے عین بحران کے وقت مسیحائی کی۔ ۴۵۰ھ کے حدود میں انھوں نے آلِ بویہ کو ختم کر دیا اور یوں امت میں پھر جان آ گئی، ورنہ آج پولوس کی طرح دینِ محمد بھی ایک ایسا چولہ اختیار کر چکا تھا جس کا تعلق سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نہ ہوتا۔ عیاذاً باللہ

اسلام کی طرف انتساب کرنے والوں میں جتنی ٹولیاں بنیں، جس جس قسم کے مدعی اٹھے ان کی تفصیل حضرت امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب مقالات الاسلامیین میں بیان کی ہے۔ ان میں سے بہت سوں کو عباسی خلافت میں فروغ ہوا۔ حالانکہ خود یہ خلفا متبعِ سنت صحیح العقیدہ تھے اور اخلاقِ فاضلہ سے متصف۔ ان کے علمی اور روحانی فیوض سے یہ امت مستفیض ہے۔ ان کے شخصی احوال اتنے رفیع القدر ہیں کہ دشمنانِ دین وملت کے افترا و تلبیس کے باوجود ان کی عظمت اور جلالتِ قدر کو ماند نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہاشمی خلافت میں چونکہ زنادقہ کو سر اٹھانے کے مواقع ملتے رہے اور آلِ بویہ وغیرہم کو سیاسی بالادستی حاصل ہوگئی، اس لیے ہسپانیہ کی اموی حکومت میں خلافتِ اسلامیہ کو شیعہ امامت کہا جاتا تھا۔

گویا یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا، اس کے وعدے کی حقانیت تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت تھی اور حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کا خلوص تھا کہ انھوں نے خلافت کو عربی رکھ کر اور امویوں کے ہاتھ میں قیادت دے کر دین کو ایسا مستحکم اور مدون کر دیا کہ ملتِ اسلامیہ کو کتاب وسنت کی حفاظت کرنے میں کامیابی ہوئی۔

اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی دور بینی سے خلافت کے نظام کو اموی سادات سے مختص نہ کر جاتے اور جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بنو ہاشم اس بارے میں ان کے ہمنوا نہ ہوتے تو وہ سب فرقے جو خود اس وقت پیدا ہو چکے تھے اور جنھوں نے بعد میں قسم قسم کی صورتیں اختیار کیں، وہ سب اسلام کو کھا جاتے اور ہم حتمی طور پر یہ جان ہی نہ سکتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اور آپ ﷺ کے اصحاب کی سنت کیا ہے۔ جتنے لوگ جماعت سے الگ ہوئے وہ آپس میں ایک دوسرے کی کیسی ہی ضد ہوں، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عداوت پر سب متفق ہیں اور سب کی دلی تمنا یہ رہی کہ کسی طرح کتاب وسنت کا عمل دخل ختم کر دیا جائے۔

اموی حکمتِ عملی کی یہ افادیت محض مشرق ہی میں نہیں رہی، بلکہ وہ جہاں کہیں بھی گئے وہاں انھوں نے محافظِ دین ہونے کا امتیاز برابر قائم رکھا۔ چنانچہ ہسپانیہ کی امارت اور پھر خلافت میں انھوں نے کسی قسم کی فرقہ بازی کو ابھرنے نہیں دیا۔ سیاسی چپقلشیں ہوئیں، لیکن عقائدِ اسلامیہ سے کوئی کھیل نہ سکا۔ موطأ شریف ہی کو وہاں بھی دستورِ اسلامی ہونے کی حیثیت حاصل رہی۔ وہی موطا جس میں اگر ایک طرف سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، سیدنا مروان رحمہ اللہ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے جانبدار بزرگوں کے مواقف کو بھی بطور حجت پیش کیا گیا ہے تو سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کو بھی اس کتاب میں وہی مقام حاصل ہے، جو لوگ جماعت سے وابستہ ہیں وہ نہ اصحابِ رسول ﷺ میں فرق کرتے ہیں اور نہ خلفائے اسلام کی عظمت وجلالتِ قدر پر چھاپہ مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر خلافت کو خالص عربی نہ رکھا جاتا، اگر امامت کو بنو عبدِ مناف میں محصور نہ کیا جاتا، اگر ساداتِ امویہ کے ہاتھ میں قیادت نہ آتی، اگر غیر عرب اقوام کے ذی اثر لوگوں کو کلیدی مناصب دیے جاتے، اگر حکمتِ عملی کے بارے میں ان کی آواز کو وزن دیا جاتا تو لازماً دعوتِ محمدیہ کی صورتِ نوعیہ بدل جاتی، کیوں کہ یہ جتنی بدعتیں پیدا ہوئیں، غیر اسلامی نظریات اور خلافِ دین رسوم نے اسلامی معاشرے کو گھن لگایا ہے۔ یہ سب کچھ ان عجمی اقوام کے استیلاء کا نتیجہ ہے، جو مسلمانوں کی بے جا فراخ دلی یا سیاسی کمزوری کی وجہ سے انھیں حاصل ہو گیا۔ یہ جتنے ملحدانہ اور مشرکانہ تصورات مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے کسی کی اصل عربی نہیں۔

نومسلموں کا حق اس وقت ثابت ہوتا جب تحریک ان کے دلوں میں رچ جاتی، ان کی دو تین نسلیں اسلامی ماحول میں پرورش پا لیتیں، یعنی جب اسلام ان کی طبیعت بن

جاتا۔ اس کے بعد بھی افراد کو پرکھا جاتا، تب وہ حکومت کے ارکان بننے کی صلاحیت رکھتے، لیکن انھوں نے اسلام میں داخل ہوتے ہی پَر پرزے نکال لیے اور اس کوشش میں لگ گئے کہ کسی طرح اس تحریک کو اپنا تابع بنا لیں۔

ہمارے سامنے افراد کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے خود یا ان کی طرف انتساب کرنے والوں نے یہودی اور نصرانی بلکہ مجوسی تصورات تک دینِ مبین میں داخل کرنے کے لیے روایات کا ایک سوختنی پلندہ ہمارے سامنے ڈال دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ تفسیر کی کتابوں میں اسرائیلیات کی وہ بھرمار ہے کہ تنقیح مشکل ہوگئی۔

یہ محض اموی حکمتِ عملی کا ثمرہ ہے کہ دعوتِ محمدیہ اپنی اصل شکل میں قائم رہ سکی اور اس طرح مدون ہوگئی کہ آج تک ہم اطمینان سے فیصلہ کر دیتے ہیں کہ فلاں تصور بدعت والحاد ہے اور فلاں بات روحِ اسلامی کے منافی نہیں ہے اور اسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اگر کتاب محفوظ نہ ہوتی جسے ''غتربود'' کرنے کی کوششیں کی گئیں، اگر تواتر کے ساتھ سنت جاری نہ رہتی، جسے مسخ کرنے کی کسی تدبیر سے دریغ نہیں کیا گیا، اگر اصحابِ اجتہاد کو امت کی دینی تربیت کی خدمت سپرد کر کے منہاجِ نبوی کو زندہ نہ رکھا جاتا تو امت کے جتنے ثقافتی کارنامے خلافتِ عباسیہ کے دوران میں ہمارے سامنے آئے وہ ہرگز نہ آ سکتے، کیوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا منہاج ہی فنا کر دیا گیا ہوتا اور غیر اسلامی تصورات و عقائد اس دین کو اسی طرح مسخ کر چکے ہوتے جس طرح نصرانیت کے نام سے ایک دین دنیا میں ہے، لیکن سلسلۂ نبوت سے اس کا تعلق صرف نام کا ہے۔

اموی اور ہاشمی تصور:

اموی اور ہاشمی حکمتِ عملی میں اصلاً کوئی فرق نہیں، لیکن عملاً ہے۔ ہاشمی تصور یہ ہے کہ آدمی نے جب اسلام کا اظہار کر دیا تو وہ مسلمان ہو گیا اور اس کے سب حقوق وہی ہو گئے جو قدیم مسلمانوں کے ہیں، لہٰذا وہ حکومت میں بھی حصہ لینے کا حقدار بن گیا۔ چنانچہ

انھوں نے اپنے دور میں اس طریقے پر بے محابا عمل کیا اور نقصان پر نقصان اٹھایا۔ افشین مسلمان ہوا اور امیر المومنین المعتصم باللہ نے اسے سپہ سالار عساکرِ اسلامیہ بنا دیا۔ پھر اس کا ایک خط پکڑا گیا، جس سے معلوم ہوا کہ دراصل وہ آتش پرستی کے قدیم دین پر قائم ہے اور یوں اس پر مرتد کی حد جاری کی گئی۔ اسی طرح امیر المومنین ہارون الرشید رحمہ اللہ کے زمانے میں برامکہ نے عروج پکڑا اور پھر ضرورت ہوئی کہ ان پر زوال لایا جائے، ان میں اچھے لوگ بھی تھے، لیکن جعفر برمکی کے عزائم کچھ دوسرے تھے وہ خلافتِ اسلامیہ کو عجمی بنا ڈالنے کے منصوبے بنا رہا تھا اور اس کے لیے اس نے چند عملی اقدامات بھی کیے تھے، جن کی تفصیل کا اس جگہ موقع نہیں۔ اس سے پہلے ابومسلم خراسانی پر اعتماد کیا گیا اور اس نے ”لَا لِحُبِّ عَلِيٍّ بَلْ لِبُغْضِ مُعَاوِيَةَ“ عرب دشمنی کے جذبات پر دل کھول کر عمل کیا اور اسی نے سبائیہ کے ایک ایسے فرقے کی بنیاد ڈالی جسے راوندیہ کہتے ہیں اور جن کے عقائد و اعمال کا اسلام سے کچھ تعلق نہیں، بلکہ سراسر دین کی دشمنی پر اس فرقے کا مدار تھا، جس کے لیے انھوں نے چولہ یہ اختیار کیا تھا کہ ساداتِ عباسیہ کی جناب میں وہی غلو برتا جائے جو سبائیہ کی دوسری شاخوں کے ہاں فاطمی اور علوی سادات کے ساتھ تھا۔ لیکن امام المسلمین کو بھلا اس کی کب برداشت ہوتی۔ چنانچہ امیر المومنین عبداللہ المنصور رحمہ اللہ نے اس فرقے کا استیصال کیا اور ابومسلم خراسانی کو اس کے زندقہ والحاد کی بنا پر ختم کر دیا۔

دین کے علمبرداروں اور ہوا پرستوں میں یہی فرق ہے۔ راوندیہ فرقہ کے لوگ خلفائے عباسیہ میں الٰہی صفات کے قائل تھے، ایسے ہی جیسے سبائیہ کے دوسرے فرقوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور آپ کی بعض اولاد کے بارے میں مشرکانہ تصورات پیدا کیے۔ لیکن امام عباسی نے اس قسم کے عقائد رکھنے والوں کو واجب القتل سمجھا۔ برخلاف اس کے جو فاطمی لوگ سبائی خیالات سے متاثر ہیں، انھیں اس پر فخر ہے کہ ان کے آبا و اجداد کو لوگوں نے معبود بنایا۔

عباسی خلفا کو اپنی حفاظتی تدابیر میں کبھی تو پوری کامیابی ہوئی اور کبھی نہ ہو سکی۔

راوندیہ اور برامکہ کے بارے میں کامیابی ہوگئی، لیکن آلِ بویہ اور عبیدیوں کے بارے میں فوراً نہ ہوسکی۔ اگر خلافتِ عباسیہ میں غیر عرب اقوام کو تدریجاً اور احتیاط کے ساتھ حکومت میں حصہ دیا جاتا تو اسلام اور مسلمانوں پر وہ مصائب نہ ٹوٹتے جو ٹوٹے!

امویوں کو ہاشمیوں کی حکمتِ عملی سے اختلاف نہیں تھا، بلکہ وہ بعض معاملات میں غیر مسلموں سے کام لیتے تھے، لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے ساتھ جو دعوت کے حاملوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

ان تمام امور پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد آدمی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے دینِ اسلام کو اغیار کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کا پورا بندوبست کر دیا تھا اور بعد کے خلفا بھی اگر انھی کے طریقے پر چلتے یا تدریجاً اس میں تبدیلی کرتے تو اہلِ اسلام ایک جماعت ہوتے اور دینِ اسلام اس طرح متضاد عقائد و تصورات کا مجموعہ نہ بن جاتا کہ آج ہم کلمہ کی ''حرمت'' کے بہانے ہر قسم کے زندقہ و الحاد کے لیے گنجایش نکال کر داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غدر اور اپنی حالت تباہ کرنے کا سامان خود ہی پیدا کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ اسلام کے ہاتھوں میں امامتِ اہلِ عالم ہونے کے بجائے زمین پر بالادستی کفار کی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ﴾ [الرعد: ۱۱]

''بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، یہاں تک کہ وہ اسے بدلیں۔''



ولایتِ عہد

مسعودی جیسے مورخ جنھیں اللہ سے زیادہ اپنے آقاؤں کی رضا مطلوب تھی۔ ابومخنف لوط بن یحییٰ جیسے راوی جنھیں حق کے مقابلے میں اپنے فرقہ وارانہ جذبات زیادہ عزیز تھے اور واقدی جیسے داستان گو، جنھیں افسانے تراشتے وقت یہ خیال نہیں رہتا تھا کہ ان کے بیانات کے اثرات کیا مرتب ہوں گے اور پھر سیوطی جیسے اصحابِ تصنیف جنھیں رطب و یابس سے کچھ بحث نہ تھی، محض حاطب اللیل تھے (اندھیرے میں لکڑیاں جمع کرنے والے) یعنی ادھر ادھر کی روایتیں بغیر تنقید کے جمع کر دینے کے مرض میں مبتلا، یہ سب کے سب اس کے ذمہ دار ہیں کہ ملتِ اسلامیہ سخت ترین ذہنی اور روحانی عذاب میں گرفتار ہے۔ ان لوگوں نے قرونِ اولیٰ کی تاریخ پر قلم اٹھانا نہایت نازک کام بنا دیا ہے۔ وجہ محض یہ ہے کہ ہم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا منہاج چھوڑ دیا اور اس کا خیال نہیں کیا کہ انھوں نے اپنے زمانے کے سیاسی احوال کو کس نگاہ سے دیکھا اور فتنوں کے زمانوں میں اپنا کیا موقف رکھا۔

ہماری آنکھوں پر شخص پرستی نے پٹی باندھ دی ہے، بزرگوں کی ہستیاں خیالی اور فرضی انسانوں میں گم ہیں، تعصب اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ بعض کو عرشِ آشیاں بنا دیا گیا اور بعض کو اپنے خیال میں تحت الثریٰ تک ڈال دینے پر بھی بس نہیں کی۔ تاریخ کو امت اور جماعت کے زاویہ سے نہیں دیکھا، محض افراد پر نگاہ رکھی ہے اور انہی کی محبت یا عداوت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

لیکن جن کے پیشِ نظر ملت کی بہبود ہے، جو جماعت کا شیرازہ مضبوط رکھنا چاہتے

ہیں، ان کی راہ اعتدال کی ہے، وہ تمام بزرگوں کی عزت وحرمت کو محفوظ رکھنا اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ روایات کے بجائے واقعات سے بحث کرتے ہیں اور اگر کسی کے قول وفعل پر انھیں تنقید کی ضرورت ہوتی ہے تو ادب ومحبت کے ساتھ دشوار گزار وادی سے صحیح سلامت نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہلِ فکر کو اگر آخرت مطلوب ہو اور امت کی فلاح مقصود ہو تو انھیں بہرحال تاریخِ اسلام کی تنقیح کر کے واقعات کی صحیح روئداد مرتب کرنی ہوگی۔ یہ روئداد وہ ہونی چاہیے جو عقلاً ونقلاً درست ہو۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ پر ان تمام لوگوں نے جو اصحابِ تصنیف ہیں، اپنے خود ساختہ تصور کے تحت یا مجموعۂ خرافات سے متاثر ہو کر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے اپنے فرزند امیر یزید رحمہ اللہ کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنا کر شخصی حکومت کی راہ کھول دی، جمہوریت کو فنا کر دیا اور شوریٰ کی اہمیت ختم کر کے کاروانِ ملت کو غلط راہ پر ڈال دیا۔ یعنی جو آخری امت ہے وہ ڈیڑھ ہزار برس سے گمراہ ہے اس کی ''گاڑی پٹڑی سے اتر چکی'' یعنی ابھی اچھی طرح بنی بھی نہ تھی کہ بگڑ گئی اور وہ لوگ جو اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہلاتے ہیں، جنھیں ''خير أمة'' کہا گیا ہے اور زمین پر اپنا گواہ بنایا گیا ہے وہ سب راہِ حق چھوڑ بیٹھے اور ''گاڑی کو پٹڑی سے اتر جانے دیا۔'' إنا لله وإنا إليه راجعون

صحابہ کرام کے مخالف اور دشمن جو چاہتے کہتے، لیکن جو لوگ ان کی عظمت وجلالت اور صدق وامانت کے معترف ہیں وہ بھی اس اعتراض میں کسی سے کم نہیں۔ اس سلسلے میں نرم ترین بات یہ کہی گئی ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے افضل طریقہ ترک کر دیا۔ انھیں چاہیے تھا کہ اس انتخاب کو شوریٰ کے تحت کر دیتے۔ چنانچہ امام ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''لسنا ننكر، ولا تبلغ بنا الجهالة ولا لنا في الحق حمية جاهلية، ولا تنطوي علي غل لأحد من أصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، بل نقول: ﴿سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ

﴿آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ [الحشر: ١٠] إلا أن نقول: إن معاوية ترك الأفضل في أن يجعلها شورى، وألا يخص بها أحد من قرابته فكيف ولدا“[1]

”ہمیں انکار نہیں اور نہ ہم جہالت میں سرشار ہیں اور نہ حق کے بارے میں جاہلی جانبداری برتتے ہیں اور نہ ہم اصحابِ رسول اللہ ﷺ میں کسی کی طرف سے کدورت رکھتے ہیں، بلکہ ہماری دعا ہے: ”خدایا ہماری بھی خطا پوشی فرما اور ہمارے ان بزرگوں کی بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر گئے اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کی طرف سے کدورت مت رہنے دے۔ خدایا! تو ہی ہے دلوں میں رافت و رحمت پیدا کرنے والا ہے“ مگر ہم اتنا ضرور کہتے ہیں کہ (سیدنا) معاویہ رضی اللہ عنہ نے افضل بات چھوڑ دی۔ انھیں چاہیے تھا کہ امرِ خلافت کو شوریٰ کے سپرد کر دیتے اور اپنے کسی رشتہ دار کو بھی اس کے لیے خاص نہ کرتے چہ جائیکہ فرزند کو۔“

حضرت قاضی ابو بکر رحمہ اللہ جیسے عارف بھی جب اس طرح بات کرنے لگیں تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسئلہ کس حد تک مسخ کر دیا گیا ہے۔ آدمی حق معلوم کرنا چاہتا ہے اور پریشان خیالی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بالآخر تھک کر کہہ دیتا ہے کہ انھوں نے شوریٰ کا انعقاد نہ کر کے افضل طریقہ چھوڑ دیا۔ یہ سب تصور اس فضا نے پیدا کیا ہے کہ گویا اس وقت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، جو اپنی رائے رکھتا ہو اور اتنی حیثیت وقوت کہ فیصلہ اگر حق نہ ہو تو اسے رد کر سکے، لہٰذا وہ اپنی من مانی کر گئے اور یوں بقول ”مجددِ عصر“ کے ”گاڑی پٹڑی سے اتر گئی۔“

لہٰذا مناسب ہے کہ اول واقعات کی روشنی میں امام ابن العربی رحمہ اللہ کے بیان کی

---

[1] العواصم من القواصم (ص: ٢٢٢)

تنقیح کر لی جائے۔ کسی عمل کے افضل یا غیر افضل ہونے کا معیار مسلمانوں کے ہاں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ اس کے بعد ہے صحابہ کرام کا اجماع اور پھر ہے قیاس۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ہے تو امت کا عملِ متواتر ہے جو عہدِ نبوی سے بغیر انقطاع چلا آ رہا ہو۔ مسلم زاویۂ نگاہ سے گفتگو کی اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں۔ کتاب اللہ، سنتِ رسول ﷺ اور اجماعِ صحابہ کی بابت زیرِ عنوان ''خلافتِ نبوت'' میں غالباً سب کچھ کہہ دیا گیا ہے، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں اور شوریٰ کا جو مفہوم ہے اس پر بحث ہو چکی۔ یہاں ہم نفسِ واقعہ سے بحث کرتے ہیں۔

شوریٰ:

جہاں تک واقعات شہادت دیتے ہیں اور صحیح روایات سے پتا چلتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ امیر یزید رحمہ اللہ کی ولایتِ عہد کے متعلق جس طرح امت کے نمایندوں سے مشورہ لیا گیا، ایسا مشورہ ان سے پہلے کسی کے لیے نہیں ہوا تھا۔ جس زبردست اکثریت کے ساتھ اس تحریک کی پذیرائی کی گئی، اس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔

تمام اہلِ تاریخ متفق ہیں کہ یہ تحریک خود حضرت امیر المومنین کی نہیں تھی اور نہ انھوں نے کبھی ظاہراً و باطناً اس قسم کا کوئی خیال ظاہر کیا تھا۔ سب کا اتفاق ہے کہ مسئلہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اٹھایا تھا۔ اس سلسلے میں اسلام کی اس جلیل القدر شخصیت اور صحابیِ رسول ﷺ پر جو فقرے کسے گئے ہیں اور سیوطی جیسے علما نے محدث و فقیہ ہونے کے باوجود ان پر افترا کیا ہے اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ یہ لوگ جانیں اور اللہ جانے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ یہ تحریک سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی تھی جو جمہور صحابہ کی طرح اموی حکمتِ عملی کے پیرو تھے، جس کی افادیت پر ہم گفتگو کر آئے ہیں۔

اس موضوع پر آج تک جس کسی معتبر شخص نے کچھ لکھا ہے اس کو یہ کہنے کی جرات نہیں ہوئی کہ حضرت امیر المومنین نے اس تجویز کو بطور خود منظور فرما لیا۔ آپ نے یہ شرط

لگائی تھی کہ دیار و امصار کے نمایندے یہ تحریک اٹھائیں تو اس پر غور کیا جائے گا۔ لوگوں نے اس تمام کارروائی کو نمایشی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امت کو دھوکا دینے کے لیے یہ سب کچھ ایک سیاسی چال کے طور پر کیا گیا۔ یعنی سب کارروائی حکماً تھی۔ اس الزام کی صفائی کی ہمیں ضرورت نہیں، جس کا جو جی چاہے سمجھ لے۔ ہمیں کسی ہم عصر کے دل کا بھی حال معلوم نہیں، چہ جائیکہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کسی شخص کے قلب میں جھانک سکیں اور شخص بھی وہ جسے جرح و تعدیل سے بالا سمجھنا تمام اہلِ رجال کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ ہم تو صرف واقعات دیکھتے ہیں، اس سے آگے جانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ایسی ہمت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ دین کا عالم اور وفادار باور کرانا چاہتے ہوں۔

متفق علیہ ہے کہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ سے اور امیر زیاد نے بصرہ سے وفد بھیجے تھے۔ ان وفدوں کے ارکان عربی النسل لوگوں پر مشتمل تھے۔ یعنی پہلے وفد انہی علاقوں سے آئے، جنھیں امویوں کا مخالف اور ہاشمیوں کا ہوا خواہ بتایا جاتا ہے۔ چھوٹی بڑی ہر کتاب جو تاریخ کی کہی جاتی ہے، اس میں ان سب تقریروں کے اقتباسات ہیں جو اس اجتماع میں ہوئیں۔ موافق و مخالف سب قسم کی باتیں نقل کی گئی ہیں، لیکن کوئی بات کسی مخالف نے ایسی نہیں کہی، جس سے امیر یزید بن امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہلیت اور صلاحیت پر حرف آئے۔

مسعودی کا بیان ہے:

”وفي سنة تسع و خمسين وفد علىٰ معاوية وفد من الأمصار من العراق وغيرها فكان ممن وفد من أهل العراق الأحنف بن قيس في آخرين من وجوه الناس“ [1]

”اور ۵۹ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس مختلف شہروں کے وفد آئے، یعنی عراق

[1] مروج الذهب (۳/۳٦،۳۷)

وغیرہ سب جگہ کے۔ اہلِ عراق کے وفد میں احنف بن قیس اور دوسرے بڑے بڑے لوگ تھے۔''

مسعودی نے اس اجتماع کا سنہ غلط دیا ہے، جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا۔ بہرحال اتنا پتا چل گیا ہے کہ امت کے بڑے بڑے نمایندے اس اجلاس میں موجود تھے۔ مسعودی کے نزدیک حضرت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ کی تقریر یہ تھی:

"إن الناس قد أمسوا في منكر زمان قد سلف، و معروف زمان يؤتنف، ويزيد حبيب قريب، فان توله عهدك فعن غير كبر مفن أو مرض مضن، وقد حلبت الدهور، وجربت الأمور، فاعرف من تسند إليه عهدك، ومن توليه الأمر بعدك، واعصى رأي من يأمرك ولا يقدر لك، ويشير عليك ولا ينظر لك"

''لوگ برے دور میں سے گزر چکے اور اچھے زمانے کی امیدیں لگائے ہوئے ہیں۔ یزید محبوب ہیں اور قریبی ہیں۔ آپ جو انھیں ولی عہد بنا رہے ہیں تو بغیر اس بڑھاپے کے جو قویٰ کو ضائع کر دیتا ہے اور بغیر اس بیماری کے جو جسم کو گھلا دیتی ہے۔ آپ نے وقت سے پورا فائدہ اٹھایا اور معاملات کو خوب پرکھا ہے۔ لہٰذا دیکھ بھال کر اپنا عہد سپرد کیجیے اور ولی عہد مقرر فرمایئے۔ ان لوگوں کی رائے پر مت چلیے جو بات تو کرتے ہیں، لیکن آپ کی حمایت کی قدرت نہیں رکھتے اور مشورہ تو دیتے ہیں، لیکن انھیں آپ کی خیر خواہی مطلوب نہیں۔''

دوسرے لوگوں نے، مثلاً: خضری نے لکھا ہے کہ جب لوگوں نے کافی بحث کر لی تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے احنف رحمہ اللہ سے کہا: "ما تقول يا أبا بحر؟" ''اے ابو بحر! آپ کیا کہتے ہیں؟'' تو انھوں نے عرض کی:

"نخافكم إن صدقنا، ونخاف الله إن كذبنا، وأنت يا أمير

المومنين أعلم بيزيد في ليله ونهاره وسره وعلانيته ومدخله ومخرجه، فإن كنت تعلمه لله وللأمة رضا فلا تشاور فيه، وإن كنت تعلم فيه غير ذلك فلا تزده الدنيا وأنت صائر إلى الآخرة وإنما علينا أن نقول سمعنا وأطعنا" [1]

"ہم سچ کہیں تو آپ کا ڈر ہے اور جھوٹ بولیں تو اللہ کا خوف ہے۔ امیر المومنین! آپ خود یزید کے احوال سے بہ نسبت ہمارے زیادہ واقف ہیں، ان کے رات دن کے مشاغل ان کے پوشیدہ اور علانیہ اعمال اور ان کا اٹھنا بیٹھنا سب آپ پر روشن ہے۔ اگر آپ انھیں خدا اور امت کی منشا کے موافق سمجھتے ہیں تو پھر کسی سے مشورہ مت کیجیے اور اگر آپ اس کے خلاف جانتے ہیں تو پھر ان کی دنیا کے لیے اپنی آخرت مت بگاڑیئے۔ رہے ہم تو ہمارا کام تو سننا اور اطاعت کرنا ہے۔"

حضرت احنف رحمہ اللہ جیسے باوقار شخص کی طرف ان دونوں مختلف و متضاد تقریروں کی نسبت درست نہیں معلوم ہوتی۔ مسعودی نے جو کچھ کہا ہے اور اپنی دانست میں اس بلیغ تقریر کے ذریعے دو کلیے بیان کیے ہیں، وہ دونوں مہمل ہیں۔ شریعت کا یہ کوئی قانون نہیں کہ آدمی ولی عہد اس وقت بنائے جب وہ بیماری سے گھل جائے یا سخت بڑھاپا اس کو بیکار کر دے اور یہ قول بھی درست نہیں کہ جو لوگ اس تحریک کی حمایت میں تھے وہ اسے کارگر بنانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، یا ان کی طرف سے بے وفائی کا خطرہ تھا۔ یہ صفت تو کچھ عراقیوں ہی کے ساتھ مختص رہی ہے۔

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنایا تھا۔ بے شک اس دن کو آپ اپنی زندگی کا آخری دن سمجھ رہے تھے۔ جیسا کہ فرمانِ خلافت

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية (۱۱۸/۲)

میں بھی مذکور ہے۔ لیکن لاکھوں آدمیوں کا تجربہ ہے اور علمِ طب میں اس کے ہزارہا شواہد ہیں کہ بظاہر ایک آدمی پر سکرات تک کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات محض سکتہ ہی میں نہیں، بلکہ واقعتاً مثل مردہ کے ہو جاتا ہے اور پھر اچانک اس کی حالت سنبھلنے لگتی ہے اور پھر برسوں زندہ رہتا ہے۔ اگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی ہوتا تو کیا حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی حیثیت ولی عہد خلافت کی نہ رہتی۔

دوسرے اس آخری دن بھی ایک خلیفہ اور اس کا ولی عہد دونوں کیا موجود نہ تھے؟ خلیفہ کے حواس درست ہیں، وہ احکام نافذ کرتا ہے، فرمان لکھواتا ہے، وصیتیں کرتا ہے اور ولایتِ عہد کی بیعت ہوتی ہے، کیا یہ بیعت ایسی حالت میں نہیں ہوئی کہ جانے والا خلیفہ اپنے حکم کے نافذ کرنے کی قدرت رکھتا تھا؟

پھر سوچنا چاہیے تھا کہ مسعودی اور سیوطی جیسے مورخین نے جو یہ بات تعریضاً کہی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے صحت و ثباتِ عقل کے ساتھ اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو ولی عہد بنایا تو اس اعتراض کی کیا قیمت ہے؟ کیا ولی عہد کا تقرر ایسی حالت میں کرنا چاہیے کہ نہ صحت ہو اور نہ ثباتِ عقل؟ اور ایسا کیا گیا تو کیا قانوناً ایسی وصیت قابلِ تسلیم ہو گی، جس کے متعلق یہ بھی نہ کہا جا سکے کہ ہوش میں کی گئی یا غفلت میں۔

پھر کیا اس کا امکان نہ تھا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۰ھ ہی میں ہو جاتی، یا ولایتِ عہد کی بیعت لیتے ہی وہ ختم ہو جاتے؟ اور کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مردِ مومن کو یہ نصیحت نہیں کی ہے کہ اس کی وصیت اس کے تکیے کے نیچے رہنی چاہیے، کیوں کہ موت کا علم کسی کو نہیں اور کتنے آدمی ہیں جو تندرست سوتے ہیں اور پھر سوتے ہی رہ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت احنف رحمہ اللہ جیسے صاحبِ عزیمت شخص کا یہ کہنا بھی نہایت مستبعد ہے: ''جھوٹ کہوں تو اللہ سے ڈر لگتا ہے اور سچ کہوں تو آپ سے'' نہ حضرت احنف رحمہ اللہ ایسے بزدل تھے کہ حق بات کہنے سے کسی انسان کا خوف کریں اور نہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ

ایسے ظالم و مستبد تھے اور خدا سے غافل کہ حق بات نہ سن سکیں۔ ان کا تو حلم ضرب المثل ہے۔

پھر یہ بات کیا ہوئی کہ ''آپ کے خیال میں یزید کی بیعت اللہ اور امت کی رضا کا موجب ہو تو لیجیے، مشورے کی ضرورت نہیں۔'' اگر بالفرض امیر یزید خلافت کے اہل نہ تھے اور امیر المومنین نے اپنی عقبیٰ بگاڑ کر ان کی بیعت لی تو کیا حضرت احنف رحمہ اللہ کے نزدیک یہ بیعت منعقد ہو گئی۔ کیا شریعت کا یہ بھی کوئی کلیہ یا جزئیہ ہے کہ کسی امرِ باطل میں جان بوجھ کر بیعت لینا چاہے تو وہ بیعت کر لی جائے۔

یہ ہے ان راویوں اور مورخوں کا حال کہ اس وقت امت کا جو عظیم ترین مسئلہ تھا اسے ان واہی روایات میں یوں گم کر دیا گیا۔ بہرحال اتنا معلوم ہو گیا کہ موافق و مخالف سب قسم کی تقریریں ہوئی تھیں اور جو اجتماع تھا وہ نمایندہ تھا، پھر اسے شوریٰ نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ سب کا اتفاق ہے کہ اس اجتماع میں اکثریت نے موافقت میں فیصلہ دیا تھا۔ چنانچہ سیدنا ضحاک رضی اللہ عنہ بن قیس جیسے مخلصوں کی بڑی پُر جوش تقریریں نقل کی گئی ہیں۔ اب یہ فیصلہ واقعی ہو یا مصنوعی، لیکن امیر المومنین نے اس اکثریت کے فیصلے کو حجت نہیں سمجھا اور فرمایا کہ جب تک اہلِ مدینہ راضی نہیں ہوں گے اسے نافذ نہیں کیا جائے گا۔ امیر المومنین کی یہ محض احتیاط تھی اور مقصود رفعِ شر تھا، کیوں کہ اب اہلِ مدینہ اربابِ حل و عقد نہیں رہے تھے کہ ان کا فیصلہ ناطق ہو۔ مدینہ بھی منجملہ دیگر امصار کے ہو گیا تھا۔ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک اہلِ مدینہ کی یہ حیثیت تھی، لیکن خلافتِ مرتضوی میں جب دار الخلافہ کوفہ ہو گیا تو اربابِ حل و عقد وہاں کے باشندے ہو گئے جو امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہتے تھے۔ کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کبھی امورِ مملکت میں اہلِ مدینہ کی رائے لی ہو، یا آخری وصیت میں یہ فرمایا ہو کہ نئے خلیفہ کا انتخاب اہلِ مدینہ کے فیصلے سے کرنا۔ آپ نے عیاناً یہ حق صرف اہلِ کوفہ کا سمجھا کہ ہونے والے خلیفہ کا انتخاب کریں۔ اسی بنا پر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کو صحیح تسلیم کیا گیا اور ان کی یہ حیثیت مانی

گئی کہ زیرِ نگین علاقے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد وہ امام ہیں۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ پر اجماع ہونے کے بعد اربابِ حل و عقد اہلِ دمشق ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بنو ہاشم اور اکابر صحابہ نے حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت نہیں کی، کیوں کہ اربابِ حل و عقد نے ان کا انتخاب نہیں کیا تھا، بلکہ جو اہلِ حل و عقد تھے انھوں نے امیر المومنین معاویہ ثانی رحمہ اللہ کی خلافت پر بیعت کی تھی اور پھر ان کے مستعفی ہونے کے بعد امیر المومنین مروان اول کو خلیفہ منتخب کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی وفات کی خبر سن کر جب امیر حصین بن نمیر نے مکہ کا محاصرہ اٹھایا ہے تو حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے کہا تھا کہ دمشق چلیں اور ذمہ لیا تھا کہ وہاں ایک شخص بھی ان کے مخالف نہ ہوگا، لیکن افسوس کہ انھوں نے نہ محض یہ کہ ان کا صائب مشورہ قبول نہیں کیا، بلکہ نہایت حقارت سے اسے ٹھکرا دیا اور تہدید آمیز کلمات کہہ کر امت کا متفق علیہ امام ہونے کا بہترین موقع کھو دیا۔ بنو ہاشم اور اکابر صحابہ آئینی حیثیت سے شام ہی کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے۔ چنانچہ امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ سے سب نے بیعت کر لی۔

”و الأصح ما قاله الذهبي أن مروان لا يعد في أمراء المؤمنين بل هو باغ خارج على ابن الزبير و لا عهده إلى ابنه بصحيح و إنما صحت خلافة عبد الملك من حين قتل ابن الزبير“

”زیادہ صحیح وہ ہے جو ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مروان کا شمار امرائے مومنین میں نہیں ہے، بلکہ وہ باغی ہیں اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما پر خروج کرنے والے۔ انھوں نے اپنے فرزند کو جو ولی عہد مقرر کیا تھا تو وہ بھی صحیح عمل نہ ہوا۔ عبدالملک رحمہ اللہ کی خلافت تو ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے قتل ہونے کے بعد صحیح ہوتی۔“

اس زمانے کے متعلق یہ فیصلہ کرنے میں کہ کس کی خلافت صحیح تھی اور کس کی نہیں، ذہبی رحمہ اللہ اور سیوطی رحمہ اللہ کا قول نہیں لیا جا سکتا۔ یہ فیصلہ کرنے کا حق ہم عصر حضرات کا

تھا۔ تمام بنو ہاشم اور ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہم نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت نہیں کی اور امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ سے کی۔ البتہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو وہ بالفعل خلیفہ سمجھتے تھے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی سنتِ مرتضوی کے مطابق ان حضرات سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا اور ان باتوں میں کچھ جان نہیں جو سیدنا محمد بن علی بن ابی طالب اور ان کے اہلِ بیعت کی قید و بند اور مختار کے ہاتھوں رہائی کی بابت لوگوں نے بیان کی ہیں۔

اگرچہ بنو ہاشم وغیرہم کے نزدیک امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ خارجی اور باغی ہوتے اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما جائز خلیفہ تو پھر ان سے بیعت کا کیا سوال تھا ان سے تو قتال واجب ہو جاتا، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کی آمد کے ایسے منتظر نہ ہوتے جیسے بخاری کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے جو اوپر ''دین کی حفاظت'' کے عنوان کے تحت بیان کی جا چکی۔ اتنا اور عرض ہے کہ ذہبی اور سیوطی کا فتویٰ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابن عباس رضی اللہ عنہما پر نہیں چل سکتا۔

بہرحال امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے امیرِ مدینہ سیدنا مروان بن الحکم رحمہ اللہ کے نام فرمان بھیجا کہ ''امیر یزید کی ولایتِ عہد کا مسئلہ اہلِ حرم کے سامنے پیش کریں'' اللہ کا شکر ہے کہ اس کی تفصیل کے لیے ہمیں مسعودی اور طبری دیکھنے کی ضرورت نہیں:

''عَنْ يُوسُفَ بْنِ مَاهَكَ، قَالَ: كَانَ مَرْوَانُ عَلَى الْحِجَازِ اسْتَعْمَلَهُ مُعَاوِيَةُ فَخَطَبَ فَجَعَلَ يَذْكُرُ يَزِيدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ لِكَيْ يُبَايَعَ لَهُ بَعْدَ أَبِيهِ، فَقَالَ لَهُ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ شَيْئًا، فَقَالَ: خُذُوهُ، فَدَخَلَ بَيْتَ عَائِشَةَ فَلَمْ يَقْدِرُوا، فَقَالَ مَرْوَانُ: إِنَّ هَذَا الَّذِي أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيهِ: ﴿وَالَّذِىْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدَانِنِىْٓ﴾ فَقَالَتْ عَائِشَةُ مِنْ وَرَاءِ الْحِجَابِ: مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فِينَا شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ عُذْرِي'' [1]

[1] صحيح البخاري، ج ٢، كتاب التفسير (الاحقاف) ص: ٧١٥، طبع أصح المطابع.

''یوسف بن ماہک سے مروی ہے کہ حجاز کے والی مروان تھے۔ انھیں معاویہ رضی اللہ عنہ نے مقرر کیا تھا، چنانچہ انھوں نے ایک تقریر کی اور یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر چھیڑا کہ ان کے والد کے بعد ان سے بیعت کی جائے۔ اس پر عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے ٹوکا تو انھوں نے کہا: ''پکڑ لو انھیں'' لیکن وہ عائشہ کے گھر چلے گئے اور لوگ انھیں پکڑ نہ سکے۔ مروان نے کہا: یہی ہیں وہ جن کے بارے میں اللہ نے یہ آیت نازل کی ہے: ''وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا تھا افسوس ہے تم پر تم مجھے دھمکی کیا دیتے ہو۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے پردے کے پیچھے سے فرمایا: ہمارے متعلق اللہ تعالیٰ نے کوئی آیت قرآن میں نہیں اتاری، سوائے اس کے کہ اللہ نے میری براءت نازل فرمائی۔''

سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا تھا، اس کا ذکر اس حدیث میں نہیں اور نہ وہ باتیں ہیں جو بعد کی روایات میں بیان ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے قیصریت کا طعن دیا تھا، یعنی ایک قیصر کے بعد دوسرا قیصر بنایا جا رہا ہے۔ سیدنا مروان نے جو آیت کا حوالہ دیا تو وہ اس اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے کہ سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں کافروں کی طرف سے شریک تھے، حالانکہ ان کے والدین شروع ہی سے مسلمان چلے آ رہے تھے۔ ممکن ہے ایسا واقعہ پیش آیا ہو۔ حضرت مروان کا بہرحال مقصد یہ نہیں تھا کہ واقعی یہ آیت شریفہ سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، بلکہ مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے، جو اپنی رائے کے مقابلے میں بزرگوں پر طعن کر دیتے ہیں یا اپنی اہمیت ان سے زیادہ سمجھتے ہیں، کیوں کہ سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کوئی چبھتی ہوئی بات متفق علیہ امام کے متعلق کہی اور ان بزرگوں کی موجودگی میں جو صحیح معنی میں اہل الرائے تھے، مثلاً: سیدنا سعد بن ابی وقاص اور سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہما اور دوسرے اجلہ اکابر۔

ام المومنین نے جو فرمایا تو مراد یہ تھی کہ برائی کی حیثیت سے اس دودمانِ عالی شان کی

بابت کوئی آیت نہیں اتری۔ جو آیتیں نازل ہوئی ہیں وہ توصیفاً ہیں۔ ایک تو یہی جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی اور دوسری ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ﴾ کی آیت کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو غار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیتِ خاصہ حاصل تھی جو پھر ہمیشہ رہی۔

غرض یہ ہے کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے اس اعتراض، امیر مروان کے اس قول اور ام المومنین کے جواب میں ان لغو اور فضول باتوں میں سے کچھ نہیں جو نیچے کے راویوں نے بڑھائی ہیں اور سیوطی صاحب نے تفسیر ابن ابی حاتم سے نقل کر کے اپنی دانست میں ایک معمہ حل کیا ہے کہ ام المومنین نے مروان رحمہ اللہ پر چوٹ کی کہ ''اس کے باپ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے اور یہ اس وقت ان کی پشت میں تھا۔ اس لیے اس لعنت کا کچھ حصہ اسے بھی پہنچا ہے۔'' خدا ان مفسروں اور راویوں سے سمجھے گا جنھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت اطہار پر کذب و افترا کی اتنی جراَت ہے۔ کیا ان کے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ کا بیان کافی نہیں تھا جو زبان وقلم کو ان مکروہ الفاظ سے آلودہ کیا گیا؟![1]

---

[1] حکومتی معاملوں میں لوگوں کے درمیان اختلاف ہو جایا کرتا تھا اور ان میں لڑائی جھگڑے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ صحیح مسلم کی وہ روایت معروف ہے جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ جھگڑتے ہوئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آتے ہیں اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ اس خائن، کذاب اور برے آدمی علی رضی اللہ عنہ اور میرے درمیان فیصلہ کر دیجیے۔ تو کیا اب اس سے ہم ایسا ہی سمجھیں گے؟ تو کیا اب اس سے ہم یہ سمجھیں گے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نعوذ باللہ بدمعاش، خائن اور جھوٹے انسان تھے، کیوں کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے ان کو غصے میں یہ سب کہہ دیا۔ لہٰذا کچھ معاملات وقتی نوعیت کے ہوتے ہیں جن کو صرف ان مخصوص حالات میں ہی سمجھا جاسکتا ہے جس میں وہ وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان حالات کے علاوہ ان کی تعبیر وتشریح کرنا ہم کو ضلالت میں دھکیل سکتا ہے۔ اس روایت میں کہیں بھی مذکور نہیں کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے مروان رضی اللہ عنہ یا یزید رحمہ اللہ کو برا بھلا کہا ہو جب کہ وہ کہہ سکتی تھیں، لیکن انھوں نے ایسا کچھ نہیں کہا جو یہ ثابت کرنے کو کافی ہے کہ سیدنا مروان رضی اللہ عنہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی نظروں میں بھی اچھے انسان تھے۔ اور پھر معترضین کا اس حدیث کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ وسیدنا مروان رضی اللہ عنہ کی تنقیص میں نقل کرنا کچھ درست معلوم نہیں ہوتا، اس روایت سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو امیر یزید رحمہ اللہ کی نامزدگی پر ←

ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی اس بات کے جس کی تفصیل امام بخاری کونہیں پہنچی اور کوئی بات اس مجمع میں نہیں ہوئی اور نہ سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی بات کو بڑھایا گیا، بلکہ قضیہ رفع دفع ہو گیا۔ اگر زمانہ جور و استبداد کا ہوتا تو اس اعتراض پر بہت کچھ لے دے ہوتی، لیکن وہ عہد تھا نورانیت کا اور مجمع تھا عظیم ترین اکابرِ امت کا اور اس میں وہ بزرگوار بیٹھے تھے جنھوں نے جان و مال قربان کر کے دین قائم کیا تھا اور جن کی آواز امت میں سنی جاتی تھی۔

لیکن امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہلِ مدینہ کی اس ایک آواز کو بھی بہت سمجھا اور بذاتِ خود افہام و تفہیم کے لیے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ آپ کے سامنے پھر اجلاس منعقد ہوا اور مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ تمام شرکائے اجلاس نے حالاتِ حاضرہ اور خدشاتِ آیندہ کے پیشِ نظر امیر المومنین کی تجویز منظور کی۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے دل میں اس وقت اپنا خیال آیا اور خلافت کے لیے اپنی اہلیت و موزونیت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ اگر اس وقت یا بعد میں کسی وقت کھڑے ہو جاتے تو امت کی سیاست میں ایک انقلاب آ جاتا۔ آپ کی شخصی عظمت اور امت میں مقبولیت ایسی نہ تھی کہ ہنگامہ برپا ہوتا اور سخت حالات رونما ہو جاتے۔ آپ کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکتا۔ آپ ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بارے میں استصواب کیا:

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى حَفْصَةَ وَنَسْوَاتُهَا تَنْطُفُ، قُلْتُ: قَدْ كَانَ مِنْ أَمْرِ النَّاسِ مَا تَرَيْنَ فَلَمْ يُجْعَلْ لِي مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ، فَقَالَتْ: اِلْحَقْ فَإِنَّهُمْ يَنْتَظِرُونَكَ، وَأَخْشَى أَنْ يَكُونَ فِي

← اعتراض تھا لیکن ان کا یہ اعتراض ہم عصر امت نے لائقِ اعتنا اس لیے نہیں سمجھا کہ اس وقت ان سے زیادہ جلیل القدر اصحاب رضی اللہ عنہم زندہ تھے، جنھوں نے بخوشی یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے لیے رضامندی ظاہر کر رکھی تھی۔ خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یزید رحمہ اللہ کی ولی عہدی کی بیعت کی تھی۔

احْتِبَاسِكَ عَنْهُمْ فُرْقَةٌ فَلَمْ تَدَعْهُ حَتَّى ذَهَبَ"[1]

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں حفصہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کی زلفوں سے اس وقت پانی ٹپک رہا تھا (غالبًا سر دھویا تھا) میں نے عرض کی: آپ لوگوں کا حال دیکھ رہی ہیں، اس معاملے میں میری کوئی حیثیت نہیں رکھی گئی۔ فرمایا: جاؤ، لوگ تمھارے انتظار میں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ تمھارے بیٹھ رہنے سے کہیں اختلاف نہ پیدا ہو جائے۔ اور اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑا جب تک چلے نہ گئے۔''

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ امیر یزید رحمہ اللہ کی ولایتِ عہد پر اجلاس کا اجماع ہو گیا تھا اور کسی ایک طرف سے بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھی، کیونکہ مسئلے کی نوعیت اور مصلحتِ ملیہ کو سب نے سمجھ لیا تھا۔ سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی اب متفق تھے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ واقعہ بہت بعد میں بیان کیا ہے جب آپ کے فرزند سیدنا سالم رضی اللہ عنہ روایت کے قابل ہو گئے تھے۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے بالوں کی کیفیت کا ذکر محض ان کی یاد میں ہے کہ اس کے ذکر کے وقت بھائی کی نگاہوں میں وہ منظر پھر گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مسئلہ فوری توجہ کا تھا، یعنی مسجد میں اجتماع کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آ چکے تھے اور غالبًا صرف آپ ہی کے پہنچنے کا انتظار تھا۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا اس وقت زندہ تھیں۔

دار المصنفین اعظم گڑھ نے سیر الصحابہ میں اس حدیث کو بے وجہ اور بے دلیل اذرح کے اجتماع پر منطبق کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اذرح مدینہ سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں جو اجتماع ہوا اس کے لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو امیدواری کا کوئی موقع نہ تھا، کیونکہ وہ اجتماع ہوا تھا سیدنا علی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کے نزاعی مسئلے کا تصفیہ کرنے کے لیے۔ اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما موجود تھے، اگر وہاں پہنچنے کے لیے آپ

[1] صحيح البخاري، جز ١٦، ص: ٥٨٩، طبع أصح المطابع.

ام المومنین رضی اللہ عنہا سے اجازت مانگتے تو حدیث کے الفاظ یہ نہ ہوتے: ”فَلَمْ يُجْعَلْ لِي مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ“ ”اس معاملے میں میری کوئی حیثیت نہیں رکھی گئی“ یہ بات اذرُح کے اجتماع کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی اور نہ اس کے لیے ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتیں: ”اِلْحَقْ فَإِنَّهُمْ يَنْتَظِرُونَكَ الخ“ ”جاؤ لوگ تمھارے انتظار میں ہیں اور تمھارے بیٹھ رہنے سے اختلاف کا ڈر ہے۔“ یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ معاملہ جلدی کا تھا اور قریب کا، نہ کہ سیکڑوں میل کے سفر کا، اور اس موقع کا جس کا تعلق ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بلاواسطہ کچھ بھی نہ تھا اور جس میں وہ کسی حیثیت سے فریقِ معاملہ نہ تھے۔

حدیثِ بالا میں اجلاس اور تمام بیعت کے بعد کی بات بھی ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بتائی ہے۔فرماتے ہیں:

”فَلَمَّا تَفَرَّقَ النَّاسُ خَطَبَ مُعَاوِيَةُ قَالَ: مَنْ كَانَ يُرِيدُ أَنْ يَتَكَلَّمَ فِي هَذَا الْأَمْرِ فَلْيُطْلِعْ لَنَا قَرْنَهُ فَلَنَحْنُ أَحَقُّ بِهِ مِنْهُ وَمِنْ أَبِيهِ، قَالَ حَبِيبُ بْنُ مَسْلَمَةَ: فَهَلَّا أَجَبْتَهُ؟ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: فَحَلَلْتُ حُبْوَتِي وَهَمَمْتُ أَنْ أَقُولَ: أَحَقُّ بِهَذَا الْأَمْرِ مِنْكَ مَنْ قَاتَلَكَ وَأَبَاكَ عَلَى الْإِسْلَامِ، فَخَشِيتُ أَنْ أَقُولَ كَلِمَةً تُفَرِّقُ بَيْنَ الْجَمْعِ وَتَسْفِكُ الدَّمَ وَيُحْمَلُ عَنِّي غَيْرُ ذَلِكَ، فَذَكَرْتُ مَا أَعَدَّ اللّٰهُ فِي الْجِنَانِ، قَالَ حَبِيبٌ: حُفِظْتَ وَعُصِمْتَ“

”جب لوگ متفرق ہو گئے (اور صرف خاص مجمع رہ گیا) تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے تقریر کی اور فرمایا: اب بھی کوئی صاحب اس معاملے میں بولنا چاہتے ہوں تو ہم سے آنکھ ملائیں۔ ہم ان سے اور ان کے والد سے اس امر (خلافت) کے زیادہ حق دار ہیں۔ حبیب بن مسلمہ نے (یعنی جن صحابی سے یہ واقعہ بیان ہو رہا ہے) فرمایا: تو پھر آپ نے کچھ جواب بھی دیا؟ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: میں نے اپنا حبوہ کھولا اور کہنا چاہا: آپ سے زیادہ اس کا حق انھیں ہے جنھوں نے آپ سے اور آپ کے والد سے اسلام کے لیے جنگ کی تھی۔ لیکن مجھے خوف ہوا کہ کہیں ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے جو اجماع کے بعد افتراق کا موجب ہو، خون ریزی کی نوبت آئے اور میرا عندیہ غلط سمجھ لیا جائے۔ لہٰذا میں نے ان نعمتوں کا خیال کیا جو اللہ نے میرے لیے جنت میں مہیا کی ہیں (اس لیے چپ رہا) سیدنا حبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ کو اللہ نے ایک غلط بات کہنے سے محفوظ رکھا اور غلط اقدام سے بچا لیا۔"

حبوہ کہتے ہیں اس کپڑے کو جو بل دے کر عمامہ کی طرح کمر اور ٹانگوں کے گرد باندھ لیا جاتا ہے اور اس طرح آدمی ٹانگیں کھڑی کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ ہاتھوں کو ٹانگوں کے گرد حلقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہ سیدنا حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں تھے۔ غزواتِ روم میں آپ نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ صفین کے موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے گفتگو میں بھی آپ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے آئے تھے۔ اجتماعِ مدینہ میں موجود نہ تھے، کیوں کہ رومیوں سے جہاد کے سلسلے میں آپ کا زیادہ وقت اسی علاقہ میں گزرتا تھا۔ حدیثِ بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیدنا حبیب رضی اللہ عنہ اس وقت زندہ تھے، جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے آپ سے گفتگو کی۔ یعنی ولایتِ عہد کا مسئلہ طے ہو جانے کے عرصہ بعد۔

ظاہر ہے کہ شخصی حیثیت سے امیر یزید کا اکابر صحابہ کے مقابلے میں کیا درجہ ہوتا، وہ تو ان کے خورد اور تابع تھے۔ لیکن یہ حضرات جن کے دلوں میں خلافت کی خواہش تھی اور بالکل بجا، خود ان سے بھی تو بڑے بڑے لوگ موجود تھے جن کے سامنے ان کی حیثیت وہی تھی جو ان کے سامنے یزید کی۔

اگر سیدنا سعد بن ابی وقاص اور سیدنا سعید بن زید کی موجودگی میں حضرت ابن عمر یا

حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر وغیرہما خلافت کے امیدوار ہو سکتے تھے تو خود ان کے سامنے امیر یزید کو یہ حق کیوں نہ تھا۔ فرزندانِ صحابہ میں اس وقت خلافت کی خواہش رکھنے کے حق دار یہ حضرات ہیں:

① حضرت خلیفہ رسول اللہ ﷺ کے فرزند سیدنا عبدالرحمان رضی اللہ عنہ۔

② امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے فرزند سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ۔

③ امیر المومنین عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت سعید رضی اللہ عنہ۔

④ امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرزند سیدنا حسین رضی اللہ عنہ۔

⑤ حضرت سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ۔

⑥ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے فرزند سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ۔

لیکن ان میں سے سیدنا عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کی خواہش کا علم، تاریخی حیثیت سے کسی معتبر شخص نے بیان نہیں کیا۔ آپ نے ابتداءً ولایتِ عہد کے بارے میں کچھ اعتراض کیا تھا، لیکن امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے آپ نے یہ اعتراض نہیں کیا، بلکہ آپ مطمئن ہو گئے تھے اور کسی طرح یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے ولایتِ عہد کی بیعت نہیں کی تھی۔ خلافت کا زمانہ آنے سے پہلے ۵۳ھ میں وفات پا گئے، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کا موقف کیا ہوتا۔ بلکہ صحیح قیاس یہ ہے کہ آپ امیر المومنین یزید سے یقیناً بیعت کر لیتے اور کبھی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حکم سے سرتابی نہ کرتے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا موقف ہمیں معلوم ہے۔ ابھی بیان ہوا کہ جو خیال آپ کے دل میں پیدا ہوا تھا وہ ام المومنین حضرت سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی توجہ سے نکل گیا اور پھر کبھی نہیں آیا۔ آپ نے دونوں بیعتیں کیں اور پوری قوت وعزیمت سے مستقیم رہے، جیسے آگے بیان ہوگا۔

حضرت سعید بن عثمان رضی اللہ عنہما نے دونوں بیعتیں کیں اور ہمیشہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ

سے وابستہ رہے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بابت زیادہ صحیح یہ ہے کہ آپ نے ولایتِ عہد کی بیعت کی تھی، اگرچہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ نہیں کی۔ طبری نے امیر یزید کے وہ اشعار نقل کیے ہیں جو انھوں نے حادثۂ کربلا کے بارے میں اہلِ مدینہ کو بھیجے تھے، جس میں وہ کہتے ہیں:

أبلغ قريشاً على شحط المزار بها　　　بيني وبين حسين الله والرحم

''اے قاصد! قریش کو میری طرف سے پیغام پہنچا دے، کیوں کہ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے میرا جانا مشکل ہے کہ میرے اور حسین رضی اللہ عنہ کے معاملے میں اللہ اور رشتے داری کا واسطہ تھا۔''

وموقف بفناء البيت أنشده　　　عهد الاله وما ترعىٰ به الذمم

''اور حرم شریف کے صحن میں کیا ہوا خدا کے نام کا عہد تھا جو میں نے انھیں یاد دلایا اور وہ سب باتیں یاد دلائیں، جن سے ذمے داریوں کا احساس زندہ رہتا ہے۔''

اس قصیدے کی زبان بالکل اس عہد کی ہے اور کوئی وجہ نہیں جو اسے امیر یزید کا قصیدہ نہ سمجھا جائے۔ بہر حال آپ نے خلافت کی بیعت سے گریز کیا، اگرچہ مورخ کہتے ہیں کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر سن کر آپ نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی تھی اور بیعت کے لیے فرمایا تھا کہ خفیہ نہیں کریں گے، بلکہ علانیہ سب کے سامنے کریں گے۔ لیکن رات ہی کو مکہ روانہ ہو گئے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن ہم یہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ آپ کا ارادہ خروج کا نہیں تھا اور آپ نے ہرگز کوفیوں سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ متفق علیہ ہے کہ ابتدا کوفیوں نے کی تھی اور خط پر خط اور وفد پر وفد آپ کی خدمت میں بھیجے تھے اور یہ یقین دلایا تھا کہ عراق سب کا سب امیر یزید کی بیعت توڑ کر آپ کی بیعت پر تیار ہے۔ ان لوگوں کے غدر کا حال آپ کو کوفہ کے قریب پہنچنے پر ہوا اور وہاں جب آپ نے دیکھا کہ ان خط بھیجنے والوں نے اور ان وفد لانے والوں نے سب جھوٹ کہا تھا، عراق پوری طرح امیر یزید کی

بیعت پر قائم ہے اور ہر طرح وہاں ان کی حکومت مضبوط ہے تو آپ نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا، جیسا کہ آیندہ مذکور ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی ولایتِ عہد کی بیعت کی تھی، اگرچہ خلافت کی بیعت سے انکار کر دیا، لیکن یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فیضان تھا کہ آپ نے امیر یزید رحمہ اللہ کی زندگی بھر اپنی طرف دعوت نہیں دی اور خلافت کا دعویٰ صرف اس وقت کیا جب انھیں امیر یزید رحمہ اللہ کی وفات کی اطلاع مل گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے دونوں بیعتیں کیں اور برابر اس کی تبلیغ کرتے رہے کہ لوگوں کو اپنی اپنی بیعت پر استقامت چاہیے۔ ویسے بھی آپ کے دل میں امیر یزید رحمہ اللہ کی علمیت اور فضیلت کی قدر تھی اور آپ نے ان کی کمان میں جہاد کیا تھا، ایسے ہی جیسے سیدنا عبداللہ بن الزبیر اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہم نے۔[1]

سوال یہاں شخصیتوں کا نہیں تھا، بلکہ امت کے مستقبل کا تھا۔ ضرورت ایک ایسے امام کی تھی جس کی پشت پر طاقت ہو، جسے وفادار اور باہمت اعوان و انصار میسر ہوں، جو اتنی

---

[1] امام احمد بن یحییٰ البلاذری اپنے استاد امام مدائنی سے نقل کرتے ہیں:

”عامر بن مسعود کہتے ہیں کہ ہم مکہ میں تھے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر دینے والا ہمارے پاس سے گزرا تو ہم سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، وہ بھی مکہ ہی میں تھے، ان کے ساتھ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور دسترخوان لگایا جا چکا تھا، لیکن ابھی کھانا نہیں آیا تھا تو ہم نے ان سے کہا: اے ابو العباس! ایک قاصد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر لایا ہے۔ یہ سن کر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر فرمایا: اے اللہ! معاویہ رضی اللہ عنہ پر اپنی رحمت وسیع فرما۔ یقیناً آپ ان لوگوں کے مثل تو نہ تھے، جو آپ سے پہلے گزر چکے، لیکن آپ کے بعد بھی آپ جیسا کوئی نہ دیکھنے کو ملے گا اور آپ کے صاحبزادے یزید بن معاویہ اپنے خاندان کے نیک و صالح شخص ہیں، اس لیے آپ لوگ اپنی اپنی جگہ اطمینان رکھیے اور ان کی اطاعت اور بیعت کر لیجیے ...اور پھر آپ گئے اور بیعت کر لی۔“ (أنساب الأشراف للبلاذري: ٥/٣٠٢، وإسناده حسن لذاته)

قابلیت رکھتا ہو کہ پیش آمدہ حالات کا بخوبی مقابلہ کر سکے۔ خود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی جب بیعت ہوئی تھی تو کیا ان سے زیادہ برگزیدہ اور کار آزمودہ حضرات موجود نہ تھے؟ لیکن ان کی بیعت پر سب نے اجماع کر لیا، کیوں کہ اس وقت کے حالات میں ان کے علاوہ کوئی نہ تھا جو امت کی گوناگوں مشکلات پر قابو پا سکے اور کیا سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی جب بیعت ہوئی تھی تو ان سے افضل واقدم حضرات موجود نہ تھے، جو از اول تا آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور جن کے مدبرانہ اور فاتحانہ کارنامے صفحۂ دہر پر ثبت ہیں اور جن کی شخصی عظمت و جلالت بے عدیل ہے، مثلاً: سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور خود اہلِ بیت میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما موجود نہ تھے جو ظاہراً و باطناً سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے بدرجہا افضل ہیں، اعلم ہیں اقدم ہیں اور جن کے فیوض سے یہ امت اب تک مستفیض ہے۔ برکاتِ نبوت میں جتنا فیض سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کا امت کو پہنچا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی اہلِ بیت میں سے کسی دوسرے بزرگوار کا نہیں پہنچا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان چند ہستیوں میں ہیں جن سے دین لیا جاتا ہے اور جن کا اجتہاد حجت ہے۔

جن بزرگواروں نے اس وقت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کی تھی وہی تو تھے جنھوں نے امیر یزید رحمہ اللہ کی ولایتِ عہد کے مسئلے میں ان کی حمایت کی۔ بے شک سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ولی عہد بنایا جاتا تو ہر طرح اس کے اہل تھے، لیکن یہ خود جب امیر یزید رحمہ اللہ کی حمایت کریں اور ان کی حکومت کو مضبوط کرنے کے درپے ہوں تو پھر کسی کو بولنے کا کیا موقع رہا؟

یہ جو لوگوں نے افضل و مفضول کی بحث نکالی ہے، ان کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ عالم و متقی اور عارف و فقیہ کون ہو گا اور کتنے ہوں گے جو شجاعت، سخاوت، عزیمت، زہد اور خطابت میں آپ کا مقابلہ کر سکیں، لیکن یہ سب ذاتی فضائل و مکارم ان کے کچھ کام نہ آئے، اس لیے کہ آپ کو مخلص اور وفادار اعوان و انصار

نصیب نہ ہو سکے۔ ساتھ دینے کو کھڑے ہوئے تو کون؟ عراقی! جن کے نہ قول کا اعتبار اور نہ فعل کا جو بظاہر تو آپ کے عقیدت مند بنتے تھے، لیکن بباطن ہمیشہ آپ کی حکمتِ عملی کو ناکام بنانے کے درپے رہے اور جو واقعی مخلص حضرات تھے ان کی رائے نہ چلنے دی۔

اسی بنا پر یہ طے ہو گیا تھا کہ افضل ومفضول کا قصہ ختم کر کے خلافت کو بنوعبدِ مناف میں محصور کر دیا جائے اور بنوعبدمناف میں سے بھی امامت کی ذمے داریاں اموی سادات پر ڈالی جائیں، تاکہ خلیفہ کی پشت پر ایسی طاقت ہو جو مخالف اور تباہ کن تحریکوں کو سر اٹھانے سے روک سکے۔ عرب عموماً اور اہلِ شام خصوصاً بنو امیہ کے ایسے سچے حامی تھے کہ دوسروں کو کبھی میسر نہ آ سکے۔ یہ تھی صاف اور سیدھی بات جسے قسم قسم کے مسائل اٹھا کر پیچیدہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ مسئلہ بآسانی طے کر دیا۔ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایات اس پر شاہدِ عدل ہے۔

خاص اجتماع میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے خاندان کی ہی مقبولیت عامہ کی بنا پر ان حضرات پر چوٹ کی تھی، جن کے متعلق آثار تھے کہ وہ خلافت کے خواہش مند ہیں، ورنہ سب جانتے ہیں کہ انھیں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے کتنی عقیدت تھی اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ بھی ان کی کتنی قدر کرتے تھے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جو جواب دینا چاہا تھا وہ شخصیتوں کے اعتبار سے تھا، ویسے مصلحتِ ملیہ کو وہ بھی سمجھتے تھے، اس لیے خاموش رہے۔ ہر مسئلے میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہی موقف تھا کہ جس بارے میں امت کا اجماع ہو جائے اس سے اختلاف نہ کریں اور جب اختلاف ہو تو بالکل غیر جانبدار ہو جائیں اور کسی طرف سے فریق نہ بنیں۔ اسی موقف کی آپ نے ہمیشہ تبلیغ کی:

”عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما أَتَاهُ رَجُلَانِ فِي فِتْنَةِ ابْنِ الزُّبَيْرِ فَقَالَا: إِنَّ النَّاسَ قَدْ ضُيِّعُوا، وَأَنْتَ ابْنُ عُمَرَ وَصَاحِبُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَمَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَخْرُجَ؟ فَقَالَ: يَمْنَعُنِي أَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ دَمَ أَخِي،

فَقَالَا: أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ [البقرة: ۱۹۲]
فَقَالَ: قَاتَلْنَا حَتَّى لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ، وَكَانَ الدِّينُ لِلّٰهِ، وَأَنْتُمْ تُرِيدُونَ
أَنْ تُقَاتِلُوا حَتَّى تَكُونَ فِتْنَةٌ، وَيَكُونَ الدِّينُ لِغَيْرِ اللّٰهِ" [1]

''حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ فتنہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں دو آدمی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: آپ دیکھ رہے کہ لوگوں نے کیا کر رکھا ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ تو عمر رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تو پھر آپ کو کھڑے ہونے سے کیا چیز روک رہی ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھے یہ چیز روکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر میرے مسلم بھائی کا خون حرام کر دیا ہے، انھوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: ''ان سے قتال کرو، تاآنکہ فتنہ مٹ جائے'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''وہ قتال ہم کر چکے، تاآنکہ فتنہ مٹ گیا اور دین اللہ کے لیے ہو گیا، لیکن تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو تاآنکہ فتنہ پھیل جائے اور دین غیرِ خدا کے لیے ہو جائے۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی راہ میں ملت کی بہبود تھی اور انہی کا منہاج آخر میں کامیاب ہوا کہ امت ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئی اور فرقہ بازوں اور فتنہ خیزیوں سے بڑی حد تک نجات مل گئی۔ بہرحال امیر یزید رحمہ اللہ کی بیعت پر بلا اکراہ اجماع ہو گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر ایسے متفق اللسان ہو گئے، جیسے خود امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہو گئے تھے۔

اسی ذیل میں متضاد اور بے اصل روایتوں کے انبار لگا دیے گئے ہیں اور غالباً ہزارہا

---

[1] صحیح البخاري، کتاب تفسیر القرآن، باب قوله: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ...الخ﴾ رقم الحدیث (٤٥٤٧)

صفحے اس موضوع پر اب تک سیاہ ہو چکے ہوں گے۔ لیکن امت کے اجماع کی عملی دلیل یہ ہے کہ امیر یزید رحمہ اللہ جب سریر آرائے خلافت ہوئے تو اس وقت ذی اثر اصحاب میں سے صرف دو صاحبوں نے بیعت سے گریز کیا اور یہ دونوں صغار صحابہ میں ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دین کے لیے کسی قربانی کا شرف حاصل نہیں ہوا اور بعد کے جہادوں میں جو ان کی شرکت ہے وہ ذیلی حیثیت رکھتی ہے۔ کمان دوسرے کمانداروں کے ہاتھ میں تھی اور اگر یہ نہ جاتے تو پیش آمدہ مہمیں سر ہونے پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

لیکن سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما دونوں نے صرف بیعت سے توقف کیا تھا۔ اپنی طرف دونوں میں سے کسی نے دعوت نہیں دی۔ دونوں کعبہ شریف میں پناہ لے کر بیٹھ گئے تھے، باقی تمام عالمِ اسلام نے بیعت کر لی۔ یہ بیعت کرنے والے کبار صحابہ تھے، مثلاً: حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت انس بن مالک، حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی، حضرت سہل بن سعد الساعدی، حضرت سلمہ ابن الاکوع، حضرت ابوسعید خدری، حضرت صہیب بن سنان، حضرت عمرو بن ابی سلمہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب اور حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فرزند) حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی، حضرت عبداللہ بن جزیمی، حضرت کعب بن عمرو انصاری، حضرت عمرو بن حریث مخزومی، حضرت عوف بن مالک اشجعی، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت عقبہ بن نافع، حضرت رافع بن خدیج، حضرت معاویہ بن خدیج، حضرت قبیصہ بن ذؤیب، حضرت محمد بن حاطب قرشی جمحی، حضرت مقدام بن معدیکرب، حضرت ابوامامہ باہلی، حضرت ابوامامہ انصاری، حضرت بریدہ بن حصیب، حضرت ثابت بن ضحاک، حضرت جابر بن عتیک، حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہ کنانی، حضرت ابوبرزہ اسلمی، حضرت عمرو بن امیہ ضمری (جو نجاشی بادشاہ رضی اللہ عنہ کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر ہو کر گئے تھے) سیدنا ابوہریرہ، حضرت فضالہ بن عبید انصاری، حضرت مالک بن حویرث، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت

ضحاک بن قیس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

ان حضرات میں اہلِ بدر ہیں، اہلِ احد ہیں، اہلِ خیبر ہیں، اصحابِ شجرہ ہیں اور ان میں سیدنا کعب بن عمر بھی ہیں جنھوں نے اسلام کی اولین بیعتِ عقبہ میں شرکت کی تھی۔ یہ چھوٹے بڑے صحابہ دو چار دس بیس نہیں تھے، سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔

بیعت نہ کرنے والوں میں ایک نام سیدنا مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کا بھی لیا جاتا ہے کہ انھوں نے خلافت کی بیعت سے گریز کر کے کعبہ میں پناہ لے لی تھی، لیکن ان کا اعتزال حقیقی تھا، انھوں نے قطعاً سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا، حتی کہ جب ابن الزبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو ان سے بھی بیعت نہیں کی۔ امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ کی بیعت سے پہلے وفات پا گئے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان سے بیعت کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہوتا۔

یہ ہے اصل صورتِ حال، اسے جبر وزور کہا جائے یا سیاسی چال اور مکر وفریب۔ جس کا جو چاہے اسے نام دے، لیکن قانوناً اور شرعاً اسے کہنا ہوگا اجماع اور اجماع بھی ان کا جنھیں اللہ تعالیٰ نے بہترین جماعت قرار دیا ہے اور زمین پر اپنا گواہ بتایا ہے اور جنھیں فرمایا ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴾ [الحجرات: ۷] ''یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔''

اگر کچھ کہنے کی ہمت کر کے یہ کہنے پر اتر آئیں کہ ان سب نے خوف یا لالچ کے تحت حق کشی کی تو کہہ لیں۔ کہنے والے جانیں اور ان کا پروردگار۔ لیکن اس حقیقت کو نہیں مٹایا جا سکتا کہ دین انھی بزرگوں نے قائم کیا تھا اور چھوٹا بڑا ہر مسئلہ انھی سے لیا جاتا ہے اور انھی کی راہ کو اللہ نے سبیل المومنین بتایا ہے اور نجات کا راستہ قرار دیا ہے۔[1]

---

[1] فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ امیر یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کے ''مسئلہ ولی عہدی'' پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تیرہ سو سال کی پوری تاریخِ اسلام میں ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں علمائے حق ایسے گزرے، جنھوں نے کبھی اقتدار کو جھک کر سلام نہیں کیا، ان سے آنکھیں چار کیں، ان کے غلط رویوں پر ہمیشہ تنقید کی، کئی مسائل میں ان سے لڑ گئے، لیکن نہ ان کے بیان ←

ولایتِ عہد کے مسئلے میں امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت کرنے والوں میں سیدنا سعد رحمہ اللہ بن ابی وقاص اور سیدنا سعید رضی اللہ عنہ بن زید ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے اس وقت بس یہی دونوں زندہ تھے۔ پھر امہات المومنین تھیں، جن کی برکات سے یہ امت مستفیض تھی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فرمان کے مطابق حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما نے امیر یزید رحمہ اللہ کی زندگی بھر خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا

← کرنے سے باز آئے نہ اس میں کسی قسم کی کوئی ترمیم کرنے پر رضامند ہوئے، لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی مسئلہ ولی عہدی پر لب کشائی نہ کی، کسی نے یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ ایک غلط طریقہ چلا آ رہا ہے جو قابلِ اصلاح ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ایسا ہوا، تابعین کے دور میں ایسا ہوا، تبع تابعین کے دور میں فقہا و محدثین کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے جن میں سے بہتیروں نے کئی مسائل میں حکومتِ وقت سے ٹکر لی، تازیانے سہے اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ پھر ان کے تلامذۃ میں ہزاروں علمائے حق ایسے ہوئے جنھوں نے جان پر کھیل کر اسلام کی حفاظت کی، سب کے سامنے خلفا مرتے رہے اور ان کی جگہ ان ہی کے بیٹے اور قریبی رشتے دار منصبِ خلافت پر فائز ہوتے رہے، علما ان کی ہر غلط بات، ہر غلط روش اور غلط حکم کو ٹھکراتے اور ان پر تنقید کرتے رہے، لیکن کسی نے اس ''جراَتِ رندانہ'' کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی سعادت آج مولانا مودودی صاحب کو حاصل ہوئی ہے۔ کسی نے اشارے اور کنائے سے بھی یہ نہیں کہا کہ ولی عہدی منبعِ فساد تو کجا، ایک غلط طریقہ ہے جس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس اس امر کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ اور تمام مسائل میں ہمیشہ علمائے حق نے لاگ لپیٹ رکھے بغیر دو ٹوک طریقے سے حق گوئی کا فریضہ ادا کیا، لیکن صرف اسی ایک مسئلے میں ان کی جراَتیں اور ہمتیں جواب دے گئی تھیں۔ ہم تو یہی سمجھیں گے کہ ان کی نظر میں فی نفسہٖ طریقۂ ولی عہدی میں کوئی خرابی یا قباحت ایسی نہ تھی جس سے اسلام کا کوئی تقاضا مجروح و پامال ہوتا ہو، اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور اس کی بھی اسی طرح وضاحت کرتے جس طرح وہ اس طریقے سے برسرِ اقتدار آنے والے خلفاء کے غلط رویوں کی وضاحت کرتے رہے، دنیا کا کوئی خوف یا لالچ ان کو اس سے نہ روک سکا۔'' (خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت، صفحہ: ۴۶۹، ۴۷۰)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اصرار کر کے بیعت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے دونوں فرزندوں نے بیعت کی تھی۔ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھانجے اور وارث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دونوں بیعتیں کی تھیں۔ آپ ہی کو ام المومنین نے اپنا بیٹا بنایا تھا اور ان کی وفات کے بعد انہی کے حجرے میں آپ درس کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھی اس وقت زندہ تھیں۔

گویا وہ زمانہ نور و برکت کا تھا نہ کہ ظلم و ظلمت کا۔ بعض لوگوں نے یہ فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت صحابہ کرام سب اٹھ گئے تھے اور ان کی دنیا پرست اولاد نے روپیہ کے لالچ میں یزید کی خلافت تسلیم کر لی تھی۔ ایسے لوگوں کا کوئی علاج نہیں، جو حقائق سے اس طرح آنکھیں بند کر لیں اور جھوٹ بولنے پر اتنے جری ہوں۔

وجۂ انتخاب:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے موقف اور واقعاتِ ثابتہ کی روشنی میں جو بات صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک سوائے اس صورت کے اور کوئی طریقہ موزوں نہ تھا۔ ان کا یہ موقف مصلحتِ ملیہ کے علاوہ دین کی نہایت اصیل بنیاد پر قائم تھا۔ کتاب و سنت کی روشنی میں ان کے اس اقدام پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور ہم کسی درجے میں بھی امام ابوبکر العربی کے بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔

اول تو اس لیے کہ معاملہ اکیلے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا نہیں تھا، بلکہ ان سب بزرگواروں کا تھا جنھوں نے دین قائم کیا اور جن سے دین کا چھوٹا بڑا ہر مسئلہ لیا جاتا ہے۔ اگر بالفرض اس کی تمام ذمے داری تنہا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر ڈال دی جائے تب بھی وہ امام مجتہد ہیں اور ان کے کسی اجتہاد کو کوئی متبع سنت شخص غیر افضل نہیں کہہ سکتا، خصوصاً جب جمہور اہلِ اجتہاد کی بھی حمایت انھیں حاصل ہو۔ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع پر حرف لانا ایسا ہی ہے جیسے ان سے پہلے کے خلفا پر اجماع کی بے وقعتی کرنا۔

غرض یہ ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے امامِ راشد ہونے کی حیثیت سے وہ سب شرطیں پوری کیں جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس بارے میں عائد کی ہیں اور ان کے اس عمل کی تائید و توثیق ان سب بزرگواروں نے کی جن سے دین لیا جاتا ہے۔ نہایت اہتمام سے شوریٰ ہوا اور نہایت تدبر کے ساتھ اس مسئلے پر امت نے اجماع کیا۔

یہ انتخاب محض فرزند کی حیثیت سے نہیں ہوا تھا، بلکہ اہلیت و صلاحیت اور مصلحت کو بھی اچھی طرح ملحوظِ خاطر رکھا گیا تھا۔ مستقبل کی حفاظت اس کی غایت تھی۔ امیر یزید رحمہ اللہ ایسے جلیل فرزند تھے کہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو پوری طرح عملاً ثابت کر کے جمہور کی طرف سے ''فَتَی الْعَرَبِ'' (عرب کے سورما) کا خطاب حاصل کر چکے تھے۔ بنو امیہ میں ایسی شخصیت اور کسی کی نہ تھی جس کی پشت پر قاطبتاً تمام اہلِ شام ہوں اور عموماً تمام عرب۔

رہا ابن العربی کا یہ فرمانا کہ ''انھیں کسی رشتے دار کو بھی خلیفہ نہیں بنانا چاہیے تھا، چہ جائیکہ بیٹے کو'' تو اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ اول تو خلیفہ بنانے والے وہ اکیلے نہیں تھے، بلکہ پوری امت تھی اور اگر وہ اکیلے ہوں تب بھی الحمد سے لے کر والناس تک قرآن حکیم میں اور موطا سے لے کر ابن ماجہ تک کسی حدیث میں اس کا کوئی اشارہ نہیں کہ رشتے دار یا بیٹے کو لازماً کوئی منصب نہیں دینا چاہیے۔ اگر نظیر ملتی بھی ہے تو اس کے مخالف، مثلاً:

''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ بَعْثًا وَأَمَّرَ عَلَيْهِمْ أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ فَطَعَنَ النَّاسُ فِي إِمَارَتِهِ فَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: إِنْ تَطْعَنُوا فِي إِمَارَتِهِ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعَنُونَ فِي إِمَارَةِ أَبِيهِ مِنْ قَبْلُ وَأَيْمُ اللّٰهِ! إِنْ كَانَ لَخَلِيقًا لِلْإِمَارَةِ وَإِنْ كَانَ لَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ وَإِنَّ هٰذَا لَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ بَعْدَهُ'' [1]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر

---

[1] صحيح البخاري، باب بعث النبي أسامة (٢/٦٤١)، طبع أصح المطابع.

بھیجا اور اس کی کمان اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو دے دی۔ لوگوں نے ان کے امیر بنائے جانے پر اعتراض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور فرمایا: تمھیں آج اس کی امارت پر اعتراض ہے اور کل تم نے اس کے باپ کی امارت پر اعتراض کیا تھا۔ بخدا! وہ امارت کا حقدار تھا اور وہ ان میں تھا جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں اور اس کے بعد یہ بھی ان میں ہے جن سے مجھے زیادہ محبت ہے۔''

ہمارا مقصد اس حدیث سے محض اتنا بتانا ہے کہ اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے محض محبوب فرزند کی حیثیت سے امیر یزید رحمہ اللہ کو منتخب کیا ہوتا تب بھی سنتِ نبویہ کی موجودگی میں اس پر اعتراض کی گنجایش نہ تھی۔ یہ کام ان سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ خود امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں اپنے قریب ترین عزیزوں کو مناصبِ حکومت عطا فرمائے اور ان سے پہلے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ جو کچھ ہوا خویش پروری کے تحت نہیں ہوا، بلکہ احوال کا تقاضا ہی یہ تھا۔ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس وقت یہ اقدام نہ کرتے تو سبائی لوگ خلافتِ مرتضوی کو دو چار دن بھی نہ چلنے دیتے۔

لیکن یہاں تو معاملہ محض خلیفۂ وقت کی رائے کا نہیں تھا، انتخاب کی ذمے داری ان تمام اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہے جنھوں نے اس تحریک کی تائید کی۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھیں جرأت تھی کہ وہ اپنا موقف بے رو رعایت واضح کر دیں اور پھر ثباتِ قلب کے ساتھ اس پر قائم رہیں۔ اس واقعے سے پہلے اور اس کے بعد ان کی سیاسی اور ملی سرگرمیاں ہمارے سامنے ہیں تو پھر کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خاص اس معاملے میں انھوں نے مداہنت برتی اور کسی کے خوف یا لالچ سے ان کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ سوچنا چاہیے کہ جو لوگ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کرتے اور پھر بعد میں ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت نہیں کرتے اس وقت انھیں کوئی لالچ اور کوئی خوف نہیں ہوتا تو امیر یزید رحمہ اللہ کی ایسی کیا ہیبت تھی، یا ان کے خزانے میں کیا کشش تھی جو وہ پوری استقامت سے ان کے ہم نوا رہے۔

امیر یزید رحمہ اللہ کوئی دو چار دس یا پانچ ہفتے یا مہینے ولی عہد نہیں رہے تھے۔ انھوں نے خلیفہ ہونے سے پہلے پورے دس برس تک اپنے عہدے کے فرائض ادا کیے تھے اور تمام امت جانتی تھی کہ ہونے والے خلیفہ وہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام امت نے ان کی خلافت پر اجماع کر لیا اور ان کے خلاف کھڑے ہونے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔

تاریخِ انعقاد:

ولایتِ عہد کا مسئلہ کس سال طے ہوا؟ اس کے متعلق بھی پیچیدگیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں جتنے بزرگواروں کے اسمائے گرامی صحیح بخاری اور دوسری کتابوں سے لے لیے گئے ہیں، ان میں اکثر کی وفات ۵۰ھ کے آگے پیچھے ہے۔ مثلاً:

① سیدنا حسن رضی اللہ عنہ (المتوفی ۴۹۔۵۰۔۵۱ھ)

② سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ (۴۹۔۵۰ھ)

③ امیر زیاد رحمہ اللہ (۴۹۔۵۰ھ)

④ سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما (۵۳ھ)

⑤ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (۴۶۔۴۷ھ)

⑥ سیدنا حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ (۴۲ھ)

امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ۵۰ھ میں حج کے لیے آنا، بلکہ خاص اسی مسئلے کے تصفیے کے لیے، زیادہ وثوق سے بیان کیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہی زمانہ متعین کرنا ہوگا۔ یعنی ۵۰ھ کے اوائل میں وفود آئے ہوں اور پھر مدینہ طیبہ وہ فرمان بھیجا گیا ہو جو صحیح بخاری کے حوالے سے اوپر بیان ہو چکا۔ اور پھر اسی سال کے آخر میں آپ حج کے لیے حاضر ہوئے ہوں، اور مدینہ طیبہ میں صحابہ کے اجتماع میں یہ فیصلہ ہوا ہو۔

لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مطابق ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی ثابت ہے اور اس کے عرصۂ دراز کے بعد سیدنا حبیب بن مسلمہ کی بھی۔ لہٰذا ان دونوں کی

جو تاریخِ وفات بتائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح بات وہی ہے جو صحیح بخاری سے معلوم ہوئی۔ چونکہ کسی روایت سے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی موجودگی کا اشارہ نہیں، اس لیے آپ کی وفات آخر ۴۹ھ اور اوائل ۵۰ھ کے درمیان تسلیم کرنی ہوگی اور غالباً سیوطی کا یہ بیان درست ہے کہ آپ نے ۴۹ھ میں وفات پائی۔

سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور امیر زیاد رحمہ اللہ نے جو وفد بھیجے تھے وہ اوائل ۵۰ھ کی بات ہوگی اور اسی سال کے آخر میں ان دونوں بزرگواروں نے وفات پائی۔

اسی طرح مسعودی کا یہ بیان غلط ہے کہ یہ وفود ۵۹ھ میں آئے تھے۔ غالباً اس نے یہ سنہ اس لیے دیا ہے کہ کسی طرح اس مسئلے کے طے ہونے اور امیر یزید رحمہ اللہ کے خلیفہ ہونے کی درمیانی مدت کو کم سے کم بنا دیا جائے، تاکہ جن روایاتِ واہیہ کے ذریعے اس مستحکم تصفیہ کو مشتبہ بنانے کی کوششیں کی گئی ہیں، ان کے لیے کچھ دلیل مل سکے۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کا مدینہ طیبہ حاضر ہونا اور پھر عبدالرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عبداللہ بن عمر، حسین بن علی اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے آپ کا گفتگو کرنا اور سب کا اپنی طرف سے بات کرنے کے لیے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو مقرر کرنا اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا یہ بات پیش کرنا کہ یا تو کسی کو منتخب نہ کریں اور امت کو ایسے ہی چھوڑ جائیں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے یا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح کسی ایسے شخص کو منتخب کریں جو رشتے دار نہ ہو یا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی طرح کچھ لوگوں کو نامزد کر جائیں کہ وہ آپس میں فیصلہ کر لیں۔ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا آپ سے یہ کہنا کہ اگر آپ تھک گئے ہوں تو الگ ہو جایئے، ہم آپ کے بیٹے کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے، ایسی لغو اور لایعنی روایتیں ہیں جن کا نہ سر ہے نہ پیر اور جو کسی طرح ان بزرگواروں کے مناسب حال نہیں جو ایک دعوت کے داعی تھے اور اقوامِ عالم کی امامت کر رہے تھے۔ پھر ان بزرگواروں کا یہ اجتماع کبھی مدینہ کا بتایا جاتا ہے اور کبھی مکہ کا۔ روایت ایک ابن وہب رحمہ اللہ ہی کے نام سے ہے، لیکن تین طرح بیان

ہوئی ہے اور تینوں کا مضمون مختلف ہے۔ یہ دلیل ہے کہ ان راویوں نے اپنے نقطۂ خیال سے اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر یہ روایتیں تصنیف کی ہیں اور اس کی پروا نہ کی کہ کبھی یہ روایتیں جمع بھی ہوں گی اور لوگ دیکھیں گے کہ ایک ہی آدمی اتنی متضاد باتیں کر رہا ہے۔

ان سب میں بدتر اور مردود روایت وہ ہے کہ آخر میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سب کو دھمکی دی کہ میں تم لوگوں کے بیعت کر لینے کا اعلان کرنے والا ہوں، اگر کسی نے مخالف یا موافق کوئی بات کرنی چاہی تو منہ سے لفظ نکلنے سے پہلے اس کا سر قلم ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر آپ نے حکم دے دیا کہ اجلاس میں ان سب کے سروں پر دو ننگی تلواریں لے کر کھڑے ہو جائیں اور جس کے بھی ہونٹ ہلیں اس کا سر اڑا دیں۔

پھر بتایا جاتا ہے کہ آپ نے بھرے مجمع میں ان کے بیعت کر لینے کا اعلان کیا اور یہ سب حضرات تلوار کے خوف سے چپکے رہے اور اسی دن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کوچ کر گئے۔ اب لوگ تو کہتے تھے کہ انھوں نے بیعت کر لی اور یہ خود کہتے تھے کہ ہم نے نہیں کی۔ یہ سب روایتیں اپنی تکذیب خود کرتی ہیں اور اس عہد کی ایسی بھیانک صورت پیش کرتی ہیں کہ اسے کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حرم شریف میں بیٹھ کر جھوٹ بولا! نہ اپنے منصب کا خیال کیا اور نہ مجمع کے تقدس کا، لیکن بات پھر بھی نہیں بنی۔ ننگی تلواریں سروں پر لیے ہوئے جب سپاہی کھڑے ہوں اور وہ بھی صرف چار آدمیوں کے سروں پر تو گویا خود ہی اعلان کر رہے ہیں کہ بات جبر کی ہے اور لوگوں نے بیعت نہیں کی۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے ذکی و فطین شخص اگر جھوٹ بولتے بھی تو کیا اس بھونڈے طریقے پر کہ جسے ایک بچہ بھی سمجھ لے گا؟ اور یہ چاروں حضرات وہ ہیں جن کے متعلق اگر یہ خیال کیا جائے کہ وہ موت کے ڈر سے سچی بات کہنے سے گریز کر سکتے تھے تو اس سے ان کی پوری زندگی کی تکذیب ہوتی ہے۔ کیا سیدنا حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے عمل سے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ ان کے نزدیک موت کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

"العواصم من القواصم" (ص: ۲۱۵۔۲۲۲) مع تعلیقات جہاں محدثانہ بحث ہے۔ مدینہ کے اجتماع کے متعلق صحیح بخاری کی جو روایت ہم اوپر نقل کر آئے ہیں اس سے اس تمام خرافات کی پوری پوری تکذیب ہوتی ہے۔

سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۳ھ میں مسلّم ہے اور پھر اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کہ آپ نے ولایتِ عہد کی بیعت کی تھی یا نہیں، لہٰذا سیوطی کا یہ بیان درست ہے کہ یہ واقعہ ۵۰ھ کا ہے۔ گویا امیر یزید رحمہ اللہ نے خلیفہ ہونے سے پہلے واقعی دس برس تک ولی عہد المسلمین ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے تھے اور جب وہ خلیفہ ہوئے تو تمام عالمِ اسلام میں سے صرف دو ممتاز شخصیتیں ایسی تھیں جنھوں نے تجدیدِ بیعت سے انکار کر دیا۔ ان میں مخالفانہ رویہ صرف ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا تھا، لیکن انھوں نے بھی امیر یزید رحمہ اللہ کی وفات تک اپنی طرف دعوت نہیں دی، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے تھے اور جب سبائیوں نے آپ کو یہ باور کرا دیا کہ عراق سب کا سب آپ کی حمایت پر متفق ہے تو تمام عزیزوں اور مخلص دوستوں کے مشورے کے خلاف گو آپ نے خروج کیا، لیکن کوفہ پہنچ کر جب صحیح صورتِ حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو اپنے موقف سے رجوع کر لیا۔

اب کسی شرعی اور عقلی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امیر یزید رحمہ اللہ کی خلافت پر تمام امت کا اجماع نہیں ہوا تھا؟! رہیں وہ داستانیں جو ان کے فسق و فجور کے متعلق وضع کی گئی ہیں اور جن سے بڑے بڑے سمجھ دار لوگ بھی متاثر ہو گئے، حتی کہ ابن خلدون تک، تو مستند روایتوں سے ان سب کی تردید ہوتی ہے اور واقعاتِ ثابتہ ان سب کی تکذیب کرتے ہیں۔

چونکہ موضوعِ سخن براہِ راست امیر یزید رحمہ اللہ کے حالات نہیں ہیں، اس لیے یہاں مزید تفصیلات کی ضرورت نظر نہیں آئی۔ البتہ ایک اصولی بات کہنی ہے کہ اگر واقعی وہ فاسق تھے تو ہمیں اجماعِ صحابہ کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک خلیفہ کا فسق اس کی خلافت کی حقانیت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

”عَنْ جُنَادَةَ بْنِ أَبِي أُمَيَّةَ قَالَ: دَخلْنَا عَلَى عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ وَهُوَ مَرِيضٌ، قُلْنَا: أَصْلَحكَ اللّٰهُ! حَدِّثْ بِحَدِيْثٍ يَنْفَعُكَ اللّٰهُ بِهِ سَمِعْتَهُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: دَعَانَا النَّبِيُّ ﷺ فَبَايَعْنَاهُ، فَقَالَ فِيْمَا أَخذَ عَلَيْنَا أَنْ بَايَعنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِيْ مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا وَأَثْرَةً عَلَيْنَا وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ إِلَّا أَنْ تَروْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ“

”حضرت جنادہ بن ابی امیہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ اس وقت علیل تھے۔ ہم نے عرض کی: کوئی ایسی حدیث بیان فرمایئے جس سے آپ کو نفع پہنچے اور آپ نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو، فرمایا: ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب کیا اور بیعت لی۔ جن چیزوں کا آپ نے ہم سے عہد لیا تھا وہ یہ تھیں کہ ہم حکومت کی بات سنیں اور اطاعت کریں، ہماری خوشی کی ہو یا ناخوشی کی ہو، سختی کی ہو یا نرمی کی اور ہم امرا کو اپنی جانوں پر ترجیح دیں اور حکومت کے معاملے میں اہلِ حکومت کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ سوائے اس کے کہ تم ان سے ایسا کفر دیکھو جس سے خون حلال ہو جاتا ہے اور خدا کی طرف سے تمھارے پاس اس بارے میں حجت موجود ہو۔“[1]

یعنی امت کا کلمہ متحد رکھنا، حکومت میں اختلال پیدا کرنے کی صورتوں سے گریز کرنا فرضِ ملی ہے اور سوائے صریح کفر کے اور کوئی صورت ایسی نہیں جو حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے حجت ہو۔ ”کفر بواح“ کے معنی ہیں، ارتدادِ حقیقی کے کہ دین سے بیزاری کا اعلان کیا جائے۔

اب اگر کہا جائے: ”یزید کافر ہو گیا تھا اور اس کے خلاف خروج فرض تھا“ تو پھر تسلیم

[1] صحيح البخاري، ج ٢، كتاب الفتن.

کرنا ہوگا کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے تعلیمِ اسلامیہ کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اور سب مرتد ہو گئے تھے۔ اگر یہ کہنے کی جرأت نہیں تو لازمی ماننا پڑے گا کہ امیر المومنین یزید ایسے ہی عالم و متقی اور ذی فضائل تھے، جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد کے ایک خلیفہ کو ہونا چاہیے اور خلیفہ بھی وہ جسے تمام صحابہ اور جمہور امت کی حمایت حاصل تھی اور وہ سب داستانیں قطعاً بے اصل ہیں اور دشمنانِ ملت کی وضع کی ہوئی جو ان کی شخصی عظمت کو کم کرنے کے لیے اس طرح پیش کی جاتی ہیں کہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے ان کے معائب کی فہرست بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

تاریخِ اسلام میں دو شخصیتیں ہیں: ایک امیر المومنین کی کہ سال بسال انھیں بد سے بدتر بنانے کا سلسلہ جاری ہے اور ایک منصور حلاج کی کہ اسے اس کے عہد کے مسلمانوں نے ایک ملحد و زندیق اور قرمطی کی حیثیت سے سولی دی۔ امیر المومنین المقتدر باللہ نے تمام فقہا و علما کے فتوے پر اسے مرتد قرار دیا، لیکن آہستہ آہستہ اس کا درجہ بڑھتے بڑھتے اکابر اولیاء اللہ کے ہم پلہ بنا دیا گیا، لیکن یہ سب خیال و گمان کی کارفرمائی ہے۔ حقیقت سے اس تصور کا کوئی علاقہ نہیں اور اس کی بنا یہ ہے کہ ہم عصر لوگوں کی رائے کو بے وقعت سمجھا گیا۔

امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے متعلق ہم عصر اکابرِ ملت کی رائے نہایت قوی اور معتبر اسناد سے جو معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ انھیں ایک جلیل القدر اور تقویٰ شعار عالمِ دین اور امامِ امت سمجھتے تھے۔ مثلاً بلاذری نے انساب الاشراف میں یہ روایت کی ہے کہ امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے خلیفہ ہونے پر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے دعائے مغفرت کی اور فرمایا:

”وإن ابنه يزيد لمن صالحي أهله فالزموا مجالسكم وأعطوا إطاعتكم وبيعتكم“

”ان کے فرزند یزید ان کے گھر کے صالح افراد میں ہیں۔ آپ لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہیں اور اپنی اطاعت و بیعت پر مستقیم رہیں۔“

یہ مورخ البلاذری امیر المومنین المتوکل علی اللہ اور دوسرے عباسی خلفا کے ندیموں میں

تھے۔ انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد اپنے ائمہ کے سامنے بیان کیا اور ان کا نام اپنی کتاب میں لفظ ''امیر المومنین'' ہی کے ساتھ لکھا۔ پھر بلاذری کے انہی راوی المدائنی کی ایک روایت امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کی ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دمشق تشریف لے گئے ہیں تو امیر یزید رحمہ اللہ بھی تعزیت کے لیے حاضر ہوئے اور جب کچھ دیر گفتگو کے بعد رخصت ہوئے تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''ذهب بنو حرب، ذهب علماء الناس''

''بنو حرب اس دنیا سے اٹھے تو گویا اہلِ عالم کے علما اٹھ جائیں گے۔''

یا مثلاً ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہ پر جب اہلِ مدینہ نے بغاوت کی تو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس اقدام کی مذمت کی:

''عَنْ نَافِعٍ قَالَ: لَمَّا خَلَعَ أَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَزِيْدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ جَمَعَ ابْنُ عُمَرَ حَشَمَهُ وَوَلَدَهُ فَقَالَ: إِنِّي سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: يُنْصَبُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَإِنَّا قَدْ بَايَعْنَا هَذَا الرَّجُلَ عَلَى بَيْعِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ، وَإِنِّي لَا أَعْلَمُ غَدْرًا أَعْظَمَ مِنْ أَنْ يُبَايَعَ رَجُلٌ عَلَى بَيْعِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ثُمَّ يُنْصَبُ لَهُ الْقِتَالُ، وَإِنِّي لَا أَعْلَمُ أَحَدًا مِنْكُمْ خَلَعَهُ وَلَا بَايَعَ فِي هَذَا الْأَمْرِ إِلَّا كَانَتِ الْفَيْصَلَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ'' [1]

''حضرت نافع سے روایت ہے کہ جب اہلِ مدینہ نے یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت توڑ دی تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے متعلقوں اور فرزندوں کو جمع کر کے فرمایا: ''میں نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر غدر کرنے والے کے لیے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ ہم نے اس شخص سے خدا اور رسول کی بیعت کی ہے اور مجھے اس سے بڑا کوئی غدر نظر نہیں آتا کہ ہم ایک شخص

[1] صحيح البخاري، كتاب الفتن، ج ٢، جز ٢٩، طبع أصح المطابع.

سے اللہ اور اس کے رسول کی بیعت کریں اور پھر اس کے خلاف لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم میں سے کسی نے ان کی بیعت توڑی یا ہنگامے میں کوئی حصہ لیا تو پھر میرا اور اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔''

ایسی ہی ایک روایت صحیح مسلم کی ہے کہ جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے داعی حضرت ابن مطیع رحمہ اللہ نے فتنے کو انگیختہ کیا تو ابن عمر رضی اللہ عنہما ان کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا: ''ابو عبدالرحمٰن کے لیے تکیہ لاؤ'' آپ نے فرمایا: تمھارے پاس بیٹھنے نہیں آیا، بلکہ وہ حدیث بیان کرنے آیا ہوں جو میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے:

"من خلع يدا من طاعة لقي الله يوم القيامة لا حجة له، ومن مات وليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهلية"

''جس نے اطاعت کا عہد کرنے کے بعد توڑ دیا تو اللہ کے سامنے اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی اور جو ایسی حالت میں مر گیا کہ اس کی گردن میں بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ جس امام پر امت کا اجماع ہو گیا ہو اس کی بیعت لازم ہے اور اس کے خلاف خروج حرام۔ اسی طرح حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ (۸/۲۳۳، منقول از العواصم من القواصم) میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے داعی حضرت عبداللہ بن المطیع اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت محمد بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (المعروف بابن الحنفیہ) کے پاس گئے اور درخواست کی کہ آپ بیعت توڑ دیں، لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ابن المطیع نے کہا: ''یزید شراب پیتے ہیں، نماز نہیں پڑھتے اور کتاب اللہ کے احکام کی انھیں پروا نہیں۔'' سیدنا محمد نے فرمایا: ''میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی، میں ان سے ملا ہوں، ان کے ساتھ رہا ہوں، میں نے انھیں ہمیشہ نماز کا پابند، خیر کا متلاشی، فقہ کا سائل اور سنت کا متبع پایا۔'' کہنے لگے: ''وہ یہ سب کچھ

آپ کے دکھانے کو کرتے ہوں گے۔'' فرمایا: ''انھیں مجھ سے کیا خوف اور کس قسم کا لالچ تھا جو وہ میرے سامنے بندگی کا اظہار کرتے؟ تم جو شراب کی بات کرتے ہو تو کیا انھوں نے تمھیں دکھا کر پی؟ اگر تمھارے سامنے پی تھی تو تم بھی اس گناہ میں ان کے شریک تھے اور اگر دکھا کر نہیں پی تو تمھیں ایسی بات بیان کرنی جائز نہیں جس کا تمھیں ذاتی علم نہ ہو۔'' انھوں نے کہا: ''ہم نے اگرچہ دیکھا نہیں لیکن یہ بات ہمارے نزدیک سچی ہے۔'' فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تو گواہوں کی یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔ وہ فرماتا ہے:

﴿ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ [الزخرف: ٨٦]

''مگر جس نے حق کے ساتھ شہادت دی اور وہ جانتے ہیں۔''

میں تمھاری کسی بات میں شریک نہیں۔''

انھوں نے کہا: ''شاید آپ کو یہ ناگوار ہے کہ حکومت کسی اور کو ملے تو آیئے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔'' فرمایا: ''میں تمھارے مقصد کے لیے جنگ کرنا جائز نہیں سمجھتا نہ کسی کے ساتھ ہو کر اور نہ کسی کو ساتھ لے کر۔'' کہنے لگے: ''تو پھر اپنے فرزندوں ابو القاسم اور قاسم کو ہمارے ساتھ ہو کر جنگ کی اجازت دیجیے۔'' فرمایا: ''اگر انھیں حکم دوں گا تو گویا خود لڑنے کھڑا ہو گیا۔'' کہنے لگے: ''تو پھر ہمارے ساتھ ہو کر دوسرے لوگوں کو جنگ پر آمادہ کیجیے۔'' فرمایا: ''سبحان اللہ! جو کام میں خود کرنا نہیں چاہتا اور نہ اسے پسند کرتا ہوں، اس کا حکم دوسروں کو کیسے دوں؟ اس طرح تو میں بندوں کو للہ نصیحت کرنے والا نہیں رہوں گا۔'' انھوں نے کہا: ''تو پھر ہم آپ کو مجبور کر دیں گے۔'' فرمایا: ''تو پھر میں لوگوں کو اللہ سے ڈرنے کا حکم دوں گا اور اس کا کہ مخلوق کو خوش کرنے کے لیے خالق کو ناراض نہ کریں۔'' اس کے بعد آپ مکہ چلے گئے۔[1]

---

[1] البداية و النهاية (٨/٢٣٣) نقلاً عن المدائني و إسناده صحيح، تاريخ الإسلام للذهبي (٥/٢٧٤) نقلاً عن المدائني و اسناده صحيح.

ان نہایت قوی مآخذ کی موجودگی میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت اطہار نے امیر المومنین یزید رحمہ اللہ سے وہی بیعت کی تھی جو وہ ان سے پہلے خلفا سے کرتے چلے آئے تھے۔ اب سوچنا چاہیے کہ سیدنا ابن عمر اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما جس شخص کی بیعت کو اللہ اور اس کے رسول کی بیعت کہیں اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو جس کی موجودگی میں کھل کر اپنی طرف دعوت دینے کی جرأت نہ ہو، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جس کے خلاف اول تو کوفیوں کے دھوکے میں آ کر کھڑے ہو جائیں اور پھر اپنے موقف سے رجوع فرما لیں، جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تمام امت جس کی بیعت میں ہو اور اس کے مخالفوں کی مخالف، تو وہ شخص کیسا ہوگا اور اس کی خلافت کی نوعیت کیا ہوگی؟!

امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے عہد میں خلافتِ اسلامیہ کے ظاہری و باطنی تمام مقاصد پورے ہوئے، ان کی خلافت کے کارکن بھی وہی تھے جو ان سے پہلی خلافتوں میں اپنے فرائض ادا کرتے آ رہے تھے، مثلاً: سیدنا عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ انھی کے سپہ سالار تھے جنھوں نے قیروان میں چھاؤنی قائم کی تھی اور بربروں کا علاقہ فتح کرتے ہوئے ساحلِ بحر تک پہنچ گئے تھے اور پھر جوش میں آ کر سمندر میں گھوڑا ڈال دیا تھا اور ہاتھ اٹھا کر کہا تھا: ''خدایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ سمندر پار بھی تیری مخلوق رہتی ہے تو تیرا کلمہ بلند کرنے کے لیے وہاں بھی پہنچتا۔'' پھر سیدنا قبیصہ بن ذویب رضی اللہ عنہ اور سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ ان کے قاضیوں میں تھے۔ سیدنا معاویہ بن خدیج، سیدنا نعمان بن بشیر اور ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہم ان کے امرا میں تھے۔

امیر المومنین یزید رحمہ اللہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں کوئی اقدام ایسا نہیں کیا جس کے متعلق ان کے پاس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے احکام نہ ہوں اور کتاب و سنت اور تعاملِ خلفائے پیشین کے نہایت محکم اور قوی دلائل سے ان کے موقف کی حقانیت نہ معلوم ہوتی ہو اور ان اقدامات میں انھیں جمہور کی حمایت حاصل نہ ہو۔

سیوطی جیسے مورخین نے اعتراض تو کر دیا کہ انھوں نے حرمین شریفین پر فوج کشی کی

اور حدیث فہمی کے دعوے کے ساتھ اپنی دانست میں صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی پیش کر دی:

''قال ﷺ: من أخاف أهل المدينة أخافه الله، وعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين''

''نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اہلِ مدینہ کو خوف میں مبتلا کیا اس پر اللہ بھی خوف طاری کر دے گا اور اس پر اللہ اور اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو گی۔''

لیکن حدیث سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہلِ مدینہ کو بے وجہ تکلیف پہنچائیں اور ان پر جینا مشکل کر دیں۔ اس کے معنی یہ کیسے نکال لیے گئے کہ اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ کو بغاوت اور امن شکنی کی کھلی آزادی ہے کہ وہ جب چاہیں لاقانونی اختیار کر کے حرمین شریفین کو مورچے بنا لیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کے متعلق یہ کھلا ہوا حکم نہیں دیا:

﴿وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ﴾ [البقرة:١٩١]

''اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو انھیں قتل کرو۔''

حرمین شریفین کا تقدس برقرار رکھنا اور انھیں امن کی جگہ سمجھنا سارے مسلمانوں پر فرض ہے، ان کی بے حرمتی کرنے والا تو وہ ہو گا جو شریعتِ اسلامیہ کے احکام ٹھکرا کر ان بستیوں کے تقدس کو ٹھیس لگائے اور انھیں جرائم کا اڈا بنا ڈالے۔ معمولی عقل کی بات ہے کہ اگر قاتل، ڈاکو، زانی اور ایسے ہی دوسرے معاصی اور جرائم کا ارتکاب کرنے والا شخص حرمین شریفین میں پناہ لے گا اور ایسے ہی لوگ وہاں جمع ہو کر اس بستی کے مکین بن جائیں گے تو کیا حکومتِ اسلامیہ اسے برداشت کر لے گی۔ اگر نہیں کرے گی اور اسے نہیں کرنا چاہیے تو باغیوں کو بدرجۂ اولیٰ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ [البقرة: ۱۹۱] ''اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے۔''

اس وقت زیرِ بحث امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی خلافت نہیں، اس لیے مبسوط طریقے پر تجویز کرنا موجبِ طوالت ہوگا، لیکن اصولی حیثیت سے ان کی ولایتِ عہد اور خلافت کی صحت سے بحث کرنا لازمی ہے اور اسی کے لیے یہ تمام دلیلیں بہترین اور صحیح ترین مآخذ سے پیش کی گئیں اور ثابت کر دیا گیا کہ ان کی ولایتِ عہد اور خلافت کے لیے جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت سے استصواب ہوا تھا ایسا اور اس پیمانے پر استصواب ان سے پہلے کسی کے لیے نہیں ہوا۔

جذبات کی رو میں بہہ کر یا واقعات سے ناواقفیت کے سبب اس استصواب پر حرف رکھنا یا اس کی بے وقعتی کرنا کسی کے نزدیک ضروری ہو، قانوناً اور شرعاً اسے سوائے استصواب رائے عامہ کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اور یہ استصواب ان سے ہوا تھا اور یہ تائید انھوں نے کی تھی جن سے بہتر جماعت اب کبھی پیدا نہیں ہوگی اور جنھیں اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا گواہ بتایا ہے۔

حضرت محمد بن علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن المطیع کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے یہ شبہہ رد کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں امیر المومنین یزید کا فسق مشہور ہو گیا تھا۔ یہ صحیح ہے، لیکن افواہ کی حد تک۔ کوئی حتمی بات سامنے نہیں آئی اور نہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیتِ اطہار نے ان الزامات کو درست جانا جو امیر المومنین سے ذاتی تعلق رکھتے تھے اور ان کی افتادِ طبع اور چال چلن سے واقف تھے۔ سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما مہینوں دمشق میں رہتے تھے وہ آخر وقت تک امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے مخلص رہے۔ اسی طرح اور متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم تھے جو خاص دمشق میں مستقل طور پر رہا کرتے تھے۔ ان پر یہ باتیں کیوں نہیں کھلیں اور کیوں ان کا ذکر اس وقت ہوا جب حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے داعی ان کی حمایت میں کام کرنے کو کھڑے ہو گئے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حادثۂ کربلا کے بعد چونکہ عالمِ اسلام میں کسی قسم کا ہیجان نہیں

ہوا اور تین برس تک مکمل خاموشی طاری رہی تو لوگوں کو یہ سوجھی کہ جس طرح امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے والیوں کے خلاف ریشہ دوانیاں کی گئی تھیں، اسی طرح امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے خلاف بھی باتیں بنانی شروع کر دیں اور ان کے اندرونی معائب پیدا کر کے اتنا اچھالیں کہ لوگوں میں نفرت پھیل جائے۔

ابن المطیع کا یہ کہنا کہ ”گو یہ باتیں ہم نے خود نہیں دیکھیں مگر ہم صحیح باور کرتے ہیں“ اس کی دلیل ہے کہ کچھ لوگ یہ باتیں وضع کر کے انھیں وثوق کے ساتھ بیان کرتے تھے، لیکن امت نے ان فضولیات کا کوئی اثر نہیں لیا۔ البتہ جب ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے داعیوں نے کام کرنا شروع کر دیا اور اہلِ مدینہ نے بغاوت کی ٹھانی تو ان مردود روایتوں کا سہارا لیا گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ خود ابن زبیر رضی اللہ عنہما جیسے عالم و فقیہ و متقی صحابی اس مکروہ کام میں شریک نہ ہوں گے اور نہ ان کے داعی ابن المطیع وغیرہ۔ لیکن باتیں وثوق سے کہی گئی ہوں گی اور ممکن ہے کہ جھوٹے حلف بھی اٹھا لیے گئے ہوں اور اس طرح انھوں نے انھیں صحیح باور کر لیا ہو یا ان کی اشاعت کو برداشت کر لیا۔

لیکن اس عہد میں بھی زیادہ سے زیادہ جو باتیں کہی گئی تھیں وہ یہ ہیں کہ امیر المومنین شراب پیتے ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔ بہت ممکن ہے کہ ان راویوں میں سے کسی شخص نے انھیں مثلث یعنی طلاء پیتے دیکھا جو فقہائے شام کے نزدیک حلال ہے، یعنی جو کھجور وغیرہ پانی میں بھگو دی جائے اور تخمیر ہو جائے تو دو تہائی آمیزہ آگ پر اڑا دیا جائے اور ایک تہائی باقی رکھا جائے۔ اس لیے اسے مثلث کہتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کی حلت کا فتویٰ دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ اہلِ شام پر اس کے بارے میں تنگی نہ کی جائے (ملاحظہ ہو: سنن ابی داود، کتاب الاشربۃ) اس کو ان لوگوں نے افتراءً و کذباً شراب کہہ کر بیان کیا ہو۔ اسی طرح امیر المومنین چونکہ نقرس کے مریض تھے اور وہ جتنا تکلیف دہ اور موذی مرض ہے اسے سب جانتے ہیں۔ ممکن ہے اسی عذر کی بنا پر وہ بعض اوقات مسجد میں

نہ آئے ہوں اور اسے غلط رنگ دے کر کہہ دیا گیا ہو کہ وہ نماز نہیں پڑھتے۔ سبائیوں کے اعتراضات اسی قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ انھوں نے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ پر کیا کچھ طوفان نہیں باندھا۔ اور یہی ہیں جنھوں نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے سید العابدین کے متعلق کہا تھا کہ انھیں نماز پڑھانی نہیں آتی۔ بات کچھ ہوتی ہے اور یہ لوگ اسے کچھ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ پوری تاریخ ان کی تلبیس و افترا ہی سے تو داغدار بنی ہے۔ افسوس ان اہلِ قلم پر جو ہوائے نفس میں اتنا بہہ جاتے ہیں جیسے تاریخ الخلفاء میں علامہ سیوطی۔ ان کی ایک روایت ہے (ص: ۸۱، طبع مصر) مگر اسی واقدی کے حوالے سے جسے خود وضاع کہا کرتے تھے جیسا کہ پیش لفظ میں مذکور ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے صراحتاً ایسے لوگوں کی بات بیان کرنے کی ممانعت کی ہے، لیکن ہوائے نفس میں آدمی سب کچھ کر جاتا ہے:

”و أخرج الواقدي من طرق أن عبد اللّٰه بن حنظلة بن الغسيل قال: واللّٰه ما خرجنا على يزيد حتى خفنا أن يرمى بالحجارة من السماء إنه رجل ينكح أمهات الأولاد و البنات و الأخوات و يشرب الخمر و يدع الصلاة“

”واقدی نے اپنی سندوں سے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن حنظلہ (ابن الغسیل) نے کہا: بخدا ہم یزید کے خلاف اس وقت اٹھے جب ہمیں یہ خوف ہو گیا کہ ہم پر کہیں آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں۔ یہ شخص اپنے باپ کی لونڈیوں پر اپنی بیٹیوں پر اور اپنی بہنوں پر تصرف کرتا ہے، شراب پیتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا۔“

کوئی پوچھے جو شخص یہ حرکتیں کرتا ہو اس کے نماز پڑھنے اور نہ پڑھنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟! اس روایت کا جھوٹا ہونا عیاں ہے، ممکن ہے کہ خود واقدی غریب پر بھی جھوٹ بولا گیا ہو۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے متعلق ایسی لغو اور مکروہ بات نہیں کہہ سکتا، چہ جائیکہ ایک صحابی بن صحابی کی زبان سے یہ کلمات نکلیں جو اللہ و رسول کے حکم کے مطابق سخت سزا

کا مستحق بناتے ہیں اور پھر ساری عمر آدمی کسی عدالت میں گواہی دینے کے قابل نہیں رہتا۔

کہاں ابن کثیر کی وہ روایت جو اوپر نقل ہوئی جس میں صرف شربِ خمر اور ترکِ صلاۃ کا ذکر تھا اور کہاں یہ مردود اضافہ۔ پھر ہے صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد کہ وہ امیر المومنین کے خلاف کھڑا ہونا دین کی بنیاد پر حرام سمجھتے ہیں اور کہاں بلاذری کا وہ بیان جو انھوں نے حضرت ابن عباس اور ابن جعفر رضی اللہ عنہم کے بارے میں دیا ہے کہ وہ امیر المومنین کی کیسی عزت کرتے تھے اور ان سے انھیں کتنی محبت تھی۔ خدا اس شخص کو غارت کرے جس نے سیدنا عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کی طرف اس مردود قول کی نسبت کی ہے۔

تعجب ہے کہ واقدی کی روایات کی حیثیت جاننے کے باوجود سیوطی نے قرآن و حدیث سب کو بالائے طاق رکھ دیا:

﴿لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ [النور: ١٣]

''وہ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ تو جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔''

ایک اور روایت (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ٢/١٣٠) ہے کہ مدینہ میں جب امیر یزید رحمہ اللہ کے خلاف باتیں بنائی گئیں تو امیرِ مدینہ عباس بن محمد نے جو امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے چچا کے فرزند تھے۔ اہلِ مدینہ کا ایک وفد دمشق بھیجا کہ اپنی آنکھوں سے سب حال دیکھ کر آئیں۔ اس وفد میں یہی سیدنا عبداللہ بن الغسیل بھی تھے۔

ظاہر ہے کہ امیر عباس کو امیر المومنین کے کردار کی رفعت اور سیئات سے مبرا ہونے کا ذاتی علم نہ ہوتا تو وہ یہ وفد ہی کیوں بھیجتے اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے جب یہ وفد بھیجا تو خود امیر المومنین کو بھی اطلاع کر دی ہو گی کہ ایک ایسا وفد آ رہا ہے۔ اب احمق سے احمق شخص بھی ایسے مواقع پر دو چار دن کے لیے اپنی حالت درست کر لیتا ہے یا کم از کم

اتنا اہتمام ضرور کرتا ہے کہ ''تحقیقات'' کے لیے جو لوگ آ رہے ہیں انھیں مطمئن کر کے بھیجے۔ یہ لوگ گئے اور واپس آئے مگر اسی رنگ میں جس میں گئے تھے۔ وہاں ان کی خوب خاطر مدارت ہوئی اور دل کھول کر انھیں روپیہ دیا گیا جو انھوں نے قبول کر لیا اور حلال وطیب جانا۔ اب ملاحظہ ہو صحیح بخاری کی وہ حدیث جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق اوپر نقل ہوئی ہے کہ انھوں نے کس طرح اپنے حشم اور آل کو اس ہنگامے میں حصہ لینے سے روک دیا تھا اور اسے خدا اور رسول کے احکام کی صریح خلاف ورزی سے تعبیر کیا تھا۔ اس حدیث کو امام بخاری نے جہاں نقل کیا ہے، وہاں باب باندھا ہے:

''باب إذا قال عند قومٍ شيئاً ثم خرج فقال بخلافه''

''باب ہے کہ جب آدمی ایک قوم کے سامنے ایک بات کہے، لیکن جب وہاں سے نکلے تو اس کے مخالف بات کہنے لگے۔''

غالباً یہ اس وفد پر چوٹ ہے کہ امیر المومنین سے انھوں نے کچھ کہا اور مدینہ آ کر کچھ اور کہنے لگے۔ پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ حضرت عبداللہ بن الغسیل رضی اللہ عنہ نے وہ لغو اور مردود باتیں نہیں کہی ہوں گی جو واقدی نے ان کے متعلق نقل کی ہیں اور لوگوں نے ان کا حوالہ دیتے وقت خدا کا خوف نہیں کیا۔

کیا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ ان باتوں کا علم صرف اہلِ مدینہ کے بعض نوجوانوں ہی کو ہوا۔ خود اہلِ دمشق اور تمام امت ان امور سے قطعاً بے خبر رہی۔ یہ زمانہ طہماسپ صفوی یا آصف الدولہ کا تھوڑا ہی تھا۔ یہ زمانہ تھا پہلی صدی ہجری کا جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کثیر تعداد میں موجود تھے اور دین اپنی آب وتاب سے برپا تھا۔[1]

[1] مشہور اہلِ حدیث عالم علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ امیر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی بابت فتویٰ دیتے ہیں:

''امیر یزید بن معاویہ رحمہ اللہ گمراہ نہ تھے اور ان کو تابعین میں شمار کیا گیا ہے۔ وہ ←



➜ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کو انھوں نے دیکھا اور ان کی صحبت اٹھائی ہے، اس لحاظ سے بلاشبہ یزید تابعی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی رواۃِ حدیث کے طبقہ ثالثہ میں ان کا شمار کیا ہے جس سے ان کی مراد تابعین کا طبقہ وسطیٰ ہے، جیسے حسن بصری اور ابن سیرین۔ بنا بریں یزید کے تابعی ہونے کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے۔''

(آ ثارِ حنیف بھوجیانی: ۱/ ۲۲۸، مرتبہ: محترم احمد شاکر)

یہی نہیں بلکہ اسی جلد کے (صفحہ: ۲۳۰) پر احمد شاکر صاحب ''امیر یزید کی خلافت'' سے متعلق علامہ بھوجیانی کا فتویٰ لائے ہیں، جس میں علامہ بھوجیانی صراحت سے لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے سوا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے، ان میں سے کسی صحابی سے انکار بیعت صحیح سند سے منقول نہیں، حتیٰ کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے رشتے داروں سے بھی۔ جس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوا کہ ''یزید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تسلیم شدہ خلیفہ'' تھا۔ اکابر محققین بھی یزید کی ''خلافت'' کو درست تسلیم کرتے تھے، چنانچہ چھٹی صدی ہجری کے ایک عظیم فقیہ و محدث امام عبدالغنی مقدسی (المتوفی ۶۰۰ ھ) نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا:

''یزید کی خلافت صحیح تھی، بعض علما کی تصریح کے مطابق ساٹھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی بیعت کی تھی۔ کوئی اس سے محبت رکھے تو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور اگر کوئی اس سے محبت نہیں رکھتا تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ صحابی نہیں کہ اس سے محبت لازمہ ایمان ہو۔''

(طبقات الحنابلہ لابن رجب الدمشقی، متوفی: ۷۹۵ھ)

وفاتِ امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یکم رجب ۶۰ھ کو (۷ اپریل ۶۸۰ء) وفات پائی۔ سیدنا ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ آپ کا کفن ہاتھوں میں لیے ہوئے مسجد میں آئے اور منبر پر اول حمد وثنا کی اور پھر فرمایا:

''معاویہ رضی اللہ عنہ عرب کے ستون تھے، عرب کے پشتیبان تھے اور عرب کے باپ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے فتنے کا قلع قمع کیا اور اپنے بندوں پر انھیں حاکم بنایا، ان کے ذریعے ممالک پر فتح نصیب کی۔ دیکھو! وہ وفات پا گئے اور یہ ان کا کفن ہے، ہم اسی کفن میں انھیں لپیٹیں گے اور ان کی قبر میں رکھ دیں گے۔ اب وہ ہوں گے اور ان کے اعمال۔ اس کے بعد قیامت تک فتنے ہی فتنے ہیں جو شخص ان کے جنازے میں شرکت کرنا چاہتا ہے وہ ظہر کے وقت حاضر ہو جائے۔''

خود سیدنا ضحاک رضی اللہ عنہ ہی نے نماز پڑھائی اور امیر یزید رحمہ اللہ کو اس واقعہ ہائلہ کی اطلاع بھیج دی۔ امیر یزید رحمہ اللہ اس وقت دمشق میں نہیں تھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین نے سیدنا ضحاک بن قیس اور مسلم بن عقبہ کو بلایا اور اپنے فرزند کے لیے جو وصیت نامہ مرتب کیا تھا وہ ان کے سپرد کر دیا۔

وصیت نامے کے الفاظ یہ ہیں:

''يا بني! إني قد كفيتك الشد والترحال، ووطأت لك الأمور، وذللت لك الأعداء وأخضعت لك رقاب العرب وجمعت لك

ما لم يجمعه أحد، فانظر أهل الحجاز فإنهم أصلك، وأكرم من قدم عليك منهم، وتعاهد من غاب، وانظر أهل العراق فإن سألوك أن تعزل عنهم كل يوم عاملاً فافعل، فإن عزل عامل أسهل من أن يشهر عليك مائة ألف سيف. وانظر أهل الشام فليكونوا بطانتك وغيبتك، فإن رأى بك من عدوّك شيء فانتصر بهم، فإذا أصبتهم فاردد أهل الشام إلى بلادهم فإنهم إن اقاموا بغير بلادهم تغيرت أخلاقهم. وإني لست أخاف أن ينازعك في هذا الأمر إلا أربعة من قريش: الحسين بن علي، وعبد اللّٰه بن عمر، وعبد اللّٰه بن الزبير، وعبد الرحمٰن بن أبي بكر، فأما ابن عمر فإنه رجل قد وقذته العبادة، فإذا لم يبق أحد وغيره بايعك، وأما الحسين بن علي فهو رجل خفيف ولن يتركه أهل العراق حتى يخرجوه. فإن خرج وظفرت به فاصفح عنه، فإن له رحما ماسة حقا عظيماً وقرابة من محمد ﷺ. وأما ابن أبي بكر فإن رأي أصحابه صنعوا شيئا صنع مثله ليس له همة إلا في النساء واللهو، وأما الذي يجثم لك جثوم الأسد ويراوغك مراوغة الثعلب فذاك ابن الزبير فإن هو فعلها فظفرت به فقطعه ربا ارباً واحقن دماء قومك ما استطعت"

"بیٹا! میں نے تمھیں گھر بیٹھے ہی سب کچھ دے دیا (کہیں آنے جانے کی ضرورت نہ پڑی) سارے معاملات تمھارے لیے درست کر دیے، دشمنوں کو تمھاری خاطر مغلوب کیا اور سارے عرب کی گردنیں تمھارے آگے جھکا دیں اور تمھارے لیے وہ کچھ اکٹھا کر دیا جو کسی نے نہ کیا ہوگا۔ اہلِ حجاز کا خیال کرنا

تمھارا نکاس وہیں سے ہے، ان میں سے جو شخص تمھارے پاس آئے اس کی عزت کرنا، جو غائب ہو اس کی استمالت کی فکر رکھنا۔ اہلِ عراق پر توجہ رکھنا، اگر وہ تم سے روزانہ ایک عامل کو بدل دینے کی درخواست کریں تو ایسا کر ڈالنا۔ کیوں کہ ایک عامل کا بدل دینا اس سے کہیں سہل ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمھارے خلاف بے نیام ہو جائیں۔ اہلِ شام پر نگاہ رکھنا، انہی کو اپنا ہمراز بنانا، کسی دشمن کی طرف سے خطرہ ہو تو انہی سے مدد لینا اور جب ان لوگوں پر (یعنی دشمنوں پر) قابو پا لو تو پھر اہلِ شام کو ان کے گھروں کو واپس کر دینا، کیوں کہ یہ اپنے شہروں کے علاوہ کہیں اور رہیں گے تو ان کے اخلاق بدل جائیں گے۔ حکومت کے بارے میں تم سے اختلاف کرنے کا خطرہ مجھے کسی کی طرف سے نہیں، سوائے قریش کے چار آدمیوں کے، یعنی حسین بن علی رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما ایسے شخص ہیں کہ عبادت نے انھیں نیم جان کر رکھا ہے۔ اگر سوائے ان کے اور کوئی شخص بیعت سے رکا نہ رہا تو وہ بیعت کر لیں گے۔ حسین بن علی کم سواد شخص ہیں، اہلِ عراق ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک تمھارے خلاف کھڑا نہ کر دیں۔ اگر وہ خروج کریں اور تم ان پر قابو پا لو تو معاف کر دینا، کیوں کہ ان سے قریبی رشتہ ہے، ان کا بڑا حق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ عزیز ہیں۔ ابن ابی بکر رضی اللہ عنہما ایسے شخص ہیں کہ جو اپنے ساتھیوں کو کرتے دیکھیں گے وہی کرنے لگیں گے، ان کے اندر ہمت نہیں، ان کی دلچسپی عورتوں میں اور کھیل تماشوں میں ہے۔ البتہ جو شخص تمھارے سامنے شیر کی طرح ڈٹے گا اور لومڑی کی طرح تم سے چالیں چلے گا، وہ ابن زبیر ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں اور تم ان پر قابو پا لو تو ان کا ایک ایک عضو کاٹ ڈالنا اور جہاں تک ممکن ہو اپنی قوم کا خون بہانے سے گریز کرنا۔''

خضری نے یہ وصیت نقل کی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے امام الصحابہ کی طرف وصیت کا یہ مضمون کس طرح منسوب کرنا قبول کر لیا۔ از اول تا آخر یہ وصیت مصنوعی ہے اور اس کا ایک لفظ بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا نہیں۔ سب سے اہم چیز جسے خضری جیسے شخص کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیے تھا، وہ سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا ذکر ہے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیدنا عبدالرحمٰن ۵۳ھ میں وفات پا چکے تھے، یعنی یہ وصیت لکھنے کے وقت سے سات برس پہلے۔ تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ امیر المومنین ان کا ذکر فرماتے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ولایتِ عہد کی بیعت کر لی تھی جیسا کہ صحیح بخاری کے حوالے سے ہم بیان کر چکے اور وہیں اس کی بھی وضاحت ہوگئی کہ خلافت کا جو تھوڑا سا خیال ان کے دل میں اس وقت پیدا ہوا تھا وہ ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا نے ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی، لیکن ان سے کر لی۔ لہٰذا ان سے اس کا خطرہ کیونکر ہوسکتا تھا کہ جو عہد وہ علی رؤس الاشہاد مسجدِ نبوی میں کر چکے تھے اسے توڑ دیں گے۔ یہ نام بھی اس وصیت میں ہرگز نہیں ہوسکتا۔

جس نے یہ وصیت نامہ وضع کیا ہے، چونکہ اس کے دل میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت نہیں تھی اور وہ انھیں ایک دنیا دار حکمران سمجھتا تھا، جو بیٹے کی محبت میں دنیا و آخرت سے بے نیاز ہو چکے تھے، اس لیے اپنی ذہنیت کے مطابق اس نے یہ وصیت نامہ مرتب کر کے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کی طرف منسوب کر دیا اور خضری جیسے لوگ اسے قبول کر بیٹھے۔

سبائیوں نے ولایتِ عہد کے مسئلے کو جس طرح امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذاتی ہوس اور خاندانی خواہش کی نمود بنا دیا ہے، اسی کے ثبوت میں یہ مردود وصیت نامہ بھی مرتب کر دیا گیا اور یہ کرامت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ اس وصیت نامہ کے مفتری مصنف کو سیدنا عبدالرحمٰن کا نام لکھتے وقت یہ خیال نہ رہا کہ وہ اس وقت زندہ نہ تھے۔

غالبًا یہ وصیت نامہ کسی سبائی کا مرتب کردہ ہے جو اس نے اہلِ عراق کو ایسا متحد الخیال اور طاقتور دکھایا ہے کہ ہر موقع پر وہ ایک لاکھ تلواریں سونت کر کھڑے ہو سکتے تھے، حالانکہ انھوں نے کسی اہم موقع پر سو دو سو تلواریں بھی نہیں سونتیں، بلکہ جس کسی کو بھی ورغلا کر حکومت کے خلاف کھڑا کیا اسے عین وقت پر بے یار و مددگار چھوڑ کر گھر جا بیٹھے۔ ایسے مکار اور بزدل لوگوں کا رعب امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ پر کیا ہوسکتا تھا، جو اپنی آنکھوں سے ان کے سب احوال دیکھے ہوئے تھے۔

اس وصیت نامے میں سیدنا حسین اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے نام جو ٹانک دیے گئے ہیں تو وہ بعد کے احوال دیکھ کر، ورنہ اس وقت ان دونوں میں سے کسی سے کوئی خطرہ نہ تھا۔

اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے عراق کے والیوں کو اہلِ عراق کے مطالبے پر جلد جلد بدلنے کی وصیت کی ہو۔ آپ کو کیا معلوم نہ تھا کہ کس طرح یہ لوگ امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اپنے ہر والی کے خلاف محاذ قائم کر کے اس کی تبدیلی کا مطالبہ کیا کرتے تھے اور انھیں کس قدر پریشان رکھتے تھے اور امیر المومنین کے مقابلے میں ان کا رویہ کیسا متمردانہ ہوا کرتا تھا۔ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے رفعِ شر کے لیے ہر دفعہ ان کی بات مانی جس کے یہ ہولناک نتائج مرتب ہوئے کہ امت کا حال و استقبال تاریک ہوگیا۔ ان کو تو ضرورت صرف امیر حجاج بن یوسف جیسے والی کی تھی جنھوں نے ان کے سب کس بل نکال دیے۔ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے مدبر اور دور بین امام ایسی لغو وصیت کر سکتے تھے جو پچیس برس کے ذاتی تجربے کے خلاف تھی؟!

لہٰذا یہ وصیت نامہ اپنے ایک ایک جزئیہ کے ساتھ بالکل وضعی ہے اور اس کے ایک حرف کی نسبت بھی امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف درست نہیں۔



موقف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

کہتے ہیں کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات اور امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے خلیفہ ہونے پر بارگاہِ خلافت سے امیرِ مدینہ سیدنا ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے پاس فرمان آیا:

”أما بعد! فخذ حسيناً وعبد الله بن عمر و ابن الزبير أخذاً ليس فيه رخصة حتى يبايعوا. والسلام“

”حمد و صلاۃ کے بعد! یہ ہے کہ حسین کو، عبداللہ بن عمر کو اور ابن زبیر کو گرفتار کر لو۔ اس میں رعایت کی اجازت نہیں، تا آنکہ وہ بیعت کر لیں، والسلام۔“

اب کہتے ہیں کہ امیرِ مدینہ نے ان حضرات کو بلایا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا: ”إنا لله وإنا إليه راجعون“ پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کی اور بیعت کے متعلق فرمایا: ”مجھ جیسا شخص خفیہ طریقے پر بیعت نہیں کیا کرتا اور نہ ایسی پوشیدہ بیعت مفیدِ مطلب ہو سکتی ہے۔ آپ جب مجمع میں بیعت کا مطالبہ کریں گے تو ہمیں بھی بلا لیجیے گا۔ بات ایک ہی رہے گی۔“ امیر ولید عافیت پسند تھے، انھوں نے آپ کو واپسی کی اجازت دے دی۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما رات ہی کو مدینہ سے چل دیے اور مکہ پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا تھا: ”میں نے بیت اللہ میں پناہ لی ہے۔“ آپ نہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور نہ ان کے ساتھ ارکانِ حج ادا کرتے تھے، بلکہ اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو جاتے تھے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ان کے بعد مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اپنے ساتھ اپنے فرزندوں، بھائیوں اور بھتیجوں کو بھی لیتے گئے تھے، سوائے حضرت محمد بن حنفیہ کے۔ انھوں نے خروج

سے انکار کر دیا تھا اور آپ کو بھی سمجھایا تھا کہ اس اقدام سے باز رہیں، لیکن آپ نے ان کی بات نہیں مانی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ فرمایا تھا: ''جب سب لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی کرلوں گا۔'' چنانچہ جب سب نے بیعت کر لی تو وہ بھی بیعت میں داخل ہو گئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی۔

یہ تو بیان ہے علامہ خضری کا، لیکن روایتیں اور بھی کئی قسم کی ہیں، مثلاً: امام ابو بکر بن العربی نے العواصم من القواصم میں ایک روایت نقل کی ہے اور اسے یک گونہ معتبر بھی بتایا ہے کہ جب مذکورہ بالا فرمانِ خلافت آیا تو امیر ولید نے سیدنا مروان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے رائے دی کہ ''سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو بلا کر بیعت پیش کی جائے اور انکار کریں تو وہیں ان کی گردن اڑا دی جائے۔'' امیر ولید نے کہا: ''سبحان اللہ! حسین رضی اللہ عنہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو کس طرح قتل کیا جا سکتا ہے؟'' لیکن حضرت مروان مصر رہے کہ کرنا اسی طرح چاہیے، ورنہ فتنہ پھیلے گا۔

بہر حال امیر ولید نے ان دونوں صاحبوں کو بلایا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے تو کچھ نہ کہا، لیکن حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے فرمایا: ہم خفیہ بیعت نہیں کرتے سب کے سامنے علانیہ کریں گے۔ یہ کہہ کر آپ چلنے لگے تو حضرت مروان نے آواز دی: ''پکڑنا، یہ جانے نہ پائیں۔'' حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما پلٹ پڑے اور انھیں گالی دی، وہ بھی گالی دے کر انھیں پکڑنے دوڑے اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو گالیاں بھی دیتے جاتے تھے۔ امیر ولید نے یہ صورتِ حال دیکھی تو دونوں کو اپنے سامنے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ دونوں چلے گئے اور پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی نکل آئے۔

یہ مردود روایت جسے امام ابن العربی نے ایک گونہ معتبر بتایا ہے، کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ نہ صحابہ و تابعین ایسے بے وقار تھے کہ اس قسم کا جاہلانہ اور عامیانہ رویہ

اختیار کرتے اور نہ امیر ولید ایسے تدبر نا آشنا تھے کہ اس شورہ پشتی کے باوجود سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو نکل جانے دیتے۔ ان راویوں نے یہ نہیں سوچا کہ ایک حاکم بااختیار کے سامنے ایسی باتوں کا امکان کہاں ہے اور اگر کوئی بات ایسی ہو تو ایک اشارے میں مجرم کیفرِ کردار کو پہنچایا جا سکتا ہے۔

رہا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بیعت کا مسئلہ تو نہ العواصم کی اس مردود روایت سے واضح ہوتا ہے، اور نہ خضری کے بیان سے۔ العواصم کی روایت کے مطابق اگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پر بیعت پیش ہی نہیں کی گئی تو بلایا کیوں تھا؟ اور خضری کے بیان کے مطابق اگر بیعت پیش کی تھی اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا تھا کہ ہم خفیہ نہیں، بلکہ مجمعِ عام میں بیعت کریں گے تو گویا جھوٹ بول کر فرار کی راہ ڈھونڈی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ یا سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما جیسے حضرات یہ مکاری کی بات کریں گے؟

پھر یہ سوال ہے کہ مکہ بھی تو امیر المومنین یزید ہی کی قلمرو میں تھا اور وہاں کے والی سیدنا عمرو بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اموی کے پاس بھی تو بیعت لینے کے متعلق فرمان آیا تھا۔ انھیں یقیناً معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ دونوں صاحب بیعت کیے بغیر آئے ہیں تو انھوں نے ان سے بیعت کیوں نہیں لی؟ اور اگر انھوں نے بیعت نہیں کی تھی تو ان کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟

سیدھی بات جو ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہے، یہ ہے کہ بیعت لینے کا صرف عام فرمان آیا ہو گا اور کسی کا نام خاص طور پر ہرگز نہیں لیا گیا ہو گا۔ جب عام بیعت ہو جائے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ فلاں اور فلاں شخص نے بیعت نہیں کی۔ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے عافیت اس میں سمجھی کہ ان دونوں صاحبوں سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔

رہا ان دونوں بزرگواروں کا مکہ آنا تو ضروری نہیں کہ امیر ولید کو دھوکا دے کر ہی ان کا آنا ہوا ہو۔ آدمی یوں بھی مکہ آ سکتا تھا۔ امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات یکم

رجب ۶۰ھ کو ہوئی تھی اور یہ مہینا عمرہ کا ہوتا تھا، لہٰذا قرینِ قیاس یہ ہے کہ دونوں بزرگوار پہلے ہی سے غالباً بہ نیتِ عمرہ مکہ آ گئے تھے۔ امیر عمرو بن سعید نے اعزاز و اکرام کے ساتھ انھیں رکھا اور چونکہ ان کی شخصی عظمت کا احترام تھا اس لیے بیعت پر اصرار کر کے فتنے کو ہوا دینا پسند نہ کیا۔ کسی ضعیف سے ضعیف بلکہ موضوع روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں صاحبوں سے یا دوسرے غیر مبایعین سے مکہ میں بیعت پر اصرار کیا گیا ہو۔ اگر امیر المومنین کے نزدیک ان دونوں بزرگواروں سے بیعت لینا ضروری ہوتا تو یہ جہاں کہیں بھی ہوتے ان سے بیعت لی جاتی اور نہ کرتے تو کم از کم اس کا انتظام کر دیا جاتا کہ ان سے کوئی شخص نہ مل سکے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں بزرگوار پوری آزادی اور عزت و احترام کے ساتھ مکہ میں رہتے تھے اور اس طرح ہرگز نہیں رہ سکتے تھے، اگر مدینہ میں ان کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا ہوتا جو روایتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

ہمیں خضری کی یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں کہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما باقی مسلمانوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یا ارکانِ حج ادا کرتے وقت اپنی ٹولی لے کر الگ ہو جاتے تھے۔ سیاسی اختلاف اپنی جگہ ہے اور آدابِ عباداتِ الٰہیہ اپنی جگہ۔ ان جیسے فقیہ اور سید الفقہاء سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ عبادات کے سلسلے میں احکامِ نبویہ کو پسِ پشت ڈال دیں گے۔ قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ مردود اور کون سا گروہ ہو سکتا ہے۔ جب آپ کی شہادت کے بعد غافقی بن حرب نے سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو امامت سے الگ کر دیا اور خود نماز پڑھانے لگا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے پیچھے نماز پڑھتے تھے یا نہیں؟ اگر غافقی جیسے شخص کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے تو امیر عمرو بن سعید جیسے بے نظیر شخص کے پیچھے کیوں نہیں ہو سکتی؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب خارجیوں کو سمجھانے گئے ہیں تو آپ نے ان کے امام کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔ لہٰذا ہم یہ ہرگز باور نہیں کر سکتے کہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے امیرِ مکہ کے ساتھ نماز پڑھنے یا حج کرنے سے گریز کیا ہوگا۔ اس وقت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا کوئی گروہ نہیں

تھا، بلکہ اس کے ایک عرصہ کے بعد تک نہ بن سکا، لٰہذا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس قسم کی حرکت کریں اور حکومت کی نگاہ میں یہ بات نہ آئے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ علامت کھلی ہوئی بغاوت کی تھی اور امیر عمرو رضی اللہ عنہما اسے کبھی برداشت نہ کرتے۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی طرف سے اس وقت تک دعوت نہیں دی، جب تک امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی وفات کی انھیں اطلاع نہ مل گئی۔ پھر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ جب خود آپ کا مکہ پر غلبہ ہو گیا تو اس وقت سب آپ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور آپ ہی کی قیادت میں حج کرتے تھے، اگرچہ بہت سے حضرات نے آپ سے بیعت نہیں کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے احکام کہ ہر نیک و بد کے ساتھ نماز پڑھو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شعار کی موجودگی میں ہم خضری کا یہ بیان کسی طرح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے شروع ہی سے ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا لی تھی۔

ہمیں خلافتِ اسلامیہ کی بھی وہ حکمتِ عملی نظر نہیں آتی جو لوگ بیان کرتے چلے آرہے ہیں، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ امیر المومنین یزید رحمہ اللہ اور ان کے عمال نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو اور نہ حقیقتاً ان کی طرف سے کوئی فتنہ کھڑا ہوا۔ لٰہذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما بیعت سے انکار کر کے یا امیرِ مدینہ کو دھوکا دے کر مکہ چلے آئے تھے، کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ وہ یقیناً بطورِ خود اور شاید بہ نیتِ عمرہ یا اپنے عزیزوں سے ملنے مکہ آئے تھے اور یہاں امیرِ مکہ سیدنا عمرو بن سعید رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو امن و عافیت کے ساتھ رہنے دیا اور ان سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا۔ مکہ میں ان سے بیعت پر اصرار نہ کرنا اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ امیر المومنین یزید رحمہ اللہ نے ان سے بیعت لینے کا کوئی حکم نہیں بھیجا تھا۔ پچھلے سیاسی احوال کا بھی تقاضا یہی تھا کہ انھیں نہ چھیڑا جائے۔ اگر مکہ امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی حکومت میں نہ ہوتا تب بھی ایک بات تھی۔ اس لیے ہمیں ان روایتوں کے اس طرح منقول ہونے پر سخت تعجب ہے۔

ابتدا میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما بالکل خاموش بیٹھے تھے اور کسی قسم کی کوئی بے چینی نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ اپنی اپنی جگہ یہ دونوں حصولِ خلافت کے خیالات پکا رہے ہوں، لیکن عملی ثبوت کوئی نہیں۔ کم از کم سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے ان کے سیاسی عزائم ظاہر ہوں۔ کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ آپ نے نام نہاد شیعوں سے ربط قائم کرنے کی کوئی کوشش کی ہو۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ آپ سے ربط قائم کرنے کی ابتدا سبائیوں نے کی تھی۔ اگر یہ مفسد لوگ آپ کو خاموش بیٹھا رہنے دیتے تو امت اس فتنے سے محفوظ رہتی جس نے تیرہ سو برس سے اسے آماجگاہِ مصائب بنا رکھا ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے جس کی کسی طرح تردید نہیں کی جا سکتی کہ آپ اپنے عم بزرگوار سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بالکل خاموش بیٹھے تھے اور حکومت کی طرف سے پوری طرح آپ کا اعزاز و اکرام تھا کہ کوفیوں کے خطوط آپ کے پاس آنے لگے، لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ آپ نے ان لوگوں کی اس تحریک کی پذیرائی میں سبقت کی ہو۔ اس پر تو آپ کو بڑی مشکل سے پے بہ پے خط اور یکے بعد دیگرے وفد بھیج کر تیار کیا گیا۔

وہ سبائی لوگ جو اس قسم کے خط لاتے تھے انھوں نے طرح طرح آپ کو باور کرایا کہ پورا ملکِ عراق اموی خلافت کے خلاف اندرونی طور پر منظّم ہے۔ اگر کسر ہے تو صرف آپ کے پہنچنے کی ہے۔ آپ کوفہ تشریف لائیں تو ہم وہاں کے والی کو نکال کر آپ کی خلافت کا اعلان کر دیں۔ ان لوگوں نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ گویا جس طرح امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے ملکِ شام منکر تھا، اسی طرح امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی بیعت توڑ دینے پر عراق متحد ہے۔

جب ان کے بہت سے خط آئے اور کوفیوں کی طرف سے بہت الحاح ہوا تو آپ نے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ صورتِ حال کا اچھی طرح مطالعہ کر کے امرِ واقعہ سے مطلع کریں۔ سیدنا مسلم کی طرف سے جو خط موصول ہوا اس سے پتا چلا کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اور ہر طرح تیاری مکمل ہے۔ بس آپ فوراً تشریف لے آئیں۔

بعض روایتوں کے مطابق اس خط میں ساٹھ ہزار آدمیوں کی بیعت کی اطلاع دی گئی تھی۔

ساٹھ آدمی حج کے بہانے آپ کو لینے آئے تھے۔ انھوں نے اور بھی معاملہ پختہ کر دیا۔ یوں تمام مخلصوں، بزرگوں، ہم چشموں اور خوردوں کے مشورے کے خلاف، بلکہ اجنبی لوگوں کے بھی یہ کہنے کے باوجود کہ آپ عراقیوں پر بھروسا نہ کریں اور ایک غلط اقدام سے امت کے لیے موجبِ فتنہ نہ بنیں۔ آپ نے ان مکار عراقیوں کی بات کو صحیح باور کر لیا اور حج کے بعد کوفہ کو روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۱ ذی الحجہ ۶۰ھ کا ہے۔ گویا آپ کو ہموار کرنے کے لیے ان عراقیوں کو چھ مہینے محنت کرنی پڑی۔

دوستوں اور بہی خواہوں کا مشورہ آپ نے کیوں قبول نہ کیا۔ اس کی ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے کہ ان سبائی نمایندوں نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ مکہ کے لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ دور بیٹھے کا اندازہ ہے، انھیں اندرونی احوال معلوم نہیں۔ ہم جو آپ کے فدائی ہیں اصل صورتِ حال جانتے ہیں۔ پے بہ پے خط اور وفد اور آخر میں ساٹھ کوفیوں کا آپ کو لینے آنا اور اس سب پر مستزاد حضرت مسلم بن عقیل کا خط، ایسی باتیں تھیں جن کے سبب آپ کو یقین ہو گیا کہ واقعی عراق آپ کی حمایت پر متفق ہے۔

اب ناسخ التواریخ کے ایرانی مولف کی زبانی پچھلے لوگوں اور مورخوں کی بیان کردہ وہ روایت ملاحظہ ہو جو انھوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مکہ سے روانہ ہونے کے سلسلے میں بیان کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ساٹھ کوفیوں نے کس طرح آپ کو یقین دلا دیا تھا کہ موجودہ حکومت کے خلاف عراق منظّم ہے اور آپ کے وہاں پہنچتے ہی آپ کی خلافت کا اعلان کر دیا جائے گا، بلکہ یوں سمجھیے کہ خلافت آپ کو مل ہی گئی اور آپ تمام امت کے خلیفہ تسلیم کر لیے گئے۔ صرف کوفہ پہنچنے کی دیر ہے۔ ان لوگوں نے خلافت کا حصول ایسا یقینی اور حتمی بنا دیا تھا کہ گویا امیر المومنین یزید رحمہ اللہ ختم ہو گئے اور آپ ہی اب سب کچھ ہیں۔ آپ کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہو چکا ہے، جس کے ثبوت میں مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کا

خط پہنچ چکا تھا کہ ہزار ہا آدمیوں نے آپ کی بیعت کر لی ہے۔ عبارت یہ ہے:

''چون حسین علیہ السلام از مکہ بیرون شد و چند میل طے مسافت فرمودہ بمنزل تغیم رسید، کاروانے رانگریست کہ مبلغے برویمانی و پارۂ درس و بعضے اشیاء نفیسہ حمل میداد واین جملہ را بجیر بن یسار حمیری کہ عاملِ یمن بود بنزدیک یزید الفاذ داشتہ بو۔ حسین علیہ السلام کہ رتق وفتق امور مسلمانان از جانب خدائے خاص او بود، آن حمال را ماخوذ داشت، وشتر بانان را فرمود کہ اگر خواہید با ما سفر عراق می کنید شترانِ خود را بہائے کری از ما بستانید و اگر نہ بہائے کری از ما بستانید و اگر نہ بہائے کری تا اینجا کہ حمل دادہ اید بگیرید و باز شوید۔ جماعتے ملازمت رکا آنحضرت اختیار کردند گردہے بہائے کری بگرفتند و باز شدند۔''

''جب حسین علیہ السلام مکہ سے باہر نکلے اور چند میل کی مسافت طے کر کے منزل تغیم تک پہنچے تو آپ نے ایک قافلہ دیکھا جو کچھ یمنی چادریں اور خوشبوئیں اور بعض نفیس اشیا لے جا رہا تھا۔ عاملِ یمن بجیر بن یسار حمیری نے یہ سب مال یزید کے پاس روانہ کیا تھا۔ حسین علیہ السلام کہ مسلمانوں کے تمام امور کی شکست و ریخت خدائے تعالیٰ کی طرف سے خاص انھیں تفویض ہوئی تھی، انھوں نے تمام سامان پر قبضہ کر لیا اور شتربانوں سے فرمایا: چاہو تو ہمارے ساتھ عراق چلو اور اپنے اونٹوں کا کرایہ ہم سے لو، ورنہ یہاں تک لانے کا کرایہ لے کر واپس چلے جاؤ۔ ایک جماعت نے آپ کی معیت اختیار کی اور ایک گروہ اپنا کرایہ لے کر واپس ہو گیا۔''

اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کوفیوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو کیسے کیسے سبز باغ دکھائے تھے اور عراق کی صورتِ حال کا کیسا نقشہ پیش کیا تھا کہ آپ نے اتنا بڑا اقدام کر لیا جو دنیا کی کسی دینی یا لادینی حکومت کے لیے قابلِ برداشت نہیں ہو سکتا۔ اور سوائے کھلی بغاوت کے اور فساد فی الارض کے، اسے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے ہمیں

اس روایت کے قبول کرنے میں تامل ہے، اگرچہ بکثرت لوگوں نے اسے نقل کیا ہے۔ ہم یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جیسے امام الاتقیاء اپنی حیثیت عرفی کا عیاناً مشاہدہ کیے بغیر اور پھر باقاعدہ منضبط حکومت بنائے بغیر اور پھر کھلم کھلا اعلانِ جنگ کیے بغیر اس قسم کا اقدام کر بیٹھتے۔ کسی روایت کا بکثرت منقول ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں، جب تک قرائن موجود نہ ہوں۔ ایسی سیکڑوں واہی روایتیں ہیں جو پیہم و متواتر بیان ہوتی چلی آ رہی ہیں، لیکن تحقیق پر بے اصل ثابت ہوئیں۔ اسی قسم کی یہ روایت بھی معلوم ہوتی ہے۔

غالب گمان یہ ہے کہ صاحبِ ناسخ التواریخ نے اسے اپنا یہ مخصوص عقیدہ بیان کرنے کے لیے لکھا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو خدا کی طرف سے ''رتق وفتق امور مسلمانان'' دیا گیا تھا۔ محض اس کی دلیل میں یہ مکروہ واقعہ نقل کر دیا، تاکہ اہلِ اسلام کے قلوب اہلِ بیت کی طرف سے متنفر ہو جائیں اور وہ سمجھیں کہ یہ لوگ شروع ہی سے مفسدانہ اور متمردانہ کارروائیاں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کی بیان کردہ منقبتیں بھی بطرز ذم ہوتی ہیں۔ ثابت تو کرنا چاہتے ہیں کہ فاطمیوں میں سے چند لوگوں کو اللہ کی طرف سے حکومت ملی تھی اور دلیلیں لاتے ہیں ایسی۔

بہر حال جب آپ کچھ مسافت طے کر چکے تو آپ کو اطلاع ملی کہ عراق میں اموی حکومت بدستور قائم ہے اور اس کے استحکام میں کوئی فرق نہیں۔ مسلم بن عقیل کو بغاوت کے جرم میں قتل کیا جا چکا ہے اور ان بیعت کرنے والے ہزاروں آدمیوں میں سے ان کی مدد کے لیے ایک شخص بھی سامنے نہیں آیا۔ ہانی بن عروہ مرادی جن کے ہاں حضرت مسلم رضی اللہ عنہ نے پناہ لی تھی، انھوں نے عربی آداب کے تحت حضرت مسلم کو حکومت کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا تھا تو انھیں بھی اعانتِ جرم کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔

حضرت مسلم بن عقیل کے قتل کے سلسلے میں جو روایتیں بیان کی گئی ہیں ہمیں ان کی تفصیلات سے کچھ بحث نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ تاریخی حقیقت دیکھنی ہے کہ وہ جب قتل

ہوئے تھے تو تنہا تھے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس صورتِ حال سے واقف ہو کر واپس جانے کا تہیہ کر لیا، لیکن جو عراقی آپ کو لینے آئے تھے انھوں نے پھر یقین دلایا کہ آپ کی حیثیت مسلم کی سی نہیں، آپ کی تو صورت دیکھتے ہی لوگ آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں گے، لہٰذا آپ چلے گئے۔ ادھر بنو عقیل نے کہا کہ جب تک خونِ مسلم کا بدلہ نہیں لیں گے ہمیں چین نہیں آئے گا، اس لیے آپ نے کوفہ کا سفر جاری رکھا۔

ہمارا خیال ہے کہ کوفہ میں حضرت مسلم کے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار یا بقولِ بعض ساٹھ ہزار آدمیوں کا بیعت کرنا محض فرضی بات ہے۔ اور حضرت مسلم کا جو خط اس بارے میں بیان کیا جاتا ہے وہ ممکن ہے مصنوعی ہو۔ سبائیہ کے لیے جعلی خط بھیجنا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ کوفہ ایک سرحدی چھاؤنی تھی اور یہ ناممکن ہے کہ وہاں کے احوال کی نگرانی میں کمی رکھی گئی ہو۔ بلادِ عجم کی دیکھ بھال کے لیے عراقیوں کی مفسدانہ ذہنیت کی موجودگی میں سبائیوں کی ریشہ دوانیوں سے حکومت غافل نہیں رہ سکتی تھی۔ دار الحکومت میں اٹھارہ ہزار آدمیوں کا کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور حکومت کا اس سے بے خبر رہنا سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے سو دو سو آدمیوں نے ایسی بیعت کر لی ہو۔ افشائے راز ہو گیا اور امیر عبید اللہ کو حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

یہ جو ساٹھ کوفی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو لینے آئے تھے، یہ سب کارروائی ان کی اور ان کے چند ساتھیوں کی معلوم ہوتی ہے، ورنہ حقیقتِ حال جو سامنے آئی اور جو سب کے نزدیک مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے پاس جو خطوں کا انبار تھا وہ آپ نے جب اہلِ کوفہ کے سامنے ڈالا ہے اور کاتبوں کا نام لے کر پکارا ہے تو سب اس سے منکر ہو گئے تھے کہ انھوں نے آپ کو اس قسم کے خط بھیجے تھے۔ ان لوگوں کا یہ انکار اگر امیر عبید اللہ کے نزدیک مسلّم نہ ہوتا تو حادثۂ کربلا کے بعد ان سب کو ختم کر دیا جاتا اور ان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جاتا جو بعد

کے احوال کے پیشِ نظر امیر حجاج بن یوسف نے اہلِ عراق کے ساتھ روا رکھا تھا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بلانا اور ان کے سامنے خیالی صورتِ حال کو واقعی بنا کر پیش کرنا چند آدمیوں کا کام معلوم ہوتا ہے نہ کہ اہلِ کوفہ کی معتد بہ جماعت کا۔ علامہ خضری نے ''محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ'' (۲/۱۲۵) میں اس سیاسی اختلال کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ اور اگرچہ ان کا خیال یہی ہے کہ واقعی اٹھارہ ہزار آدمیوں نے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ سے بیعت کی تھی لیکن وہ یہ ثابت نہیں کر سکے کہ ان خط لکھنے والوں کا جب نام پکارا گیا اور انھوں نے انکار کیا تو امیر عبید اللہ نے ان مجرموں کے خلاف کیا کارروائی کی، کیوں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا انھیں نام لے لے کر پکارنا ان کے خلاف اہم ترین شہادت تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سبائی لوگ جب مکہ آ کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو خروج پر ابھار رہے تھے تو حکومت نے اس کی روک تھام کیوں نہیں کی؟ یہ تو کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا کہ امیر عمرو بن سعید سایگانۂ روزگار والی ان کارروائیوں سے بے خبر رہ سکتا تھا اس لیے سوائے ایک وجہ کے اور کچھ نہیں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا شخصی احترام مدِنظر تھا اور امیر سمجھتے تھے کہ آپ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے جو سراسر نصوصِ شرعیہ کے خلاف ہو۔ پھر ان کا گمان ہو گا کہ ان بے ننگ و بے نام لوگوں کے بجائے آپ اپنے بزرگوں اور مخلصوں کی رائے کو زیادہ اہمیت دیں گے۔ حضرت امیر جانتے تھے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما حکومت کے کس طرح وفادار اور اموی خلافت کے کیسے حامی ہیں۔ اور سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین یزید رحمہ اللہ سے کتنی محبت ہے اور ان کے کردار کو وہ کتنا عظیم سمجھتے ہیں۔ پھر سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے مخلص اور شیخ الصحابہ کا موقف بھی وہ جانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ کبھی یہ باور نہیں کر سکتے تھے کہ غدار عراقیوں کا جادو چل سکے گا۔ جو لوگ اس عہد کو ظلم و جبر اور بے دینی کا دور سمجھتے ہیں کیا وہ اس کی کوئی توجیہ کر سکتے ہیں کہ امیر عمرو بن سعید نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ مراعات کیوں برتیں؟

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی روانہ اس وقت ہوئے جب حج سے واپس جانے والے ہزار ہا آدمی اپنے گھروں کو جا رہے تھے، اس لیے آپ کو بھی چپکے سے نکل جانے کا موقع مل گیا، لیکن اس اقدام پر بھی حکومت نے جبر و زور کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیدنا عمرو الاشدق کو جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اس طرح روانہ ہو جانے کی اطلاع ملی تو سیدنا عبداللہ بن جعفر اور اپنے بھائی حضرت یحییٰ بن سعید کے ہاتھ انھوں نے اپنا مہر شدہ امان نامہ آپ کے پاس بھیجا کہ واپس تشریف لے آئیں اور بدستور عزت و احترام سے مکہ میں مقیم رہیں اور اس اقدام سے گریز فرمائیں جو امت کے لیے ہلاکت آفرین ہو گا، لیکن یہ سب کوششیں رائیگاں گئیں اور حضرت یحییٰ صرف اتنا کہہ کر واپس آ گئے کہ اللہ سے ڈریے اور امت میں افتراق پیدا مت کیجیے، ایسا نہ ہو کہ پھر آپ کے حقوق کی پاسداری نہ کی جا سکے۔[1]

اس واقعے سے بھی یمنی قافلہ لوٹنے کی تغلیط ہوتی ہے۔ اگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس قافلے کو لوٹا ہوتا جو بیت المال کا سامان لے کر دمشق جا رہا تھا تو پھر امیرِ مکہ کے پاس کوئی حجت نہیں رہتی اور وہ دست اندازی پر مجبور ہوتے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح واہی روایتیں شہرت پا گئی ہیں۔

بہر حال بارہا واپسی کا قصد کرنے کے بعد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کوفہ کے قریب پہنچے اور امیر عبیداللہ کا فوجی دستہ سامنے آیا جس میں سب کے سب عراقی تھے تو آپ نے عیاناً دیکھ لیا کہ آپ کے ساتھ کیسا زبردست فریب کیا گیا تھا اور بے بات کی کیسی ہوا باندھی گئی تھی۔ آپ نے اپنا رخ موڑ کر دمشق کی راہ لی۔

تمام اہلِ تاریخ متفق ہیں کہ جب کوفہ میں آپ کو گھیرا گیا ہے اور آنے کا مقصد

---

[1] البداية و النهاية (٨/١٦٩)، طبري (٤/٢٩١،٢٩٢)
گورنر مکہ عمرو بن سعید اور سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے متعلق یہ پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''رسوماتِ محرم الحرام اور سانحۂ کربلا'' (ص: ۱۰۱،۱۰۳) پر درج کیا ہے۔ مزید تشفی کے لیے قارئین مذکورہ بالا حوالہ جات کی طرف مراجعت فرمائیں۔

دریافت کیا گیا ہے تو آپ نے فرمایا: ''میں خاموش بیٹھا تھا، لیکن تم لوگوں نے مجھے بلایا۔ اب اگر میرا آنا گوارا نہیں تو مجھے واپس جانے دو۔'' وہ لوگ اس پر راضی نہیں ہوئے اور نہ ہونا چاہیے تھا تو آپ نے فرمایا: ''دمشق جاتا ہوں کہ اپنے چچا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں'' یہ باتیں تاریخ کی چھوٹی بڑی ہر کتاب میں موجود ہیں اور قرینِ قیاس ہیں، اس کی عملی دلیل موجود ہے اور مواقفِ اہلِ بیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ امیر عمر بن سعد اور امیر عبیداللہ بن زیاد دونوں اس آخری شرط پر راضی ہو گئے، کیوں کہ یہی اقدام موجبِ برکت تھا اور اسی میں امت کی فلاح وصلاح تھی۔ [1]

گویا یہ پہلا موقع تھا کہ آپ کے سامنے بیعت کا مسئلہ رکھا گیا۔ اگر اب بھی اس پر اصرار نہ ہوتا تو کب ہوتا۔ حکومت جتنی طرح دے سکتی تھی اتنی اس نے دی اور استمالت

---

1. سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے جب کوفیوں کی غداری ملاحظہ کرلی تو انھوں نے امیر عبیداللہ بن زیاد کے لشکر کے قائد جناب عمر بن سعد بن ابی وقاص رحمہ اللہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد بھائی اور رشتے میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے نانا تھے کے سامنے یہ شرط رکھی تھی جو کہ صحیح سند کے ساتھ دیگر تاریخی کتب کے ساتھ ساتھ تاریخِ طبری میں بھی موجود ہے۔ علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

''ہلال بن یساف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبیداللہ بن زیاد نے حکم دیا کہ واقصہ اور شام و بصرہ کے بیچ میں پہرہ لگا دیا جائے اور کسی کو بھی آنے جانے سے روک دیا جائے۔ چنانچہ حسین رضی اللہ عنہ ان باتوں سے بے خبر آگے بڑھے، یہاں تک کہ بعض اعرابیوں سے آپ کی ملاقات ہوئی تو آپ نے ان سے پوچھ تاچھ کی تو انھوں نے کہا: نہیں اللہ کی قسم! ہمیں کچھ معلوم نہیں، کیوں کہ ہم نہ وہاں جاسکتے ہیں اور نہ وہاں سے نکل سکتے ہیں۔ پھر حسین رضی اللہ عنہ شام کے راستے پر یزید بن معاویہ کی طرف چل پڑے، پھر راستے میں گھڑسواروں نے انھیں کربلا کے مقام پر روک لیا اور وہ رک گئے تو وہ انھیں اللہ اور اسلام کا واسطہ دینے لگے۔ عبیداللہ بن زیاد نے عمر بن سعد بن ابی وقاص، شمر بن ذی الجوشن اور حصین بن نمیر کو ان کی جانب بھیجا تھا۔ حسین رضی اللہ عنہ نے ان سے اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر کہا: وہ انھیں امیر المومنین یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے چلیں، تاکہ وہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیں۔'' (تاریخ طبري: ۲۹۹/۳، و اسنادہ صحیح)

کے جتنے طریقے ممکن ہو سکتے تھے وہ سب امیر المومنین کے نمایندوں نے اختیار کیے۔ انھوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی عزت و حرمت برقرار رکھنے میں حد سے تجاوز کیا اور اس وقت تک آپ سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا جب تک آپ عیاناً مقابلے پر نہ آگئے اور خود اپنی زبان سے کوفیوں کی تمام ریشہ دوانیوں کا اقرار نہ کر لیا۔ علمِ سیاست کا معمولی سے معمولی طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ طرح دینا ناممکن ہے۔

اب دو باتیں بیان کی جاتی ہیں، جن کے نتیجے میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کی شہادت کا المناک حادثہ رونما ہوا۔

ایک بات تو کہی گئی ہے کہ امیر عبیداللہ نے آپ سے مطالبہ کیا کہ اگر آپ اپنے موقف سے رجوع کر چکے ہیں تو امیرِ کوفہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے دمشق تشریف لے جائیں۔ آپ نے اسے اپنی ہتکِ عزت سمجھا، اس پر راضی نہیں ہوئے اور فرمایا: ''اس سے تو موت بہتر ہے۔'' اس کے نتیجے میں جنگ ہوئی اور آپ شہید کر دیے گئے۔[1]

اگر دیکھا جائے اور امرِ واقعہ بھی یونہی ہو تو امیر عبیداللہ کا مطالبہ ناجائز نہیں تھا۔ امیر کے ہاتھ پر بیعت اس کی ذات سے نہیں ہوتی، بلکہ امام سے ہوتی ہے۔ امیر کی اطاعت امام ہی کی اطاعت ہے۔ جو شخص امام کی بیعت پر تیار ہوا اسے امیر کے ہاتھ پر بیعت سے گریز کی گنجایش نہیں۔ شریعت کا یہ کھلا ہوا مسئلہ ہے اور ناممکن ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی نگاہ سے پوشیدہ ہو۔ آپ اس پر خود بھی عمل کرتے تھے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی

---

[1] بعینہٖ اسی وجہ کا ذکر حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''رسوماتِ محرم الحرام اور سانحۂ کربلا'' میں کیا ہے۔ صلح کی ناکامی کی وجہ لکھتے ہوئے حافظ صاحب رقم طراز ہیں:

''ہمارے خیال میں اس کی بڑی وجہیں دو باتیں بنیں: ایک ابن زیاد کا سخت گیر حاکمانہ رویہ، دوسری سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا ابن زیاد کی انتظامی مصلحت کے مقابلے میں اپنی عزتِ نفس اور وقار کو اہمیت دینا۔'' (صفحہ: ۱۰۶، ۱۰۷)

وفات کے بعد ان کی نمازِ جنازہ حضرت امیر مروان[1] نے پڑھائی تھی، حالانکہ رشتے کے لحاظ سے یہ حق سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا تھا کہ بالغ عصبات میں اس وقت آپ ہی اقرب تھے، لیکن آپ نے اسے پسند کیا کہ نمازِ جنازہ امیر پڑھائیں گے۔ ویسے بھی تمام نمازوں میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور آپ امیرِ مدینہ ہی کی اقتدا کیا کرتے تھے۔

ہمیں امیر المومنین محمد الامام المہدی رحمہ اللہ کے عہد کا ایک واقعہ ملتا ہے کہ امیرِ مدینہ نے ایک مرتبہ نمازِ جنازہ پر امیر المومنین کے ایک عباسی عزیز کو امامت کے لیے کھڑا کر دیا تو بارِگاہ خلافت سے اس پر تنبیہ ہوئی تھی کہ تم اس وقت اپنے باپ کی نیابت نہیں کر رہے تھے، بلکہ میرے نائب تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«من أطاع أميري فقد أطاعني»

''جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے یہ اطاعت میری کی۔''

لہٰذا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ امیر المومنین یزید کی بیعت پر تیار ہو جانے کے باوجود سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے امیر عبیداللہ سے بیعت کو اپنی ہتکِ عزت سمجھا ہو۔ دمشق کے باہر جتنے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) تھے سب نے اپنے اپنے امیر ہی کے ہاتھ پر تو بیعت کی تھی۔ پھر امیر عبیداللہ سے بیعت کرنے کے مقابلے میں موت کیوں بہتر ہوتی اور نصوص کی موجودگی میں آپ یہ بات کیوں فرماتے۔

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ يَرْوِيهِ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا فَكَرِهَهُ فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ يُفَارِقُ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَيَمُوتُ إِلَّا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً''[2]

---

[1] بعض روایات میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھانے کے سلسلے میں سیدنا مروان بن الحکم رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ کا نام ملتا ہے، تاہم ہر دو روایات صحت کے لحاظ سے بہت معتبر نہیں سو کسی کو کسی پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ واللہ أعلم

[2] صحيح البخاري ج ٢، كتاب الاحكام

’’حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا: ’’اگر کوئی شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناگوار ہو تو چاہیے کہ صبر کرے، کیوں کہ جو شخص ایک بالشت کے برابر بھی جماعت سے ہٹ کر مرے گا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔‘‘

لہٰذا ہمیں یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ امیر عبیداللہ نے آپ کو اول اپنے ہاتھ پر بیعت کے لیے بلایا ہو اور آپ نے اس سے انکار کیا ہو اور اس کے نتیجے میں جنگ ہوئی ہو۔ ہمارے نزدیک امیر عبیداللہ نے یہ مطالبہ ہی نہیں کیا اور اگر کرتے تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ضرور بیعت کر لیتے۔ مورخوں نے امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کا فرمان نقل کیا ہے جو آپ نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کی اطلاع پا کر امیرِ کوفہ کو بھیجا تھا:

”قد بلغني أن الحسين بن علي قد توجه نحو العراق فضع المناظر والمسالح واحترس على الظن وخذ على التهمة غير ألا تقتل إلا من قاتلك واكتب إلي في كل ما يحدث من الخبر“ [2]

’’مجھے معلوم ہوا ہے کہ حسین عراق کی طرف روانہ ہو چکے ہیں، تم مخبروں کو مقرر کرو، چوکیاں قائم کرو اور پہرے کا انتظام کرو، جس سے بدگمانی ہو اسے قید کر دو، کسی کی مخبری کی جائے تو اسے گرفتار کر لو۔ لیکن کسی کو قتل مت کرنا۔ تا آنکہ کوئی تم سے لڑنے کھڑا نہ ہو جائے۔ جس قسم کی تمھیں اطلاعات پہنچیں اور واقعات رونما ہوں مجھے مطلع کرتے رہو۔‘‘

اس فرمان کی موجودگی میں اس کا امکان نہ تھا کہ امیر عبیداللہ کی طرف سے کوئی اقدام ایسا ہو، جس کا نتیجہ جنگ نکلے۔ پھر اس وقت تک حکومت نے جس طرح پاسداری کی تھی اور محض آپ کی شخصیت کا خیال کر کے عملی سیاست کے اصول قربان کیے تھے، اس

[2] تاريخ الطبري (٢٨٦/٤) طبع مصر.

عمل کا تقاضا بھی یہی تھا کہ امیر عبیداللہ کی طرف سے رفعِ شر کی کوشش ہو اور جب یہ کوشش بارآور ہو گئی تھی اور آپ بیعت کے لیے دمشق جانے پر راضی ہو گئے تھے تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ پر بیعت کا شوشہ چھوڑا ہو وہ تو اس پر نہایت مسرور تھے کہ آپ دمشق تشریف لے جا رہے ہیں۔

لہٰذا جنگ کا ہمیں کوئی اور سبب تلاش کرنا چاہیے۔ ہمیں قرینِ قیاس یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی بات اچانک ہوئی اور کسی غلط فہمی کے تحت جنگ چھڑ گئی۔ دائرہ معارف اسلامیہ (انگریزی) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ امیر عبیداللہ اور سیدنا عمر بن سعد نے آپ سے مطالبہ کیا کہ چونکہ آپ بہ نیتِ صلح و آشتی تشریف لے جا رہے ہیں، اس لیے زائد ہتھیار اور فوجی ساز و سامان حکومت کے سپرد کرتے جائیں۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک آپ کے ساتھیوں نے سرکاری فوجی دستے پر حملہ کر دیا۔ ممکن ہے کہ یہ حرکت بنو عقیل نے اپنے جوش میں کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے ساتھیوں نے ایسا کیا ہو۔ چونکہ یہ حملہ اچانک اور پوری قوت سے کیا گیا اس لیے لڑائی چھڑ گئی اور سرکاری دستے نے جواب دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ستر آدمی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی طرف کے اور ۸۰ (اسّی) آدمی سرکاری فوجی دستے کے کام آئے۔ یہ قضیہ نامرضیہ اور واقعہ ہائلہ گھنٹا دو گھنٹے میں ختم ہو گیا۔[1]

یہ حرکت بعینہٖ وہ تھی جو سبائیوں نے جنگِ جمل کے موقع پر کی تھی کہ عین اسی وقت

---

[1] فضیلۃ الشیخ مولانا کفایت اللہ سنابلی حفظہ اللہ نے بھی سببِ جنگ اسی وجہ کو قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
''عمر بن سعد رحمہ اللہ کے سامنے حسین رضی اللہ عنہ نے اللہ کا واسطہ دے کر کہا کہ مجھے یزید کے پاس جانے دو۔ عمر بن سعد اس پر بہت خوش ہوئے، انھوں نے ان کی یہ بات منظور کر لی اور عبیداللہ بن زیاد سے اس کی اجازت بھی لے لی۔ کوفی سبائیوں نے جب یہ دیکھا کہ حسین رضی اللہ عنہ یزید کے پاس بیعت کے لیے جا رہے ہیں اور ان کے خطوط بھی ان کے پاس موجود ہیں تو انھوں نے ہنگامہ برپا کر کے حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔'' (یزید بن معاویہ رحمہ اللہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ: ۸۸۳)

جب صلح ہو گئی جنگ چھیڑ دی اور یوں بے وجہ دونوں گروہوں میں تصادم ہو گیا۔ چونکہ جارحانہ حملے کی ابتدا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کی طرف سے ہوئی تھی، اس لیے حکومت نے ان کے ساتھ باغیوں کا سا سلوک کیا اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک امیر عبیداللہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ سر مبارک کے دمشق بھیجے جانے کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں۔

"عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ أُتِيَ عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ زِيَادٍ بِرَأْسِ الْحُسَيْنِ علیہ السلام فَجُعِلَ فِي طَسْتٍ فَجَعَلَ يَنْكُتُ وَقَالَ فِي حُسْنِهِ شَيْئًا فَقَالَ أَنَسٌ: كَانَ أَشْبَهَهُمْ بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَكَانَ مَخْضُوبًا بِالْوَسْمَةِ"[1]

"سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عبیداللہ بن زیاد کے سامنے حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لایا گیا اور ایک طشت میں رکھا گیا اور وہ اسے چھوتے جاتے اور ان کے حسن کی تعریف کرتے تھے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہت رکھتے تھے، اس وقت آپ کے وسمہ کا خضاب تھا۔"

یہ گستاخانہ حرکت غلط فہمی کے سبب ہوئی تھی۔ اصل واقعہ جب معلوم ہوا تو کمالِ احترام کے ساتھ اسے دفن کر دیا گیا ہو گا۔ یہ جو لوگوں نے اس سلسلے میں الم انگیز تفصیلات دی ہیں اور جن میں برابر اضافہ کیا جاتا ہے اور طرح طرح کی خیال آرائی کے ذریعے رونے رلانے کا انتظام کیا جاتا ہے اس قسم کی باتیں قطعاً نہیں ہوئیں۔ بس اتنا ہی ہوا جتنا ہنگامہ میں ہو جاتا ہے۔ جو زخمی تھے ان کا علاج کیا گیا، مثلاً: سیدنا زید بن حسن بن علی بن ابی طالب، سیدنا حسن بن حسن بن علی جو حسن المثنیٰ کہلاتے ہیں۔ جو حضرات جنگ میں شامل نہیں تھے وہ محفوظ رہے، مثلاً: سیدنا علی زین العابدین رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

حرمِ محترم اور ان تمام اہلِ بیت کو عزت و احترام کے ساتھ دمشق بھیج دیا گیا، جہاں امیر المومنین یزید رحمہ اللہ نے ایک غم زدہ شفیق چچا کی طرح ان کا استقبال کیا۔ عرصۂ دراز تک

[1] صحيح البخاري (٢/٣٠٦) طبع مصر.

اپنے پاس محبت و شفقت کے ساتھ رکھا اور پھر ان حضرات کی خواہش کے مطابق حفاظتی دستے کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیا۔ ہر طرح ان کی دلجوئی کی اور ان حضرات نے بھی ساری عمر ان کے ساتھ محبت اور وفاداری کا تعلق قائم رکھا۔[1] سیاسی اختلاف کا کوئی اثر ہاشمی اور اموی سادات نے باہمی محبت و الفت اور قرابت کے معاملے میں کبھی نہیں لیا۔ بعد کے واقعات اس کے شاہد ہیں اور روایات کے اس طومار سے انھیں دبایا نہیں جا سکتا اور نہ تلبیس و افترا سے یہ باتیں کہیں چھپتی ہیں۔ ان نسلوں کو کیسے ختم کر دیں، جن کی رگوں میں ہاشمی اور اموی خون دوڑ رہا ہے۔

بے شک حادثہ کربلا میں جارحانہ اقدام سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کی طرف سے ہوا تھا، لیکن یہ آپ کے منشاء کے تحت نہ تھا، آپ تو جس طرح صورتِ حال کا عینی مشاہدہ

---

[1] واقعہ کربلا کے بعد اہلِ بیت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ امیر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے حسنِ سلوک اور اس حسنِ سلوک کے نتیجے میں اہلِ بیت حسین رضی اللہ عنہ کا یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کی بیعت پر مستقیم رہنا خود خانوادۂ حسین رضی اللہ عنہ کے ایک فرد جناب علی بن حسین رحمہ اللہ المعروف زین العابدین کی شہادت سے بھی ثابت ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ امام مدائنی کی روایت مع سند نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”علی بن حسین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب حسین رضی اللہ عنہ قتل کر دیے گئے تو ہم کوفے میں پہنچے۔ ہم سے ایک آدمی نے ملاقات کی اور ہم اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ اس نے ہمارے سونے کا بندوبست کیا اور میں سوگیا۔ پھر گلیوں میں گھوڑوں کی آواز سے میری نیند کھلی، پھر ہم یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کے پاس پہنچائے گئے تو جب یزید بن معاویہ رحمہ اللہ نے ہمیں دیکھا تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، یعنی وہ رو پڑے۔ پھر انھوں نے ہمیں وہ سب کچھ دیا، جو ہم نے چاہا اور مجھ سے کہا: آپ کے یہاں کچھ معاملات پیش آئیں گے، آپ ان لوگوں کے کسی معاملے میں شرکت مت کیجیے گا۔ پھر جب اہلِ مدینہ کی طرف سے یزید کی مخالفت ہوئی تو مسلم بن عقبہ کو یزید بن معاویہ نے خط لکھا، جس میں انھوں نے مجھے امان دی اور جب مسلم حرہ کے واقعہ سے فارغ ہوئے تو مجھے بلوایا۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا اور میں اپنی وصیت لکھ چکا تھا تو انھوں نے مجھے وہ خط دیا، جس میں لکھا ہوا تھا کہ علی بن حسین کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنا۔ اگر وہ اہلِ مدینہ کے معاملے میں شریک ہو جائیں تو بھی انھیں امان دینا اور انھیں معاف کر دینا اور اگر وہ ان کے ساتھ شریک نہ ہوئے تو یہ انھوں نے بہت اچھا اور بہتر کیا۔“ (تاریخ الإسلام: ۲/۵۸۳، نقلاً عن المدائني و اسناده صحيح)

کر کے اپنے موقف سے رجوع فرما چکے تھے، اس کے مطابق زائد اسلحہ بھی حکومت کو یقیناً سپرد کر دیتے، کیوں کہ آپ کا دل صاف تھا اور سبائیوں کا سب مکر وفریب آپ پر کھل گیا تھا۔ اس لیے کربلا کے خونچکاں واقعہ کو ایک المناک حادثہ ہی کہا جا سکتا ہے، اس سے زیادہ کچھ کہنا واقعاتِ ثابتہ کے خلاف ہوگا۔ کیوں کہ اس تصادم کی ذمے داری طرفین پر نہیں، اگر ہے تو صرف سبائیوں پر۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت اطہار نے نہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کو اس کا ذمے دار سمجھا، نہ امیر عبیداللہ کو نہ سیدنا عمر بن سعد رضی اللہ عنہم کو، بلکہ سب نے اس کی ذمے داری اہلِ عراق پر ڈالی۔

”عَنِ ابْنِ أَبِي نُعْمٍ قَالَ كُنْتُ شَاهِدًا لِابْنِ عُمَرَ وَسَأَلَهُ رَجُلٌ عَنْ دَمِ الْبَعُوضِ، فَقَالَ: مِمَّنْ أَنْتَ؟ فَقَالَ: مِنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ، قَالَ: انْظُرُوا إِلَى هَذَا يَسْأَلُنِي عَنْ دَمِ الْبَعُوضِ وَقَدْ قَتَلُوا ابْنَ النَّبِيِّ ﷺ وَسَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: هُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا“ [1]

”ابن نعم سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص نے آپ سے مچھر کے خون کا کفارہ دریافت کیا (حالتِ احرام میں) آپ نے فرمایا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا: عراق کا۔ فرمایا: ذرا اسے دیکھو مجھ سے مچھر کے خون کا کفارہ پوچھتا ہے، حالانکہ یہی لوگ ہیں جنھوں نے فرزندِ رسول کو شہید کیا تھا۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ دنیا میں میرے یہی دو پھول ہیں، (یعنی حضراتِ حسنین علیہما السلام)۔“

یہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی ہیں جو ایک طرف تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی محبت کو تقاضائے ایمان سمجھتے تھے اور دوسری طرف امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی بیعت میں تھے اور پوری قوت سے اس پر مستقیم رہے، کیوں کہ ان کی بیعت کو اللہ و رسول کی بیعت جانا اور ان کے خلاف کھڑے

---

[1] صحيح البخاري (٤/ ٥٠ـ ٥١) كتاب الأدب، طبع مصر.

ہونے والوں کو سب سے بڑا غدار کہا (صحیح بخاری، کتاب الفتن، بسلسلہ واقعہ حرہ)۔ یہ دونوں نظریے اسی وقت رکھے جا سکتے ہیں جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا الزام امیر المومنین یزید رحمہ اللہ اور ان کی حکومت پر نہ ہو اور یہ بھی تسلیم ہو کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جب شہید ہوئے تو خلافت پر خروج کی حالت میں نہیں ہوئے، بلکہ جماعت میں شمولیت کا اعلان فرما چکے تھے۔

جب "التوابون" نے اس دعوے کے ساتھ خروج کیا کہ وہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کھڑے ہوئے ہیں تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ظاہراً و باطناً ان سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ نہ ان کی پشیمانی کو پشیمانی سمجھا اور نہ ان کی توبہ کو توبہ۔ جب مختار ثقفی نے زور پکڑا جو آپ سے نسبتی تعلق رکھتا تھا اور اس نے حقوقِ اہلِ بیت دلوانے کا دعویٰ کیا تو آپ اس سے قطعاً بے تعلق رہے۔ اگر یہ باتیں آپ نے تن آسانی اور عافیت پسندی کے تحت کیں، یا بزدلی دکھائی تو پھر سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت کیوں نہ کر لی، حالانکہ ان کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی اور تمام عالمِ اسلام پر ان کی تلوار کی دھاک تھی اور خوف تھا کہ بیعت نہ کرنے کی پاداش میں کہیں وہ قتل نہ کر دیں۔

بالکل یہی موقف تمام بنو ہاشم کا تھا۔ سیدنا علی زین العابدین جو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے حقیقی وارث اور ولی الدم تھے، سیدنا زید بن حسن، سیدنا حسن المثنیٰ جو کربلا میں موجود تھے، ان سب نے امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کو اپنا بزرگ اور مربی سمجھا، ان کی بیعت پر مستقیم رہے، اہلِ مدینہ کی بغاوت میں حصہ نہیں لیا اور اپنے شریک نہ ہونے کی اطلاع امیر المومنین کو دے دی۔ توابون اور مختار ثقفی سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں رکھا، اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت نہیں کی اور ساری عمر اموی خلافت کے طرف دار رہے۔ جو لوگ سیدنا زین العابدین کو پس ہمت سمجھتے ہیں وہ سمجھتے رہیں، لیکن اہلِ ایمان کے نزدیک آپ کا عمل بالکل اللہ و رسول کے احکام کے مطابق تھا، اور یہ آپ کی جرأت وللّٰہیت تھی کہ آپ پوری قوت سے اپنے موقف پر قائم رہے۔ باقی اہل بیت کا بھی بعینہٖ یہی موقف تھا جس پر وہ جانبازانہ قائم رہے۔

سیدنا علی زین العابدین نے حادثۂ کربلا کی ایک ایک تفصیل اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کے عمل سے یہی بات ہویدا ہے کہ کربلا میں اہلِ بیت اطہار پر جو کچھ گزرا وہ محض ایک دلگداز حادثہ تھا اور بالکل غیر متوقع۔ اگر کسی درجے میں بھی آپ کے نزدیک اس خونِ ناحق کی ذمے داری حکومت پر ہوتی تو آپ کے لیے بار بار زریں مواقع پیدا ہوئے کہ آپ خونِ حسین کا پورا پورا بدلہ لے سکتے تھے۔ لوگ باتیں تو بناتے ہیں، جوش وغضب کا اظہار کرتے ہیں مگر اتنا نہیں سوچتے کہ جس شخص کے دل پر سب سے زیادہ چوٹ لگی، جن حضرات کا بلاواسطہ تعلق سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے تھا اور جن کے مقابلے میں اگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا زیادہ وفادار ہونے کا کوئی دعویٰ کرے تو عند اللہ والناس جھوٹا قرار پائے گا، یہ سب کے سب حضرات بلا استثناء ان لوگوں کے ساتھ تھے جنھیں مجرم بتایا جاتا ہے اور ان کے خلاف تھے جو مخلص بنتے ہیں۔ اسی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مجرم کون ہے اور مخلص کون۔

حقیقت یہ ہے کہ سبائیوں ہی کے نامہ اعمال میں یہ خونِ ناحق بھی لکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کی صفت بیان کی ہے:

﴿ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ [البقرة: ٦١]

”اور نبیوں کو حق کے بغیر قتل کرتے تھے۔“

اسی صفت کا مظاہرہ عبداللہ بن سبا یہودی کے متبع ہمیشہ کرتے چلے آرہے ہیں اور اسی کا مظاہرہ انھوں نے میدانِ کربلا میں بھی کیا تھا۔ إنا للّٰه و إنا إليه راجعون.

اب بعض لوگ تیرہ سو برس کے بعد ایسے پیدا ہوئے ہیں جنھیں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا اپنے موقف سے رجوع کرنا اور امیر المومنین یزید رحمہ اللہ سے بیعت کرنے پر تیار ہو جانا تسلیم نہیں۔ علامہ خضری نے بڑے زور سے قطعی فیصلہ کیا ہے:

”وليس بصحيح أنه عرض عليهم أن يضع يده في يد يزيد“ [1]

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية (١٢٨/٢)

''اور یہ صحیح نہیں ہے کہ آپ نے ان پر یہ شرط پیش کی تھی کہ آپ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دیں گے۔''[1]

لیکن کاش وہ اس متواتر خبر کی تردید سے پہلے جو مواقفِ اہلِ بیت کے عین مطابق ہے، اس وقت کے جغرافیے پر بھی نگال ڈال لیتے۔ مکہ سے جانے والا آدمی کربلا ہو کر کوفہ نہیں جاتا تھا، بلکہ کوفہ کے قریب پہنچنے کے بعد جب دمشق کی طرف رخ کر لیتا تھا تب کربلا پہنچتا تھا۔ گویا مشہدِ حسین رضی اللہ عنہ زبانِ حال سے پکار پکار کر قیامت تک یہ اعلان کرتا رہے گا کہ کوفیوں نے جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح، سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرح اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کی طرح، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور خانوادۂ نبوت کو شہید کیا تھا تو اس وقت وہ اپنے موقف سے رجوع کر کے امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کو روانہ ہو چکے تھے۔

مشہد شریف کے جائے وقوع پر متنبہ کرنے کے بعد ہم امت کو پھر اس امر پر متوجہ کرتے ہیں کہ تمام صورتِ حال کا صحیح علم ان بزرگواروں کو تھا جو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قریب ترین اعزہ ہیں۔ انہی کے طرزِ عمل سے موقفِ حسین معلوم کرنا ہو گا، کیونکہ وہ ہزار ہا صفحات جو اس واقعۂ جانگداز کی تفصیلات بیان کرنے پر سیاہ کیے گئے ہیں، نہایت گمراہ کن ہیں اور ان کے مطالعے کا نتیجہ سوائے انتشارِ طبع اور اضمحلالِ روح کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ اطمینانِ قلب صرف اہلِ بیت کے عمل پر غور کرنے اور ان کے اتباع ہی میں میسر آ سکتا ہے۔

ان کے فرزند سیدنا علی زین العابدین، ان کے بھائی سیدنا محمد بن ابی طالب اور سیدنا عمر بن علی بن ابی طالب، ان کے بھتیجے سیدنا زید بن حسن بن علی اور سیدنا حسن بن حسن بن علی، ان کے سگے چچا کے بیٹے اور سگے بہنوئی سیدنا عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب اور ان

---

[1] ہم گذشتہ صفحات میں تاریخِ طبری کے حوالے سے بسند صحیح یہ بات نقل کر آئے ہیں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے امیر یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کی پیش کش کی تھی۔ سو خضری کا اس بابت یہ دعویٰ کرنا کہ ''یہ صحیح نہیں'' بلا دلیل اور صحیح روایت کے مخالف ہے۔

کے چچا سیدنا عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب ، بلکہ تمام بنو ہاشم رضوان اللہ علیہم اجمعین سب کے سب امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی بیعت میں تھے، ان کے مخلص احباب تھے اور حادثۂ کربلا کے باوجود ان کی محبت ومودت و یگانگت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تمام مشکل اور سخت احوال میں وہ ان کی بیعت پر مستقیم رہے اور ان کے مخالفوں سے عدمِ تعاون کیا۔

یہ سب حضرات اس تحریک سے بھی قطعاً الگ رہے جو حادثۂ کربلا کے تین چار برس بعد سبائیوں نے خونِ حسین کا بدلہ لینے کے لیے جاری کی اور بقولِ خود اپنی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرنے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے مختار ثقفی سے بھی براءت کا اعلان کیا اور اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے جرم کا اعتراف تاریخِ اسلام میں صرف سبائیوں نے کیا ہے، لیکن ان کی توبہ نہ اہلِ بیت نے قبول کی، نہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے اور نہ امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ نے۔

"التوابون" کی توبہ کا یہ عالم تھا کہ تین چار برس بالکل چپکے بیٹھے رہے اور کھڑے ہوئے تو اس وقت جب ایک طرف حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور دوسری طرف امیر المومنین مروان کی خلافت کا اعلان ہو چکا تھا۔ اگر واقعی انھوں نے توبہ کی تھی تو سب سے پہلے سیدنا علی زین العابدین رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بنو ہاشم کے سامنے معذرت پیش کرتے اور ان سے رائے لیتے کہ ہم اپنے گناہ کا کفارہ کس طرح ادا کریں، لیکن اس کے بجائے انھوں نے اہلِ بیت کے طرزِ عمل اور طریقہ کار کے خلاف بطور خود حکومتِ شام پر خروج کیا اور امیر عبیداللہ کے ہاتھوں شکست کھائی۔

مختار ثقفی بھی اہلِ بیت ہی کے نام سے کھڑا ہوا تھا اور سیدنا محمد بن علی بن ابی طالب پر افترا کر کے اپنے آپ کو ان کا نمایندہ بتایا تھا، لیکن کھڑا ہوا سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے لڑنے اور سیدنا مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اب کوئی پوچھے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے شہید کرنے میں ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا کیا ہاتھ تھا جو ان سے لڑنے کھڑا ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ سبائیہ کو نہ اہلِ بیت کی دوستی مطلوب تھی اور نہ امویوں کی دشمنی سے کچھ غرض تھی، ان کا مقصد تھا امت میں فساد۔ حادثۂ کربلا کے تین برس تک عالمِ اسلام میں مکمل خاموشی اس کی بیّن دلیل ہے کہ امت نے اسے محض ایک افسوس ناک اور دلدوز حادثہ سمجھا، اور اس کی تمام ذمے داری کوفیوں پر ڈالی۔ امیر المومنین یزید، امیر عبیداللہ بن زیاد، امیر عمر بن سعد کو اس خونِ ناحق سے بری الذمہ سمجھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عموماً اور اہلِ بیتِ اطہار خصوصاً سب امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے ساتھ تھے اور سبائیوں سے بیزار۔ سبائیوں کو بھی سب سے زیادہ عداوت اصحابِ رسول سے ہے، بلکہ اہلِ بیتِ اطہار سے بھی۔ بظاہر تو انھیں اتنی محبت معلوم ہوتی ہے کہ اپنے خود ساختہ ائمہ کی جناب میں اس حد تک غلو کرتے ہیں کہ نصرانیوں کو بھی مات کر دیا۔ مگر مقصد یہ ہے کہ ساداتِ ہاشمیہ کو آپس میں اس طرح بانٹ کر کہ اگر ایک گروہ اپنے ائمہ کے ساتھ غلو کی حد تک محبت کا دعویٰ کرے تو دوسرا گروہ اپنے ائمہ کو چھوڑ کر باقی سب کو کذاب و دجال کہے۔ اس طرح انھوں نے تمام اہلِ بیت پر لعنت کا انتظام کر دیا ہے۔

لیکن تاریخ یہ کہتی ہے کہ مآثرِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہاشمی سادات اپنے اپنے ائمہ کی بیعت میں تھے، جماعت سے وابستہ تھے، کتاب و سنت کے حامل تھے اور مدارجِ روحانیہ میں ایک دوسرے پر فائق تھے اور اتنی نورانیت رکھتے تھے کہ یہ امت ان کے فیوض سے برابر بہرہ ور چلی آ رہی ہے اور ان کی برکات سے متمتع۔

بے شک چند لوگوں نے اپنے ائمہ پر خروج کیا، لیکن یہ گنے چنے لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے سبائیوں نے ابھار کر کھڑا نہ کیا ہو اور پھر عین موقع پر بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ نہ گئے ہوں، مثلاً: زید بن علی بن حسین بن ابی طالب اور ان کے فرزند یحییٰ کو۔ ایسے ہی اوروں کے بارے میں تاریخی یادداشتیں ہیں جن پر بحث موضوع سے خارج ہے۔

مفسدوں اور گمراہوں کا موقف:

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا جو فرضی اور خیالی موقف لوگوں نے قائم کر رکھا ہے اور مُصر ہیں

کہ آپ کے رجوع کا انکار کریں، یعنی یہ باور کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ آپ نے اسی موقف پر جان دی جو مکہ سے چلتے وقت تھا، اس کی غایت محض یہ ہے کہ امت میں افتراق کو ہوا دیں اور ہر برپا شدہ منظّم حکومت کے خلاف کھڑے ہو کر اختلال و بدامنی پیدا کرنے کا نام جہاد رکھیں۔ اگر ان لوگوں کی نیت تعمیری ہوتی تو اہلِ بیت کا موقف ان کے لیے کافی تھا، لیکن چونکہ عزائم تخریبی اور مفسدانہ ہیں، اس لیے اللہ کے آخری رسول کے محترم و محبوب نواسہ کا نام اپنے تباہ کن عزائم کے لیے کام میں لاتے ہیں۔

گویا کذب و افترا کا دفتر محض امیر المومنین یزید رحمہ اللہ ہی کے خلاف وضع نہیں کیا گیا، بلکہ یہ تیر نشتر مستقلاً جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی چل رہے ہیں اور پیہم آپ کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ (نعوذ باللّٰہ من ذلک) آپ نے اپنے جدِامجد صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات پسِ پشت ڈال کر، کتاب و سنت سے منہ موڑ کر اور جمہور صحابہ و اہلِ بیت کے موقف کی تحقیر و تکذیب کر کے عالمِ اسلام کو فتنہ میں مبتلا کر دیا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو چھ مہینے کی لگاتار محنت کے بعد خروج پر تیار کیا گیا تھا، لیکن پھر بھی آپ مطمئن نہ تھے اور بار بار لوٹ آنے کا قصد فرماتے تھے، تا آنکہ آپ کوفہ کے قریب پہنچ گئے اور سب صورتِ حال عیاناً دیکھ لی اور محسوس کر لیا کہ آپ کے پاس کوئی حجت نہیں، اس لیے پوری قوت سے رجوع کا اعلان کر دیا۔

اگر آپ کا موقف آخر تک وہی رہا ہوتا جو بیان کیا جاتا ہے اور جس کے ثبوت میں کبھی دیدہ دلیری سے کہہ دیا جاتا ہے: ''سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی۔'' اور کبھی بتایا جاتا ہے کہ ''گاڑی پٹڑی سے اتر گئی تھی اسے بحال کرنے کے لیے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔'' تو سوال ہے کہ اگر صورتِ حال یہ تھی تو آپ نے کوفہ کے سفر میں بار بار لوٹ جانے کا ارادہ کیوں کیا اور موقع پر پہنچ کر اپنے موقف سے رجوع کا اعلان کیوں فرمایا۔ انھیں نہایت سکون سے ''حق'' پر جان دینی چاہیے

تھی۔ امیر المومنین کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کی پیش کش کیوں کی اور اس کے لیے عملی قدم یہ کیوں اٹھایا کہ دمشق کی طرف باگ موڑ دی۔ اگر اس پیش کش کی روایت متواترہ بقول علامہ خضری کے غلط ہے، تب بھی کیا واپس جانے دینے کی درخواست سے یہ الم نشرح نہیں کہ آپ اپنے موقف سے رجوع فرما چکے تھے، بلکہ اس بارے میں تذبذب راہ میں پیدا ہو چکا تھا۔ آپ نے رجوع محض اس لیے کیا کہ صورتِ حال آپ پر واضح ہوگئی تھی کہ سبائیوں نے سب جھوٹی باتیں بیان کی تھیں، نہ عراق آپ کی حمایت پر منظّم تھا اور نہ امت کے اجماع میں کوئی اختلال تھا۔ یعنی نہ گاڑی پٹڑی سے اتری تھی اور نہ زمامِ کار جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔

اگر پھر بھی لوگ مُصر ہوں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ واقعی اپنے ابتدائی موقف پر قائم رہے تو اس کے دو ہی مآل ہو سکتے ہیں، یا تو یہ کہ تمام امت میں صرف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ہی کی ایک ذات منبعِ رشد و ہدایت تھی اور باقی تمام صحابہ و اہلِ بیت اور علما و فقہائے امت، بلکہ ساری دنیا کے مسلمان باطل پر تھے، کیوں کہ کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور سب نے ان کے اقدام کو غلط بتایا، حتی کہ خود ان کے اپنے فرزند نے اسی شخص سے بیعت کر لی جس کے خلاف کھڑے ہونے کو یہ مفتری لوگ غزوۂ بدر کے مماثل بتاتے ہیں۔

اگر اہلِ ایمان ایسی بات نہیں کہہ سکتے تو ماننا پڑے گا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا موقف باطل تھا۔ وہ محض خارجی باغی اور واجب القتل تھے اور ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ شریعتِ مطہرہ کے مطابق تھا اور تمام نصوصِ صریحہ کے موافق۔ اس طرح ان کے جتنے فضائل و مکارم صحاح سے ثابت ہوتے ہیں وہ غلط ہیں۔ انھیں قطعاً احکامِ کتاب وسنت کا پاس نہ تھا۔

اگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے اور کسی صاحبِ ایمان کے دل میں یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے منہ سے نکل سکتی ہے تو پھر سوائے ایک بات کے کسی دوسری بات کے سوچنے اور سمجھنے کا امکان نہیں کہ سبائیوں کی غداری، مکاری، افترا پردازی سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے صورتِ حال کا غلط اندازہ لگا کر اجتہادی غلطی کی اور پھر جب صورتِ حال آپ نے اپنی

آنکھوں سے دیکھ لی تو کمالِ ایمان اور پختگیِ علم و عرفان کے سبب نہایت جرأت کے ساتھ اپنے موقف سے رجوع کا اعلان کر دیا۔ سبائیوں کو چونکہ یہ امر ناگوار تھا اس لیے انھوں نے جنگ چھیڑ کر صورتِ حال بگاڑ دی، تاکہ جمل و صفین کی طرح امت اس بارے میں بھی انتشار کا شکار ہو جائے۔ سبائی تحریک کا یہی اصل منشا ہے۔ سیدنا زین العابدین رحمہ اللہ جنگ میں شریک نہیں تھے، اس لیے امیر عمر بن سعد کی کوشش سے وہ بچ گئے اور سیدنا زین بن حسن المجتبیٰ اور سیدنا حسن المثنیٰ زخمی ہو کر مردہ سمجھ لیے گئے تھے، اس لیے وہ بھی امیر عمر بن سعد کی سعیِ بلیغ سے بچ گئے، ورنہ سبائیہ کا یہ مقصد نہیں تھا کہ اہلِ بیت میں کوئی زندہ بچ کر جائے۔ انھوں نے جس کسی شخص کو بھی حکومت کے خلاف کھڑے ہونے پر ابھارا، اسے عین موقع پر قتل ہونے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا علی زین العابدین، سیدنا زین بن حسن اور سیدنا حسن المثنیٰ بلکہ تمام علمائے اہلِ بیت ہمیشہ سبائیوں سے بیزار رہے اور اموی خلافت کے بہی خواہ۔ امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے یہ روایت بیان کی ہے:

"أن الحسن المثنٰى بن الحسن السبط بن علي بن أبي طالب قال لرجل من الرافضة: "والله لئن أمكننا الله منكم لنقطعن أيديكم وأرجلكم، ثم لا نقبل منكم توبة" الخ [1]

"سیدنا حسن المثنیٰ بن سیدنا حسن المجتبیٰ بن سیدنا علی بن ابی طالب نے ایک رافضی شخص سے فرمایا: بخدا اگر اللہ نے ہمیں تم پر قابو کا موقع دیا تو ہم تمھارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں گے اور تمھاری توبہ قبول نہیں کریں گے۔"

یہ ہے حال اس بزرگ کا جو خود حادثۂ کربلا میں شریک تھے اور زخموں سے چور چور ہو گئے تھے۔ انھیں سبائیہ سے اتنی نفرت تھی۔

اگر واقعی "زمامِ کار جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی تھی" یا حقیقتاً "گاڑی پٹڑی سے اتر

[1] العواصم من القواصم حاشیہ (ص: ۱۸۵)

گئی تھی'' اور یہ سبائی لوگ یا اہلِ عراق پھر ''نورانیت'' کا دور واپس لانا چاہتے تھے اور اس وقت گہوارۂ اسلام صرف عراق تھا اور باقی تمام عالمِ اسلام مہدِ کفر تو ان عراقیوں کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ کوفہ میں فاطمی خلافت کا اعلان کر دیں۔ اس وقت کی سیاسی تنظیم ایسی تھی کہ ہر علاقہ خود کفیل تھا اور ہر بالغ شخص ماہرِ حرب وضرب۔ نہ وہاں شامیوں کی فوج تھی اور نہ امیرِ کوفہ کے پاس عراقیوں کے علاوہ کچھ اور لوگ تھے۔ راتوں رات سب کام ہو سکتا تھا اور عراق کی آزادی وخود مختاری کا اسی طرح اعلان کیا جا سکتا تھا جس طرح عہدِ مرتضوی میں شام نے علاحدگی اختیار کر رکھی تھی۔ مگر یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ اہلِ عراق من حیث القوم حکومت کے ساتھ تھے۔ چند شریر النفس سبائیوں کی کارروائی سے یہ اندوہ ناک حادثہ رونما ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نبی کریم ﷺ کے محبوب نواسے نے اپنے موقف سے رجوع کر کے اپنی دانست میں تو فتنے کا سدِ باب کر دیا تھا اور اہلِ بیت اطہار نے آپ کے اسی آخری موقف پر زندگی بسر کر کے اموی خلافت کی ہمیشہ حمایت کی۔ مگر پھر بھی لوگوں نے فتنے کا یہ دروازہ کھلا رکھا اور سلف صالحین پر کذب وافترا کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔

اللهم أرنا الحق حقا واجعلنا من أهله، وأرنا الباطل باطلا ونعوذ بك أن نكون منهم.



یزیدی فرقہ

ابھی حال میں ایک نیا انکشاف ہوا ہے جسے چودھویں صدی کا ''تحقیقی'' کارنامہ کہنا چاہیے۔ ابھی معاملہ بعض روزناموں تک ہے، لیکن پھر یہ کتابوں میں آ جائے گا۔ اس پر مقالے لکھے جائیں گے اور ممکن ہے کہ اس کے لیے سندیں بھی تلاش کر لی جائیں اور کچھ عجب نہیں کہ کسی قدیم مخطوطہ میں کچھ عبارت بڑھا دی جائے۔ یہ امر معمولات میں ہے کہ خود ہی ایک بات وضع کی، پھر خود ہی اس سے استشہاد کیا، کتابوں میں لکھا، اس پر قصیدے کہے، رباعیاں کہیں، مثنویاں لکھیں، پھبتیاں اور مقولے بنائے، تا آنکہ وہ خود ساختہ بات مسلمات میں بنا ڈالی۔

کہتے ہیں کہ امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے حکم سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر فوجیں بھیجنے کا جب حکم ہوا اور امیر عبیداللہ بن زیاد نے یہ ''مہم'' سر کرنے کے لیے عام بھرتی کا اعلان کیا تو اہلِ عراق نے اس حکم کی پذیرائی نہیں کی، اور جب لڑنے کے لیے کوئی بھی نہ نکلا تو امیر المومنین کے حکم سے یزیدی فرقے کے لوگوں کو بلایا گیا اور انھوں نے خلافت کی یہ ''خدمت'' انجام دی۔ گویا ان محقق صاحب کے نزدیک یزیدی نام کا کوئی فرقہ اس وقت بھی موجود تھا اور عراقی لوگ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت میں ایسے منظّم تھے کہ آپ کے خلاف نہ کھڑے ہونے پر متحد ہو گئے۔ کاش یہ محقق صاحب اتنا اور بتا دیتے کہ جب اہلِ عراق میں ایسی یکجہتی تھی اور اہلِ بیت کے وہ ایسے وفادار تھے تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پر جان قربان کرنے کے لیے کیوں متحد نہ ہو سکے، یا عقیدت محض زبانی ہے؟

واقعہ صرف اتنا ہے کہ کردوں کے جاہل طبقے میں ایک مردود فرقہ یزیدی نام کا پایا جاتا ہے جو امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی جناب میں غلو کرتے ہیں، لیکن یہ ایسے ہی جاہل اور دین سے بے بہرہ ہیں کہ عملاً اسلام اور امتِ محمدیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ایک صاحب تھے عدی بن مسافر (۴۶۷۔۵۵۷ھ) اچھے عالمِ باعمل شخص تھے۔ انھوں نے جو اپنے قرب و جوار کے سبائیوں کی باتیں سنیں اور امیر المومنین یزید رحمہ اللہ پر لعن طعن سن کر ان کے کان پک گئے تو انھوں نے سیدھی بات کہہ دی کہ وہ مسلمانوں کے ایک امام اور امت کے خلیفہ ہیں، ان کی جناب میں سوئے ادب کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔ ان کے دلائل و براہین سے لوگ متاثر ہوئے اور اپنے خیالات میں تبدیلی کر لی۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے شیخ عدی کے احوال بیان فرمائے تو رائے ظاہر کی کہ وہ معتدل خیالات کے شخص تھے اور ان کا طریقہ مطابق کتاب وسنت درست تھا۔ ان کے خلفا میں ایک صاحب تھے شیخ حسن۔ انھیں سبائی لوگوں نے شہید کر دیا اور بڑا ہنگامہ ہوا۔ اسی طرح ان لوگوں میں شیخ حسن اور شیخ عدی رحمہما اللہ کی بابت غالیانہ باتیں پیدا ہوگئیں اور امیر المومنین یزید کے بارے میں بھی غلو کرنے لگے، حتی کہ بعض نے انھیں نبی کہہ دیا۔ یہ سب نتیجہ تعصب، جہالت اور غلو کا ہے۔ اس غلو کی راہ بھی کردوں کو سبائیوں ہی نے دکھائی تھی۔ جس طرح سبائی لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد میں سے بعض کے ساتھ انتہائی بلکہ بے انتہا غلو کرتے ہیں، ایسا ہی غلو امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے متعلق کردوں نے بھی شروع کر دیا، تا آنکہ یہ لوگ خود دینِ اسلام سے ہٹ گئے، اور ان میں وہ باتیں آ گئیں جن کا ادنیٰ تصور بھی امتِ محمدیہ کے ہاں نہیں۔

حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان کے متعلق ایک ''رسالۃ العدویۃ'' لکھا ہے اور اس میں بتایا ہے کہ اگر حضرت شیخ عدی زندہ ہوتے تو ان لوگوں سے بیزاری کا اعلان فرماتے۔ ہندوستان میں بھی اس کی نظیر سکھوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جن بزرگوں نے ان کی اصلاح کی اور اسلام کی طرف انھیں چلایا ان کے مرنے کے بعد یہ

لوگ ایک مستقل دین کے حامل بن گئے اور اب کفار کا ایک فرقہ ہیں نہ کہ مسلمانوں کا۔ یہی حال ان جاہل اور غالی کردوں کا ہوا۔

شمالی عراق وغیرہ علاقوں میں یہ لوگ اب بھی پائے جاتے ہیں، لیکن ان کی تاریخ پانچویں چھٹی صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے نہ کہ پچھلی صدی سے۔ مگر ہمیں وہ وقت قریب نظر آ رہا ہے جب یزیدی فرقے کا وجود ۶۰ھ سے پہلے ثابت کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں گی۔ یزیدی فرقہ کے بارے میں یہ تصریحات ہم نے المنتقیٰ (ص: ۲۷۹۔۲۸۰، طبع مصر) سے لی ہیں۔

ایک بے سر و پا افسانہ:

امیر المومنین یزید اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کے مابین ذاتی اور خاندانی بغض و عداوت ثابت کرنے کے لیے جہاں اور بہت سی روایتیں وضع کی گئی ہیں، وہاں ایک افسانے کو خاص فروغ حاصل ہے، بلکہ کہا گیا ہے کہ ان دونوں بزرگواروں کے درمیان عناد کی اصل وجہ یہی تھی۔ اس کی تفصیلات کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں غالبًا پہلی مرتبہ بیان ہوئی ہیں۔ اور پھر تو اس کی اشاعت اس طرح کی گئی کہ گویا ایک حقیقتِ مسلمہ ہے۔ اس قسم کی روایتوں کا اس کتاب میں بار پانا اس کی قطعی اور حتمی دلیل ہے کہ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ جیسے فقیہ شخص کی طرف اس کی نسبت افترائے محض ہے اور تلبیسِ خالص۔ راقم الحروف نے یہ افسانہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتے ہوئے سنا ہے اور افسانوں کے مجموعات میں ''علامہ'' احمد شبلی جیسون نے اسے نقل کر کے ''سرزمینِ عرب کا ایک دلچسپ ترین واقعہ'' بتایا ہے، حالانکہ از اول تا آخر اس کی کوئی تفصیل قابلِ اعتنا نہیں، کیوں کہ سراسر کذبِ محض ہے اور بہتانِ شنیع۔ کہتے ہیں:

> امیر یزید اپنی ولایتِ عہد کے زمانے میں جب حج کے لیے آئے تو ''ایک پری چہرہ حسین دوشیزہ'' کو دیکھ کر عقل و ہوش کھو بیٹھے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ان کا نام اُرینب بنت اسحاق ہے اور وہ اپنے ابن عم عبداللہ بن سلام کے

نکاح میں ہیں جو ایک قرشی نوجوان تھے اور عراق کے والی۔

''امیر یزید اس ''عشق'' کے ہاتھوں ایسے از خود رفتہ ہوئے کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے باپ سے بھی کبیدہ خاطر ہو گئے کہ ہر طرح دلداری کے باوجود انھوں نے اپنے فرزند کو اُرینب جیسی فقید المثال خاتون کی زوجیت سے محروم رکھا۔

''حضرت امیر المومنین کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فرزند کے لیے ترکیبیں لڑانی شروع کر دیں۔ والی عراق عبداللہ بن سلام کو اپنے پاس دمشق بلایا اور تزک و احتشام کے ساتھ ان کا استقبال کر کے اپنا مہمان رکھا۔ سیدنا ابو الدرداء اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بھی اس وقت دمشق میں موجود تھے، انھیں طلب فرما کر عبداللہ کو اپنا داماد بنانے کے بارے میں مشورہ لیا۔ دونوں نے اس رائے سے موافقت کی، بلکہ امیر المومنین کے اشارے پر یہ بات عبداللہ بن سلام تک بھی پہنچا دی۔

''ادھر امیر المومنین نے اپنی دختر سے فرمایا کہ ابو الدرداء اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما تمھارے پاس عبداللہ بن سلام کا پیغام لائیں گے تم کہنا کہ اول اُرینب کو طلاق دیں، اس کے بعد میں نکاح پر تیار ہو سکتی ہوں۔ عبداللہ اس جال میں پھنس گئے اور اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ بنتِ امیر المومنین نے کچھ ٹال مٹول کی اور بالآخر نکاح سے انکار کر دیا۔

''اُرینب کی جب عدت پوری ہوئی تو امیر المومنین نے ان کے پاس اپنے ولی عہد کا پیغام لے کر انھی سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ اتفاق سے اس وقت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی عراق میں موجود تھے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ اول نواسۂ رسول سے ملاقات کریں۔ دورانِ گفتگو میں سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ

آپ جیسے بزرگ کے ذریعے اُرینب کو اپنا پیغام بھیجوں، لہٰذا آپ میرا پیغام بھی پہنچا دیجیے گا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اُرینب نے پوچھا کہ آپ میرے بزرگ ہیں، آپ ہی مشورہ دیجیے کہ میں دونوں میں سے کسے قبول کروں؟ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو قبول کر لو، تا کہ ان ہونٹوں پر ہونٹ رکھ سکو، جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چوما کرتے تھے، چنانچہ یہ نکاح ہو گیا۔

''سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس پر بہت خفا ہوئے کہ کیا کرنے بھیجا تھا اور کیا کر دیا۔ دونوں بزرگوں سے اپنی نگاہیں پھیر لیں اور وظیفہ بھی بند کر دیا۔ تا آنکہ سیدنا ابو الدرداء اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بد دل ہو کر مدینہ چلے آئے اور وہیں مقیم رہے۔ ادھر عبداللہ بن سلام مبہوت تھے کہ بیٹھے بٹھائے کس آفت میں پھنس گئے۔ ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بیوی الگ چھٹی اور امیر المومنین کی دامادی کا خواب جو دیکھا تھا وہ بھی ''غتر بود'' ہوا۔ رنج اور کوفت کا ان پر اتنا غلبہ ہوا کہ بیمار پڑ گئے۔ کچھ عرصے بعد خیال آیا کہ جواہرات کا ایک تھیلا ارینب کے پاس ہے، کم از کم اسے ہی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مال تمھارا ہے اپنے آپ جا کر لو۔ پردہ کرا دیا گیا اور دونوں اس کے پاس ملول و غمزدہ بیٹھ گئے۔ ارینب نے تھیلا نکال کر دے دیا اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ یہی حال عبداللہ کا تھا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے یہ سب کارروائی اس مکر کے جواب میں کی تھی جس کا تم شکار ہو گئے۔ میں ارینب کو طلاق دیتا ہوں۔ میں نے یہ نکاح ہی اس لیے کیا تھا کہ تم دونوں کو پھر یکجا کر دوں۔''

آل انڈیا ریڈیو سے جو جاہل شخص یہ افسانہ نشر کر رہا تھا وہ آل انڈیا ریڈیو ہی کی نگاہ میں نہیں، بلکہ اپنے گروہِ خاص اور اپنی پارٹی میں بڑا معتبر ہو گا جو قوم تک یہ معلومات بہم

پہنچانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ نکاح و طلاق کے مسائل سے یہ شخص اس درجہ بے خبر تھا کہ اپنی دانست میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے کردار کی رفعت اور طینت کی طہارت ثابت کرنے کے لیے اتنا اور اضافہ کر دیا کہ ''اب تک میں نے اریب کو مثل اپنی بہن کے رکھا ہے، تم نکاح سے کچھ اور خیال نہ کرنا۔''

اب ملاحظہ ہوں اس روایت کے ظاہری اور باطنی پہلو:

① امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں عبداللہ بن سلام نام کا کوئی قرشی امیر عراق کا حاکم نہیں رہا۔ محض عراق ہی کا نہیں، بلکہ کسی دوسری جگہ کے امرا میں بھی یہ نام نہیں ملتا۔

② عرب کی جو خواتین حسن و جمال میں مشہور تھیں ان کے احوال محفوظ ہیں، لیکن ان میں اریب بنت اسحاق نام کی کسی خاتون کا تذکرہ کم از کم راقم الحروف کی نگاہ سے نہیں گزرا۔

③ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ عہدِ عثمانی میں دمشق کے قاضی تھے اور ۳۱۔۳۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت نہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ امیر المومنین تھے اور نہ امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کی ولایتِ عہد کا فیصلہ ہوا تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ ان کی عمر اس وقت بمشکل ایک یا دو برس کی تھی، کیوں کہ تحقیق کے مطابق ان کی پیدائش ۳۰ھ کی ہے۔

④ کسی مطلقہ سے کوئی شخص اس لیے نکاح کرے کہ اسے طلاق دے کر زوجِ اول کے لیے حلال کرے، تو یہ شخص اللہ اور رسول اور تمام فقہا و ائمہ کے نزدیک ملعون ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جیسے اعلم و اتقی سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہو۔ اور پھر بہن کی طرح رکھنے کا کیا مطلب؟ اس جاہل شخص کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ نکاح کے لغوی معنی ہی جماع کے ہیں۔ جب تک خلوتِ صحیحہ نہ ہو، نکاح کی غایت پوری نہیں ہوتی۔ اگر یہ ناکح ثانی محض اپنی مرضی سے اور پہلے سے سوچے ہوئے کسی منصوبے کے بغیر طلاق دے دے، تب البتہ زوجِ اول کو اپنا پیغام بھیجنے کا موقع مل سکتا ہے۔

اس کے بغیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صاف حکم ہے:

﴿حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ [البقرة: ٢٣٠]

''یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔''

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے ''إغاثة اللهفان في مكائد الشيطان'' میں اس موضوع پر مبسوط تبصرہ فرمایا ہے اور متعدد ارشاداتِ نبویہ کے علاوہ اکابر صحابہ و تابعین اور جمہور اہلِ علم کا مذہب یہی بتایا ہے۔ من جملہ ازاں یہ حدیث ہے:

"عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه لعن المحلل والمحلل له، رواه أحمد وأهل السنن كلهم غير النسائي"

''سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیا کہ آپ نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو کسی کی مطلقہ بیوی کو اس کے لیے حلال کرے اور اس پر بھی لعنت کی ہے جس کے لیے حلال کی گئی (اسے امام احمد اور تمام اہلِ سنن نے روایت کیا سوائے نسائی کے)۔''

سنن نسائی اور مسند احمد میں یہ حکم ایک دوسرے سلسلے میں مروی ہے:

"لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الواشمة والموتشمة، والواصلة والموصولة والمحلل والمحلل له، وآكل الربا وموكله"

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے: ① جو عورت بدن گودے یا جس عورت کا بدن گودا جائے ② انسانی بال کسی کے بالوں میں گوندھ کر اس کی چوٹی بڑھانے والی عورت اور وہ عورت جس کی اس طرح چوٹی بڑھائی گئی ہو ③ وہ شخص جو دوسرے کی بیوی کو اس کے لیے حلال کرنے کی نیت سے ایک مطلقہ سے نکاح کرے اور وہ شخص جس کی مطلقہ کو اس پر حلال کرنے کے لیے یہ نکاح کیا گیا ④ سود کھانے والا اور سود کھلانے والا۔''

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ”إغاثة اللهفان في مكائد الشيطان“ جس میں امام ابن القیم رحمہ اللہ نے بہت شافی بحث کی ہے۔ اللہ اس شخص کا منہ کالا کرے جس نے سیدنا حسین، ابو الدرداء، ابو ہریرہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم جیسے ائمہ ہدیٰ پر یہ مکروہ جھوٹ بولے ہیں اور اللہ ان لوگوں کو ہدایت دے جو اس قسم کی رکیک اور بے سروپا روایتیں نمک مرچ لگا کر بیان کرتے ہیں اور شیطان کا کھلونا بنے ہوئے ہیں۔

ایک اور حکایت:

عوفی نے منتخب الحکایات میں ایک اور مضحکانہ روایت لکھی ہے، کہتا ہے:

”(سیدنا) معاویہ رضی اللہ عنہ کا جب آخری وقت آیا تو آپ نے اپنے فرزند کو وصیت کی کہ جب میرا جنازہ قبر پر رکھا جائے تو تم (سیدنا) عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے استدعا کرنا کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ ہی نماز پڑھائیں، پھر عرض کرنا کہ برکت کے لیے قبر میں بھی اتاریں۔ جب وہ قبر میں اتر جائیں اور میری نعش رکھ دی جائے تو تم تلوار سونت کر کھڑے ہو جانا کہ اب قبر میں سے اس وقت تک نہیں نکل سکتے جب تک میری خلافت کی بیعت نہ کر لو۔

”چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ امیر یزید نے جب تلوار سونت لی تو (سیدنا) عمرو رضی اللہ عنہ نے (حضرت) معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منہ کر کے کہا: ”کیوں صاحب! مرتے مرتے بھی چالاکی سے باز نہ آئے“ اور پھر بیعت کر لی۔“

لکھنے والے نے یہ مردود روایت نقل تو کر دی اور اپنی دانست میں ایک لطیفہ بھی کہہ دیا، لیکن اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ زندہ بھی تھے یا نہیں؟ آپ کی وفات مصر میں ہوئی تھی۔ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے آپ وہاں کے والی تھے۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت امیر المومنین نے آپ کے فرزندِ گرامی سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو وہاں کا والی

بنا دیا۔ انھوں نے بھی مصر ہی میں وفات پائی۔ ان کا مزار قاہرہ میں موجود ہے اور زیارت گاہِ خلائق چلا آ رہا ہے۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ سیدنا ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی اور امیر المومنین یزید رحمہ اللہ اس وقت دمشق میں نہیں تھے۔ ایک مہم پر گئے ہوئے تھے۔ کئی روز کے بعد اپنے والدِ ماجد۔ صلوات اللہ علیہ۔ کے مزار مبارک پر حاضر ہو سکے۔

غرض یہ ہے کہ افترا و بہتان کی کوئی حد نہیں۔ لطائف و ظرائف و حکایات و روایات اور اشعار کے ذریعے قسم قسم کے خیالات و تصورات کی اشاعت کی گئی ہے، تا کہ قرنِ اول کی صحیح تاریخ امت کے سامنے نہ آ سکے اور عمومیت کے ساتھ لوگوں کے قلوب صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی طرف سے مکدر رہیں اور ان کی عظمت دلوں میں قائم نہ رہے۔

نعوذ باللہ من شر الوسواس الخناس الذي یوسوس في صدور الناس من الجنة و الناس.



موقفِ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بہت پہلے سے امت کی عملی سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔ جنگِ جمل میں آپ نے کافی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کے فرزند تھے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نواسے، ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھانجے اور مثلِ فرزند۔ آپ ہی کے نام پر ان کی کنیت امِ عبداللہ تھی اور یہ کنیت خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ آپ کی نسبی حیثیت اور ذاتی فضائل کے بارے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشادات صحیح بخاری کے حوالے سے اوپر نقل ہو چکے، ان سے تمام صورتِ حال سامنے آجاتی ہے۔ ان احوال نے قدرتی طور پر آپ کے دل میں خلافت کے حصول کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

امیر یزید رحمہ اللہ کی ولایتِ عہد کی بیعت غالباً آپ نے محض رائے عامہ کے دباؤ سے کی تھی۔ اسی لیے امیر المومنین کی خلافت کی بیعت سے آپ نے گریز کیا اور مکہ میں پناہ لے کر بیٹھ گئے۔ بظاہر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے، لیکن در پردہ اپنے لیے راہ ہموار کرنے کی تدبیروں میں مشغول تھے۔ ویسے بالفعل خلیفۂ وقت امیر المومنین ہی کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ طبری نے نقل کیا ہے اور متفق علیہ ہے کہ جب امیرِ مکہ عمرو بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہما نے آپ کی نگرانی شروع کی اور آپ نے دیکھا کہ وہ آپ کے مقاصد میں رکاوٹ بن رہے ہیں تو امیر المومنین کو ایک خط لکھا کہ کسی نرم خو شخص کو مکہ کا والی بنا کر بھیجیں اور حضرت امیر المومنین نے محض رفعِ شر کے لیے ایک ناتجربہ کار نوعمر صاحب کو بھیج دیا۔ اور یوں سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو اپنی خفیہ کارروائیاں جاری رکھنے کا موقع نصیب ہو گیا، لیکن

یہ سب تیاریاں آیندہ کسی وقت کے لیے تھیں۔ بالفعل پوری طرح حکومت کے تابع تھے اور رعایا کی حیثیت سے رہتے تھے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی خلافت کی بیعت سے گریز کر کے مکہ چلے آئے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس مقیم تھے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ خاموش بیٹھے تھے جیسا کہ مذکور ہوا۔ پھر آپ عراقیوں کی غلط بیانیوں سے متاثر ہو کر کوفہ چلے گئے، مورخوں کا بیان ہے کہ جب تک سیدنا حسین رضی اللہ عنہ چلے نہ گئے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو چین نہ آیا۔ ممکن ہے ان لوگوں کا یہ خیال درست ہو کہ دونوں اس طرح اپنی اپنی خلافت کے لیے کوشاں تھے، اس لیے یک گونہ ایک دوسرے کو حریفانہ دیکھتے تھے۔

ہمیں یہاں یہ سوچنا چاہیے کہ اگر واقعی ان دونوں صاحبوں کے نزدیک نظامِ خلافت میں تبدیلی کی ضرورت تھی اور یہ دونوں اس کے لیے باقاعدہ تحریک چلانا چاہتے تھے تو انھیں چاہیے تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں۔ اگر حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی عراقیوں کے بیانات پر اطمینان ہو گیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اہلِ عراق واقعی حکومتِ وقت کے خلاف منظّم ہو چکے ہیں، تب بھی مفاد اسی میں تھا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ مکہ ہی میں رہیں، اور آپ کے نمایندے عراق کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس سے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما اپنی کارروائیاں تیز کر سکتے تھے اور کم مدت میں فضا ہموار ہونے کا امکان تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں نے اپنی جدوجہد جداگانہ رکھنی پسند کی۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کوفیوں کی غداری سے ناکام رہے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو فضا اپنے حق میں بنانے کا موقع مل گیا۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لوگوں کے بیان کے بالکل خلاف سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی دعوت میں حادثۂ کربلا کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف امیر المومنین کی ذات کے خلاف پراپیگنڈہ ہے اور اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا محض حادثہ ہونا امت کے نزدیک اتنا مسلّم تھا کہ ہم عصر لوگوں کو اس کی ذمے داری حکومت پر ڈالنے کی ہمت نہیں

ہوئی اور اگر سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے داعی یہ ذکر چھیڑتے تو اپنا موقف کمزور کر لیتے۔ اس لیے ان کے لیے چارہ کار نہ تھا سوائے اس کے کہ امیر المومنین کے ذاتی معائب بیان کریں اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے ذاتی فضائل۔

لیکن پھر بھی تین برس تک انھیں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا نام علانیہ لینے کی جرأت نہیں ہوئی۔ صرف امیر المومنین کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے پر اکتفا کیا گیا۔ چنانچہ البدایہ والنہایہ کی جو روایت ہم اوپر بیان کر چکے جس میں حضرت ابن المطیع رحمہ اللہ اور سیدنا محمد بن علی رحمہ اللہ بن ابی طالب کے مابین اس موضوع پر گفتگو مذکور ہے۔ اس میں حضرت ابن المطیع رحمہ اللہ کا یہ بیان موجود ہے: ''شاید آپ دوسرے کا امیر بننا پسند نہیں کرتے تو آیئے ہم آپ کے ہاتھ میں بیعت کرتے ہیں۔'' اور یہ اس کی دلیل ہے کہ کھل کر حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی دعوت نہیں دی جارہی تھی، بلکہ صرف امیر المومنین کے خلاف مدینہ میں محاذ قائم کیا جا رہا تھا۔

واقعہ حرہ:

افسوس کہ اس بارے میں بھی نہایت درجہ ناتجربہ کاری کا ثبوت دیا گیا اور شہر کی اکثریت کو ہموار کیے بغیر بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا گیا۔ امیر مدینہ عباس بن محمد رحمہ اللہ کو نکال دیا گیا اور بنو امیہ کو گرفتار کر کے بعد میں اس شرط پر چھوڑ دیا گیا کہ شہر کے حالات سے باہر کے لوگوں کو مطلع نہ کریں۔ کیا اسے سیاست یا دور اندیشی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا ایک شہر تین چوتھائی دنیا کے حکمران کا مقابلہ کر سکتا تھا؟ اس بغاوت میں مہاجرین اور ان کی اولاد میں آلِ ابی بکر، آلِ عمر، آلِ علی، آلِ عباس اور آلِ جعفر رضی اللہ عنہم قطعاً شریک نہ تھے۔ انصار میں بنو عبدالاشہل بھی شریک نہ تھے جو انصار کا سب سے بڑا قبیلہ تھا۔[1]

[1] علامہ ابن کثیر دمشقی نے اپنی کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں واقعہ حرہ کی بابت تفاصیل دیتے ہوئے کئی جگہ صراحت کی ہے کہ اس بغاوت میں اشرافِ مہاجرین وانصار شامل نہ تھے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:
''علی بن حسین رحمہ اللہ (زین العابدین) باغیوں سے کنارہ کش رہے۔ اسی طرح عبداللہ ←

مدینہ کے تین طرف خندق کھودی گئی اور چوتھی طرف انصار کے اسی محلے کو حصار سمجھ لیا گیا جو ان کے ساتھ شامل نہ تھا۔ ادھر امیر المومنین کو جب اس حرکت کی اطلاع ہوئی تو آپ نے امیر مسلم بن عقبہ کی کمان میں ایک فوج بھیجی کہ اول ان لوگوں پر امان پیش کریں اور نہ مانیں تو جنگ کی جائے۔ مورخوں نے اس فرمان میں یہ حکم بھی نقل کیا ہے کہ اگر جنگ ہو تو پھر تین دن تک شہر کو لوٹا جائے اور وہ سب مال فوج کا ہو، لیکن فرمان کا یہ فقرہ ناقابلِ قبول ہے، کیوں کہ نہ اس سے پہلے مسلمانوں نے کبھی یہ حرکت کی اور نہ اس کے بعد۔ جب مدینہ کے بڑے بڑے اور ذی اثر گھرانے اس بغاوت سے بیزار تھے اور جو خود شہر والوں کی مدد سے شہر پر قبضہ ہوا تھا تو ان مجرمانہ حرکتوں کی گنجایش اور ضرورت ہی کہاں تھی جو بیان کی گئی ہیں۔ چوتھی طرف جو انصار کے سب سے بڑے گھرانے بنو عبدالاشہل کا محلّہ تھا۔ انھوں ہی نے امیر مسلم بن عقبہ کی فوج کو شہر میں داخل کیا اور یوں گنتی کے چند گھنٹوں میں شہر پر قبضہ ہو گیا۔

لوگوں نے محض فتنہ انگیزی کے لیے حادثہ حرہ کی یہ تفصیلات مرتب کی ہیں اور مسعودی و سیوطی جیسے لوگ اس کے ذمے دار ہیں کہ انھوں نے قرونِ اولیٰ کے مجاہد مسلمانوں کے کردار کا ایسا بھیانک نقشہ پیش کر کے بعد کے مسلمانوں کو اپنے اسلاف سے بیزار کرنے کا سامان پیدا کر دیا۔ سیوطی صاحب فرماتے ہیں:

”قتل فیها خلق من الصحابة رضی اللہ عنہم ومن غیرهم، ونهبت

← بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے بھی خلیفہ یزید کی بیعت نہیں توڑی اور نہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں سے کسی ایک شخص نے۔ اور اسی طرح نہ بنی عبدالمطلب یعنی ہاشمی گھرانے کے کسی ایک فرد نے بھی یزید کی بیعت سے انحراف کیا۔“ (البدایة و النهایة: ۸/۲۱۸)

اسی طرح سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے اور علی بن حسین زین العابدین کے بیٹے محمد باقر کا قول امام ابن کثیر صحیح سند سے اپنی کتاب ”البدایہ والنہایہ“ میں لائے ہیں کہ جنگ حرہ کے موقع پر نہ تو ابو طالب کے خاندان کا کوئی فرد یزید کے خلاف نکلا اور نہ ہی بنی عبدالمطلب کا کوئی شخص اس بغاوت میں شامل تھا۔ (۸/۲۳۳)

المدينة، وافتض بها ألف عذراء، فإنا لله وإنا إليه راجعون“ [1]

”اس میں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ مدینہ کو لوٹ لیا گیا اور ایک ہزار کنواریوں کی عصمت دری کی گئی۔ إنا للہ وإنا إليه راجعون“ [2]

ہم یہ ”إنا للہ وإنا إليه راجعون“ سیوطی کے اس بیان پر پڑھتے ہیں کہ عقل وخرد اور غیرت وحمیت سب کو خیر باد کہہ کر انھوں نے یہ ناشائستہ اور مردود کلمات لکھے۔ اگر امیر مسلم کی فوجوں سے حرم شریف میں ان حرکتوں کا ہزارواں حصہ بھی صادر ہوتا تو تمام عالمِ اسلام میں آگ لگ جاتی۔ امویوں کے خلاف عام نفرت پھیل جاتی اور تمام امت سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتی اور ناممکن ہو جاتا کہ اموی خلفا ایسے کامیاب ہوں کہ سو برس تک انہی کا پھریرا عالمِ اسلام پر لہرائے۔ معلوم نہیں اس وقت کے مسلمانوں کو ان ”مورخوں“ نے کیا سمجھ رکھا ہے۔

امویوں کی مقبولیت کا روز بروز بڑھنا اس کی دلیل ہے کہ ان سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہوئی جسے دین کی بنیاد پر ہم عصر امت نے نفرت سے دیکھا ہو، کیوں کہ یہی وہ امت تھی جس نے اموی خلفا کی قیادت میں مشرق ومغرب کو اسلام کے لیے فتح کیا۔ مدینہ طیبہ کوئی پہلا شہر نہیں تھا جسے شامی فوج نے فتح کیا ہو۔ سیکڑوں شہر اس سے پہلے اور ہزاروں اس کے بعد اس فوج نے فتح کیے تھے تو کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ جو فوجیں کفار کے شہروں کے لیے ہر جگہ رحمت ثابت ہوئی ہوں وہ خاص حرمِ نبوی میں بربریت کے اعتبار سے چنگیز و ہلاکو

---

[1] تاریخ الخلفاء (ص: ۸۱) طبع مصر

[2] اس بابت کتبِ تاریخ سے جتنی بھی روایتیں نقل کی جاتی ہیں وہ سب حد درجہ ضعیف ومردود ہیں۔ ایسی روایات کی استنادی حیثیت پر مفصل کلام کے لیے فضیلۃ الشیخ کفایت اللہ سنابلی حفظہ اللہ کی کتاب ”یزید بن معاویہ رحمہ اللہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ“ کے (صفحہ: ۴۶۱، ۴۶۵) کی طرف مراجعت کی جائے جہاں مولانا کفایت اللہ سنابلی حفظہ اللہ نے علم الروایہ کی روشنی میں ان تمام روایات کا ضعیف وغیر صحیح ہونا ثابت کیا ہے۔

کو بھی مات کر دیں۔ خصوصاً جب شہر کی بڑی آبادی اس فتنے سے الگ ہو اور ذی اثر حضرات اس ہنگامے کو اللہ و رسول کے کھلے احکام کے خلاف ہونے کا حکم صادر کر چکے ہوں۔

اگر اموی سادات اور اموی خلفائے کرام، اسلام کے ضائع کرنے والے ہوتے تو کیا ان کے ساتھ امت کی شیفتگی کا یہی عالم ہوتا جو ہم قرونِ اولیٰ میں دیکھتے ہیں کہ امت اگر حمایت کرتی تھی تو ان کی اور مخالف رہتی تھی تو ان کے مخالفوں کی۔ ان کی تاریخ مدون ہوئی ہے ان کے دشمنوں کے زمانے میں اور مخالفینِ دعوتِ محمدیہ کے ہاتھوں سے۔ آلِ بویہ کا عالمِ اسلام پر تسلط اور مسعودی جیسے مورخوں کا یوں اوراق سیاہ کرنا، اس کا سبب ہے کہ تاریخِ اسلام کا جو سب سے سنہری دور تھا وہ ہمیں ایسا خسیس اور مایوس کن اور اندوہناک نظر آتا ہے۔

اگر یہ تاریخ اب بھی قرآن حکیم اور صحاح کی روشنی میں سمجھ کے ساتھ مدون ہو تو پھر اس دور کی حقیقی صورتِ حال معلوم ہو سکتی ہے اور یہ بھی پتا چل سکتا ہے کہ عالمِ اسلام پر جو مصائب نازل ہوئے اور دین کے مسخ ہونے کی جو صورتیں پیدا ہوئیں اس کا سبب مسلمانوں کا ذہنی اور روحانی انحطاط نہیں تھا، جیسا کہ احمق اور متعصب لوگ ثابت کرنے کے درپے ہیں، بلکہ تخریبی عناصر کام کر رہے تھے اور یہ عناصر جماعت اور اس کے ائمہ سے وابستہ نہیں تھے، بلکہ اس کے باہر تھے اور اس کے دشمن۔ اگر مسلمان سمجھ لیں کہ یہ تخریبی عناصر کیا ہیں تو پھر وہ اس بحرِ ظلمات سے نکل کر آفتابِ ہدایت کے نور سے منور ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے انھیں اپنے خود ساختہ تصورات چھوڑنے پڑیں گے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زاویۂ نگاہ سے تمام امور کو دیکھنا ہوگا۔

حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما نے جو تحریک شروع کی تھی اس کا مقصد سوائے اپنی خلافت قائم کرنے کے اور کچھ نہیں تھا۔ لوگوں نے یہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حادثۂ کربلا سے برافروختہ ہو کر آپ نے اپنے خروج کا اعلان کیا تھا، لیکن یہ محض خیالی بات ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو بنو ہاشم آپ کا ساتھ دیتے اور اکابر اصحاب ہمنوائی کرتے، لیکن بنو ہاشم

سے تو آپ کی چلی ہوئی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک بیان ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ وہی مضمون ایک دوسری طرح ملاحظہ ہو:

"عَنْ عُمَرَ بْنِ سَعِيدٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ دَخَلْنَا عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ فَقَالَ: أَلَا تَعْجَبُونَ لِابْنِ الزُّبَيْرِ قَامَ فِي أَمْرِهِ هَذَا؟ فَقُلْتُ: لَأُحَاسِبَنَّ نَفْسِي لَهُ مَا حَاسَبْتُهَا لِأَبِي بَكْرٍ وَلَا لِعُمَرَ وَلَهُمَا كَانَا أَوْلَى بِكُلِّ خَيْرٍ مِنْهُ وَقُلْتُ: ابْنُ عَمَّةِ النَّبِيِّ ﷺ وَابْنُ الزُّبَيْرِ وَابْنُ أَبِي بَكْرٍ وَابْنُ أَخِي خَدِيجَةَ وَابْنُ أُخْتِ عَائِشَةَ فَإِذَا هُوَ يَتَعَلَّى عَنِّي وَلَا يُرِيدُ ذَلِكَ فَقُلْتُ: مَا كُنْتُ أَظُنُّ أَنِّي أَعْرِضُ هَذَا مِنْ نَفْسِي فَيَدَعُهُ وَمَا أُرَاهُ يُرِيدُ خَيْرًا وَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ لَأَنْ يَرُبَّنِي بَنُو عَمِّي أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ يَرُبَّنِي غَيْرُهُمْ" [1]

"عمر بن سعید سے مروی ہے وہ کہتے ہیں مجھے ابن ابی ملیکہ نے اطلاع دی اور کہا کہ ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا: تمھیں ابن الزبیر کی اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ وہ (اپنی خلافت کی) یہ تحریک لے کر اٹھے تو میں نے کہا کہ میں آپ کو ان کا ایسا پابند بنا لوں گا کہ نہ ایسی پابندی میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کی اور نہ عمر رضی اللہ عنہ کی۔ حالانکہ وہ ہر طرح اور ہر بھلائی کے ان سے زیادہ مستحق تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے فرزند ہیں، زبیر رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں، خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے ہیں اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں، لیکن وہ تو میرے مقابلے میں اکڑے ہی چلے گئے اور وہ نہیں چاہتے کہ میرا ان سے تعلق ہو۔ میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اپنے آپ کو ان کے سامنے اس طرح پیش کروں گا

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير

اور وہ ٹھکرا دیں گے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کے پیشِ نظر بھلائی نہیں اور اگر یونہی ہونا ہے تو پھر بہتر ہے کہ میرے چچا کی اولاد میری پرورش کرے۔ یہ چیز مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے کہ میری پرورش دوسرے کریں۔''

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بنو ہاشم کے ساتھ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کا رویہ حریفانہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے چلے جانے سے انھیں اطمینان ہوا اور ان کی تحریک میں ہم حادثۂ کربلا کا ذکر نہیں پاتے۔ پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مقصد واقعی امت کی خیر خواہی کے لیے نظامتِ خلافت میں کوئی تبدیلی کرنا تھا۔ پھر یہ کہ انھوں نے جس طرح حکومت کی اس میں بھی تاریخ کے کسی طالب علم کو اموی خلافت سے کچھ تغایر نظر نہیں آتا۔ مسلم حکومت کا جو طریقہ صدیوں بعد تک رہا وہی ان کا بھی تھا۔ اس لیے باوجود ان کے زور پکڑ جانے کے حتی کہ خود دمشق میں بھی ان کی بیعت ہوگئی اور عالمِ اسلام کا بہت بڑا علاقہ، بلکہ تقریباً سب عالمِ اسلام ان کے قبضے میں آ گیا تھا، ان کی تحریک کو ہم عصر اکابر صحابہ اور بنو ہاشم نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا اور ان سے خلافت کی بیعت نہیں کی۔ محدثین کرام کے ہاں بھی ان کے زمانے کا ذکر ''فتنۃ ابن الزبیر'' کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی پچھلی حدیث میں مذکور ہے، لیکن سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما اور بنو ہاشم میں حریفانہ چشمک مختار ثقفی کی تحریک کی بنا پر نہیں تھی، بلکہ اس لیے تھی کہ بنو ہاشم ہی کی وجہ سے دوسرے حضرات بھی ان کی بیعت سے گریزاں تھے اور ان سب کی ہمدردیاں امویوں کے ساتھ تھیں۔

اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے دعوائے خلافت اور سیاسی حرکت کو جس نگاہ سے دیکھا وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس واقعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے جو امام مسلم نے نقل کیا ہے:

''عَنْ أَبِي نَوْفَلٍ رَأَيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ عَلَى عَقَبَةِ الْمَدِيْنَةِ قَالَ: فَجَعَلَتْ قُرَيْشٌ تَمُرُّ عَلَيْهِ وَالنَّاسُ حَتَّى مَرَّ عَلَيْهِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَوَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكَ أَبَا خُبَيْبٍ السَّلَامُ عَلَيْكَ

أَبَا خُبَيْبٍ السَّلَامُ عَلَيْكَ أَبَا خُبَيْبٍ، أَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ كُنْتُ أَنْهَاكَ عَنْ هٰذَا، أَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ كُنْتُ أَنْهَاكَ عَنْ هٰذَا، أَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ كُنْتُ أَنْهَاكَ عَنْ هٰذَا، أَمَا وَاللّٰهِ إِنْ كُنْتَ مَا عَلِمْتُ صَوَّامًا قَوَّامًا وَصُولًا لِلرَّحِمِ، أَمَا وَاللّٰهِ لَأُمَّةٌ أَنْتَ أَشَرُّهَا لَأُمَّةٌ خَيْرٌ، ثُمَّ نَفَذَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ" [1]

"ابونوفل سے روایت ہے کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو شہر کی گھاٹی میں سولی پر لٹکا ہوا دیکھا۔ قریش ان کے پاس سے گزرتے جاتے تھے اور دوسرے لوگ بھی تاآنکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ادھر سے گزرے تو آپ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: "ابوخبیب تم پر سلام ہو، ابوخبیب تم پر سلام ہو، ابوخبیب تم پر سلام ہو، خدارا دیکھو میں نے تمھیں اس کام سے روکا تھا، خدارا دیکھو میں نے تمھیں اس کام سے روکا تھا، خدارا دیکھو میں نے تمھیں اس کام سے روکا تھا۔ بخدا میں جانتا ہوں کہ تم بہت روزے رکھنے والے، راتوں کو نماز پڑھنے والے اور رشتہ داری کا حق ادا کرنے والے تھے۔ بخدا اگر تم اس قوم میں سب سے برے ہوتو پھر تو یہ قوم بہت ہی اچھی ہے۔ یہ کہہ کر آپ چلے گئے۔"

آگے قصہ ہے کہ کس طرح امیر حجاج بن یوسف کو خبر ہوئی تو وہ آئے اور انھیں یہود کے قبرستان میں دفن کرا دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی ذکر ہے کہ انھوں نے حضرت سیدہ اسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ عنہما کو طلب کیا، لیکن وہ نہ آئیں تو انھوں نے گستاخانہ یہ بات کہی کہ اگر نہ آئیں تو انھیں گھسیٹ کر بلائیں گے اور جب انھوں نے کہا کہ اگر اس طرح بلانے کی ہمت ہوتو اسے بھی کر ڈالو، اس پر وہ خود جوتیاں گھسیٹتے ہوئے پہنچے اور سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ثقیف میں ایک کذاب ہوگا اور ایک مبیر، یعنی بے محابا

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤١٦) طبع مصر.

خون بہانے والا۔ کذاب کو ہم نے دیکھ لیا (یعنی مختار ثقفی کو) اور مبیر تم ہو۔''

اس حدیث کی تفصیلات میں کئی باتیں آ گئی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض راویوں نے مضمون میں تصرف کیا ہے، مثلاً اس میں ''عقبة المدينة'' ہے، جس کے معنی ہم نے شہر کی گھاٹی کیے ہیں، لیکن ''المدینۃ'' عموماً مدینہ طیبہ کو کہا جاتا ہے اور شاید راوی کا مطلب بھی وہی ہو۔ پھر اس میں یہود کے قبرستان کا ذکر ہے جو یقیناً مکہ میں نہیں تھا اور سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت مکہ معظّمہ میں ہوئی تھی۔ ان دو غلطیوں کی موجودگی میں یہ روایت قابلِ استناد نہیں رہی، اور نہیں کہا جا سکتا کہ باقی تفصیلات کس حد تک درست ہیں اور تعصب کو اس میں کتنا دخل ہے۔

بہرحال یہ اندازہ ضرور لگتا ہے کہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی تحریک بالکل شخصی تھی۔ مفادِ امت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ جہاں تک ذاتی دشمنیوں اور علمی و عملی مکارم و فضائل کا تعلق ہے تو یقیناً سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا اونچا معیار ہے اور آپ بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور قابلِ ہستی ہیں اور ان کی کافی اہم خدمات ہیں، لیکن امور جہانبانی میں محض ذاتی فضائل کام نہیں آتے اور نہ محض شخصیت کی بنا پر آدمی مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت کی بھی یہی کیفیت تھی کہ ہزارہا لوگ عملاً آپ کی رعایا تھے، لیکن آئینی حیثیت سے انھوں نے آپ سے بیعت نہیں کی تھی اور نہ یہ جانتے تھے کہ ان کی تحریک امت کے لیے سود مند ہوسکتی ہے۔ امامِ جماعت سے روگردانی کر کے امتِ مسلمہ میں آدمی کو پائیدار مقبولیت کبھی حاصل نہیں ہوسکتی، اگرچہ شخصی حیثیت سے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ تمام وہ تحریکیں ظاہراً و باطناً قطعاً ناکام رہیں جو اموی خلافت کو مٹانے کے لیے جاری کی گئیں اور ان سے سوائے داخلی انتشار اور فتنہ و فساد کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ عباسیوں کو کامیابی اس وقت ہوئی جب خود امویوں میں باہمی نزاع کھڑا ہو گیا اور امت کا کوئی متفق علیہ امام نہ رہا۔ لیکن دعوتِ عباسیہ کے متعلق بھی یہ امر قطعی اور حتمی ہے کہ

امت میں جو اختلال رونما ہوا اس میں عباسیوں کے داعیوں کا کوئی ہاتھ نہ تھا اور نہ انھوں نے کسی متفق علیہ امام کے خلاف خروج کیا تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ جو اختلال رونما ہو چکا تھا اور جا بجا اموی حکومتِ عملی کو بخوبی نہ چلانے سے ہنگامے بپا ہو رہے تھے جنھیں فرو کرنے میں آخری اموی خلفا ناکام رہے تو اس وقت آل البیت نے امت کی خیر خواہی میں یہ تحریک چلائی اور سب نے متفق ہو کر زمامِ کار بنو عباس کے ہاتھ میں دے دی اور انھوں نے کامیابی حاصل کر کے دکھا بھی دی۔

بہر حال ایک بات قطعی اور حتمی ہے کہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی طرف دعوت نہیں دی، اگرچہ جمعیت بنا لی تھی اور امیر یزید رحمہ اللہ کی بیعت سے گریز کیا تھا۔ اسی لیے مدینہ کی بغاوت فرو کرنے کے بعد امیر مسلم نے مکہ کا رخ کیا۔ راہ میں وفات پائی اور حصین بن نمیر نے مکہ کا محاصرہ کر لیا۔ خضری نے (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ۱۳۲/۲) میں لکھا ہے کہ اہلِ حجاز نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے خلافت کی بیعت کر لی تھی، لیکن یہ بات غلط ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ آپ کے ساتھ ہو گئے تھے انھوں نے آپ کو اپنا امیر بنایا تھا نہ کہ امیر المومنین۔ آپ نے خلافت کی بیعت لی تو امیر المومنین یزید کی وفات کے بعد لی تھی۔

ان دونوں بغاوتوں کے سلسلے میں عجیب و غریب قسم کی باتیں وضع کی ہیں کہ کسی طرح اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ کے خروج کو باقاعدہ صلحائے امت کی کوئی تحریک ثابت کریں اور امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کو جاہلیت کا امام بتائیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے تفصیلات بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ جتنا ہم پیچھے ہٹتے ہیں تو مآخذ سے یہ سادہ بغاوت معلوم ہوتی ہے، لیکن جتنا آگے آتے ہیں اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے علم برداروں نے کفر کے خلاف جہاد کیا تھا، یہ اور بات ہے کہ ناکام رہے اور امت کی قیادت بالکلیہ ''جہالت کے ہاتھ میں چلی گئی۔''

واقعۂ حرہ کے بارے میں ایک بیان تو صحیح بخاری کا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت محمد رحمہ اللہ بن علی بن ابی طالب نے اس بغاوت کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غدر سے

تعبیر کیا تھا، اور ایک بیان ہے چھٹی صدی ہجری میں روض الانف کا، جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک شامی ایک انصاری کے گھر میں گیا اور روپیہ کا مطالبہ کیا۔ اس وقت ایک خاتون اپنے بچے کو (چھاتی سے) دودھ پلا رہی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ تم سے پہلے جو لوگ آئے تھے وہ سب مال و متاع لے گئے۔ شامی نے ان کا بچہ گود سے چھین لیا اور روپے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا: اس بچے کے باپ صحابیِ رسول ابوکبش رضی اللہ عنہ ہیں اور میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی۔ شامی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور روپیہ نہ ملنے پر بچے کو دیوار سے دے مارا جس سے اس کا دماغ پھٹ گیا۔ اس خاتون نے بچے کا نام لے کر کہا: ''افسوس ہمارے پاس روپیہ ہوتا تو ہم تمھیں بچا لیتے'' مصنف نے یہ روایت تو لکھ دی۔ لیکن خود ہی خیال آیا کہ ۶۳ھ کے آخر میں ایسی خاتون کون سی ہو سکتی تھیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہو اور پھر ان کا اتنا چھوٹا بچہ ہو کہ اسے دودھ پلائیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''غالباً وہ بچے کی نانی یا دادی ہوں گی۔'' لیکن اتنی سمجھ سے پھر بھی کام نہ لیا کہ دادی یا نانی چھاتی سے دودھ پلاتی ہے؟ چونکہ جذبات سے مغلوب تھے، اس لیے اس روایت کو دیوار پر مارنے کے بجائے اس خیالی انصاری کے خیالی بچے کو دیوار سے مار دیا۔ گویا یہ شامی مجاہد بھی ۱۹۴۷ء کا کوئی سکھ تھا جو دودھ پیتے بچے کو دیوار سے مار دے۔ اسی صفحے پر یہ روایت ہے کہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے جب بتایا کہ وہ اس ہنگامے سے الگ رہے ہیں تو ان کے گھر پر چڑھ آنے والے شامیوں نے کہا کہ یہ تو آپ نے اچھا کیا، مگر روپیہ دلوایئے۔ آپ نے عذر کیا تو آپ کی ڈاڑھی نوچ ڈالی۔[1]

پھر شہدائے حرہ کے فضائل میں ایک حدیث بھی لکھی ہے کہ ''وہ حضرات روئے زمین کے بہترین لوگ ہیں جو اس معرکے میں کام آئے۔'' کوئی شک نہیں کہ ان میں جو صحابہ

---

[1] سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی نوچنے والی روایت امام سہیلی نے طبقات ابن سعد رحمہ اللہ سے نقل کی ہے جہاں اس روایت کے راوی جناب محمد بن عمر الواقدی ہیں جو کہ مشہورِ زمانہ کذاب اور ←

تھے اور غلط اندیشی کے سبب اس بغاوت میں شریک ہو گئے تھے وہ بہترین حضرات تھے، مگر اس بغاوت کے سبب نہیں، بلکہ اپنی شخصیتوں کے اعتبار سے اور اپنے پہلے اعمالِ صالحہ اور کفار سے جہاد کے سبب۔ یہ ان حضرات کی اجتہادی غلطی تھی کہ دوسروں کے بہکاوے میں آ گئے۔ نہ ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی تھی، جیسا کہ سیوطی نے لکھا ہے اور نہ یہ ان کا جہاد تھا۔ اسے جہاد اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب تمام نصوص کو پسِ پشت ڈال دیا جائے۔

اب صحیح مسلم کی ایک اور روایت ہے:

''عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: لِبِلَالٍ أَعْطِهِ أُوْقِيَّةً مِنْ ذَهَبٍ وَزِدْهُ، قَالَ: فَأَعْطَانِي أُوْقِيَّةً مِنْ ذَهَبٍ

← بقول امام ذہبی رحمہ اللہ ان کے کذب پر محدثین کا اجماع موجود ہے۔ سو یہ روایت واقدی کی وجہ سے نا قابلِ قبول ہے۔ ساتھ ہی یہ اس صحیح روایت کے بھی مخالف ہے جو کہ امام خلیفہ بن خیاط صحیح سند سے اپنی تاریخ میں لائے ہیں جس میں صراحت سے مذکور ہے کہ حرہ کے دن ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں نہیں بیٹھے تھے کہ کوئی گھر آ کر ان کی ڈاڑھی نوچ جاتا، بلکہ وہ گھر سے نکل کر غار میں پناہ لینے گئے تھے۔ امام خلیفہ لکھتے ہیں:

''سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کے مصاحب منذر بن مالک ابونضرہ کہتے ہیں کہ حرہ کے دن ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔ ایک شخص غار میں ان کے پاس آیا، پھر باہر نکل گیا اور باہر نکل کر ایک شامی فوجی سے کہا: میں تمھیں ایک شخص کے بارے میں بتاتا ہوں، تم اسے قتل کر دو! پھر جب شامی فوجی غار کے دروازے پر پہنچا تو ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے جن کے پاس تلوار تھی، کہا کہ باہر نکلو! ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں! اگر تم میرے پاس آ ؤ گے تو میں تمھیں قتل کر دوں گا۔ پھر شامی فوجی غار کے اندر داخل ہوا تو ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نے تلوار رکھ دی اور کہا: میرے اور اپنے گناہ اپنے سر لا دلو اور دوزخیوں میں سے بن جاؤ۔ ظالموں کا یہی انجام ہے (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۲۹ کا مفہوم ہے)۔ یہ سن کر شامی فوجی بول پڑا: ابوسعید الخدری! یہ آپ ہیں؟ ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں! اس پر شامی فوج نے گزارش کی کہ آپ میرے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ چنانچہ ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نے دعا کی کہ اللہ تمھاری مغفرت کرے۔ (تاریخ خلیفہ بن خیاط، صفحہ: ۲۳۹، واسنادہ صحیح)

وَزَادَنِي قِيرَاطًا، قَالَ: فَقُلْتُ لَا تُفَارِقُنِي زِيَادَةُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، قَالَ: فَكَانَ فِي كِيسٍ لِي فَأَخَذَهُ أَهْلُ الشَّامِ يَوْمَ الْحَرَّةِ"[1]

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ خریدا تھا اور اس کی قیمت ایک اوقیہ سونا طے کی تھی تو) آپ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو اور کچھ زیادہ بھی دو۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے مجھے ایک اوقیہ سونا دیا اور ایک قیراط کا اضافہ کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں: میں نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو زیادہ سونا دیا ہے اسے میں کبھی اپنے سے جدا نہ کروں گا وہ میری ایک تھیلی میں تھا اسے حرہ کے دن اہلِ شام نے لے لیا۔''

اہلِ شام کا اس طرح مال لے لینے کا ذکر صرف سالم بن ابی الجعد کی روایت میں ہے۔ باقی حضرات جو اس واقعے کے راوی ہیں ان میں سے کسی نے یہ اضافہ نہیں کیا۔ یعنی عامر، ابونضرہ، ابوالزبیر، ابوالمتوکل الناجی، محارب اور عطا سب نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اس واقعے کی روایت کی ہے مگر کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ ایک قیراط سونا سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے محفوظ کر رکھا تھا اور اسے اہلِ شام نے ان سے چھین لیا۔ وقائع سیاسی ہیں اس قسم کے اضافات لوگوں نے اپنے مطلب کے لیے کر دیے ہیں۔

آخر وہ بھی تو حدیث ہے کہ مکہ میں ایک آدمی بغاوت کرے گا اور مقتول و مصلوب ہو گا اسے نصف امت کا عذاب دیا جائے گا۔ اسے بھی لوگ احادیث کی کتابوں میں پڑھتے ہی ہیں، صراحتاً یہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما پر طعن ہے اور ان کے کسی مخالف نے وضع کی ہو گی۔



[1] صحيح مسلم (١/٦٩٩) طبع مصر.

ایک لغو روایت

علامہ خضری نے تاریخ محاضرات الامم الاسلامیہ (۱۶۴/۱، طبع مصر) میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے جس کی غرابت کا انھیں خود اعتراف ہے۔ محمد بن جبیر فرماتے ہیں:

''۶۸ھ میں حج کے موقع پر چار پرچم بلند تھے۔ ایک حضرت محمد رحمہ اللہ بن حنفیہ کا، ایک نجدہ حروری (خارجی) کا، ایک حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کا اور ایک بنو امیہ کا۔ مجھے فتنے کا خوف ہوا تو میں پہلے حضرت محمد رحمہ اللہ بن حنفیہ کے پاس گیا اور انھیں حرم میں فساد انگیزی سے ڈرایا۔ انھوں نے کہا میں لڑنے نہیں آیا ہوں، البتہ جو لڑے گا اس سے لڑوں گا، تم اس بارے میں ابن الزبیر رضی اللہ عنہما اور نجدہ سے بات کر لو۔ پھر میں ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے پاس گیا۔ انھوں نے فرمایا: میرے ہاتھ پر بیعت ہو چکی ہے اور یہ لوگ سب کے سب باغی ہیں۔ میں نے کہا: بہر حال ہاتھ روکے رکھنے ہی میں بہتری ہے۔ پھر میں نجدہ کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنی طرف سے تو قتال نہیں کروں گا، لیکن اگر کوئی لڑا تو اس سے لڑوں گا۔ میں نے کہا کہ وہ دونوں تو تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ پھر میں بنو امیہ کے ہوا خواہوں کے پاس گیا، انھوں نے کہا ہم لڑنے نہیں آئے، مگر جو لڑے گا اس سے لڑیں گے۔ بہر حال سب سے پہلے ابن الحنفیہ رحمہ اللہ کا جھنڈا لپیٹا گیا، پھر نجدہ کا، پھر بنو امیہ کا اور پھر حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کا۔ لوگوں نے (مناسکِ حج) سب ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کی اقتدا میں ادا کیے۔''

یہ روایت وضع کرنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ ۶۸ھ کے حج میں اختلافِ امت کے باوجود کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور امت کے سب گروہوں نے بخیر وخوبی اپنا فرضِ عبدیت ادا کیا۔ اس روایت کے بے اصل ہونے کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ سیدنا محمد بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے نہ کوئی شیعہ تھے اور نہ آپ کا کوئی سیاسی موقف تھا۔ سوائے اس کے کہ باقی بنو ہاشم کی طرح آپ کی ہمدردیاں اموی خلافت کے ساتھ تھیں اور آپ نے بھی حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت نہیں کی تھی، بلکہ ان کے برافروختہ ہونے کے بعد آپ چاہتے تھے کہ شام چلے جائیں۔ رہا مختار ثقفی تو وہ دور دور ہی سے اپنے آپ کو آپ کا فرستادہ کہتا تھا۔ دو بدو سامنے آنے کی اس نے کبھی ہمت نہیں کی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کے ادعاء کے بطلان کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کی تخریبی کارروائیوں کی ذمے داری نہ سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما نے بنو ہاشم پر رکھی اور نہ امیر المومنین حضرت عبدالملک رحمہ اللہ نے۔ لہٰذا آپ کا کوئی جھنڈا ہونا یا اس جھنڈے کے نیچے کسی گروہ کا اجتماع محض خیالی اور فرضی بات ہے، ہم اس کا ثبوت دے چکے ہیں کہ قاطبتاً تمام بنو ہاشم کی ہمدردیاں بنو امیہ کے ساتھ تھیں تو پھر وہ مجتمع ہوتے تو اموی جھنڈے کے نیچے ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سبائی گروہ کی مختلف ٹولیوں نے اپنے گھروں میں بیٹھ کر آل البیت کو باہمی تقسیم کر رکھا تھا۔ کوئی کسی کی امامت کا مدعی تھا اور کوئی کسی کی۔ خود بنو ہاشم ان لغویات سے مبرا تھے اور اس سے قطعاً ناواقف کہ ان میں سے کوئی صاحب کسی قسم کی امامت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے وقت کے خلفا سے بیعت کی اور اس گروہ سے کوئی تعلق نہ رکھا جو اپنے آپ کو آل البیت میں سے کسی کا شیعہ کہتا تھا، اگر کوئی ہاشمی ان میں سے کسی ٹولی کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کا وہی حشر ہوا جو حضرت زید بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہما بن ابی طالب وغیرہ حضرات کا ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے ہم یہ باور کرنے پر کبھی تیار نہیں ہو سکتے کہ اس حج کے موقع پر بنو ہاشم نے

کوئی جھنڈا بلند کیا تھا یا اپنا گروہ بنا کر الگ کھڑے ہوئے تھے۔

پھر دریافت طلب بات ہے کہ اگر سیدنا محمد بن علی رضی اللہ عنہ کا کوئی جھنڈا اور گروہ تھا تو باقی بنو ہاشم کس جھنڈے کے نیچے تھے؟ کیا ان سب نے حضرت محمد رحمہ اللہ کی امامت قبول کر لی تھی؟ اگر نہیں کی تھی تو کسی دوسرے ہاشمی جھنڈے کا ذکر کیوں نہیں؟

سیدھی اور صاف بات ہے کہ جو شخص بھی اس وقت حج کے لیے حاضر ہوا تھا وہ احرام کی حالت میں تھا اور اس جگہ تھا جہاں ہر حال میں امن رکھنا فرضِ عین ہے۔ ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ﴾ [آل عمران: ۹۷] ''جو کوئی اس میں داخل ہوا امن والا ہو گیا۔'' ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ﴾ [البقرۃ: ۱۹۷] ''تو حج کے دوران نہ کوئی شہوانی فعل ہو اور نہ کوئی جھگڑا''۔ خود یہ روایت بھی اس کی گواہی دیتی ہے کہ اختلاف کے باوجود اس موقع پر تمام حجاج پر امن رہے اور سب نے سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کی اقتدا میں مناسکِ حج ادا کیے۔

اب ہم سوال کرتے ہیں کہ جب لوگ مسلح ہو کر آئے ہوں، اپنے اپنے جھنڈے بلند کیے ہوئے ہوں اور گروہ بندی میں مبتلا ہوں، یعنی اللہ کے بندے بن کر نہ آئے ہوں، بلکہ سیاسی اکھاڑہ جمانے کے درپے ہوں اور قتال و جدال تک پر تیار ہوں تو ایسی ذہنیت کے لوگوں کو پر امن رکھنے کے لیے بڑی طاقت کی ضرورت ہوگی۔ کیا امت کی سیاست میں محمد بن جبیر رضی اللہ عنہ کی یہ حیثیت تھی کہ لوگ ان کا فرمان بجا لانے پر مجبور ہوں؟ کبھی تاریخ میں ان صاحب کی عالمگیر مقبولیت اور دبدبہ کا کوئی ذکر کیا گیا ہے؟ جو لوگ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صاف وصریح احکام کی خلاف ورزی کر کے فوجی پرے بنائے کھڑے ہوں اور آدابِ صالحین کو چھوڑ کر احرام کی حالت میں بھی خطرات انگیز کرنے کے درپے ہوں، ان کی اصلاح کے لیے یا تو ان کی مجموعی طاقت سے بھی بدرجہا زیادہ مضبوط فوجی طاقت کی ضرورت ہے یا پھر نبی کا تصرف چاہیے محمد بن جبیر رحمہ اللہ دونوں صفتوں سے عاری تھے۔

لہٰذا صرف یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس وقت جتنے مسلمان حج کے لیے آئے تھے وہ

انہی آداب کے مطابق آئے تھے جو اللہ و رسول ﷺ نے مقرر فرمائے ہیں اور انھیں یہ فقہی جزئیہ معلوم تھا کہ حرم شریف جس کی تولیت میں ہے اسی کی امامت و قیادت میں مناسکِ حج ادا کیے جائیں۔ آخر بنو ہاشم اور تمام مسلمان جنھوں نے سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت نہیں کی تھی، ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے یا نہیں؟ پھر حج کے موقع پر فوجی پریڈ کی ضرورت کیوں ہوئی؟

نماز ہر نیک و بد کے پیچھے ہے اور امت کا اس پر عملِ متواتر ہے، اسی طرح سب لوگ جانتے تھے کہ اپنی شخصی حیثیت میں سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کا یہ مرتبہ ہے کہ حج کے اجتماع میں آپ قیادت فرمائیں۔ پہلے اس روایت کی لغویت پر روشنی ڈالی جا چکی ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما اپنی جماعت الگ کرایا کرتے تھے اور اموی امیر کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ ایسی ہی لغو روایت ہے اور اس قسم کی فضول داستانیں لوگوں نے محض یہ دکھانے کے لیے وضع کی ہیں کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اپنے سیاسی اختلاف اور اجتہادی موقف کو کسی حالت میں نہیں چھوڑتے تھے اور ہر موقع پر دھڑے بندی کی لعنت ان کی گردن میں رہتی تھی اور ان میں آدابِ دینیہ کی پاسداری کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ نعوذ باللہ من ذلك.

کاش ایسی باتیں بیان کرتے وقت لوگ اللہ کا خوف کریں اور بزرگوں سے حیا کا کوئی جذبہ لے کر لکھنے بیٹھا کریں۔ مسلمانوں کو یہ باور کرنا چاہیے کہ ۶۸ھ کے اجتماعِ حج میں نہ کوئی جھنڈا نصب کیا گیا نہ کوئی جھگڑا اور فساد ہوا اور نہ مسلمانوں نے سوائے بندگی کے کوئی مظاہرہ کیا۔



بعض شبہات کا ازالہ

وفات سیدنا حسن رضی اللہ عنہ:

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ امتِ مسلمہ کے محسنِ عظیم ہیں اور آپ کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی آیت ہے۔ مسلمانوں نے اس نورِ چشم مصطفوی کو ہمیشہ بغایت عزت و احترام ومحبت وعقیدت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ہم عصرِ امت نے انھیں مایۂ افتخار جانا۔ ایک طرف تو آپ کی یہ حیثیت ہے اور دوسری طرف آپ کے بارے میں کذب و افترا کا ایک دفتر ہے، جس کا کچھ اندازہ ان اوراق میں وقائع صلح کے تحت نظر آ گیا ہوگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت اطہار کی راہ سے ہٹ کر چلنے والوں نے جہاں اور قسم قسم کی باتیں سلف صالحین کے متعلق وضع کی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے اشارے سے زہر دیا گیا تھا، جس سے آپ نے وفات پائی۔ بعض لوگ اس کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''تاریخ الخلفاء'' میں لکھا ہے:

"توفي الحسن رضي الله عنه بالمدينة مسموما، سمته زوجته جعدة بنت الأشعث بن قيس، دس إليها يزيد بن معاوية أن تسمه فيتزوجها، ففعلت، فلما مات الحسن بعثت إلى يزيد تسأله الوفاء بما وعدها، فقال: إنا لم نرضك للحسن أفنرضاك لأنفسنا؟"[1]

''حسن رضی اللہ عنہ کی وفات مدینہ میں زہر سے ہوئی۔ یہ زہر انھیں ان کی بیوی جعدہ

---

[1] تاریخ الخلفاء (ص: ٧٤) طبع مصر

بنت اشعت بن قیس نے دیا تھا۔ یزید بن معاویہ نے انھیں ورغلایا کہ اگر وہ انھیں زہر دے دیں تو وہ خود ان سے نکاح کر لیں گے، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو یزید کو انھوں نے پیغام بھیجا کہ اب اپنا وعدہ پورا کریں۔ انھوں نے کہا: ''ہم نے تمھیں حسن رضی اللہ عنہ کے لیے پسند نہیں کیا تو کیا اپنے لیے کر لیں گے؟''

اب ان صاحب سے پوچھنا چاہیے کہ اتنی تفصیلات جب انھیں معلوم ہیں تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بھی معلوم ہوں گی، بلکہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو بھی اور سب اہلِ بیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس سے واقف ہوں گے کہ آپ کو زہر دیا گیا، فلاں شخص نے دیا ہے اور فلاں مقصد سے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں، یا تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ یا اہلِ بیت کو یہ باتیں معلوم تھیں اور قاتل کو معاف کر دیا تو پھر اس کا تذکرہ کیوں؟ اور اگر معلوم نہیں تھیں تو بعد کے لوگوں پر یہ راز کس طرح کھل گیا؟!

تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہ بات معلوم تھی اور معاف نہیں کیا تو پھر قاتل کے خلاف کارروائی کیا کی گئی؟ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اور ضعیف سے ضعیف بلکہ موضوع روایت بھی ایسی نہیں، جس سے معلوم ہو کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے زہر خوانی کا مقدمہ امیر مروان رحمہ اللہ کی عدالت میں پیش کیا تھا اور اس سلسلے میں یہ کارروائی ہوئی تھی۔ یعنی سیدنا مروان رحمہ اللہ اور اموی خلفا اہلِ بیت کے ازلی دشمن تھے، اس لیے یہ مقدمہ خارج کر دیا گیا اور قاتل سے قصاص نہیں لیا گیا۔

اگر تو ایسی کوئی بات نہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سب بعد کی وضع کی ہوئی باتیں ہیں۔ اہلِ بیت کو ان میں سے کسی بات کا علم نہیں تھا اور انھوں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کو طبعی سمجھا، اسی لیے قطعاً کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں ہوئی اور نہ کسی پر زہر خوانی کا انھوں نے شبہہ کیا۔

دائرہ معارف اسلامیہ اردو کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات مرضِ سل میں ہوئی تھی۔ یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق محقق ہے کہ آپ خوشبو کا استعمال بہت کرتے تھے، حتی کہ جدھر سے گزر جاتے مدینے کی گلیاں مہک اٹھتی تھیں، ہوسکتا ہے آپ کو نزلہ ہوا ہو اور احتیاط نہ کرنے سے بگڑ گیا ہو۔ یہ جو روایتوں میں منہ سے خون آنے کا ذکر ہے، اس کی یہی وجہ ہوسکتی ہے۔

پھر ہمیں دیکھنا چاہیے امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے ساتھ اہلِ بیت کا برتاؤ۔ اگر اس قسم کا کوئی شبہہ ان حضرات کو ہوتا تو انھیں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کا قصہ یاد آتا اور ان کی ہمدردیاں ان سے اٹھ جاتیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حضرات بغاوتِ اہلِ مدینہ سے محض الگ ہی نہیں رہے، بلکہ امیر المومنین کی طرف سے مدافعت کی اور ان کے کردار پر حرف رکھنے والوں کو جھٹلایا، انھیں ملازمِ سنت اور متلاشیِ خیر باور کرایا اور دین کی بنیاد پر ان کے خلاف خروج کو حرام جانا۔ پھر ان کی وفات کے بعد نہ ان لوگوں سے کوئی واسطہ رکھا جو خونِ حسین رضی اللہ عنہ کا نام لے کر کھڑے ہوئے تھے اور نہ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کا ساتھ دیا جو اموی خلافت کے طاقتور مخالف تھے۔

پھر ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ جو لوگ خونِ حسین رضی اللہ عنہ کا ''بدلہ لینے'' کھڑے ہوئے تھے، انھوں نے امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے ''جرائم'' میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دینا بھی شامل کیا ہو اور اپنے پروپیگنڈہ میں کسی جگہ اشارتاً بھی اس جرم کو بیان کیا ہو۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ بعد کے مورخوں کو اس زہر خوانی کے تمام واقعات اور تفصیلات کا علم ہے، لیکن نہ ہم عصر لوگ اس سے واقف تھے اور نہ ان کے بعد فوراً آنے والے۔[1]

[1] کتبِ حدیث میں یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں پائی جاتی ہے جبکہ کتبِ تاریخ میں ابن قتیبہ (المتوفی: ۲۷۶ھ)، ابو حنیفہ دینوری (المتوفی: ۲۸۱ھ)، صاحب المحبر (المتوفی: ۲۴۵ھ) جیسے قدیم مورخین میں سے کسی نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی زہر خورانی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ ابن جریر ←

طبری (المتوفی: ۳۱۰ھ) جنھوں نے کئی بے اصل قصہ بڑے وثوق اور یقین سے اپنی تاریخ میں بیان کیے ہیں، انھوں نے بھی کہیں زہر خورانی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ مورخین میں زہر خورانی سے متعلق سب سے پہلا الہام شیعہ مورخ مسعودی (۳۴۶ھ) کو ہوا۔ جہاں تک مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت کا تعلق ہے تو اس کی سند کچھ یوں ہے: "أَبُو أُسَامَةَ، عَنِ ابْنِ عَوْنٍ، عَنْ عُمَيْرِ بْنِ إِسْحَاقَ" اس روایت کے راوی عمیر بن اسحٰق کو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "تقریب التہذیب" میں مقبول راوی بتایا ہے (تقریب تحت الترجمہ عمیر بن اسحٰق) جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تقریب التہذیب کے مقدمہ میں مقبول کا درجہ متعین کرتے ہوئے تصریح کرتے ہیں کہ مقبول وہ راوی ہوتا ہے جس کی روایت تفرد میں حجت نہیں ہوتی بلکہ صرف متابعت میں قابلِ قبول ہوتی ہے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی زہر خورانی کی روایت کے تمام طرق میں عمیر بن اسحٰق کا تفرد پایا جاتا ہے سو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق تو یہ روایت عمیر بن اسحٰق کی وجہ سے قطعی قابلِ قبول نہیں رہتی۔

اسی طرح حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں عمیر بن اسحٰق کی بابت لکھتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ

"اسے ثقہ قرار دیا گیا ہے۔ ابن عون کے علاوہ اور کسی نے اس سے حدیث روایت نہیں کی۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں: اس کی حدیث کسی چیز کے مساوی نہیں (یعنی ردی ہے) تاہم اس کی حدیث کو (تحقیق کی غرض سے) لکھا جائے گا، یہ قول عباس الدوری نے یحییٰ بن معین سے نقل کی ہے، جبکہ عثمان الدارمی روایت کرتے ہیں کہ یحییٰ نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ امام نسائی اور دیگر حضرات فرماتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں ہے (یعنی یہ راوی صرف متابعت میں قابلِ قبول ہے)۔ (میزان الاعتدال تحت ترجمہ عمیر بن اسحٰق)

اسی طرح ذہبی نے الکاشف میں بھی عباس الدوری کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ یحییٰ بن معین نے ان کو لین الحدیث قرار دیا ہے جبکہ دیگر حضرات نے ان کو قوی کہا تھا۔ (الکاشف تحت ترجمہ عمیر بن اسحٰق) بعینہٖ اسی طرح کی بات امام ذہبی رحمہ اللہ نے المغنی فی الضعفاء میں نقل کی ہے کہ ابن معین ان کو "لا یسوی حدیثه شیئا" کہتے ہیں کہ ان کی حدیث کسی شے کے مساوی نہیں۔ (المغنی فی الضعفاء تحت ترجمہ عمیر بن اسحٰق) ذہبی کا عمیر بن اسحٰق کو ہر اس کتاب میں لے کر آنا جس میں وہ ضعیف رواۃ کا تذکرہ کرتے ہیں، اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ذہبی کے نزدیک بھی عمیر بن اسحٰق حجت نہیں۔

اسی طرح امام مالک بن انس سے جب عمیر بن اسحٰق کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں اسے نہیں جانتا۔ اس سے صرف ابن عون نے روایت لی ہیں۔ بعینہٖ یہی بات امام

احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ بن احمد سے فرمائی تھی۔ (موسوعۃ اقوال الامام احمد بن حنبل تالیف ابی الفضل السید ابو المعاطی النوری، تحت ترجمہ عمیر بن اسحق)

حیرت کی بات ہے کہ تابعین میں سے ایک ثقہ شخص کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام مالک بن انس رحمہ اللہ نہ جاننے کی بات کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس راوی کی توثیق کرنے والے حضرات یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ جاننے کے دعوے سے تضعیف لازم نہیں آتی تو ہمیں ان کی بات سے انکار نہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ عباس الدوری کی روایت کے تحت احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ہم عصر ابن معین رحمہ اللہ اس کی تضعیف کرتے ہیں جبکہ محدثین تصریح کرتے ہیں کہ ابن معین کے معارض اقوال میں سے عباس الدوری کے قول کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ انھوں نے ابن معین کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارا اور آخری وقت تک ان کے ساتھ رہے۔ سو ابن معین کا آخری قول عمیر بن اسحق کی تضعیف کا ہی ہے۔ اس بابت عثمان الدارمی کا توثیق کا قول منسوخ ہے۔

اسی طرح سے ابن عدی ان کا ذکر اپنی الکامل میں کرتے ہیں جس میں ابن عدی ایسے رواۃ کو لے کر آتے ہیں جو یا تو ضعیف ہوتے ہیں یا جن پر جرح کی گئی ہوتی ہے، البتہ وہ جرح بعض دفعہ قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ ابن عدی ان کی بابت اقوال نقل کر کے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ "لا أعلم يروى عنه غير بن عون وهو ممن يكتب حديثه وله من الحديث شيء يسير" یعنی میرے علم میں نہیں کہ ابن عون کے علاوہ کوئی ان سے روایت کرتا ہے اور ان کی حدیث لکھ لی جائے گی اور ان کی احادیث بہت کم ہوتی ہیں۔ (الکامل ابن عدی جلد دوم تحت ترجمہ عمیر بن اسحق)

یاد رہے کہ محدثین "ممن يكتب حديثه" کے الفاظ ایسے رواۃ کے لیے بولتے ہیں جن کی روایات صرف متابعت میں قابلِ قبول ہوتی ہیں یعنی اگر کسی حدیث میں ان کا تفرد پایا جاتا ہو یا وہ اس حدیث کو اکیلے روایت کریں تو وہ حدیث لائقِ حجت نہیں ہوتی۔ اور چونکہ عمیر بن اسحق سے اس حدیث کو صرف ابن عون نقل کر رہے ہیں اور عمیر بن اسحق کے علاوہ اس حدیث کو کوئی اور روایت نہیں کرتا سو عمیر بن اسحق کے تفرد کی وجہ سے یہ حدیث قطعی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ابن عدی الکامل میں ان عمیر بن اسحق پر امام یحییٰ بن معین کا عباس الدوری والا قول نقل کر کے جرح نقل کرتے ہیں اور پھر ان عمیر بن اسحق کی ایک روایت جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو سیدنا حسن بن علی رحمہ اللہ کی ناف چومنے سے متعلق ہے کو نقل کر کے فرماتے ہیں یہ روایت سخت ضعیف ہے۔ اسی (ناف والی) روایت پر شعیب ارناؤط تعلیق لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اسناده ضعيف تفرد به عمير بن إسحق ..... والقول الفصل فيه انه يقبل

حديثه في المتابعات والشواهد وما انفرد به فضعيف لذا قال الحافظ في التقريب مقبول أي عند المتابعة و الا فلين الحديث“

”یعنی عمیر بن اسحق کے تفرد کی وجہ سے یہ روایت (سرتہ الحسن والی) ضعیف ہے۔ اس راوی کے بارے میں قول فیصل یہی ہے کہ یہ متابعت وشواہد میں قابلِ قبول ہے اور تفرد میں ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں اس کو متابعت میں مقبول بتایا ہے۔

گویا ابن عدی، ابن حجر اور شعیب ارناؤط کی تحقیق میں عمیر بن اسحق کی روایات صرف متابعت میں لی جاسکتی ہیں، تفرد کی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہوں گی، جبکہ ابن معین کا آخری قول عمیر بن اسحق کی تضعیف کا ہے۔

ابن حجر عسقلانی عمیر بن اسحق کے بارے میں تہذیب التہذیب میں تفصیل سے کلام کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ہمارے علم میں نہیں کہ عمیر بن اسحق سے عبداللہ بن عون کے علاوہ کسی اور نے روایت کی ہو۔ ابن معین کہتے ہیں کہ اس کی حدیث کسی شے کے مساوی نہیں (یعنی قابلِ رد ہے) لیکن اس کی حدیث (تحقیق کی غرض سے) لکھ لی جائے۔ عثمان الدارمی کہتے ہیں کہ میں نے ابن معین سے پوچھا کہ اس کی حدیث کیسی ہوتی ہے، انھوں نے کہا: ثقہ۔ اورنسائی کہتے ہیں: ”ليس به باس“ یعنی اس میں کوئی حرج نہیں (گویا امام نسائی کے نزدیک بھی عمیر بن اسحق کی روایت اکیلے حجت نہیں) اور ابن حبان نے اس کا ذکر کتاب الثقات میں کیا ہے (ابن حبان کی توثیق اکیلے حجت نہیں)۔ ساجی کہتے ہیں کہ امام مالک سے اس کی بابت پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس (عمیر بن اسحق) سے جس نے روایت کی ہے میں اس کے بارے میں کچھ کہنے پر قادر نہیں۔ اور عقیلی نے عمیر بن اسحق کا ذکر الضعفاء میں کیا ہے کیونکہ اس سے صرف ایک ہی شخص نے روایت کیا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ میرے علم میں نہیں کہ ان سے ابن عون کے علاوہ اور کسی نے روایت کیا ہو اور ابن عون سے بھی ان کی حدیث بہت کم ہیں اور ان کی حدیث لکھی جائے گی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ تحت الترجمۃ عمیر بن اسحق)

ابن جوزی اس عمیر بن اسحق کو اپنی ”الضعفاء والمتروکین“ جلد دوم میں لائے ہیں اور اس کو ضعیف بتلایا ہے۔ اسی طرح امام عقیلی نے بھی عمیر بن اسحق کو ناقابلِ حجت قرار دیا ہے۔ (الضعفاء للعقيلي، جلد ۸)

المختصر عمیر بن اسحق کی بابت راجح بات یہی ہے کہ ان کی روایت لکھ لی جائیں گی لیکن بلا متابعت وشاہد حجت نہیں ہوں گی بلکہ صرف متابعت میں قابلِ قبول ہوں گی جیسا کہ امام ابن عدی، ابن حجر عسقلانی، امام نسائی اور شعیب ارناؤط نے تصریح کی ہے۔ نہ ہی تو ان کی تعدیل مفسر ہے اور نہ ہی

ان پر مفسر جرح موجود ہے اور پھر ان سے روایت بھی صرف عون بن عبداللہ کرتے ہیں۔ ان کی بابت راجح قول ابن حجر و ابن عدی کا ہی ہے یعنی "مقبول وممن یکتب حدیثه" اور چونکہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی زہرخورانی والی روایت میں عمیر بن اسحٰق کا تفرد پایا جاتا ہے سو یہ روایت بغیر متابعت کے قطعی لائق حجت نہیں اور اس کو صحیح یا حسن قرار دینا سخت سہو ہے۔

اب جہاں تک بات رہی مسعودی کی پیش کردہ روایت کی تو مسعودی نے بھی زہرخورانی کی داستان وضع کرتے ہوئے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کسی کا نام نہ مل سکا تو مجبوراً لکھنا پڑا کہ کہا جاتا ہے کہ جعدہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایما سے حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیا تھا۔

لفظ ''کہا جاتا ہے'' بھی غور طلب ہے۔ یہ الفاظ ثابت کر رہے ہیں کہ اس قول کے قائل کا کوئی پتا نہیں، بلکہ یہ بے پر کی گپ ہے۔ پھر بھی مسعودی نے یہ الزام معاویہ رضی اللہ عنہ کے سر تھوپ دیا لیکن بعد کے سنی علما نے سنی ہونے کے ناتے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بجائے اسے یزید بن معاویہ کی جانب منسوب کر دیا۔ یاد رہے کہ یہ مسعودی وہی حضرت ہیں جنھوں نے عبداللہ بن رقیہ رضی اللہ عنہ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کو اپنی تاریخ میں شرابی اور زانی قرار دیا ہے۔ اسی مسعودی سے متاثر ہو کر اس روایت کو حافظ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ (المتوفی: ۹۷۴ھ) نے اپنی کتاب "الصواعق المحرقه" میں نقل کیا ہے:

"وكان سبب موته ان زوجته جعدة بنت الأشعث بن قيس الكندي دس إليها يزيد ان تسمه و يتزوجها و بذل طعاماته ألف درهم ففعلت فمرض أربعين يوما فلما مات بعثت إلى يزيد تساله الوفاء بما وعدها فقال لها انا لم نوضك و للحسن فنرضاك لا نفسنا و بموته مسموما شهيد اجزم غير واحد من المتقدمين كقتادة و أبي بكر بن حفص و المتاخرين كالزين العراقي في مقدمة شرح التقريب"

''حسن رضی اللہ عنہ کی موت کا سبب یہ ہے کہ جعدہ بنت اشعث بن قیس الکندی نے انھیں زہر دیا۔ اسے یزید نے حکم دیا تھا کہ وہ حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دے دیں تو وہ ان سے نکاح کر لے گا اور ایک لاکھ درھم اس کے پاس بھیجے گا۔ اس نے یزید کے کہنے پر عمل کیا۔ حسن رضی اللہ عنہ چالیس دن بیمار رہے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو جعدہ نے یزید سے وعدہ نباہنے کو کہا۔ اس نے جواب دیا ہم تجھے حسن رضی اللہ عنہ کے لیے پسند نہ کرتے تھے۔ اب اپنے لیے کیسے پسند کر سکتے ہیں۔ حسن رضی اللہ عنہ کی موت زہر سے شہید ہو کر ہوئی۔ متقدمین میں قتادہ اور ابوبکر بن حفص اور متاخرین میں حافظ عراقی کا قول یہی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے شرح تقریب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔''

تقریباً یہی بات سیوطی نے اپنی کتاب "تاریخ الخلفاء" میں لکھی ہے۔ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ

تدفین:

سیوطی نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ بنو امیہ کی دشمنی

نے آگے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے بہت اصرار کیا کہ زہر دینے والے کا نام بتایئے لیکن حسن رضی اللہ عنہ نے نام بتانے سے انکار کر دیا۔ جب حسن رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا تو مسعودی وہیثمی کو کیسے الہام ہوا کہ زہر دینے کی حرکت یزید اور جعدہ کی تھی۔ یہ ایک نکتہ غور کرنے کے قابل ہے۔

پھر ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے کہ متقدمین میں سے قتادہ اس بات کے قائل تھے اور متاخرین میں زین الدین عراقی۔ جہاں تک قتادہ کا معاملہ ہے تو اول تو ہماری ناقص معلومات میں ان کا ایسا کوئی قول نہیں، اگر کسی صاحب کو ملے تو وہ ہماری اصلاح کر دیں۔ دوسرے قتادہ حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بہت زمانہ بعد پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۱۷ھ میں ہوا، جب تک وہ اس کی سند بیان نہ کریں تو ان کے قول کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔ جہاں تک حافظ زین الدین عراقی کا تعلق ہے تو انھوں نے تمام لوگوں کی جانب سے ایک اصول اپنی منظوم سیرت میں بیان کردیا ہے:

ولیعلم الطالب ان السیر ما صح اما قد انکرا

''یعنی طالب علم کو جان لینا چاہیے کہ سیرت کی کتابوں میں صحیح ومنکر ہر قسم کی روایات جمع کی جاتی ہیں۔''

الغرض سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی زہر خورانی کے سبب وفات پا جانے کا قصہ سخت لغو اور غیر ثابت ہے۔

سو اوپر کے مبحث سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ حسن رضی اللہ عنہ کا انتقال طبعی طور پر ہوا لیکن یار لوگوں نے اس کو زہر خورانی کا قصہ بنا ڈالا۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ اہلِ تشیع کے بنیادی نظریات میں یہ بات ثابت ہے کہ ان کے امام یا تو تلوار سے قتل ہوں گے یا پھر زہر خورانی سے، جیسا کہ ملا باقر مجلسی نے ''جلاء العیون'' میں تصریح کی ہے:

''اور فرمایا مجھے جناب رسول نے خبر دی ہے کہ بعد ان کے بارہ خلیفہ اور امام ہوں گے، گیارہ فرزندان علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور یہ سب تلوار یا زہر سے شہید ہوں گے۔''

(جلاء العیون: ۲/ ۳۶۸)

لہٰذا جب یہ اصول طے پا گیا تو اب تو زبردستی بھی اس کے لیے زہر خورانی کی داستان تیار کرنا ہوگی جیسا کہ مسعودی نے کیا۔ اتفاق سے جن اماموں نے دور اموی میں انتقال کیا، انھیں بنو امیہ کے ذریعے زہر دلوایا اور جنھوں نے دورِ عباسی میں انتقال کیا، انھیں بنو عباس نے زہر دیا، مثلاً موسیٰ کاظم اور علی رضا کو مامون نے زہر دیا، حالانکہ علی رضا کے نکاح میں مامون کی بیٹی تھی۔

ثابت کی ہے کہ امیر مروان رحمہ اللہ [1] نے انھیں روضۂ شریف میں دفن نہیں ہونے دیا اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جب ہتھیار لگا کر آئے کہ بزورِ شمشیر وہاں تدفین عمل میں لائیں تو

---

[1] مولف کتاب نے اپنی کتاب میں ہر جگہ سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کے لیے ''رحمہ اللہ'' کا لاحقہ استعمال کیا ہے، جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ غالباً مولف کے نزدیک سیدنا مروان رضی اللہ عنہ زمرۂ تابعین میں شامل تھے۔ لاریب امت میں علما کے ایک معتدبہ گروہ کا یہ ماننا ہے کہ سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کبارِ تابعین میں سے تھے۔ تاہم ہماری تحقیق کے مطابق سیدنا مروان رضی اللہ عنہ صحابی تھے۔ ''الاصابہ'' کے مقدمہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ خود تصریح کرتے ہیں کہ اس کتاب میں انھوں نے ابن اثیر رحمہ اللہ کی مخالفت کی ہے جنھوں نے بہت سے ایسے لوگوں کو بھی صحابہ رضی اللہ عنہ میں شامل کر دیا جو صحابی نہیں تھے، گویا اپنی اس کتاب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صرف ان ہی لوگوں کو صحابی قرار دیا ہے جو ان کے نزدیک اس رتبے کے حامل ہیں۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں مذکور اشخاص کو چار قسموں میں تقسیم کیا جس میں قسم اول وقسم ثانی والوں کو صحابی بتایا۔ قسم ثانی والوں کی بابت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ عسقلانی لکھتے ہیں:

> ''القسم الثانی کے تحت ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ صحابہ کی اولاد تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صغیر سن تھے، انھیں گمان غالب کی بنا پر صحابہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس احتمال پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھا ہوگا۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اپنے بچوں کو ولادت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لانے کے بے شمار اسباب ہیں .... لیکن محققین اہلِ علم جنھیں حدیث کا علم ہے ان کے نزدیک ان لوگوں کی احادیث مراسیل میں شمار ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر میں نے انھیں قسم اول کے لوگوں سے علاحدہ کیا ہے۔'' (الإصابه في التميز الصحابة: ١/ ٥٥، مقدمة)

اب دیکھیے مقدمہ میں اسی تمہید کے بعد جلد پنجم میں سیدنا مروان بن الحکم رضی اللہ عنہ کے حالات میں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

> 'یہ حکم بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ اموی تھے اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کا ذکر القسم الثانی میں آئے گا۔''

یہی وجہ ہوئی کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا کہ ''لا تثبت له صحبة'' سے مراد ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست روایت کی نفی ہے البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رؤیت کے تحت سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کو صحابی ہی مانتے تھے، جیسا کہ انھوں نے الاصابہ کے مقدمہ میں تصریح کر دی تھی۔ بعینہٖ اسی لیے ←

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے انھیں سمجھا بجھا کر اس سے باز رکھا اور یوں قبۂ اہلِ بیت میں سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے پاس انھیں دفن کیا گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ امیر مروان رحمہ اللہ نے کہا تھا:

➜ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ہدی الساری میں سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھتے ہیں: ”له رؤية“ یعنی انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ (فتح الباري: ١٤/٣/٢٤٣)

یہ تو ہوگئی حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے قول کی صحیح توضیح کہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے نزدیک سیدنا مروان رضی اللہ عنہ صغار صحابہ میں سے آتے ہیں جن میں وہ محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بھی شامل کرتے ہیں۔

اب ذرا ان اقوال کو دیکھ لیتے ہیں جن میں سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کی صحابیت کی تصریح ملتی ہے:

”تاریخ خمیس“ (۲/۳۰۶) میں ہے ”وكان مروان قد لحق النبي ﷺ“ یعنی سیدنا مروان رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہے، اسی لیے اہلِ شام کے نزدیک ان کا صحابی ہونا متفق علیہ ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ منہاج السنۃ (۳/۱۸۹) میں فرماتے ہیں: ”واختلف في صحبة“ یعنی ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، پھر فرماتے ہیں: ”و مروان اقران ابن الزبير“ یعنی اور مروان تو ابن الزبیر کے طبقے کے ہیں اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”هو صحابي عند طائفة كثيرة لانه ولد في حياة النبي ﷺ“ (البداية والنهاية: ٨/٢٥٧)

”یعنی کثیر جماعت کے نزدیک سیدنا مروان رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور وہ دورِ نبوی میں پیدا ہوئے۔“

البتہ روایت کے اعتبار سے وہ تابعی ہیں، لیکن اس شان کے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان سے روایت کی ہے۔

گویا ایک جمِ غفیر نے سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کو رویت کے اعتبار سے صحابی مانا ہے جیسا کہ محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ، سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ، طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ وغیرہم اور روایت کے اعتبار سے ان کو تابعی مانا ہے اور ان کی مرویات کو مرسل کا درجہ دیا ہے۔

سیدنا مروان رضی اللہ عنہ سے متعلق یہی سب سے صائب اور محقق رائے بن سکتی ہے۔ اس رائے کی مکمل نفی کر کے سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کو مطلقاً تابعی قرار دینا کئی ادلہ سے صرف نظر کرنا ہوگا، خاص کر جب کہ ”الاصابة“، ”البداية والنهاية“ اور ”الجمع بين رجال الصحيحين“ وغیرہ میں تصریح ہے کہ ”مات في شهر رمضان سنة خمس و ستين بدمشق“ یعنی ”ماہ رمضان المبارک میں ۶۵ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں دمشق میں مروان رضی اللہ عنہ نے وفات پائی“ تو اس حساب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر ۸ سے ۹ سال بنتی ہے۔ اس لیے یہ صغار صحابہ میں شمار کیے جائیں گے جیسا کہ سیدنا حسین، عبداللہ بن زبیر اور محمود بن ربیع رضی اللہ عنہم وغیرہ کا نام آتا ہے۔

”جب عثمان رضی اللہ عنہ وہاں دفن نہیں ہوئے تو حسن رضی اللہ عنہ بھی نہیں ہو سکتے۔“

یہ سب افسانے ہیں، جن کی کوئی قیمت نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سب سے پہلے حق تھا حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا۔ لیکن خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں وہاں دفن کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جنت البقیع ہی میں دفن کیا۔ حالانکہ اس وقت اس کے امکانات قوی تھے اور اگر ایسی کوئی کوشش کی جاتی تو کوئی حرج نہ ہوتا۔ ان کے بعد یہ حق تھا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا اور ان کے ساتھ خلفائے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور جمہور امت کو جو عقیدت تھی وہ ظاہر ہے کہ کس طرح حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ انھیں دیکھ کرسواری سے اتر جاتے تھے اور مخالف سمت بھی جا رہے ہوں تو انھیں ان کی جائے مقصود پر پہنچا کر واپس ہوتے تھے۔ صحاح کی یہ روایت سب جانتے ہیں کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ ان کے وسیلے سے بارش کی دعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ہر دفعہ ان کی برکت سے یہ دعائیں سنتا تھا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان سے اتنی عقیدت و محبت تھی اور وہ ان کے نزدیک اس درجہ معزز و محترم تھے اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تنہا وارث تھے تو ان کا حق تھا کہ وہ آپ کے پہلو میں دفن ہوں، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ پھر یہ حق تھا سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جنھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جمہورِ صحابہ خال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے جو عشرہ مبشرہ میں ہیں اور جن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ اسلام کو اتنی عقیدت تھی کہ وادیِ عقیق سے جہاں آپ کا قصر تھا آپ کے جسدِ اطہر کو ہاتھ پر مدینہ طیبہ لائے تھے، کیوں کہ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ آپ کو اٹھانے کی سعادت حاصل کرے اور یوں کئی میل کی مسافت طے کی گئی۔ مسجد شریف میں نمازِ جنازہ ہوئی، لیکن دفن کیا گیا بقیع میں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ روضۂ شریف میں دفن ہونے کا حق صرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو تھا کہ دعوتِ محمدیہ کے یہی تین ستون تھے۔ اس کے بعد جو کوئی بھی دفن ہوتا وہ ترجیح بلا مرجح ہوتی۔ یا پھر

روضۂ شریف خود قبرستان بن جاتا۔ امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے آپ کی تدفین کے بارے میں وصیت معلوم کرنے کا موقع ہی کہاں تھا۔ لیکن اگر آپ ایسی وصیت کرتے تو یقیناً اس کی تعمیل ہوتی اور باغی کیسے ہی سرکش کیوں نہ ہوتے وہ حجرۂ شریف کی بے حرمتی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور ناممکن تھا کہ وہ اس تدفین میں حارج ہوسکیں۔ ویسے ہم یقین رکھتے ہیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اگر وصیت کر سکتے تو یقیناً یہ وصیت نہ کرتے کہ آپ کو روضہ شریف میں دفن کیا جائے۔ آپ شہید ہونے کے لیے پوری طرح تیار تھے، حتی کہ ازار اتار کر پاجامہ بھی پہن لیا تھا کہ ستر رہے۔ آپ فرما سکتے تھے کہ مجھے روضہ شریف میں دفن کیا جائے، مگر یہ وصیت نہیں کی۔

اس کے بعد سب سے زیادہ حق وہاں دفن ہونے کا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تھا کہ حجرہ شریف تھا ہی آپ کا، اور آپ کی وفات اس وقت ہوئی تھی جب کوئی فتنہ نہ تھا، لیکن آپ نے وصیت فرمائی کہ باقی ازواجِ مطہرات کے ساتھ ہی آپ کو دفن کیا جائے۔

اس تمام طرزِ عمل سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں اور وزیروں کے ساتھ کوئی اور شخص دفن نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کا امکان نہیں کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے وہاں دفن ہونے کی کوئی وصیت فرمائی ہو اور اس ذیل میں کوئی ہنگامہ ہوا ہو۔

باقی جو خرافات سیوطی صاحب نے سیدنا مروان رحمہ اللہ کے بارے میں لکھی ہیں، ان پر محاکمہ کی ضرورت نہیں۔ جب یہ طے کر لیا جائے کہ امویوں کی بابت اچھی بات کہی نہیں جائے گی اور بُری باتیں چھانٹ چھانٹ کی بیان کی جائیں گی تو آدمی کہاں تک ان روایتوں کے پیچھے پڑے۔[1] ان کی تکذیب کے لیے موطأ کافی ہے اور اس سے اہلِ ایمان

---

[1] سیدنا مروان رضی اللہ عنہ پر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی حجرۂ نبوی میں تدفین میں رکاوٹ ڈالنے کے الزام کے ابطال کے لیے قارئین کو قاضی طاہر علی الہاشمی صاحب کی کتاب ''سیدنا مروان بن الحکم رضی اللہ عنہ۔ ←

معلوم کر سکتے ہیں کہ سیدنا مروان رحمہ اللہ کس کردار اور کس مرتبہ کے شخص تھے اور صحیح روایتوں سے معلوم کیا جا سکتا کہ اہلِ بیت کے ساتھ ان کے تعلقات ایسے تھے کہ کسی دوسرے غیر ہاشمی کے ساتھ نہ تھے۔ ان کا وہ خط موجود ہے، جو انھوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کے بعد امیر عبیداللہ بن زیاد کو بھیجا تھا:

"أما بعد فإن الحسين بن علي قد توجه إليك، وهو الحسين بن فاطمة، وفاطمة بنت رسول الله ﷺ، وتالله ما أحد يسلمه الله أحب إلينا من الحسين، فإياك أن تهيج على نفسك مالا يسده شيء، ولا تنساه العامة، ولا تدع ذكره آخر الدهر والسلام"[1]

"اما بعد! حسین بن علی رضی اللہ عنہما تمھاری طرف چل پڑے ہیں۔ یاد رکھو وہ حسین بن فاطمہ رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں۔ اللہ کی قسم! اللہ انھیں سلامت رکھے، ہمیں کوئی شخص بھی حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبوب نہیں۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ تم نفس کے ہیجان میں ایسی کوئی بات کر بیٹھو جس کے (برے نتائج کی) روک تھام نہ ہو سکے، عوام اسے بھول نہ سکیں اور قیامت تک اس کا تذکرہ ہوتا رہے۔"

ناسخ التواریخ کے غالی مولف کی اس شہادت کے بعد کہ سیدنا مروان رحمہ اللہ کو اہلِ بیتِ رسالت سے کیسی محبت و مودت تھی، مسلمان سیوطی کی تحریر پر جتنی بھی ندامت محسوس کریں کم ہے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے ابتداءً خروج کیا تھا، جب ان کے بارے میں

← شخصیت و کردار" میں (صفحہ: ۴۲۷۔۴۴۱) کی طرف مراجعت مفید و دلچسپ رہے گی جہاں قاضی محمد طاہر علی الہاشمی حفظہ اللہ نے اس بابت "سیدنا مروان رضی اللہ عنہ پر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی تدفین میں رکاوٹ ڈالنے کا الزام" کی سرخی قائم کر کے نہایت مفصل لیکن مدلل مبحث قائم کر کے اس لغو اعتراض کے تار پود اکھیڑ کر رکھ دیے ہیں۔

[1] البداية والنهاية (٨/١٦٥) ناسخ التواريخ: مطبوعه إيران، كتاب دوم (٦/١٦٥)

سیدنا مروان رحمہ اللہ کے یہ جذبات ہیں تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق ان کے جذبات کیسے ہوں گے، جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تھے اور سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار فرما کر قطعی خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس خط کی موجودگی میں سیوطی کے تمام بیانات "ھباء منثورا" ہو جاتے ہیں۔ کوئی صاحبِ عقل یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گا کہ جو شخص برضا و رغبت خلافت سے دستبردار ہو کر امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کر چکا ہو اور اس پر مستقیم ہو، جو ہر فتنہ و فساد سے لوگوں کو روکتا ہو، جو مرنجان مرنج زندگی بسر کر رہا ہو اسے خفیہ زہر دے کر شہید کر دیا گیا ہو گا۔ امیر یزید رحمہ اللہ کو عورتوں کی کیا کمی تھی جو وہ دوسرے کی بیوی پر نگاہ ڈالتے اور وہ بھی غائبانہ۔ سیدہ جعدہ رحمہا اللہ کیا اس حقیقت سے نا آشنا تھیں کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ متعدد خواتین کو طلاق دے چکے تھے، اس لیے انھیں اگر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے ''چھٹکارا'' کی خواہش ہوتی تو بآسانی طلاق لے سکتی تھیں۔ اور اگر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دے کر ختم کرنا ہی مقصود ہوتا تو یہ کام بیوی سے کیوں لیا جاتا، ایسے لوگ بھی مل سکتے تھے جو کام کر جائیں اور کسی کو شبہہ بھی نہ ہو۔ لیکن علمِ غیب ان راویوں اور مصنفوں کو ہے، جن حضرات کی آنکھوں کے سامنے ان واقعات کا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ ان کی نہ آنکھیں تھیں اور نہ دل، نہ محبت تھی اور نہ غیرت وحمیت۔ اہلِ بیت کی تمام محبت وعقیدت صرف سبائیہ کے حصے میں آتی ہے۔

غِلْمَةٌ مِنْ قُرَيْشٍ:

"قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: سَمِعْتُ الصَّادِقَ الْمَصْدُوقَ يَقُولُ: هَلَكَةُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيْ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ، فَقَالَ مَرْوَانُ: لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ غِلْمَةً فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: لَوْ شِئْتُ أَنْ أَقُولَ بَنِي فُلَانٍ وَبَنِي فُلَانٍ لَفَعَلْتُ" [1]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

[1] صحيح البخاري، كتاب الفتن (٤/٢٢٢) طبع مصر.

فرماتے سنا ہے: ''میری امت کی ہلاکت کم عمر قریشی لڑکوں کے ہاتھوں ہو گی'' مروان رحمہ اللہ نے کہا: اللہ کی لعنت ہو ان پر، لڑکے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر یہ کہنا چاہوں کہ فلاں خاندان کے اور فلاں خاندان کے تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں۔''

ایک صاحب نے اپنی خیالی نسلی برتری کے جذبہ کے تحت "غلمة" کا ترجمہ کیا ہے ''چھوکرے'' مقصد توہین ہے، کیوں کہ یہ صاحب بزعمِ خود سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد صرف اموی نوجوان ہیں۔

ظاہر ہے کہ قریشی لڑکوں سے مراد وہی لوگ ہوں گے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کم عمر تھے۔ قیامت تک پیدا ہونے والے بچے تو مراد نہیں ہو سکتے، یا پھر وہ ہوں گے کہ جنھوں نے چھوٹی عمر میں امت کی سیاست میں حصہ لیا۔ اب کیسی دلچسپ بات ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں: ''قریشی لڑکے'' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمائیں: فلاں خاندان کے اور فلاں کے خاندان کے'' لیکن لفظ قریش کو مختص کر دیا جائے بنو امیہ سے اور کہہ دیا جائے کہ یہ پیشین گوئی اموی نوجوانوں کے ہاتھوں امت کی تباہی کی ہے۔[1]

---

[1] اس حدیث کی تشریح کے لیے بنو امیہ معترضین حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی فتح الباری کا حوالہ دیتے ہیں کیونکہ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کا مصداق امیر یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کو ٹھہرایا ہے۔ اس بابت سب سے پہلے تو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس بات کی کسی حدیث میں تصریح نہ ہو اور مختلف شارحینِ حدیث اپنے اپنے علم کے مطابق قرائن کی بنا پر حدیث کا محمل متعین کرنے کی کوشش کریں تو شارحین کے بیان کردہ محامل کو حدیث کی طرح قطعیت کا درجہ نہیں دیا جاتا، مثلاً سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو بیان قطعیت سے ثابت ہے وہ صرف یہ ہے کہ میری امت کی ہلاکت چند قریشی چھوکروں کے ہاتھوں ہو گی اور اسی بات پر ایمان لانا لازم ہے لیکن ان چھوکروں میں یزید بن معاویہ رحمہ اللہ شامل ہے یا دوسرے اموی خلفا شامل ہیں، یہ بات اشارتاً و کنایتاً بھی حدیث میں نہیں پائی جاتی اور نہ ہی اس بات کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے کہنے سے قطعیت کا کوئی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ خاص کر جبکہ صحیح بخاری میں ہی دوسری جگہ اسی حدیث کے راوی سعید بن عمرو ←

پھر جب قریش کے بارے میں ۱۲ خلفا کی حدیث مذکور ہو تو اس وقت اس فہرست سے امویوں کا نام نکال دیا جائے اور مراد لیے جائیں محض تیمی، عدوی، ہاشمی اور اسدی یا

← "غلمة من قريش" سے مرادعہدِ یزید کے بعد کے ادوار کے چھوکروں کو قرار دے رہے ہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری "كتاب الفتن، باب قول النبي ﷺ هلاك أمتي على يدى اغيلمة سفهاء، رقم الحديث: ۷۰۵۸) میں اس حدیث کے آخر میں مذکور ہے:

''پھر جب بنو مروان شام کی حکومت پر قابض ہو گئے تو میں (یعنی عمرو بن یحییٰ بن سعید بن عمرو) اپنے دادا (سعید بن عمرو) کے ساتھ ان کی طرف جاتا تھا۔ جب وہاں انھوں (سعید بن عمرو) نے نوجوان لڑکوں کو دیکھا تو کہا کہ شاید یہ انہی میں سے ہوں۔ ہم نے کہا کہ آپ کو زیادہ علم ہے۔''

گویا اس حدیث کے مرکزی راوی اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد سعید بن عمرو کے نزدیک تو اس روایت کا یزید بن معاویہ رحمہ اللہ یا اموی خلفا سے کوئی تعلق نہیں جبکہ انھوں نے خود یہ حدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنی تھی اور وہ اس حدیث کے موقع و محل سے مابعد کے دور کے ہر انسان اور شارح حدیث سے زیادہ واقف تھے، سو جس قدر درست محمل حدیث کا وہ سمجھ سکتے ہیں، ان کے سات آٹھ سو برس کے بعد آنے والے کوئی شارح سمجھنے سے رہے۔ یاد رہے کہ اہلِ علم میں یہ بات معروف ہے کہ راوی اپنی روایت کا مفہوم دوسروں سے بہتر سمجھتا ہے اور شاید یہی وجہ رہی کہ سلف صالحین و خیر القرون کے ادوار میں کسی ایک عالم نے بھی اس حدیث کا مصداق کسی اموی خلیفہ کو قرار نہیں دیا اور نہ ہی اس حدیث سے وہ مفہوم کشید کیا جو کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور ان کی اتباع میں بنو امیہ معترضین اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی بات کی طرف ہندوستان کے جید اہلِ حدیث عالم فضیلۃ الشیخ کفایت اللہ سنابلی حفظہ اللہ اپنی کتاب ''یزید بن معاویہ رحمہ اللہ پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ'' (صفحہ: ۲۶۳) میں اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اب قارئین کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ یہی روایت صحیح بخاری میں دوسرے مقام پر مفہوم کی وضاحت کے ساتھ بھی موجود ہے تو اسے نظر انداز کر کے دوسرے مقام کی مختصر روایت کو ہی کیوں پیش کیا جاتا ہے؟

مقصد ظاہر ہے، تاکہ اس طرح لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ہم نے جو مفہوم لیا ہے، راوی حدیث کی طرف سے لیے گئے مفہوم کے خلاف ہے، بلکہ خیر القرون کے تمام اہلِ علم کے فہم کے خلاف ہے، کیونکہ یزید بن معاویہ کے دور میں کسی بھی صاحبِ علم سے یہ منقول نہیں کہ ←

عنایت فرما کر صرف ایک نام سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا لیا جائے۔ گویا تمام خوبیاں قریش کے دوسرے خاندانوں میں تھیں اور تمام برائیاں بنو امیہ میں۔ انصاف اور عقل کو خیر باد کہہ کر

← کہ اس نے اس حدیث سے یہ مفہوم مراد لیا ہو۔ حتیٰ کہ آگے چل کر جب اہلِ مدینہ کے بعض لوگوں نے یزید کی بیعت توڑی تو انھوں نے بھی یزید کے خلاف اس روایت کو پیش نہیں کیا۔''

المختصر اس روایت میں کہیں یزید یا کسی اموی خلیفہ کا نام مذکور ہی نہیں، پھر اس حدیث کے راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے خود ۵۰ھ کی دہائی میں ایک اموی خلیفہ یزید بن معاویہ رحمہ اللہ کی ولی عہدی کی بیعت کی تھی سو اس کا تو صاف مطلب یہ ہوا کہ خود ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی اموی خلیفہ یزید بن معاویہ رحمہ اللہ اس حدیث کے مصداق نہیں تھے ورنہ وہ ان کی ولی عہدی کی بیعت کبھی نہ کرتے۔

یعنی جو لوگ حدیث روایت کر رہے ہیں، ان میں سے تو کوئی بھی اس حدیث کا مصداق کسی اموی خلیفہ کو قرار نہیں دے رہا اور ظاہر سی بات ہے کہ وہ لوگ اس دور میں جیتے تھے سو وہ ہم اور آپ سے بہتر اندازہ لگا سکتے تھے کہ اس حدیث کا مصداق کون ہے، جب انھوں نے کوئی تصریح نہیں کی تو ہماری اور آپ کی کی جانے والی ہر تصریح اس بابت مردود ہوگی۔ پھر راوی کا تخیل بھی بنو مروان کے زمانے میں شام میں موجود لڑکوں سے متعلق ہے، اور چونکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں دار الخلافہ کوفہ سے شام منتقل ہو چکا تھا اور مکہ و مدینہ سے کئی خاندان شام ہجرت کر چکے تھے سو کس کو کیا معلوم کہ راوی نے یہ شک کس خاندان کے لڑکوں کے متعلق ظاہر کیا۔ قریش تو ایک وسیع الخاندان قبیلہ تھا جس میں بنو امیہ بھی تھے تو بنو ہاشم بھی، بنو عدی بھی تھے تو بنو مخزوم بھی۔ سو یہ تباہی تو کسی کے ہاتھوں بھی آسکتی ہے۔

اموی خلیفہ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت اس وقت موجود ۲۵۰ سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کی تھی، یزید کے بعد جتنے اموی خلفا آئے ان کی بیعت اس وقت حیات تمام صحابہ و تابعین نے کی سو بقول بنو امیہ معترضین کے وہ سب کے سب امت کی تباہی جن لونڈوں کے ہاتھوں ہونی تھی ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس تباہی میں اپنا حصہ رسدی ادا کر چکے تھے۔ پھر صرف اموی خلفا ہی کو نہیں بلکہ ان تمام صحابہ و تابعین کو بھی اس حدیث کا مصداق سمجھنا چاہیے جنھوں نے یزید کی بیعت کر کے اس کی خلافت کو مستحکم کیا۔ بلکہ اس حدیث کا سب سے پہلا مصداق تو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ہونا چاہیے کہ انھوں نے واقعہ کربلا کے تین سال کے بعد جب مدینہ میں بغاوت ہوئی تو تب آلِ عمر رضی اللہ عنہ کو جمع کر کے یزید کی بیعت پر مستقیم رہنے کی تلقین کی اور اس کی بیعت فسخ کرنے کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے غداری قرار دیا اور یزید کے بعد اموی خلیفہ امیر عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ ←

زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جائیں ان لوگوں کی خیالی توصیف میں جو باہمی فساد کے ذمے دار ہیں اور سوائے داخلی فتنوں کے ان کے نامۂ اعمال میں اور کچھ نہیں، لیکن جنھوں نے ایشیا، افریقہ اور یورپ میں دعوتِ محمدیہ کو برپا کیا، تین چوتھائی متمدن دنیا کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا اور ایسا نظامِ عدل دنیا میں برپا کیا کہ اقوامِ عالم اس کی روشنی میں اپنے مسائل حل کرتی چلی جا رہی ہیں، ان کی قسمت میں یہ ہو کہ جب خلافت کا ذکر آئے تو شر الملوک کہلائیں اور جب امت کی ہلاکت کا ذکر ہو تو تمام ذمہ داری انھی کے سر ڈال دی جائے۔ اگر تاریخ اور حقائق سے بالکل آنکھیں بند کر لی جائیں اور دورِ فتن پر تبصرہ کرتے وقت محض شخصیتوں کی پوجا مقصود ہو، تب البتہ یہ لغو باتیں کہی جا سکتی ہیں جو نسلی تعصب میں مبتلا لوگ کرتے ہیں۔

کوئی پوچھے کہ نبی اکرم ﷺ نے ''اموی چھوکرے'' فرمایا تھا یا ''قرشی لڑکے'' اور خلفا کے ذکر میں آپ نے کہیں یہ تشریح کی کہ یہ بشارت امویوں کے علاوہ باقی قرشی خلفا کے لیے ہے، لیکن ان لوگوں کا کیا علاج جو خلافت پر بحث کرتے وقت ''الأحادیث المنذرة من خلافة بني امیة'' ''بنو امیہ کی خلافت سے ڈرنے والی حدیثیں'' جمع کریں اور خود ہی کہتے بھی جائیں کہ فلاں راوی وضاع ہے اور فلاں کذاب، پھر جمع کریں ''الأحادیث المبشرة بخلافة بني العباس'' ''بنوعباس کی خلافت کی بشارت دینے والی حدیثیں'' اور یہاں بھی تصریح کرتے جائیں کہ فلاں راوی وضاع ہے اور فلاں ضعیف۔

← کی بھی بیعت کی۔ اب یہ روایات بھی بخاری میں ہی موجود ہیں۔ سو بنو امیہ معترضین کی پیش کردہ یہ روایت تو صرف قریش کے لونڈوں کی بات کرتی ہے لیکن وہ لونڈے کون تھے اس کی کوئی تصریح اس میں موجود نہیں۔ سو اموی خلفا جن کی بیعت پر اس وقت موجود امت جمع ہو گئی تھی، ان کو اس حدیث کا مصداق بنانے سے بہتر ہے کہ ان ۶۰ علویوں کو اس حدیث کا مصداق بنا لیا جائے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں مجمع علیہ خلفا کے خلاف خروج کرکے امت میں انتشار پیدا کیا اور کشت و خون کا بازار گرم کیا۔ کیونکہ ظاہر سی بات ہے کہ علوی بھی بنو امیہ کی طرح قریش ہی تھے۔

سیوطی صاحب کو علمِ حدیث پر عبور کا دعویٰ ہے، لیکن اس کا خوف نہیں کہ وضاعوں اور کذابوں کی روایات کو سند بنا کر بطورِ حجت پیش کرنا عند اللہ کتنا موجبِ توبیخ ہے۔ تاریخ الخلفاء حدیث کی کتاب نہیں ہے، جو علمائے حدیث اسے پڑھیں۔ یہ تاریخ کی کتاب ہے، جو خاص و عام ہر شخص کے ہاتھ میں جائے گی اور چونکہ ان کے نام کے ساتھ علامہ جلال الدین سیوطی کا نام لکھا ہوا ہے، اس لیے وہ اس کے اندر مندرج شدہ باتوں کو مستند سمجھے گا۔

یہ جو چار دانگِ عالم میں جدھر رخ کرو اللّٰہ أکبر اور لا إلٰه اللّٰہ کی آواز سنو اسے امت کی ہلاکت سے تعبیر کیا جائے گا یا اسے کہ آج بغداد تباہ ہو رہا ہے اور کل ملکِ مصر، پرسوں میسور اور پھر دہلی اور آخر میں دکن۔ آخر حیا اور ایمان بھی کوئی چیز ہے ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہیم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت کے داخلی فتنوں کو جس طرح دیکھتے ہیں وہ صحیح بخاری میں دیکھیے:

”عَنْ أَبِي الْمِنهَالِ قَالَ: لَمَّا كَانَ ابْنُ زِيَادٍ وَمَرْوَانُ بِالشَّأْمِ وَوَثَبَ ابْنُ الزُّبَيْرِ بِمَكَّةَ وَوَثَبَ الْقُرَّاءُ بِالْبَصرَةِ فَانْطَلَقْتُ مَعَ أَبِي إِلَى أَبِي بَرْزَةَ الْأَسْلَمِيِّ حَتَّى دَخَلْنَا عَلَيْهِ فِي دَارِهِ وَهُوَ جَالِسٌ فِي ظِلِّ عُلِّيَّةٍ لَهُ مِنْ قَصَبٍ فَجَلَسْنَا إِلَيْهِ فَأَنْشَأَ أَبِي يَسْتَطْعِمُهُ الْحَدِيثَ فَقَالَ: يَا أَبَا بَرْزَةَ أَلَا تَرَى مَا وَقَعَ فِيهِ النَّاسُ فَأَوَّلُ شَيْءٍ سَمِعْتُهُ تَكَلَّمَ بِهِ إِنِّي احْتَسَبْتُ عِنْدَ اللّٰهِ أَنِّي أَصْبَحْتُ سَاخِطًا عَلَى أَحْيَاءِ قُرَيْشٍ إِنَّكُمْ يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ كُنْتُمْ عَلَى الْحَالِ الَّذِي عَلِمْتُمْ مِنَ الذِّلَّةِ وَالْقِلَّةِ وَالضَّلَالَةِ وَإِنَّ اللّٰهَ أَنْقَذَكُمْ بِالْإِسْلَامِ وَبِمُحَمَّدٍ ﷺ حَتَّى بَلَغَ بِكُمْ مَا تَرَوْنَ وَهَذِهِ الدُّنْيَا الَّتِي أَفْسَدَتْ بَيْنَكُمْ إِنَّ ذَاكَ الَّذِي بِالشَّأْمِ وَاللّٰهِ إِنْ يُقَاتِلُ إِلَّا عَلَى الدُّنْيَا وَإِنَّ هَؤُلَاءِ الَّذِينَ بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ وَاللّٰهِ إِنْ يُقَاتِلُونَ إِلَّا عَلَى الدُّنْيَا وَإِنْ

ذَاكَ الَّذِي بِمَكَّةَ وَاللّٰهِ إِنْ يُقَاتِلُ إِلَّا عَلَى الدُّنْيَا"[1]

''حضرت ابو منہال رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جب ابن زیاد اور مروان رحمہما اللہ شام میں تھے، ادھر ابن الزبیر رضی اللہ عنہما مکہ میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور خارجیوں نے بصرہ پر قبضہ کر رکھا تھا تو میں اپنے والد کے ساتھ (سیدنا) ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم آپ کے گھر میں جب پہنچے ہیں تو آپ اینٹوں کے ایک سائبان کے نیچے تشریف رکھتے تھے، ہم آپ کے پاس جا بیٹھے اور میرے والد نے سلسلۂ گفتگو چھیڑنے کے لیے کہا: ''اے ابو برزہ! آپ دیکھتے نہیں کہ لوگوں نے کیا کر رکھا ہے؟'' تو پہلی بات جو میں نے آپ کے منہ سے سنی وہ یہ تھی: ''میں خدا لگتی کہتا ہوں کہ میں قریش کے گھرانوں سے ناراض ہوں'' عرب کے باشندو! تم جانتے ہو کہ تم ذلت وقلت اور ضلالت کے کس عالم میں تھے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے تمھیں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نجات دی، تا آنکہ تم اس مرتبہ تک پہنچ گئے جو تمھارے سامنے ہے، اب یہ دنیا ہے جس نے تمھیں تباہ کر رکھا ہے۔ یہ صاحب جو شام میں ہیں بخدا محض دنیا کے لیے شمشیر بکف ہیں اور یہ لوگ جو تمھارے درمیان ہیں (یعنی خارجی) بخدا یہ بھی محض دنیا کے لیے لڑ رہے ہیں اور یہ صاحب جو مکہ میں ہیں بخدا ان کے لڑنے کی غرض بھی محض دنیا ہے۔''

یہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نظریہ تمام اندرونی فسادات کے متعلق۔ ان کے نزدیک حق وصداقت کے یہ معنی تھے کہ آپس میں امن ہو اور کفار سے جنگ۔ اسی لیے وہ عموماً ان فسادات سے الگ رہتے تھے۔ رہے وہ حضرات جو خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے تو ان کے متعلق سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ وہ کہہ سکتے تھے جو انھوں نے کہا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الفتن (ص: ٢٣٠) طبع مصر

اپنی دانست میں یہ حضرات بھی اللہ کے لیے لڑے اور امت کی بھلائی کو پیشِ نظر رکھا، اگرچہ نتیجہ کچھ اور نکلا۔ اگر انھوں نے یہ اقدامات محض ذاتی ترفع کے لیے کیے تب بھی چونکہ ان کے نفس پاک تھے، اس لیے اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو بہرحال کام وہی کرتے جو اللہ اور رسول کی تعلیمات کے مطابق کرنا چاہئیں اور ہر مسلم حکمران کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اس سے ان امور کی توقع کی جاتی ہے۔

بہرحال سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے "غِلْمَةٌ مِنْ قُرَيْشٍ" سے مراد محض اموی نوجوانوں کو نہیں لیا، بلکہ ان سب کو لیا جو کفار سے جہاد کے بجائے آپس میں برسرِ پیکار تھے، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جونہی وہ ان فتنوں سے نکلے، انھوں نے داخلی امن اور خارجی ترقیوں کی راہیں کھولنے کی کوشش سے دریغ نہیں کیا اور اسی طرف لگ گئے جدھر اللہ و رسول نے لگایا تھا۔

ہمارا مقصد یہاں اس بحث میں الجھنا نہیں کہ قوانینِ شریعت کے مطابق کون حق پر تھا اور کس نے خطا کی، ہم تو محض اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ امت کے باہمی فساد میں محض بنو امیہ ہی مبتلا نہیں ہوئے اور نہ سبب بنے، بلکہ دوسرے اس میں برابر کے شریک ہیں اور اگر ایمان و دیانت سے تجزیہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بنو امیہ نے خود یہ جھگڑے نہیں اٹھائے، بلکہ انھیں ان فسادات میں گھسیٹا گیا۔

اس کے علاوہ ایک اور فرق ہے اور وہ بہت بڑا ہے کہ دوسرے لوگ تو باہم الجھ کر ناکام رہے اور سوائے فساد کے ان کی تحریکوں سے امت کو ظاہری یا باطنی کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، لیکن ساداتِ امویہ نے ان مفاسد کا قلع قمع کر کے اپنے عزائم کا رخ ان امور کی طرف کر دیا، جس کے نتیجے میں تین چوتھائی دنیا حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئی اور چار دانگِ عالم میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور یوں دنیا نے اپنی آنکھوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دیکھ لیا کہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے اور ایک سے ایک بڑا امام پیدا ہوا۔ ان اموی خلفا نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی ہی میں اسلام کو دنیا میں سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے چشم پوشی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے یا کسی قسم کے نسلی یا مذہبی تعصب نے ان کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔

لوگ وقت پر فخر سے کہا کرتے ہیں: ''تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا'' لیکن بوالعجبی یہ ہے کہ جن ائمۂ ہدیٰ کی سرکردگی میں اس سیل نے تندی اور ہمہ گیری پیدا کی انہی پر لعنت کی بوچھاڑ ہے اور ان کے لیے ایسے ایسے خطاب تجویز کیے جاتے ہیں کہ گویا دنیا نے ان سے بدتر حکمران کبھی نہیں دیکھے۔

کوئی شک نہیں کہ جن حضرات نے امویوں سے جنگ کی وہ اگر غالب رہتے تو ان کے ہاتھوں بھی ایسے ہی کچھ کام انجام پاتے جو اللہ تعالیٰ نے اموی خلفا رضی اللہ عنہم کے ذریعے کیے، لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان میں سے کسی کو عربوں کی حمایت حاصل نہ ہوتی، جو امویوں کو ہوئی اور یہی ہے امویوں کی کامیابی کا اصل راز۔

اگر اس وقت اموی خلافت کے بجائے ہاشمی خلافت قائم ہو جاتی، تب البتہ صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، کیوں کہ اس خلافت کو غدارانِ ملت اسی طرح گھیرے رہتے، جیسے سیدنا علی مرتضوی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو گھیر رکھا تھا۔ روز ایک فساد کھڑا ہوتا اور ہر شب ایک فتنہ جگایا جاتا۔ اسی حقیقت کو سیدنا حسن المجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا تھا، اگر آپ کو ذرا بھی اطمینان ہوتا کہ ان لوگوں کو یکسوئی حاصل ہو جائے گی تو ممکن ہے آپ خلافت سے دستبردار نہ ہوتے اور اجماع بھی آپ ہی پر ہو جاتا، لیکن ان لوگوں سے نجات کی صرف ایک ہی راہ تھی کہ زمامِ کار سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں چلی جائے، کیوں کہ اس تحریک کو کچلنے کی قدرت اللہ تعالیٰ نے انہی کو ودیعت فرمائی تھی۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اس نفسیاتی کیفیت کو جانتے تھے کہ جب تک زمامِ کار اہلِ بیت کے ہاتھ میں رہے گی یہ لوگ اپنی نمایشی عقیدت کی بنا پر انھیں گھیرے رہیں گے اور وہ فطرتِ بشریہ سے مغلوب ہو کر ان عقیدت مندوں کی باتوں سے چشم پوشی کیا کریں گے،

جس کا نتیجہ امت کے لیے ہلاکت آفریں ہوگا۔ اسی صورتِ حال کا نمونہ ہمیں آلِ بویہ کے اقتدار میں ملتا ہے اور یہی بات ہمیں ان دوسرے علاقوں میں نظر آتی ہے، جہاں ہاشمیوں کی کبھی حکومت قائم ہوئی۔

دیلمی لوگ حسن بن زید اور حسن بن علی الاطروش فاطمی (المتوفی ۳۰۴ھ) کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ انہی کی امامت کو اپنے لیے سرمایۂ نجات سمجھتے۔ یہ حسنی اور حسینی خاندانوں جن کے ہاتھ پر یہ لوگ مسلمان ہوئے تھے اور تعلیم و تلقین انھوں نے کی تھی۔ یہی حسن بن زید بن محمد بن اسماعیل بن الحسن بن زید رضی اللہ عنہ بن سیدنا الحسن رضی اللہ عنہ بن سیدنا علی رضی اللہ عنہ جنھیں یہ اپنا مقتدا کہتے تھے، ان کا محض دین ہی صفحۂ ہستی سے نہیں مٹا دیا گیا، بلکہ ان کی نسل بھی گمنام کر دی گئی۔ یہ حضرات سب کتاب و سنت کے پیرو تھے اور منہاجِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے وابستہ۔ سوائے چند حقیر فقہی مسائل کے اور کسی بارے میں عامۃ المسلمین سے ان کا اختلاف نہ تھا، صرف اپنے خاندان کی حکومت انھوں نے قائم کی تھی اور خلافتِ عباسیہ کے بھی کچھ ایسے حریف نہ تھے، جس سے اندازہ ہو کہ اس کے مقابلے میں کوئی تحریک چلا رہے ہیں، بلکہ محض خاندانی رقابت تھی۔ دائرۂ معارفِ اسلامیہ اردو میں الاطروش کے احوال ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں اور پتا لگ سکتا ہے کہ سوائے خاندانی سیاست کے اور ان کا مطمحِ نظر کچھ نہ تھا۔ اپنے عقائد و اعمال و نظریات میں وہ جماعت ہی سے وابستہ تھے، اگرچہ ان سے ملتِ اسلامیہ کو سوائے نقصان کے اور کچھ نہ ہوا۔ لیکن آلِ بویہ جس دین کے پابند تھے اس کا اہلِ بیت کے دین سے کچھ تعلق نہ تھا اور ان کی یہ کیسی سیاسی چال تھی کہ جنھیں اپنا امام کہتے تھے انھی کو نسیاً منسیاً کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ پھر جب ان لوگوں نے عروج پکڑا تو خلافتِ عباسیہ کو بھی فنا کرنے کی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ بظاہر تو خلیفہ کے دربار میں کرسی پر اس وقت بیٹھتے جب باصرار حکم دیا جاتا، ورنہ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے اور جب امتثالِ امر کے لیے بیٹھتے تو اول کرسی کو تعظیماً چومتے، لیکن

یہ سب دکھانے کی باتیں تھیں۔ حقیقی صورتِ حال یہ تھی کہ ادنیٰ ترین امور میں بھی خلیفۂ وقت فلاں الدولہ اور فلاں الدولہ کے احکام کا منتظر رہتا تھا اور یہ ہمت نہیں رکھتا تھا کہ ان کی خلاف ورزی کر سکے۔ اگر غیرتِ ملیہ کے تحت کچھ کرنا بھی چاہا تو اس کی چلنے نہ دی گئی۔

ایک معمولی سا واقعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ ۳۵۸ھ میں شاہِ روم نے شام پر حملہ کیا اور شہر کے شہر تباہ کر دیے، امیر المومنین المطیع للہ رحمہ اللہ کا زمانہ تھا، جو ضعیف ترین اور مجبور ترین خلیفہ گزرے ہیں۔ آپ نے جہاد کا حکم دیا۔ بغداد کے شہریوں میں سخت جوش تھا۔ امام ابو بکر القفال رحمہ اللہ نے ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں کی فوج تیار کی۔ معز الدولہ احمد بن بویہ کا بیٹا عز الدولہ بختیار اس وقت امورِ خلافت پر حاوی تھا اور اس عالم میں شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ مسلمانوں کو اس کی حرکت پر سخت طیش تھا۔ ایک وفد نے جا کر اسے ملامت بھی کی کہ مسلمانوں پر مصائب ٹوٹ رہے ہیں اور آپ شکار کھیل رہے ہیں۔ اس وفد کو اس نے اطمینان دلایا کہ جہاد کیا جائے گا، پھر اس نے قرب و جوار کے امرا کو لکھا، انھوں نے بہت سی امداد بھیجی، پھر اس نے امیر المومنین کے پاس پیغام بھیجا کہ جہاد کے لیے روپیہ مہیا کریں۔ انھوں نے فرمایا: ان امور پر خرچ کرنا میرے اوپر اس وقت تھا جب خزانہ میرے پاس ہوتا اور مسلمانوں کے امور کی نگرانی میرے ذمہ ہوتی۔ موجودہ صورت میں یہ ذمے داری میری نہیں، بلکہ اس کی ہے جس کے قبضہ میں ملک ہے۔ میرے نام کا صرف خطبہ ہے، یہ بھی گوارا نہ ہو تو مستعفی ہو جانے کو تیار ہوں، مگر وہ کسی طرح نہ مانا۔ بہرحال نتیجہ میں امیر المومنین نے اپنا مکان اور زیور اور کپڑے تک بیچ کر چار لاکھ درہم اس کو دیے۔ لیکن وہ یہ سب روپیہ ہضم کر گیا اور جہاد کا قضیہ ختم کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کی طاقت روز بروز بڑھتی گئی اور مسلمانوں پر ان کا رعب چھایا کہ اس کا تصور ہی تکلیف دہ ہے۔ کفار سے جنگ کے بجائے اس نے بنو حمدان پر حملہ کر دیا۔ بنو حمدان ہی میں امیر سیف الدولہ تھے جنھوں نے روم سے قتال کیا تھا اور پوری قوت سے ان کے مقابلے پر

ڈٹے ہوئے تھے۔ اور فتوحات بھی کی تھیں، لیکن اب ان کا انتقال ہو چکا تھا اور اس لیے بنو بویہ کے لیے نصرانیوں سے جنگ کرنے کے بجائے آلِ حمدان سے جنگ کرنا زیادہ ضروری تھا۔

معز الدولہ احمد بن بویہ وہ شخص ہے جس کے متعلق علامہ خضری لکھتے ہیں:

”هو أحمد بن بويه ـفاتح العراقـ وكان أصغر إخوته، وكان سلطان معز الدولة بالعراق مبدأ خرابته بعد أن كان جنة الدنيا“

”یہ احمد بن بویہ فاتح عراق ہے۔ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے۔ عراق میں معز الدولہ کی حکومت کی تباہی آنی شروع ہوئی (اور علاقہ ویران ہو گیا) حالانکہ یہ دنیا کی جنت تھا۔“

یہی شخص ہے جو چاہتا تھا کہ عباسیوں کی رسمی خلافت بھی ختم کر دے اور کسی فاطمی کو خلیفہ بنا دے۔ اس میں یہ طاقت تھی اور ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا، لیکن اس کے ندیموں میں سے کسی نے کہا: ”ایسا نہ کر، کیوں کہ اس وقت جو خلیفہ ہے اسے آپ اور اس کے ساتھی جائز خلیفہ نہیں سمجھتے، اگر آپ اس کے قتل کا بھی حکم دیں تو آپ کے آدمی اسے قتل کر دیں گے، لیکن اگر آپ نے کسی علوی کو مسندِ خلافت پر بٹھا دیا تو وہ ایسا شخص ہوگا جس کی خلافت کی صحت آپ کو بھی تسلیم ہوگی اور آپ کے ساتھیوں کو بھی، حتی کہ وہ اگر آپ کے قتل کا حکم دے گا تو آپ ہی کے ساتھی اس کی تعمیل کو تیار ہو جائیں گے۔“ لہٰذا وہ اس ارادے سے باز آ گیا اور صرف اتنا کیا کہ خلیفہ عباسی کے ہاتھ میں کسی قسم کی طاقت نہ رہنے پائے۔

اہلِ فکر اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک نہ ایمان کوئی چیز تھا اور نہ عقیدہ وعقیدت۔ یہی وجہ ہے کہ جن فاطمیوں کے ہاتھ پر وہ مسلمان ہوئے تھے ان کا بیج باقی نہ چھوڑا اور عباسی خلافت کو مٹا کر فاطمی خلافت بھی اس لیے قائم نہیں کی کہ پھر اپنی حکومت ذیلی ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ مقصد فاطمیوں کا ”حق“ دلوانا تھا اور نہ ”غاصبوں“ سے حکومت لینا، بلکہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی تخریب مطلب تھا، حالانکہ

یہی معز الدولہ ہے جس نے ماتمِ حسین جاری کیا، عیدِ غدیر منانے کی ابتدا کی اور بغداد کی مساجد پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں کے ساتھ لعنت کے الفاظ لکھوائے۔

یہ ہے ان کا اصل طریقہ کار کہ مسلمانوں کی نام نہاد فراخ دلی کے نتیجے میں اول یہ حکومت کے اعلیٰ مناصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور پھر ہر ممکن طریقے پر حکومت کو تباہ اور اسلام و ملت کو بدحالی کے آماجگاہ بنا دیتے ہیں۔ مشرق و مغرب میں تیرہ سو برس کی تاریخ چھوٹی بڑی مسلم حکومت کا یہی انجام ان کے ہاتھوں دکھاتی ہے۔ فاعتبروا یأولي الأبصار .

اگر امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں زمامِ کار نہ آتی اور ساداتِ امویہ پر ملتِ اسلامیہ کی قیادت کی ذمے داری اللہ تعالیٰ نہ ڈالتا تو پہلی ہی صدی ہجری میں اسلام اور مسلمانوں پر فاتحہ پڑھی جا چکی ہوتی۔

سیوطی نے بنو امیہ کی خلافت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ناپسندیدہ ثابت کرنے کے لیے وضعی احادیث تو لکھ دیں جن کے وضعی ہونے کا خود انھیں بھی اعتراف ہے لیکن تعجب ہے کہ ان کی نگاہ سے یہ صحیح احادیث نہیں گزریں جو درایتاً درست اور قابلِ قبول ہیں۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ (۸/۲۰) میں حافظ عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی روایت نقل کی ہے کہ صفین کے موقع پر ایک شخص نے کہا: ''اللھم العن أھل الشام'' ''خدایا اہلِ شام پر لعنت کر'' تو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لا تسب أھل الشام فإن بھا الأبدال، فإن بھا الأبدال، فإن بھا الأبدال''

''اہلِ شام کو برا مت کہنا، ان میں ابدال ہیں، ان میں ابدال ہیں، ان میں ابدال ہیں۔''

ایسی ہی ایک مرفوع حدیث ہے، سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"قال رسول الله ﷺ بينا أنا نائم رأيت الكتاب احتمل من تحت رأسي، فظننت أنه مذبوب به، فأتبعه بصري فعمد به إلى الشام، وإن الإيمان حين تقع الفتنة بالشام" [1]

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں سوتے میں دیکھتا ہوں کہ میرے سر کے نیچے سے کتاب اٹھا لی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کسی جگہ لے جایا جائے گا۔ چنانچہ اسی سمت دیکھتا رہا اس کا رخ شام کی طرف تھا۔ جب فتنہ بپا ہو گا تو اس وقت ایمان شام میں ہو گا۔"

ایسی ہی حدیث صحیح بخاری کی ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ: اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا وَفِي يَمَنِنَا، قَالَ: قَالُوا وَفِي نَجْدِنَا، قَالَ: قَالَ: اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا وَفِي يَمَنِنَا قَالَ: قَالُوا: وَفِي نَجْدِنَا قَالَ: قَالَ: هُنَاكَ الزَّلَازِلُ وَالْفِتَنُ وَبِهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ" [2]

"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ذکر کیا: خدایا ہمارے شام میں برکت دے، خدایا ہمارے یمن میں برکت دے، لوگوں نے عرض کی: اور ہمارے نجد میں یا رسول اللہ!؟ آپ ﷺ نے فرمایا: خدایا ہمارے شام میں برکت دے، خدایا ہمارے یمن میں برکت دے۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اور ہمارے نجد میں؟ آپ فرماتے ہیں: میرے خیال میں تیسری مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ادھر تو زلزلے اور فتنے ہیں اور وہیں شیطان سر اٹھائے گا۔"

---

[1] العواصم من القواصم (ص: ١٨٣)

[2] صحيح البخاري (٤/٢٢٧)، كتاب الفتن، طبع مصر.

ایسی ہی اور بھی احادیث ہیں۔ اہلِ بیتِ اطہار اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شام کو مہبطِ ایمان سمجھتے تھے اور ان کی نگاہیں اسی طرف مدد کے لیے اٹھتی تھیں۔ ہر فتنے میں انھوں نے دمشق ہی کی طرف دیکھا جو ساداتِ امویہ کی خلافت کا مرکز تھا۔ رضوان اللہ علیہم أجمعین.



امیر زیاد

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر نہایت دیدہ دلیری سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ناجائز طور پر شریعت کے بالکل خلاف ایک غیر شخص (یعنی زیاد) کو اپنے باپ کی اولاد بنا لیا۔ مسعودی کا بیان ہے:

”أن علياً كان وَلَّاه فارس حين أخرج منها سهل بن حُنَيف، فضرب زياد ببعضهم بعضاً حتى غلب عليها، وما زال يتنقل في كُوَرِهَا حتى صلح أمر فارس، ثم وَلاه على أصطخر، وكان معاوية يتهدد، ثم أخذ بُسر بن أرطاة عبيد الله وسالماً ولديه وكتب إليه يقسم ليقتلنهما إن لم يراجع ويدخل في طاعة معاوية، وكتب معاوية إلى بُسر ألا يعرض لأبُنيِ زياد، وكتب إلى زياد أن يدخل في طاعته وَيَرُدَّه إلى عمله، فقدم زياد على معاوية، فصالحه على مال وحلي، ودعاه معاوية إلى أن يستحلفه، فأبى زياد ذلك“

”(سیدنا) علی رضی اللہ عنہ نے انھیں فارس کی حکومت اس وقت دی جب وہاں کے لوگوں نے سیدنا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو نکال دیا تھا۔ زیاد نے وہاں پہنچ کر ایک دوسرے کو لڑا دیا، تا آنکہ خود غالب آ گئے اور پھر برابر ایک علاقے سے دوسرے علاقے کا دورہ کرتے رہے، یہاں تک کہ فارس کے احوال درست ہو

گئے۔ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں اصطخر کی بھی حکومت دے دی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ البتہ انھیں دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ پھر بسر بن ارطاۃ نے ان کے دونوں بیٹوں عبیداللہ اور سالم کو پکڑ لیا اور انھیں خط لکھا جس میں قسمیہ بیان کیا تھا کہ اگر انھوں نے اپنا سیاسی موقف نہ بدلا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت اختیار نہ کی تو انھیں قتل کر دیں گے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت بسر کو لکھا کہ زیاد کے دونوں بیٹوں سے کچھ سروکار نہ رکھیں اور زیاد کو خط بھیجا کہ وہ ان کی اطاعت کر لیں گے تو اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے۔ چنانچہ زیاد اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے اور ان سے کچھ مال اور زیور پر صلح کر لی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنا خویش بنانا چاہا تو زیادہ نے اس سے انکار کر دیا۔''

مولوی محمد اسلم جیراج پوری نے ''تاریخ الامت'' میں فرمایا کہ ''زیاد چونکہ شعیانِ علی میں نہایت طاقتور تھے، اس لیے معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنا بھائی بنا لیا۔ یہ ان کی سیاسی چال تھی، ورنہ حقیقتاً زیاد ابوسفیان کے بیٹے نہیں تھے۔''

علامہ خضری فرماتے ہیں:

"وفی سنة ٤٤ استحلق معاوية زيادا، الحقه بأبي سفيان لاعتراف كان من أبي سفيان بذلك، شهد به جمع، وكان معاوية قد كتب إلى زياد حياة علي يعرض له بولادة أبي سفيان إياه فلما علم بذلك علي كتب إلى زياد يقول له: إني وليتك ما وليتك، وأنا أراك له أهلا وقد كانت من أبي سفيان فلتة من أماني الباطل وكذب النفس لا توجب له ميراثاً ولا تحل له نسبا وأن معاوية يأتي الإنسان من بين يديه ومن خلفه وعن يمينه وعن شماله فاحذر ثم احذر والسلام. فلما قتل علي

رأى معاوية أن يستميل زياداً واستصفى مودته باستلحاقه“ [1]

”اور ۴۴ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو اپنا بھائی بنا لیا اور ان کا نسب ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ملا دیا، کیوں کہ اس بارے میں ابوسفیان کے اعتراف کا انھیں علم ہوا تھا اور بہت سے لوگوں نے اس کی گواہی دی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو خط لکھ کر یہ اطلاع دی تھی کہ وہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے زیاد کو خط لکھا: میں نے تمھیں جہاں کی حکومت دینی تھی دے دی اور میں تمھیں اس کا اہل سمجھتا ہوں۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے منہ سے اچانک ایک بات نکل گئی، باطل آرزو تھی اور نفس کا دھوکا تھا نہ اس سے میراث ثابت ہوتی ہے اور نہ اس طرح نسب صحیح ہوتا ہے، معاویہ وہ شخص ہیں جو آدمی کو آگے سے پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے گھیرا کرتے ہیں۔ لہٰذا خبردار رہنا، خبردار رہنا، والسلام۔ اس کے بعد جب (حضرت) علی رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو (حضرت) معاویہ رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ زیاد کو اپنی طرف مائل کریں اور ان کا تعلق قلبی استوار کرنے کے لیے انھیں اپنے نسب میں شامل کر لیا۔“

اب غور طلب امر یہ ہے کہ متفق علیہ قول کے مطابق امیر زیاد کے نسب کا اعلان ۴۴ھ میں کیا گیا، یعنی اس وقت جب امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ کو بیعت کیے ہوئے چار برس کے قریب ہو چکے تھے۔ تمام عالمِ اسلام امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت میں آچکا تھا اور امتِ مسلمہ کی تمام طاقت ان کی ذات پر مرکوز تھی۔ پھر تمام مورخوں کو اس سے بھی اتفاق ہے کہ نسب کے اعلان سے پہلے ہی امیر زیاد نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی تھی اور اپنے منصب پر واپس چلے گئے تھے، تو پھر وہ کونسا داعیہ تھا اور کیا مقصد ہوسکتا تھا جس کے لیے یہ

---

[1] محاضرات الأمم الإسلامية (۲/ ۱۰۲)

''سیاسی چال'' کھیلی گئی کہ انھیں ابوسفیان کا فرزند بنا لیا گیا اور جب نسب میں شامل کر لیا گیا تو وہ کون سے اعلیٰ مراتب اور دنیوی فوائد تھے جو امیر زیاد کو ان کی پہلی حالت سے زیادہ مل گئے اور امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی وہ کون سی پریشانیاں تھیں جو ان کے بھائی بنا لینے سے رفع ہوگئیں اور اس کے بغیر رفع ہی نہ ہوسکتی تھیں؟! مسعودی کا یہ بیان البتہ دلچسپ ہے کہ بسر کے ہاتھ میں لوگوں کو زیر کرنے کا ایک ہی کامیاب نسخہ تھا کہ معتوب کی اولاد کو قتل کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایسی معتبر شہادتیں ملیں جن سے معلوم ہوا کہ وہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں اور جاہلیت کے زمانے میں اس طریقے پر پیدا ہوئے تھے جو عرب میں صحتِ نسب کے لیے اس وقت مقبول تھا۔ شریعتِ اسلامیہ میں ایک آدمی کا نسب اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک وہ نکاحِ ابراہیمی سے پیدا نہ ہو۔ اس نکاح کے علاوہ باقی تمام صورتیں حرام ہیں اور آدمی کا نسب کسی دوسرے طریقے سے درست نہیں ہوتا، لیکن یہ احکام ہیں اسلام کے۔ انھیں جاہلیت پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا میں اس وقت بھی کروڑوں لوگ موجود ہیں جو اپنے رواج یا قانون کے مطابق ایسی عورتوں سے نکاح کرتے ہیں جن سے نکاح کا شریعتِ اسلامیہ میں کوئی تصور نہیں۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ہاں بیک وقت ایک عورت کے کئی کئی خاوند ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ لوگ اسلام لائیں تو کیا ان کی اولاد کو حرام کی اولاد کہا جائے گا؟ ہرگز نہیں! ان کا نسب درست ہوگا۔ اگرچہ نکاح باطل کر دیا جائے اور ناجائز ازدواج کو توڑ دیا جائے، یہ بالکل سیدھا اور صاف مسئلہ ہے۔

سیدنا زیاد رحمہ اللہ ایسے ہی ایک جاہلی دستور کے تحت عہدِ نبوی میں پیدا ہوئے تھے اور سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا اس بارے میں اعتراف ثابت ہے۔ الحاق سے پہلے سیدنا زیاد کا انتساب ان کی والدہ سمیہ کی طرف ہوتا تھا اور وہ ابن سمیہ کہلاتے تھے۔ کسی مرد کی طرف ان کا انتساب کبھی نہیں کیا گیا۔

حارث رضی اللہ عنہ بن کلدہ جن کی لونڈی یہ سمیہ تھیں اور ان کے غلام عبید جن کے ساتھ

انھوں نے سمیہ کا نکاح کر دیا تھا، ان دونوں نے کبھی زیاد کو اپنا بیٹا نہیں کہا، لہٰذا یہ تصور خود بخود باطل ہوگیا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی دوسرے شخص کے بیٹے کو اپنے باپ کا بیٹا بنا لیا۔ نہ انھیں اس کی ضرورت تھی اور نہ وہ ایسے بے حیا اور بے غیرت تھے کہ محض ''سیاسی چال'' سے ایک شخص کو اپنا بھائی بنا کر اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے لائیں اور نہ کسی کی اس وقت یہ حیثیت تھی کہ وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے سرتابی کر کے اپنی آزادانہ حکومت قائم رکھ سکے۔ نہ وہ اتنے کمزور تھے کہ فارس کو بزورِ شمشیر فتح نہ کر سکیں۔ نہ وہ فارس میں غیر مقبول تھے اور نہ زیاد اتنے مقبول کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو انھیں زیر کر لینا مشکل ہوتا۔ یہ کوئی آلِ بویہ کا زمانہ تھا کہ امام المسلمین بے دست و پا ہو؟! یہ زمانہ تھا دنیا کے عظیم ترین حکمران کا جس کی ٹکر کا ایک بھی حکمران دنیا میں نہیں تھا۔ لہٰذا یہ سب خرافات ولغویات اور مراسلہ بازی کی داستانیں محض برائے طعن وضع کی گئی ہیں نہ ۴۲ھ سے پہلے اس قسم کا کوئی اقدام کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف جو خط منسوب ہے اس کی کچھ اصل نہیں اور اگر کچھ اصل ہے تو انھوں نے خود ہی گواہی دے دی کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے بھی اعتراف کیا تھا۔

نسب کا تعلق اہلِ خاندان سے ہے اور اس بارے میں صرف انہی کی رائے مانی جا سکتی ہے۔ سیدنا زیاد رحمہ اللہ کا نسب امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان شہادتوں کی بنا پر قبول کیا، جن کی واقعیت اور صداقت آپ پر کھل گئی تھی۔

ان میں سب سے اہم شہادت سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی ہے۔ انھوں نے اپنے والد ماجد کے اعتراف کی توثیق کی تھی۔ پھر وہ لوگ ہیں جن کا ذکر المدائنی نے کیا ہے، یعنی حضرت منذر بن الزبیر رضی اللہ عنہ، حضرت مسور رضی اللہ عنہ بن قدامہ باہلی وغیرہما۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرب کے قاعدے کے مطابق ان شہادتوں کی بنا پر اس نسب کا اعلان کر دیا اور پھر زندگی بھر انھوں نے بلکہ نسلاً بعد نسلٍ ان کے خاندان نے ان کے بارے میں اپنا یہی موقف قائم رکھا۔ حضرت زیاد رحمہ اللہ کی اولاد کو اموی سادات نے اپنی

بیٹیاں دیں اور خود امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک فرزند کا نکاح ان کی بیٹی سے کیا۔

امیر زیاد کا نسب محض امویوں ہی نے تسلیم نہیں کیا، بلکہ تمام بنو عبدِ مناف نے اسے مانا اور اسی نسب سے انھیں یاد کیا۔ مشہور مورخ البلاذری جو امیر المومنین المتوکل علی اللہ رحمہ اللہ کے ندیم تھے، انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاشراف'' میں امیر زیاد کی اولاد کا تذکرہ اسی طرح کیا ہے جس طرح باقی اموی سادات کا، اور انھیں ''ابن ابی سفیان'' ہی لکھا ہے۔ اگر ان کا نسب بنو ہاشم کے نزدیک مسلم نہ ہوتا تو خلفا اس انتساب کی اجازت نہ دیتے۔

اسی طرح موطا امام مالک میں ان کا نام ''زیاد بن ابی سفیان'' ہی مرقوم ہے۔ فقہ اسلامی کی یہ عظیم ترین کتاب امیر المومنین عبداللہ المنصور رحمہ اللہ کے فرمان کے تحت مرتب ہوئی اور محض اس کی سماعت کے لیے امیر المومنین ہارون الرشید نے خلیفہ ہونے کے بعد مدینہ کا سفر کیا۔ تمام عالمِ اسلام میں دستورِ اساسی یہی موطا شریف ہے۔ ہسپانیہ میں بھی اسی پر مدار تھا۔ گویا بنو ہاشم اور بنو امیہ سب اس پر متفق ہیں کہ امیر زیاد رحمہ اللہ واقعی سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے فرزند تھے۔ اگر سیدنا زیاد رحمہ اللہ کا نسب بنو ہاشم اور اکابرِ امت کے نزدیک مسلم نہ ہوتا تو کیا امام مالک رحمہ اللہ اسے لکھتے؟ اگر یہ الحاق درست نہ ہوتا تو کیا اسلام کے عظیم ترین خلفا اس بدعت والحاق کو قبول کر لیتے جو شریعتِ اسلامیہ میں موجبِ لعن ہے؟

بڑی حیرت ہوتی ہے کہ لوگوں نے اموی اور ہاشمی سادات کو اتنا بے غیرت کیوں سمجھ لیا ہے کہ وہ اس معمولی حمیت سے بھی عاری ہوں جو ہر شریف آدمی میں ہوتی ہے۔ اور مزید حیرت یہ ہے کہ ہر کس و ناکس فتویٰ دینے کو موجود ہے اور جن کے گھر کا معاملہ ہے ان کے موقف کی کوئی حرمت ہی نہیں۔ گویا امویوں اور ہاشمیوں سے اپنے نسب پر بات کرنے کا حق بھی چھین لیا گیا۔

یہ سب ہاشمی اور اموی جب امیر زیاد کو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا بیٹا کہتے ہیں اور ان سے رشتے میں عار نہیں سمجھتے تو ان کی بات نہیں مانی جاتی۔ آلِ عبد مناف تو کہتے ہیں: ''زیاد

بن ابی سفیان‘‘ لیکن جنھیں سادات کے نسب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ان میں سے کسی کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ انھیں ’’زیاد بن ابیہ‘‘ کہے اور کوئی کہتا ہے: زیاد بن سمیہ۔

پھر جب یہی ہاشمی اور اموی سادات بالاتفاق مصر کے عبیدیوں کی فاطمیت کا انکار کرتے ہیں اور انھیں مجہول النسب بتاتے ہیں تب بھی ان کی بات نہیں مانی جاتی۔ گویا ان کا نسب بھی ان کا نہ رہنے دیا گیا کہ ہر کس و ناکس کو تو اس بارے میں بولنے کا حق ہے، لیکن نہیں ہے تو انھیں جن کے گھر کا معاملہ ہے۔

علامہ ابوبکر بن العربی نے اس موضوع پر العواصم من القواصم میں فقہی حیثیت سے بحث کی ہے، لیکن ہمارے نزدیک امیر زیاد کے نسب کے معاملے میں اس بحث کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاریخی حیثیت سے ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ بنو عبد مناف نے انھیں سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا فرزند تسلیم کیا اور ان سے وہی روابط رکھے جو ہم نسبوں میں ہوتے ہیں۔ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسا امام مجتہد جو فیصلہ فرمائے اس پر بولنے کا کیا موقع ہے؟ خصوصاً جب یہ فیصلہ اموی اور ہاشمی سادات کو تسلیم ہو اور بعد کے خلفا اس کی توثیق کریں اور امام مالک رحمہ اللہ اس کی تائید میں ہوں۔[1]



[1] فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اس مسئلے کی وضاحت میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل کی توضیح کرتے ہوئے ’’استلحاق زیاد‘‘ کی سرخی قائم کر کے لکھتے ہیں:

’’سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے دس آدمیوں نے اس امر کی شہادت دی کہ زیادہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا بیٹا ہے۔ ان گواہوں میں جلیل القدر صحابی سیدنا مالک بن ربیعہ سلولی رضی اللہ عنہ اور خود سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی جویریہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں۔‘‘ (خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت، صفحہ: ۵۴۱)

لعنت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہماری ہی طرح کے آدمی تھے اور ایسے ہی جذبات رکھتے تھے جیسے دوسرے سب انسان۔ ان سے غلطیاں ہوتی تھیں، خواہشاتِ نفسانی کا بھی زور ہوتا تھا، غصہ آتا تھا، رنج ہوتا تھا اور دلوں میں نفرت پیدا ہوتی تھی۔ غرض یہ ہے کہ سب اعراضِ نفسانیہ ان کے بھی ایسے ہی تھے جیسے بعد کے لوگوں کے۔

لیکن بعد کے لوگوں میں اور ان میں مرتبے کا فرق ہے اور اللہ تعالیٰ نے کھول کھول کر ان کا مرتبہ بیان کیا ہے، اس لیے ان کی انسانی کمزوریوں میں وہ پستی نہ تھی جو عام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور ان کی خوبیاں ان کی کمزوریوں پر حاوی تھیں۔ وہ اپنی غلط اندیشیوں میں بھی زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور تہذیبِ نفس کے داعیات کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کے سامنے ان کی گردنیں ہمیشہ خم رہیں۔ ان کی غلط روی بھی تاویلات کی بنا پر اجتہادی ہوتی تھی۔

ہر جگہ، ہر قوم اور ہر عصر کا یہ مشاہدہ ہے کہ مہذب اور غیر مہذب لوگوں میں خسیس اور پست جذبات کی نمود یکساں نہیں ہوتی، بلکہ وہی فرق ہوتا ہے جو ان کی ذہنی رفعت اور پستی کے تفاوت کا قدرتی نتیجہ ہونا چاہیے۔ ہاں بعض اوقات نہایت مہذب شخص نہایت بدتہذیب ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پستی کے عمیق ترین گڑھے میں گر گیا، لیکن پھر اس پر انفعالی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یہ ہے اس کی ذہنی رفعت کی اصل نمود۔ مہذب شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ جو غلطی اس سے ایک دفعہ ہو گئی ہے وہ دوبارہ سرزد نہ ہو۔

جب یہ حال ان تمام لوگوں کا ہے جن کی تربیت اچھے ماحول میں ہوتی ہے تو اندازہ لگانا چاہیے کہ جن بزرگواروں کی تربیت سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور قرآن حکیم کے انوار ان کے سینوں میں اتارے، ان کا اخلاقی معیار کتنا بلند ہوگا؟!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ [القلم: ٤]

''اور بلاشبہ یقیناً آپ ایک بڑے خلق پر ہیں۔''

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری بعثت کی غایت یہ ہے کہ میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔''

یہ تربیت آپ نے بدرجۂ اتم کی اور اپنے اصحاب کو اس بلند ترین مقام تک پہنچا دیا کہ اللہ تعالیٰ بطورِ امرِ واقعہ خود انہی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴿۷﴾ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [الحجرات: ٧، ٨]

''اور لیکن اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔ اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کی وجہ سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

یہ تو ہے اللہ کی بیان کی ہوئی صفت، لیکن دشمنانِ دین وملت نے جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اور بہت سے بہتان رکھے ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ وہ بطورِ شعار ایک دوسرے پر لعنت کیا کرتے تھے اور اسے اپنی زندگی کا اصول بنا لیا تھا۔ دراصل یہ خود ان افترا پردازوں کی اپنی ذہنیت ہے، یعنی بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کے آئینے میں انھیں بس اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔

ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کی روایت ہے کہ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) پر لعنت شروع کی تھی اور نماز میں ان کے لیے بددعا کیا کرتے تھے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے بھی لعنت کا یہ سلسلہ شروع کر دیا۔ خصوصیت کے ساتھ جمعہ کے خطبے میں یہ نیک کام ہوا کرتا تھا۔

لوگوں نے ان کذابوں اور افترا پردازوں کی جیسے اور بہت سی باتیں قبول کر کے انھیں تاریخی مسلمات بنا دیا ہے ایسے ہی یہ لعنت کی بات بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ امیر المومنین عمر ثانی رحمہ اللہ نے جہاں باقی ''اموی بدعتیں'' مٹائیں وہاں اس بدعت کو بھی ختم کر کے حکم دیا کہ خطبوں میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی جایا کرے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ [النحل: ۹۰]

''بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت والے کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور سرکشی سے منع کرتا ہے، وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

ممکن ہے یہ آیت امیر المومنین عمر ثانی ہی نے خطبے میں داخل کی ہو، لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ پسِ منظر یہی تھا جو بیان کیا جاتا ہے۔ اسے عام اخلاقی سبق کیوں نہ سمجھا جائے جس کی ضرورت ہر عہد اور ہر طبقے کے لیے ہے۔ شریف رضی اور شریف مرتضیٰ وغیرہما کے ہفوات سے قطع نظر اور ابن ابی الحدید کے جذبات و خیالات سے بھی، جنھوں نے ان دونوں کی تصنیف، نہج البلاغہ کو امیر المومنین اور سید المتقین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کر کے شرح کرنے کی تکلیف کی، ہمارے پاس سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کردار دیکھنے کے اور ذرائع بھی تو ہیں جن کا قابلِ اعتبار ہونا معلوم ہے۔

ہم کیسے کہہ دیں کہ آپ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوتی رہتی تھی جو ایک معمولی

مہذب آدمی سے بھی نہیں ہوتی۔

نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ احد میں جو ظاہری اور باطنی صدمے اٹھائے تھے کہ پوری دعوت خطرے میں پڑ گئی تھی، اس کی وجہ سے آپ نے حربی کفار کے لیے بددعا کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی: ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ﴾ [آل عمران: ۱۲۸] ''تیرے اختیار میں اس معاملے میں کچھ بھی نہیں۔'' یہ واقعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں دیکھا تھا۔ تو سوچنا چاہیے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے مومن اور مقبول بارگاہِ مصطفوی پر نماز میں بددعا یا خطبوں میں لعنت کرتے وقت یہ فرمانِ الٰہی آپ کی آنکھوں سے کیسے اوجھل ہو سکتا تھا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ﴾ [آل عمران: ۱۳٤]

''اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔''

تو پھر جو شخص ایمان کے بلند ترین درجے پر ہے وہ کیا معمولی امتیوں سے بھی گیا گزرا ہو گیا؟!

جنگِ صفین کے علاوہ سیدنا علی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان کوئی تلخ بات نہیں ہوئی اور سب جانتے ہیں کہ یہ جنگ کیسے چھڑی اور کس طرح ختم ہوئی۔ عین جنگ کے زمانے میں بھی آپ نے ایک شخص کو اہلِ شام پر لعنت کرنے سے روک دیا اور پھر جنگ بند کر کے صلح کی شرائط کی پوری پاسداری کی تو اب یہ کیسی عجیب بات ہو گی کہ جنگ تو بند کر دی جائے، لیکن لعنت کا سلسلہ جاری رہے۔

ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اہلِ شام اور ان کے امام کے کردار کی رفعت کا اپنے گروہ کی بدکرداری سے مقابلہ کر کے آپ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ غلبہ اہلِ شام کو ہو گا تو کس طرح ممکن ہے کہ جس منبر سے آپ اہلِ شام کی ثنا کریں، اسی منبر سے ان کے لیے بددعا بھی کرتے رہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ملعون تھے تو اس لعنت کی زد سب سے زیادہ خود ان کے فرزند جگر گوشۂ مصطفیٰ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ پر پڑتی، جنھوں نے ایک ''ملعون'' شخص کے ہاتھ

میں ہاتھ دے کر اپنے جدِ امجد ﷺ کی امت کی زمام اسے سپرد کر دی۔ نعوذ باللہ من ذلک

صفین میں جو قتال ہوا، ویسا ہی قتال جمل میں بھی ہوا تھا، جو فعل سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا تھا وہی فعل بعینہٖ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ان کی جماعت کا تھا رضی اللہ عنہم۔ کوئی نہیں کہتا کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اصحابِ جمل پر لعنت کی تو پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایسا کیا قصور تھا کہ انھیں لعنت کے لیے خاص کر دیا جائے اور کیسے سمجھ لیں کہ جس شخص کے ہاتھ میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ دیا تھا وہ ان کے والدِ ماجد کے نزدیک ملعون تھا۔ نعوذ باللہ من شر الشیاطین.

ہم جانتے ہیں کہ باہمی نزاع کے دوران سیدنا عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شام چلے گئے تھے، انھیں اپنے سگے چھوٹے بھائی کی سیاست سے اختلاف تھا اور امت کی فلاح وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمتِ عملی میں سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی اختلاف سے ان کے برادرانہ جذبات تو سرد نہیں پڑ گئے تھے۔ کیا کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر لعنت ہو اور نمازوں میں ان پر بددعا کو شعار بنا لیا جائے اور سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ اسے برداشت کر لیں۔ اگر روکنے کی طاقت نہ تھی تو وہاں سے چلے تو آ سکتے تھے، جو لوگ جاہلیت میں سرورِ عالم ﷺ کو اذیت پہنچانا برداشت نہ کر سکتے تھے تو وہ اسلام میں کیسے برداشت کر لیتے کہ محبوبِ خدا اور رسول پر لعنت کی جائے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہو چکنے کے بعد سیدنا حسین، سیدنا عبداللہ بن جعفر، سیدنا عبداللہ بن عباس سیدنا محمد بن علی بن ابی طالب اور اجلہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین برابر دمشق جاتے رہتے تھے اور مہینوں وہاں قیام رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نمازیں امیر المومنین ہی کے ساتھ پڑھتے ہوں گے، پھر اس کا امکان کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ حضرات سامنے بیٹھے ہوں اور منبر پر سے درود و سلام کے بجائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دی جا رہی ہوں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ نماز میں تو کہیں اللّٰھم صلّ علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد اور منبر

پر لعنت کریں اور وہ بھی اس پر جو سرخیلِ آلِ محمد ﷺ ہے۔ اگر ایک دفعہ بھی ایسا ہوا ہوتا تو ان میں سے پھر کوئی دمشق کا رخ نہ کرتا اور بنو ہاشم کی طرف سے بنوامیہ کی اس طرح حمایت ہوتی جیسے ہوئی، کہ بنو ہاشم ہر اس شخص کے خلاف رہے جو اموی خلافت کے خلاف ہوا۔

بے شک صحاح میں دو ایک روایتیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو برا کہا جائے اور صحابہ نے اس پر انھیں ٹوک دیا۔ لیکن روایتاً یہ احادیث ناقابلِ قبول ہیں۔ جو حضرات ان روایات کو قبول کرتے ہیں اور صحیح مسلم میں ہونے کی بنا پر انھیں رد کرنے کی جرات نہیں کرتے، وہ بھی توجیہ و تاویل کیا کرتے ہیں، کیوں کہ انھیں مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہوا ہو۔

بات یہ ہے کہ عملی سیاست میں جذبات بھڑک جایا کرتے ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دور میں مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء میں اختلاف تھا۔ اس زمانے میں مولانا آزاد، مولانا حسین احمد اور قائداعظم رحمہ اللہ کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ موجودہ نسل کے لوگ سب باتیں جانتے ہیں۔ تقریروں کی یادداشتیں اور اخبارات کے اداریے مخالف گروہ پر سب وشتم سے بھرے ہوئے ہیں، لیکن یہ سب نیچے درجے کے لوگوں کی باتیں ہیں۔ ویسے اب بھی جب تحریک پر بحث ہوتی ہے تو چوٹیں ہو جاتی ہیں، لیکن کیا اس حرکت کو مذہب اور شعار بنا لیا گیا ہے کہ بزرگانِ پیشین کا نام عزت سے نہ لیا جائے؟!

جب ہمارا یہ حال ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد دونوں ملکوں میں بزرگوں کی حرمت بحال ہورہی ہے تو ہم کیسے سمجھ لیں کہ بہترین زمانے کے لوگ اخلاقاً ہم سے بھی پست تھے؟!

ہوا ہوگا کچھ تو صلح کے بعد ختم ہو گیا ہوگا اور ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اسے شعار بنا لیا گیا ہو۔ ان کے پہلے اور بعد کے تعلقات کی روشنی میں کبھی نہیں مانا جا سکتا کہ سات روز کی بات دلوں میں ایسی بیٹھ گئی کہ نکل نہ سکی اور طرفین یوں تو باہم بغل گیر ہوتے تھے، لیکن نماز پڑھتے میں ایک دوسرے پر لعنت کیا کرتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جمل وصفین پر

طرفین کو ہمیشہ ندامت رہی اور ان کے دلوں میں بار بار ہوک اٹھتی تھی کہ کاش یہ جنگیں نہ ہوتیں، جو محض اشرار کی ریشہ دوانیوں سے بپا ہوئیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ، رسول اللہ ﷺ، دعوتِ محمدیہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دشمنوں کو اپنا ایک شعار زندہ رکھنا تھا کہ دل سے یہ بات محو نہ ہو سکے کہ ہمارا اصل کام ہے مسلمانوں کا دین مسخ کرنا، ان میں افتراق قائم رکھنا، ان کی حکومتوں کو مٹانا، ان کے ممالک کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی پریشانیوں میں مبتلا رکھنا، ان کے نوجوانوں کی زندگیوں کو سلف صالحین سے بدظن کر کے بے روح بنانا، اور ان کے عوام کے دلوں میں ہمیشہ یہ کھرچن پیدا کرتے رہنا کہ جس دین کے داعی ایسے پست تھے وہ دین قابلِ اتباع کب ہے، اسی لیے انھیں تاریخِ اسلام میں کربلا و صفین کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا اور ان کے نزدیک سوائے علی و معاویہ اور حسین و یزید کے کوئی آدمی ہی نہیں گزرا، جس کا ذکر کیا جائے۔

بزرگوں نے تو آپس میں صلح کر لی، تلخیوں کا کفارہ ادا کیا، مگر جو ناخلف ہیں وہ برابر فتنوں کو ہوا دیے جا رہے ہیں۔ سبائیوں کے ہاں لعنت کرنا ویسے تو بارہ مہینے کا وظیفہ ہے اور پانچوں نمازوں کا، بلکہ پانی پیتے وقت کا بھی۔ لیکن شعبان کی پندرہویں شب اس کارِ ثواب کے لیے مخصوص ہے۔ اس شب کی عبادت کی برکت و نورانیت کا ظہور ہی نہیں ہوتا، جب تک صحابہ پر عموماً اور آلِ ابی سفیان اور آلِ مروان پر خصوصیت کے ساتھ لعنت نہ کر لی جائے۔

لیکن سنت اللہ یہ ہے کہ ان کی تدبیریں وقتی رہتی ہیں اور ہر ٹھوکر کے بعد مسلمان پھر سنبھل جاتے ہیں اور ملت کی کشتی بہرحال بھنور سے نکل ہی جاتی ہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ [الحشر: ۱۰]

''اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے

والا، نہایت رحم والا ہے۔‘‘

امت کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا ہے کہ ایک عصر میں اگر تلخی پیدا ہوئی، جذبات میں ہیجان ہوا تو بعد کے لوگ اس اختلاف کو ہوا نہیں دیتے اور ایسی صورتیں پیدا کرتے ہیں کہ وحدتِ امت فنا نہ ہونے پائے اور اخلاف کے دل اسلاف سے صاف رہیں، لیکن جنھوں نے نبی اکرم ﷺ سے رشتہ توڑ لیا اور جماعت سے کٹ کر اپنی ٹولی الگ بنانے پر مصر رہے ان کی گفتگو ہمیشہ اختلاف ہی پر ہوتی ہے۔

سادات اموی ہوں یا ہاشمی اور ہاشمیوں میں عباسی ہوں یا فاطمی وہ ہمیشہ جماعت سے وابستہ رہے اور ہر آن ملت کی بہبود کو پیشِ نظر رکھا۔ ان کے مابین نہ دین کا کوئی اختلاف کبھی رہا اور نہ عزائمِ ملیہ کا، ضروریاتِ دین اور تقاضا ہائے ملت پر سب ہمیشہ متفق رہے۔ آپس میں کچھ سیاسی اختلاف ہوا، حکومت کے لیے باہمی نزاع ہوا، لیکن یہ محض ذاتی معاملات رہے، جس طرح غیر سیاسی لوگوں کے باہمی زر زمین کے نزاعات ہوتے ہیں، ایسے ہی ان کے سیاسی تنازعات تھے۔ امویوں اور ہاشمیوں میں نیز عباسیوں اور فاطمیوں میں۔ جن سیاسی چپقلشوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے، ایسے ہی جھگڑے خود امویوں امویوں میں، ہاشمیوں ہاشمیوں میں، عباسیوں عباسیوں میں اور فاطمیوں فاطمیوں میں بھی ہوتے رہے، لیکن یہ محض ذاتی معاملات تھے، ان کا تعلق نہ دینی اختلاف تھا، نہ نظامِ سیاسی میں تبدیلی سے اور نہ ملتِ اسلامیہ کے مقاصد بدلنے سے۔ سب کتاب و سنت ہی کی بات کرتے تھے، اور یہ ثابت کرنے کے درپے ہوتے تھے کہ زمامِ کار ہمارے ہاتھ میں آئے گی تو ہم ان مقاصد کو زیادہ موثر بنا سکیں گے۔ حالانکہ ہوا کچھ بھی نہیں جو حکومت امویوں کی تھی وہی عباسیوں کی رہی، اور جو عباسیوں کی تھی وہی فاطمیوں کی بھی رہی۔ نہ احکام بدلے اور نہ ان احکام کو بروئے کار لانے میں کوئی تبدیلی ہوئی۔ امویوں کی، عباسیوں کی اور فاطمیوں کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں سب ہمارے سامنے ہیں، اور جس طرح ان حکومتوں کو چلایا گیا وہ بھی۔ اعتراض کی جو بات نظر

آتی ہے اسی کو ہر جگہ قابلِ اعتراض کہا گیا، جو خوبی ایک جگہ دکھائی دی اسی کو ہر جگہ خوبی کہا گیا۔ جب مدار کتاب وسنت پر ہو اور معیار اخلاقِ نبوی ہو تو اس سے باہر آدمی کیسے جا سکتا ہے، لیکن یہ باتیں صحیح النسب سادات کی ہیں۔ مدعیوں اور کذابوں کا منہاج دوسرا رہا۔

خلیفہ اموی ہو یا ہاشمی، ہمیشہ ان کے فرامین ہوتے تھے: "من عبد الله عبد الملك أمير المؤمنين إلى فلان" ''اللہ کے بندے عبدالملک امیر المومنین کی طرف سے فلاں شخص کے نام۔'' "من عبد الله هارون أمير المؤمنين إلى فلان" ''اللہ کے بندے ہارون امیر المومنین کی طرف سے فلاں شخص کے نام۔'' اور ہر فرمان کا مقصد ہوتا تھا کسی برائی کو روکنا، کسی اچھائی پر زور دینا اور تقویٰ کی تلقین کرنا۔ فرمان کا یہ منہاج فاروقی ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی طرح لکھا کرتے تھے: "من عبد الله عمر أمير المؤمنين".

لیکن جو لوگ کسی نسب کا ادعا کر کے اپنے تخریبی مقاصد کے لیے کھڑے ہوئے ان کا وہ عالم ہوتا تھا جو عبیدیوں کا مصر میں تھا کہ اپنے آپ کو الٰہی صفات کا حامل ثابت کرنے کے درپے ہوئے۔ جیسے الحاکم، کہ جہاں کہیں اس کا نام لیا جائے گا لوگوں کو سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ اسی طرح ایک صاحب امیر المومنین المکتفی باللہ کے زمانے میں فاطمی بن کر سامنے آئے اور اپنے گال پر ایک تل دکھایا کہ یہ علامت ہے اللہ کی طرف سے مقرر ہونے کی۔ اور اس طرح ذوشامہ کہلائے۔ عوام کو اپنی مصنوعی فاطمیت کے جال میں پھنسا کر بڑی قوت حاصل کر لی۔ یہاں مناسب ہے کہ آپ کا بھی ایک فرمان نقل کیا جائے جو آپ نے اپنے ایک والی کے نام بھیجا تھا:

"من عبد الله أحمد بن عبد الله المهدي المنصور بالله الناصر الدين الله القائم بأمر الله الحاكم بحكم الله الداعي إلى كتاب الله، الذاب عن حرم الله، المختار من ولد رسول الله، أمير

المؤمنين وإمام المسلمين ومذل المنافقين خليفة الله على العالمين وحاصد الظالمين وقاصم المعتدين ومبيد الملحدين وقاتل القاسطين ومهلك المفسدين وسراج المبصرين وضياء المستضيئين ومشتت المخالفين والقيم بسنة سيد المرسلين وولد خير الوصيين ﷺ وعلى أهل بيته الطيبين كثير إلى جعفر بن حميد الكردي سلام عليك"

"منجانب بندۂ خدا احمد بن عبداللہ مہدی، خدا کی مدد سے کامیاب ہونے والا، اللہ کے دین کا مددگار، اللہ کے حکم کا پیرو، اللہ کے حکم سے حکومت کرنے والا، اللہ کی طرف بلانے والا، اللہ کے حرم کی حرمت قائم کرنے والا، رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے منتخب شدہ، اہلِ ایمان کا امیر اور اہلِ اسلام کا امام، منافقوں کو ذلیل کرنے والا، تمام جہانوں پر خدا کا نائب، ظالموں کا قلع قمع کرنے والا، ظلم کرنے والوں کی کمر توڑنے والا، ملحدوں کو فنا کرنے والا، انصاف دشمنوں سے لڑنے والا، مفسدوں کو تباہ کرنے والا، دیکھنے والوں کے لیے چراغِ (ہدایت) اور نور حاصل کرنے والوں کے لیے روشنی، مخالفوں کو پراگندہ کرنے والا، سید المرسلین کی سنت قائم کرنے والا اور اس کا بیٹا جو سب وصیتوں سے بہتر ہے (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) اللہ اُن پر اور ان کی اولاد پر بہت درود وسلام بھیجے۔ بجعفر بن حمید کردی، سلام علیك."[1]

اپنے قلم سے اتنے بہت سے القاب اپنے لیے لکھنے والے صاحب کے کارنامے یہ ہیں کہ حاجیوں کے قافلے لوٹا کرتے تھے اور دو دفعہ جب اس طرح خدا اور نائبِ حقیقی نے سنتِ رسول اللہ ﷺ یوں قائم کر لی تو گرفتار ہو کر کیفرِ کردار کو پہنچے اور ان کے ساتھی فی النار والسقر کر دیے گئے۔ یہی حال ان بنے ہوئے فاطمیوں کا ہے جو سبائیہ کے ایک گروہ سے تعلق

---

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية، الدولة العباسية (ص: ٢٣١)

رکھتے ہوں یا دوسرے سے۔

رہے صحیح النسب ساداتِ فاطمیہ تو وہ کوئی یہی پچیس تیس آدمی نہیں تھے جنھوں نے وقتاً فوقتاً امامِ جماعت کے خلاف خروج کر کے اپنی خلافت کی ڈول ڈالنی چاہی اور کبھی کچھ کامیابی حاصل کر لی اور کبھی ناکام رہے۔ یہ سادات سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ سب جماعت سے وابستہ رہے اور خروج کرنے والوں کی حرکتوں سے بیزار۔ یہ خروج کرنے والے بھی جب کہیں کامیاب ہو گئے تو اسی کتاب اور سنت کو انھوں نے اپنا دستورِ حیات بنایا۔ جو لوگ کھڑے ہوئے اور ناکام رہے تو ان کی اپنی طرف سے دین پر کوئی زد نہیں پڑی۔ اور سوائے سیاسی اختلال کے امت کو ان کی ذات سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس لیے نہ ان کے ہاں لعنت کا کبھی دستور رہا اور نہ بغض و عداوت جاری رکھنے کا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، امیر المومنین یزید رحمہ اللہ کے بعد امیر المومنین معاویہ ثانی رحمہ اللہ، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا علی زین العابدین وغیرہ ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ انھیں نہ مخالف سے کوئی دینی اختلاف تھا اور نہ خاندانی رقابت اور نہ باہمی بغض و نفرت، تو پھر کیسے باور کر لیا جائے کہ یہ ایک دوسرے پر لعنت کو اپنا شعار جانتے تھے کہ بغیر اس کے جذباتِ دلی کا اظہار ہی نہ ہو سکے؟! اس قسم کی تمام مکروہات کو ان لوگوں نے اپنا شعار بنا لیا جن کا ان بزرگواروں سے نہ دین کا تعلق ہے اور نہ نسب کا۔ یہ ملتِ اسلامیہ کے باہر کے لوگوں کی حرکتیں ہیں جو جماعت سے الگ ہو گئے اور اسلافِ کرام کا منہاج چھوڑ چکے۔ لہٰذا یہ جو چاہیں بکواس کرتے پھریں، مسلمانوں کو ان سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اور جو صحیح النسب سادات اس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں تو انھیں بھی سوچنا چاہیے کہ ان پر سب سے زیادہ وفاداری سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت سے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی جماعت سے۔



اسلام کا دستورِ سیاسی

سیاسیاتِ اسلامیہ اور نظامِ خلافت پر جب بحث ہوتی ہے تو خود بخود دستورِ اسلامی کا ذکر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں تو یہ مسئلہ بہت ہی معرکۃ الآراء بن گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دستور، قانون اور شعائر کے فرق پر غور نہیں کرتے۔

دستور نام ہے اجتماعی سیاسی نظام کا۔ مملکت کی تشکیل کس طرح ہو، اربابِ حل وعقد کیسے برسرِ اقتدار آئیں، سرِ حکومت کیونکر اور کن اختیارات کے ساتھ زمامِ کار سنبھالے، نظام کے کتنے شعبے ہوں اور ان کے تحت کن کن امور کا کس طرح انصرام ہو۔ فرد اور جماعت کے حقوق کی تعیین اور پھر ان کے تحفظ کے وسائل کس طرح موثر بنائے جائیں، یہ اور اسی قسم کے امور دستور میں بیان ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ہیں قوانین، جن کے تحت جرائم کا سدِ باب کیا جاتا ہے۔ آمد وخرچ کی جائز و ناجائز صورتیں مقرر کی جاتی ہیں۔ وراثت کی تعیین اور تقسیم کے اصول و حدود مرتب ہوتے ہیں۔ معاشرے کی طہارت اور ترقی کے اسباب متعین کیے جاتے ہیں۔ یہ اور ایسی ہی باتیں قوانین کے تحت آتی ہیں۔

اجتماعی نظام کی ایک روح ہوتی ہے جو ظاہراً و باطناً تمام اصول وقواعد اور مقاصد میں جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ اس روح کے مظاہر کو شعائر کہا جاتا ہے اور بجائے خود اگرچہ ان شعائر کی کچھ اہمیت نہیں ہوتی، لیکن چونکہ ان میں نمود ہوتی ہے روح کی اس لیے شعائر کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ شعائر ہی ہیں جو ایک دعوت کے علمبرداروں کو دوسری

دعوتوں کے اتباع سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان شعائر کے تحت آتے ہیں لباس کے، وضع قطع کے، کھانے پینے کے، رنج وخوشی منانے کے، آپس میں ملنے جلنے اور ملاقاتوں کے آداب، اور جذبات و خیالات کے اظہار کے لیے ایک مشترک زبان کو اختیار کرنا اور ایسے امور کی پابندی کرنا جو اپنی وحدت اور دوسروں سے مغایرت کا سبب بنے۔

آج کل مغرب زدہ لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اسلام کوئی ڈاڑھی اور کپڑوں میں ہے؟ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دعوتِ محمدیہ کے پیرو اگر اپنے امتیازات قائم نہ رکھیں گے تو نصاریٰ اور ہنود سے کیسے پہچانے جائیں گے اور جب ان کا ظاہر روحِ اسلامی سے مطابقت نہیں رکھے گا تو ان کے نفس پر روح طاری کیسے ہوگی۔ اور وہ کیسے اس چیز کو ہر وقت اپنے اوپر مسلط رکھ سکیں گے کہ ہماری زندگی کے کچھ مقاصد ہیں، اور وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں۔ ہم ایک عالمگیر برادری ہیں جس کا مقصد ہے دوسروں کو اپنے اندر جذب کرنا نہ کہ خود دوسروں میں جذب ہوکر اپنی حیثیت کھو دینا۔

ہم یہاں صرف دستور کے متعلق بحث کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ان تمام مآخذ کو دیکھنا جن کی روشنی میں دعوتِ محمدیہ کے کل مسائل طے کیے جاتے ہیں، یعنی کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ، اجماعِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، قیاس اور امت کا عملِ متواتر جو بغیر انقطاع عہدِ نبوی سے اب تک چلا آ رہا ہے۔

کتاب اللہ:

قرآن حکیم آخری کتاب ہے۔ اب انسان کو خدائے عزوجل کی طرف سے کوئی اور ہدایت نامہ نہیں دیا جائے گا۔ اس کتاب میں زندگی کے نظریات اور اصول بیان کیے گئے ہیں۔ کسی مسئلے کا کوئی جزئیہ بھی بیان ہوا ہے تو نظری اعتبار سے۔ کسی عمل کی بات ہے تو وہ محض علمی اور نظری حیثیت سے ہے۔ جن اصحاب کو قرآن حکیم کے صحیح مطالعے کی سعادت نصیب ہوئی ہوگی تو انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اس میں عملی امور کا ذکر اس طرح ہے جیسے

جانی پہچانی چیزوں کا ہوتا ہے، برخلاف اس کے عقائد و نظریات خوب کھول کھول کر تفصیلاً بیان کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن حکیم کو ﴿ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ﴾ اور ﴿ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴾ فرمایا ہے، یعنی ہر چیز کو تفصیلی طور پر کھول کھول کر بیان کرنے والی اور نظری حیثیت سے اس میں کوئی مسئلہ تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ نماز، زکات، حج، طہارت، وراثت، نکاح اور محاصل وغیرہ امور کی ایسی تفصیل قرآن مجید میں نہیں کہ آدمی محض قرآن سے یہ سب عملی باتیں معلوم کر سکے۔ اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کرے گا تو سوائے گمراہی اور خبط کے اسے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا منشا محض انسان کی ذہنی تربیت ہے۔ عمل کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس سے اس لیے تفصیلی بحث نہیں کرتا کہ یہ تفصیلات بیان کرنے کی ذمے داری رسول اللہ ﷺ پر ہے۔ یوں دینِ محمدی کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ پر رکھی گئی۔ آپ ایک بے اختیار پیغمبر نہیں ہیں جیسا کہ بعض احمق اور جاہل لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ آپ آمر ہیں، شارع ہیں، معلم ہیں، مفسر ہیں، امام ہیں اور منشائے الٰہی سمجھنے کا وسیلہ ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [الجمعة: ٢، ٣]

”وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔ اور ان میں سے کچھ اور لوگوں میں بھی (آپ کو بھیجا) جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ تھی کہ تمام جہانوں کا آخری رسول اس نے عربوں میں

پیدا کیا جن کا کوئی ثقافتی سرمایہ نہ تھا اور جو دنیا سے الگ تھلگ اپنی خودی میں مخمور زندگی بسر کررہے تھے، تاکہ جو نقش ان کے دل پر بیٹھے وہ اتنا گہرا ہو کہ جب قوموں کی ثقافتوں سے ٹکرلیں تو اپنا کچھ نہ کھوئیں، بلکہ دوسروں کو اپنی برکات سے مستفیض کریں اور الحق کہ ایسا ہی ہوا۔ نبی اکرم ﷺ کی بنائی ہوئی جماعت ہی ہے جو اقوامِ عالم کے ذہنی ارتقا کا اصل سبب بنی۔ اور تنگنائے قومیت سے انھیں نکال کر بین الاقوامی زندگی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ اور اس طرح کہ تمام دنیا کی مہذب و متمدن قومیں چھوٹے بڑے ہر مسئلے میں محمدی زاویۂ نگاہ سے اپنی اصلاح کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ سب کچھ ہرگز نہ ہوسکتا تھا، اگر اپنی جماعت کی تعلیم و تربیت اور امامت نبی کریم ﷺ نے نہ کی ہوتی۔ اگر آپ محض قرآن پڑھ کر سنا دیتے تو اس کا کچھ بھی نتیجہ نہ ہوتا۔ یہ چھپا ہوا قرآن اب بھی موجود ہے اور لوگ اسے پڑھ کر جس طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں اس کا نقشہ ہمارے سامنے ہے۔

گویا صاف ہوگیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یونہی سمجھا تھا کہ قرآن نظر ہے اور سنت عمل۔ اس قرآن مجید میں جابجا ''اولی الامر'' کا ذکر ہے، ان کی اطاعت کا حکم ہے، خلافت و حکومت کا تذکرہ ہے، مگر از اول تا آخر یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ حکام کس طرح برسرِ اقتدار آئیں گے، کس طبقے اور کس معیار کے لوگ ہوں گے، اس بارے میں ایک بھی آیت بطورِ حکم پیش نہیں کیا جا سکتی۔ کسی آیت سے اگر کوئی شخص کچھ استدلال کرے گا بھی تو نظری ہوگا، اجتہادی ہوگا اور یہ حیثیت نہیں رکھے گا کہ اس کا انکار کفر ہو اور اس میں تاویل کی گنجایش نہ رہے۔

اگر قرآن حکیم میں دستورِ اساسی دیا جاتا تو پھر اس سے ہٹنے کی سبیل نہ رہتی۔ اللہ تعالیٰ اس آخری امت پر یہ تنگی نہیں کرسکتا تھا کہ بنائے تو اسے زمان و مکان کی حدود سے بالا اور پابند کر دے ایسے دور کے ایک ماحول کا جو عہدِ جدید کا ابتدائی دور تھا اور جسے قدم بہ قدم ارتقائی منازل طے کرنے تھے۔ لہٰذا اس نے حیاتِ ارضی کے مجمل اصول بتائے ہیں، تاکہ

ہر عہد کے لوگ ایک ہی اصل کے تحت اپنے ماحول کے مطابق اپنا سیاسی نظام مرتب کر سکیں۔قرآن کی تعریف ہے:

﴿ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴾ [البینة: ۳] ''جن میں لکھے ہوئے مضبوط احکام ہوں۔''

جن امور میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی ہے اور جن میں اگر ترمیم و تنسیخ نہ ہو تو پھر انسان ارتقائے ذہنی و عملی سے محروم ہو جاتا ہے، ایسے امور کا تذکرہ اس آخری کتاب میں کیسے ہوسکتا تھا؟

انسان کی زندگی کی رفتار زمانے کے تابع ہے اور آسمانی و زمینی اثرات کے تحت ڈھلتی ہے۔ اگر کتاب اللہ میں عمل کے جزئیات ہوتے تو امتِ مسلمہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو یہود کا ہوا ''اسرائیل'' نام کی ایک حکومت زبردستی قائم کر دی گئی ہے جو سراسر فطرت سے جنگ کے مرادف ہے۔ اسی لیے کھلا ہوا نتیجہ سامنے ہے کہ ان لوگوں پر تورات کے مطابق اپنی سیاسی زندگی کو ڈھالنا ممکن نہیں۔ کتنی ہی کوشش کر لیں اور کتنی ہی تاویلات کریں وہ اپنے سیاسی نظام کی تشکیل تورات کے مطابق نہیں کر سکتے۔ وہ احکام جس قوم اور جس زمانے کے لیے نازل ہوئے تھے، اب نہ وہ قوم ہے اور نہ وہ زمانہ، اس لیے ان پر عمل کی بھی کوئی سبیل نہیں رہی۔

یہی حال دنیا کی تمام قوموں کا ہے۔ ہندو ہوں یا نصرانی، مجوسی ہوں یا صابی، وہ اپنی نام نہاد قومی حکومت تو قائم کر سکتے ہیں، لیکن دینی حکومت اور اس دین کے احکام کے مطابق معاشرے کی تشکیل کے دروازے ان پر بند ہو چکے۔ اس لیے وہ مجبور ہیں کہ چرچ اور اسٹیٹ یعنی کلیسا اور مملکت کو الگ کر دیں۔ انھوں نے رفتارِ زمانہ سے مجبور ہو کر اپنی دینی زندگی کو انفرادی بنا دیا ہے، کیوں کہ وہ اپنے اجتماعی عمل اور دینی احکام میں ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتے۔

انسانی معاشرے کی اس حقیقت کو اللہ عزوجل سے زیادہ کون جان سکتا ہے، اس

لیے اس نے اپنی آخری کتاب کو اس عظیم ترین سقم سے محفوظ رکھا۔ صرف دائمی اصولِ زندگی بتا دیے جن میں اتنی لچک ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ماحول میں یہ کتاب یکساں مشعلِ ہدایت ہے۔ اس کے عجائبات کبھی کم نہیں ہوتے اور اس کی کارگری میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اس کی تازگی کا یہ عالم ہے کہ ہر دور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاص آج کے مسائل حل کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔

لوگ مغربی جمہوریت سے متاثر ہو کر قطعیت کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام کا سیاسی نظام جمہوری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہٹلر کے غالب آ جانے پر مصر ہوئے کہ اسلام کا سیاسی نظام آمرانہ ہے، حالانکہ اسلام کو اس سے کچھ غرض نہیں کہ لوگ شخصی حکومت کے قائل ہیں یا آمرانہ نظام کے، یا جمہوریت کے یا کسی اور طریقے کے:

﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۚ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۚ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

[یوسف: ٤٠]

’’اللہ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔‘‘

یہ وطن اور نسل، یا حکمران، یا زبان، یا اور جتنے معبود لوگوں نے بنا رکھے ہیں، یہ سب اصنام ہیں اور ان سے ایسی وابستگی کہ اللہ تعالیٰ سے تعلقِ عبدیت پر زد پڑے شرک ہے اور عند اللہ مردود۔ امتِ مسلمہ کی تشکیل محض اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند رکھے اور زمین پر اللہ تعالیٰ کی گواہ بنے۔ گویا قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کی بنیاد پر اپنے دنیوی مسائل حل کرنے کے لیے اپنی حکومت قائم کریں اور سوائے اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانے کے اور کسی چیز کو اپنے عقائد میں جگہ نہ دیں۔ جس قوم میں ہجرت اور جہاد ہو

اسے نسل اور جغرافیہ سے کیا غرض؟

حکومت ایک ظاہری چیز ہے اور وہ ہمیشہ ایسی ہی ہوگی جیسے دنیا کی اور حکومتیں ہوتی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ بس فرق ایک ہوگا کہ دوسری حکومتیں جب دستور بناتی ہیں تو وہاں قانون سازی کا حق بھی ان کا ہوتا ہے اور مقاصدِ حکومت بھی خود ہی متعین کرتی ہیں۔ یعنی ان کا جو بھی حاکم ہو وہ شخصِ واحد ہو، یا کسی طبقے کا یا جمہور نمایندہ ہو، وہ اس کا مجاز گردانا جاتا ہے کہ جو قانون چاہے بنائے اور جس طرح اسے بروئے کار لانا چاہے لائے۔

امریکہ کا صدر روز ویلٹ جب انتخاب کے لیے کھڑا ہوا تو اس نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا اگر اسے صدر بنا دیا گیا تو وہ شراب پر سے پابندیاں اٹھا دے گا۔ چنانچہ اس کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ تھا۔ جرمنی کا ایک سائنس دان تھا، اس نے کوشش کر کے وہاں لواطت کو قانونی طور پر جائز کروا لیا تھا۔

لیکن مسلمانوں کا بادشاہ ہو یا آمر، صدر جمہوریہ ہو یا سرِ شوریٰ، مجلسِ قانون ساز میں امرا وعوام کے سے دو دیوان ہوں یا صرف ایک، اور قوم کے یہ نمایندے عام رائے شماری سے آئیں یا محدود انتخاب کے ذریعے جس طرح مناسب سمجھیں کام کریں، لیکن انھیں قانون اور شعار اور روحِ اجتماعی وہی رکھنی ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر فرمائی ہے۔ سرِ مو اس سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک حدود اللہ قائم نہیں ہوں گی اور ان کی پاسداری نہیں کی جائے گی، اس وقت تک نہ حکومتِ اسلامی ہوگی اور نہ مسلمان بارگاہِ خداوندی میں سرخ رو ہوسکیں گے۔ ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ [الأنعام: ٥٧] ''فیصلہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں۔''

لہٰذا ہر وہ حکومت اسلامی ہوگی جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی بنیاد پر قائم کی جائے گی، اگرچہ اس کا قالب شخصی حکومت کا ہو، آمرانہ ہو، جمہوری ہو اور جمہوریت شوروی ہو یا محدود نمایندگی کی، کوئی پرانا طریقہ اختیار کیا گیا ہو یا بالکل نیا اور اپنا ایجاد کردہ۔

قرآن حکیم اس کی کھلی آزادی عطا فرماتا ہے اور کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا۔ وہ پابند صرف اس کا بناتا ہے کہ ہم مسلمان رہیں، حدودِ الٰہی جاری رکھیں اور اللہ و رسول اللہ ﷺ کے فرمان ہی کو اپنی زندگی کا اصلِ اصول بنائیں۔

آیتِ استخلاف میں اس نے جو حکومت دینے کا وعدہ کیا ہے وہ ایسی ہی حکومت ہے، جیسے اہلِ عالم کی ہوا کرتی ہے:

﴿ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ﴾ [النور: ۵۵]

''جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے۔''

البتہ یہ شرط ہے کہ وہ حکومت دین کی بنیاد پر ہوگی اور ان احکام کے مطابق جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیے ہیں۔ اس حکومت میں کسی جاہل فوجی آمر کو یہ حق نہیں ہوگا کہ خدا کے اس حکم کو تبدیل کر سکے جو اس نے وراثت کے متعلق نازل فرمایا ہے:

﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾ [النساء: ۱۱]

''مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر حصہ ہے۔''

اس حکم کی حکمت اگر کسی پر نہ کھلے تو اسے چاہیے کہ اپنی عقل پر ماتم کرے، خود بدلتے نہیں، قرآن بدل دیتے ہیں۔

سنتِ رسول اللہ ﷺ:

کتاب اللہ کی عملی تفسیر نبی کریم ﷺ کی سنت اور طریقہ کار ہے۔ آپ ﷺ نے بھی اس کا اہتمام رکھا کہ چھوٹے بڑے ہر مسئلے میں عمل کی کئی صورتیں ہوسکیں، تاکہ ایک ہی اصل کے تحت متعدد طریقوں پر کام کیا جا سکے۔ امت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نماز سے زیادہ اہم کوئی عمل نہیں، لیکن عہدِ نبوی سے آج تک اس بارے میں امت برابر متعدد طریقوں پر اپنے فقہی اجتہاد کے مطابق عمل کرتی چلی آرہی ہے۔ سوائے اس شخص کے جو تعصب اور جہل میں مبتلا ہو اور مقامِ نبوت سے ناآشنا، اور کوئی شخص ان مسنون طریقوں میں سے کسی پر طعن

نہیں کرتا۔ اس کا نام ہے ''تَوَسُّع'' کہ یوں بھی روا ہے اور یوں بھی۔ یہ محض اس لیے ہے کہ آخری رسول ہیں اور اب کوئی شارع نہیں آئے گا۔ اگر آپ کوئی تنگی کرتے تو امت کے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے اور اجتہاد کے مواقع جاتے رہتے، جس کے بغیر ارتقا ناممکن ہے۔

ہمارے زمانے میں ایک شخص نے اپنی جہالت اور حمق سے کچھ دن پہلے یہ مطالبہ کیا تھا کہ نماز کا صرف ایک ہی طریقہ متعین کر دیا جائے۔ گویا جو سنتیں جاری ہیں انھیں ہم منسوخ کر دیں، اور نبی کریم ﷺ نے جس حکمت کے تحت اس تنوع کو پسند فرمایا تھا اسے پسِ پشت ڈال کر تنگی پیدا کر دیں اور یوں کچھ دن بعد چاروں فقہی مکاتب میں سے تین سے یہ امت اجنبی ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج: ۷۸]

''اور اس نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

نبی کریم ﷺ کا آخری عمل بھی آخری اجتماع میں یہی تھا۔ یعنی حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے اس دین لاحرج کو اچھی طرح نمایاں کر دیا۔ جس نے جو بات کی کہ یا رسول اللہ مجھے یوں کرنا تھا اور میں نے یوں کر لیا، تو آپ کا ایک ہی جواب ہوتا تھا: ''لا حرج'' کوئی حرج نہیں۔[1] جب روح قائم اور فعال ہے تو عمل کے تنوع سے کوئی حرج پیدا نہیں ہو سکتا۔

آپ نے کوئی بات ایسی نہیں کی جو بعد کے لوگوں کا جینا مشکل کر دے اور قرآن کے لچک دار عالمگیر دائمی اصولِ زندگی پر توسع کے ساتھ عمل کر کے بتا دیا کہ اب تم ہی تم ہو۔ تمھارے سامنے لامحدود ترقیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور تم اس مقام پر ہو جہاں اب کسی دوسرے ہادی کی ضرورت نہیں۔ امامتِ عالم تمھارے سپرد ہے۔ تم قوموں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹو گے، اور تم دنیا میں میزانِ عدل قائم کرو گے، تو میں تمھاری

[1] صحيح البخاري (٤/ ١٥٤) باب إذا حنث ناسياً، طبع مصر.

روشن کی ہوئی مشعل کی روشنی میں چلیں گی۔ تم دنیا کو حقیقی آزادی سے روشناس کراؤ گے۔ علمی اور مالی اجارہ ختم کرو گے۔ تمھاری وجہ سے قومیں ایک دوسرے سے قریب تر ہوں گی۔ نسل اور وطن اور زبان و رنگ سے تمھارا معاشرہ بالا ہوگا اور اخوت کی لڑی میں منسلک ہو گے۔

نبی کریم ﷺ کی یہی صفت پہلی کتابوں میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ ءَامَنُوا۟ بِهِۦ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا۟ النُّورَ الَّذِيٓ أُنزِلَ مَعَهُۥٓ ۙ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [الأعراف: ١٥٧]

”اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ اور طوق اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔ سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

اگر نبی کریم ﷺ اپنی امت کے لیے کوئی مخصوص دستورِ اساسی چھوڑ جاتے یا اپنے بعد کسی کو خلیفہ کر دیتے تو امت کے لیے عمل کی ایک ہی صورت رہتی اور اس سے ہٹنے کا نام کفر و ارتداد قرار پاتا۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت مستقل ہے۔ کسی وقت ایک مسلم فرد یا معاشرہ اس سے سرتابی نہیں کر سکتا، لیکن ”اولی الامر“ کی اطاعت بالواسطہ ہے۔ اگر ان سے اختلاف ہو تو اللہ اور اس کے رسول کے حکم اور منشا کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہوگا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ افضل کون سی بات ہے اور غیر افضل کون سی؟

کوئی ایک حدیث بھی پیش نہیں کی جا سکتی جسے خلافتِ نبوت کی تشکیل کے سلسلے میں بطورِ حکم سمجھا جا سکے اور جس سے روگردانی کا امکان نہ ہو۔ علمائے حدیث و سیر کا اتفاق ہے اور جمہور صحابہ کا اجماع ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد اپنی امت کے لیے نظامِ سیاسی

چلانے کے لیے کوئی دستور نہیں چھوڑا۔ آپ کی امت اس بارے میں بالکل آزاد ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق جو راہِ عمل چاہے اختیار کرے۔ نہ کچھ افضل ہے اور نہ ادنیٰ، نہ کچھ جائز ہے اور نہ ناجائز۔ ایک دستور العمل کے متعلق اپنے لیے مناسب و نامناسب، مفید و غیر مفید، موزوں اور ناموزوں کی حیثیت سے تو بحث کی جا سکتی ہے، لیکن شرعاً جائز و ناجائز یا افضل و غیر افضل نہیں کہا جا سکتا۔

ایک عصر کے لوگ جس دستور پر متفق ہو جائیں اس عصر کے لیے وہی حق وصواب ہے اور جب بعد کے لوگ اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ کریں تو وہ بھی ان کے حق میں صواب ہوگا۔ بشرطیکہ اس پر اجماع ہو جائے، یعنی غالب اکثریت اس سے متفق ہو اور دین کے تقاضے اس سے پورے ہوتے ہوں۔

گویا اصل ہے امت کا اجماع۔ صحاح سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے فرمان لکھوانا چاہتے تھے کہ اپنے بعد انھیں خلیفہ بنائیں، لیکن پھر آپ ﷺ نے اسے ملتوی کر دیا اور فرمایا:

"یابی اللہ والمؤمنون إلا أبا بکر"

"اللہ اور اہلِ ایمان سوائے ابوبکر کے اور کسی کو قبول نہیں کریں گے۔"

یہ ہے اصل۔ مقصد نہ ابوبکر و عمر ہیں نہ عباس و علی اور نہ حسن و معاویہ رضی اللہ عنہم۔ مقصد ہے امت کا اجماع جس پر بھی ہو اور جیسے بھی ہو۔ اور مقصد یہ ہے کہ جو حکومت بنے وہ دین کی بنیاد پر اور دعوت کے مقاصد پورے کرنے کے لیے بنے۔ یہ تقاضے وہ ہیں جو سورۃ الحج کی آیت (۴۱) میں بیان کیے گئے، اور خلافتِ نبوت کے عنوان کے تحت مذکور ہوئے۔

یہ تصور بعد کی پیداوار ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فلاں شخص کے حق میں وصیت کی تھی، اس بارے میں تین نام لیے جاتے ہیں، حالانکہ یہ لوگوں کی اپنی خام خیالی اور گمانِ باطل ہے اور اس کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کا

اجماع۔ اگر نبی کریم ﷺ کسی فرد کے حق میں وصیت کر گئے ہوتے تو پھر انصار کا اجماع ارتداد کے مرادف ہوتا۔ اور ان کے بعد سب سے بڑا مرتد وہ ٹھہرتا جس کے لیے حضرت خاتم النبیین ﷺ نے وصیت کی اور وہ اسے بروئے کار لانے کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔

تمام اربابِ سیر متفق ہیں کہ سقیفہ کے اجتماع میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم اور امین الامت حضرت ابوعبیدہ کا نام لیا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلو۔ اگر خود آپ کے حق میں وصیت ہوتی تو اسے بیان کرتے اور دوسرے کا نام نہ لیتے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ دونوں نے حضرت صدیق اکبر سے بیعت کی تھی۔ اگر ان کے حق میں وصیت ہوتی تو ان کا فرض تھا کہ نبی کریم ﷺ کی بات رکھنے کے لیے اپنی جان دے دیں۔ تمام بنو ہاشم میں سب سے پہلے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر بیعت کی تھی کہ آپ ہی خاندانِ نبوت کے بزرگ ترین فرد تھے۔ صحاح کی بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو ہاشم نے کچھ عرصہ توقف کیا تھا، لیکن یہ متفق علیہ ہے کہ سب نے بیعت کر لی۔ ان احادیث پر نقد وتبصرہ سے قطع نظر، کیا ان سے بداہتاً یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ نبی کریم ﷺ نے حکماً کسی کی تعیین نہیں کی تھی، اور نہ سرکاری طور پر کسی کے لیے وصیت کر گئے تھے۔ قریش کی امامت پر بحث پیچھے گزر چکی ہے اور خلافتِ نبوت کے عنوان کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

عملِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

نبی اکرم ﷺ اگر واقعی آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی ہادی نہیں آئے گا۔ اگر قرآن مجید واقعی آخری کتاب ہے اور اب کوئی ہدایت نامہ اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوگا، اگر اللہ کا وعدہ سچا ہے کہ غلبہ اسے اور اس کے رسولوں کا ہوگا۔ اگر اس کا یہ فرمان درست ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی برپا کردہ امت بہترین جماعت ہے اور تمام عالمِ انسانیت کے لیے نمونہ تو ہمیں یہ بھی یقین رکھنا ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ نے کوئی متعین دستور چھوڑا ہوتا

یا کسی شخص کو اپنے بعد نامزد کیا ہوتا یا کسی اعتبار سے امت کو حدودِ الٰہی کے علاوہ پابند کر گئے ہوتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے جان و مال قربان کر کے دین قائم کیا تھا اور سخت سے سخت آزمایش میں سے گزر کر اسے برپا رکھا تھا، وہ ہرگز اس راہ سے نہ ہٹتے، بلکہ سوائے اس ایک طریقہ کار کے کوئی دوسرا طریقہ برداشت نہ کرتے اور نہ کسی بدعت پر راضی ہوتے۔ ان کی تمام زندگی قربانیوں میں گزری۔ بڑھاپے میں بھی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ آسمان و زمین نے یہ منظر دیکھا ہے کہ بیٹا اپنے جانے پر مُصر ہے اور باپ اپنے جانے پر۔ باپ کی رائے غالب رہتی ہے۔ خود گھوڑے کی پیٹھ پر نہیں بیٹھ سکتے دوسرے سوار کراتے ہیں اور یوں میدانِ کارزار میں جا کودتے ہیں۔ ایسے لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اور آپ کی منشا سے کیسے ہٹ سکتے تھے، انھیں کیسے برداشت ہوتا کہ امت کی ''زمامِ قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی جائے'' یا ''گاڑی پٹڑی سے اتر جائے۔''

ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تک پانچ خلفا کو زمامِ قیادت سپرد کی اور ہر خلیفہ کے برسرِ اقتدار آنے کا طریقہ مختلف رہا۔ گویا صحابہ کے نزدیک اگر کسی چیز پر اتفاق اور اجماع تھا تو اس پر کہ تبدیلی ہو اور احوال کے مطابق سیاست کی تشکیل کی جائے اور ان کا اجماع اس پر تھا کہ اسلام کا سیاسی نظام متعین نہیں ہے، بلکہ امت کی منشا پر اس کے قیام کا انحصار ہے۔

حضرت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

حضرت صدیقِ اکبر خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت ایک محدود حلقے میں ہوئی تھی، جو تین مہاجروں کے علاوہ انصار کے ایک غیر نمایندہ اجلاس پر مشتمل تھا۔ امت سے قطعاً استصواب نہیں کیا گیا، لیکن چونکہ یہ بیعت ہوئی تھی ایسے شخص سے جو اگر خلیفہ نہ ہوتا تو تب بھی صدیقِ اکبر اور ثانی اثنین (دو کا دوسرا) ہی رہتا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑا شخص سمجھا جاتا۔ آپ کی بیعت مکمل ہوگئی، کیوں کہ طبعًا سب کی نگاہیں آپ ہی کی طرف اٹھتی تھیں۔

امیر المومنین عمر اول رضی اللہ عنہ:

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا تو قطعاً انتخاب ہی نہیں ہوا، بلکہ حضرت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اپنی مرضی سے اور صرف اپنی صوابدید کے مطابق انھیں نامزد کیا۔ روایتیں ہیں کہ آپ نے فلاں صاحب اور فلاں صاحب سے مشورہ کیا تھا، لیکن سرکاری طور پر اس مشورے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اول تو آپ رضی اللہ عنہ کا فرمان صراحت کر رہا ہے کہ وہ تقرر محض آپ کی اپنی منشا سے ہوا اور اس میں ادنیٰ ترین اشارہ بھی ان مشوروں کے متعلق نہیں جو مروی ہیں۔ پھر یہ ہے کہ روایتوں میں جو مشورے بیان کیے گئے ہیں ان میں یہ ہرگز مذکور نہیں کہ فلاں اور فلاں میں کسے موزوں سمجھتے ہو، بلکہ صرف یہ فرمایا: ''عمر کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے'' گویا مشوروں کی ان روایتوں کے مطابق بھی آپ حضرت فاروقِ اعظم کی خلافت کا یہ فیصلہ کر چکے تھے۔

لوگوں نے خلافتِ نبوت کے بارے میں شوریٰ کے جو فرضی تصورات بطور خود قائم کر لیے ہیں، انھی کے تحت وہ واقعات کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ تلبیس سے عوام متاثر ہوں تو ہوں طالبانِ علم متاثر نہیں ہو سکتے اور نہ خیالی باتوں سے واقعات بدل جایا کرتے ہیں۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا تقرر استصوابِ رائے عامہ سے ہرگز نہیں ہوا۔ بلکہ اربابِ حل و عقد کے سامنے بھی دو چار نام نہیں رکھے گئے تھے۔ سوائے حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور پر اس تقرر کی ذمہ داری نہیں ہے۔

البتہ آپ کے متعلق جو فیصلہ ہوا وہ بالکل قدرتی تھا۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے بعد سوائے حضرت فاروقِ اعظم کے اور کسی پر نگاہ نہیں پڑتی تھی۔ فرمانِ صدیقی کے الفاظ ہیں:

"إني استخلفت عليكم بعدي عمر بن الخطاب، فاسمعوا له وأطيعوا، وإني لم آل الله ورسوله و دينه و نفسي وإياكم خيراً"

''میں نے اپنے بعد تمھارے اوپر عمر بن خطاب کو خلیفہ بنایا ہے، ان کی بات سننا اور اطاعت کرنا۔ میں نے اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے دین، اپنی جان اور خود تمھاری خیر خواہی کے علاوہ اور کوئی بات نہیں سوچی۔''

اس پورے فرمان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے اندازہ ہو کہ اس انتخاب و تقرر

کی ذمے داری میں کوئی دوسرا شخص بھی شریک ہے۔

امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ:

امیر المومنین سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب ایک بالکل ہی دوسری طرح ہوا۔ حضرت فاروقِ اعظم نے اپنے بعد چھے بزرگواروں کو نامزد کیا کہ ان میں سے کسی کا انتخاب ہو جائے۔ آپ نے یہ ہرگز نہیں فرمایا کہ یہ حضرات امیدوار ہیں، انھیں امت کے سامنے پیش کر کے استصواب کرنا، تاکہ ایک صاحب منتخب ہو جائیں۔ بلکہ شوریٰ محض ان چھے حضرات کے مابین تھا کہ آپس میں کسی ایک پر اتفاق کر لیں۔ لوگوں نے جو اضافے کیے ہیں کہ اگر ایک صاحب ایک طرف ہوں اور پانچ دوسری طرف تو ان ایک صاحب کو قتل کر دیا جائے گا اور دو ایک طرف ہوں تو ان دو کو، یہ سب بے اصل باتیں ہیں اور بعد کے لوگوں کی بنائی ہوئی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے حکمت مآب امام کہ مقتدا ہیں، ان کی پشت پر طاقت ہے اور ان کے عقیدت مند کبھی اس ظلم و تعدی کو برداشت نہیں کریں گے۔ یہ شوریٰ قیامِ امن اور اصلاحِ حال کے لیے کیا گیا تھا نہ کی فساد اور افتراق کے لیے۔ کسی کو جرأت ہوسکتی تھی کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ہاتھ ڈالے اور ان کے خاندان والے اسے پی جائیں۔

یہ بزرگوار علم و تقویٰ اور مدارجِ روحانیہ کے بلند ترین درجے پر تھے اور دعوتِ محمدیہ کے وفادار ترین افراد تھے، ان کے متعلق حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ بدگمانی کیسے ہوسکتی تھی کہ اپنی شخصیتوں کی خاطر یہ امت میں موجبِ فتنہ ہوں گے۔ بلکہ آپ سمجھتے تھے کہ چونکہ پیش آمدہ حالات میں آپ کو موقع نہیں کہ اطمینان سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کر دیں، اس لیے امت کا معاملہ انہی کے سپرد کر دیا۔ اس پر آپ کو اطمینانِ راسخ تھا کہ یہ کوئی خوش آیند فیصلہ کر لیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

بغایت دور اندیشی اور نہایت بے نفسی سے چار حضرات الگ ہو گئے اور فیصلہ کیا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ میں سے کسی کو منتخب کیا جائے۔ یہ دونوں اس پر متفق تھے

کہ اگر خود خلیفہ نہ ہوں تو دوسرے صاحب ہو جائیں۔ یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نہ ہوں تو علی ہوں'' اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نہ ہوں تو عثمان ہوں'' اصحابِ شوریٰ کا یہ طرزِ عمل نہایت اصیل بنیاد پر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر خلیفہ آلِ عبد مناف میں سے نہ ہوا تو اس کی پشت پر وہ طاقت نہ ہوگی، جو متفق علیہ امام کی پشت پر ہونی چاہیے۔ یہ سب جانتے تھے کہ خلافتِ خاصہ ختم ہوگئی جو بالکل ایسی ہی تھی کہ گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے درمیان موجود ہیں، جو مقام حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا تھا وہ مقام کوئی حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لیے لازماً خلافت کے لیے دوسرے امور پر توجہ کرنی ہوگی۔ چنانچہ امت کی خیر خواہی اور نظامِ خلافت کے لیے انھوں نے مناسب سمجھا کہ خود دستبردار ہو جائیں۔

سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے متعلق مدینہ طیبہ کے ایک ایک گھر جا کر رائے لی اور اکثریت کے فیصلے کے مطابق سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوگیا، مگر یہ اجتہاد خود سیدنا عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کا تھا۔ اس بارے میں نہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی کچھ ہدایت تھی اور نہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے متعلق کوئی حکم تھا۔ سیدنا عبدالرحمان نے تین دن تک تنِ تنہا استصواب کی یہ خدمت انجام دی، کیوں کہ شوریٰ نے یہ ذمے داری آپ پر ڈالی تھی، ان کا یہ غایت تقویٰ تھا کہ انھوں نے خلیفہ نامزد کرنے کی ذمے داری تنہا اپنے اوپر نہیں لی، بلکہ مدینہ کو اس میں شریک کیا، تاکہ ان کے اقدام پر کسی طرف سے شبہہ نہ ہو، لیکن پھر بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے، جو سیدنا عبدالرحمان رضی اللہ عنہ جیسے بے نفس اور امت کے وفادار ترین شخص پر طعن کرتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے طریق کار کو سراہا اور ان کے اجتہاد کا احترام کیا۔ اہلِ مدینہ کی رائے کا اعلان کرنے کے لیے جب آپ منبر پر گئے تو زیبِ سر وہ عمامہ تھا جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ آپ کے اعلان کو امت نے قبول کیا اور سب نے اس مقدس ماحول میں بطیبِ خاطر بیعت کر لی۔ گویا یہ پہلا موقعہ تھا کہ مدینہ طیبہ کے باشندوں سے صحیح معنی میں استصواب کیا گیا اور اس اقدام کا سہرا سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے سر ہے۔

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ:

امیر المومنین سیدنا علی ۔ کرم اللّٰہ وجھہ۔ [1] کی بیعت ہنگامی حالات میں ہوئی اور چونکہ اس کے سب کرتا دھرتا وہی باغی لوگ تھے، جن کے ہاتھوں سے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ ٹپک رہا تھا اور پہلا بیعت کرنے والا شخص اشتر نخعی تھا، اس لیے آخر وقت تک آپ کی خلافت آئینی حیثیت زیرِ بحث رہی، حتی کہ خود آپ نے اپنی خلافت کا مسئلہ ثالثوں کے ہاتھ میں دے دیا، ثالثوں نے آخری تصفیہ کرنے کا مجاز امت کے نمایندوں کو قرار دیا، لیکن ابھی یہ اجماع نہیں ہوا تھا کہ آپ ہی کے ایک باغی گروہ کے فرد نے آپ کو شہید کر دیا ورنہ معلوم نہیں کیا فیصلہ ہوتا۔

بہر حال چونکہ سوائے آپ کے اور کسی کو خلیفہ نہیں کہا جاتا تھا اور نہ کسی نے آپ کے مقابلے میں خلافت کا دعویٰ کیا تھا اور نہ کوئی شخص حریفانہ آپ کے مقابلے پر آیا تھا، اس لیے چوتھے خلیفہ آپ ہی ہیں۔ آپ کے ہم عصروں کو آپ کے خلیفہ ہونے پر اعتراض نہیں تھا، لیکن وہ چاہتے تھے کہ آئینی حیثیت سے امت کے صحیح نمایندے اس کی توثیق کر دیں۔ کیوں کہ یہ خلافت برپا کی تھی باغیوں نے، جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے بیعت کی تھی، انھیں امید تھی کہ امت کے معاملات رُو بہ صلاح آ جائیں گے۔ چنانچہ جنگِ جمل کے موقع

---

[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ برصغیر پاک و ہند میں عموماً ''کرم اللہ وجہہ'' لگانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مؤلف نے بھی یہ لاحقہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نام سے ساتھ استعمال کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے یہ لاحقہ نہ ہی تو دور رسالت میں کبھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے استعمال کیا گیا اور نہ ہی خیر القرون کے دور میں کبھی اس کا استعمال ہوا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سمیت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' ہی لگتا رہا۔ موطا امام مالک سے لیکر صحاح ستہ کی تمام کتب کی صحیح روایات میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور دیگر تمام صحابہ کرام کے لیے صرف ''رضی اللہ عنہ'' ہی ملتا ہے۔ (صحیح بخاری میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے علیہ السلام کے لاحقہ کا استعمال وراق ابو حاتم کا ادراج ہے، امام بخاری کا نہیں)۔ سو مناسب یہی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی وہی تعظیمی سابقے لاحقے استعمال کیے جائیں جو کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وغیرہم اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو صرف انہیں القابات سے پکارا جائے جو کہ صحیح سند سے ان کے لیے ثابت ہوں۔

پر اس کے مواقع پوری طرح پیدا بھی ہو گئے تھے اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے اصحابِ جمل کی امداد و تعاون پر اعتماد کر کے قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی فوج سے نکال دیا تھا، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مذکور ہوا۔ اگر جنگ نہ چھڑتی تو آپ کی خلافت پر لازماً اجماع ہو جاتا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی بیعت سے گریز نہ کرتے، کیوں کہ توقف کا جو سبب تھا وہ رفع ہو جاتا۔ لیکن دشمنانِ دین وملت نے یہ جنگ چھیڑ کر حالات بگاڑ دیے، جس سے تلخیاں پیدا ہوئیں۔

بہرحال ہمیں ان فسادات اور خانہ جنگیوں کے باوجود اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ بیعت سے رکنے والے یا بیعت سے انکار کر کے مقابلے پر آنے والے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حریف اور مدمقابل ہونے کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے۔ اگر حریف ہوتے یا آپ کو مدعی متغلب اور غاصب و باغی سمجھتے تو پھر نہ مطالبات پیش کرتے اور نہ صلح و صفائی کی کوششیں ہوتیں۔ اسی طرح اگر امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے مقابلے پر آنے والوں کو باغی جانا ہوتا یا امت کا کلمہ متفرق کرنے والا سمجھا ہوتا تو ہرگز التوائے جنگ نہ کرتے۔ ثالثی پر راضی نہ ہوتے اور نہ ثالثوں کے فیصلے کی پذیرائی کرتے۔

یہ محض اجتہادی اختلاف تھا، جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے کہ اگر امام سے اختلاف ہو تو مسئلے کو اللہ و رسول کے حکم کی طرف لوٹا دو۔ چنانچہ امیر المومنین نے اور اصحابِ جمل وصفین نے اسی فرمانِ الٰہی پر عمل کیا، اس کی راہ میں جو لوگ حائل ہوئے وہ دشمنانِ دین و ملت تھے، فریقین نہیں تھے۔ گویا یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ ہم عصر صحابہ کے نزدیک چوتھے خلیفہ بالفعل سیدنا علی ہی تھے، کرم اللہ وجھہ انہی کی یہ حیثیت مانی جاتی تھی کہ نزاعی مسائل کو خاطر خواہ طے کر کے امت کا کلمہ متحد کر دیں۔ اموی خلافت میں جو آپ کو خلیفہ نہیں کہا گیا تو آئینی حیثیت سے، ورنہ بالفعل وہ بھی آپ ہی کو خلیفہ سمجھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ بغیر آپ کے مسائل کا تصفیہ نہیں ہو گا۔ وقائع تاریخی سے قطع نظر اس بارے میں سب سے اہم دلیل موطا امام مالک ہے، جس میں امیر المومنین

علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے بطور نظائر و حجت مرقوم ہیں اور اموی امرا اور خلفا کے ہاں مغرب میں اسی کو دستور بنایا گیا۔ ہسپانیہ کے امرا اور امیر المومنین عبدالرحمان الناصر رضی اللہ عنہم اس کتاب کو دستور کیسے بناتے؟ اگر امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بالفعل ان کے نزدیک مسلم نہ ہوتی اور ان بزرگوں کا یہ موقف نہ ہوتا۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنے مقدمے میں جس طرح صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے وہ بڑی حد تک درست ہے، فرماتے ہیں:

”فأما واقعة علي فإن الناس كانوا عند مقتل عثمان مفترقين في الأمصار، فلم يشهدوا بيعة علي والذين شهدوا فمنهم من بايع ومنهم من توقف حتى يجتمع الناس ويتفقوا على إمام كسعد وسعيد وابن عمر وأسامة بن زيد والمغيرة بن شعبة وعبد الله بن سلام وقدامة بن مظعون وأبي سعيد الخدري وكعب بن عجرة وكعب بن مالك والنعمان بن بشير وحسان بن ثابت ومسلمة ابن مخلد وفضالة بن عبيد وأمثالهم من أكابر الصحابة والذين كانوا في الأمصار عدلوا عن بيعته أيضا إلى الطلب بدم عثمان وتركوا الأمر فوضى حتى يكون شورى بين المسلمين لمن يولونه وظنوا بعلى هوادة في السكوت عن نصر عثمان من قاتله لا في الممالاة عليه فحاش لله من ذلك ولقد كان معاوية إذا صرح بملامته إنما يوجهها عليه في سكوته فقط ثم اختلفوا بعد ذلك فرأى علي أن بيعته قد انعقدت ولزمت من تأخر عنها باجتماع من اجتمع عليها بالمدينة دار النبي ﷺ وموطن الصحابة وأرجأ الأمر في

المطالبة بدم عثمان إلى اجتماع الناس واتفاق الكلمة فيتمكن حينئذ من ذلك ورأى الاخرون أن بيعته لم تنعقد لافتراق الصحابة أهل الحل والعقد بالآفاق ولم يحضر إلا قليل ولا تكون البيعة إلا باتفاق أهل الحل والعقد ولا تلزم بعقد من تولاها من غيرهم أن من القليل منهم وإن المسلمين حينئذ فوضى فيطالبون أولا بدم عثمان ثم يجتمعون على إمام وذهب إلى هذا معاوية وعمرو بن العاص وأم المؤمنين عائشة والزبير وابنه عبد الله وطلحة وابنه محمد وسعد وسعيد والنعمان بن بشير ومعاوية بن خديج ومن كان على رأيهم من الصحابة الذين تخلفوا عن بيعة علي بالمدينة كما ذكرنا إلا أن أهل العصر الثاني من بعدهم اتفقوا على انعقاد بيعة علي ولزومها للمسلمين أجمعين وتصويب رأيه فيما ذهب إليه وتعيين الخطإ من جهة معاوية ومن كان على رأيه وخصوصا طلحة والزبير لا نتقاضهما على علي بعد البيعة فيما نقل مع دفع التاثيم عن كل من الفريقين كالشان في المجتهدين وصار ذلك اجماعاً من أهل العصر الثاني علىٰ أحد قولي أهل العصر الأول كما هو معروف“ [1]

”رہا (سیدنا) علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو لوگ (یعنی کبار صحابہ) سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت مختلف شہروں میں تھے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت موجود نہ تھے، جو موجود تھے ان میں سے بعض نے بیعت کر لی اور بعض نے

[1] تاريخ ابن خلدون (ص: ١٥٠) مصر المطبعة البهيه

توقف کیا۔ تا آنکہ جمہور کا اجماع ہو جائے اور وہ کسی امام پر متفق ہو جائیں۔ ان میں ایسے حضرات ہیں، جیسے: سیدنا سعد، سیدنا سعید، سیدنا ابن عمر، سیدنا اسامہ بن زید، سیدنا مغیرہ بن شعبہ، سیدنا عبداللہ بن سلام، سیدنا قدامہ بن مظعون، سیدنا ابوسعید خدری، سیدنا کعب بن عجرہ، سیدنا کعب بن مالک، سیدنا نعمان بن بشیر، سیدنا حسان بن ثابت، سیدنا مسلمہ بن مخلد، سیدنا فضالہ بن عبید اور ایسے دوسرے بڑے بڑے اصحاب رضی اللہ عنہم۔ پھر جو حضرات دوسرے شہروں میں تھے وہ بھی قصاصِ عثمان کے مطالبے کے سبب بیعت سے رکے رہے۔ حکومت کو بغیر سرِ حکومت کے سمجھا تا آنکہ مسلمانوں کے عام مشورے سے طے ہو کہ کسے خلیفہ بنائیں۔ انھوں نے اسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سستی سمجھا کہ وہ قاتلانِ عثمان سے قصاص لے کر ان کی حمایت نہیں کرتے۔ نہ کہ خدانخواستہ اس لیے کہ وہ انھیں اس خون میں ملوث سمجھتے تھے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی جب صراحتاً ان پر ملامت کرتے تھے تو ان کا مقصد بھی محض ان کے سکوت کا سبب تھا۔ پھر ہے ان کا دوسرا اختلاف۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا نظریہ یہ تھا کہ ان کی بیعت ہو چکی اور مدینہ طیبہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مرکز ہے اور صحابہ کا وطن، جب اس میں اس بیعت پر مجتمع ہونے والے مجتمع ہو گئے تو جو لوگ بیعت سے رکے ہوئے ہیں، ان پر بھی بیعت کرنا لازم ہو گیا۔ آپ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ اس وقت تک ملتوی رکھا، جب تک آپ پر امت مجتمع نہ ہو اور کلمہ متحد نہ ہو جائے، کیوں کہ اسی وقت آپ کے لیے قابو پانے کا امکان ہوتا۔

''دوسرے حضرات کی رائے تھی کہ ان کی بیعت منعقد نہیں ہوئی، اس لیے کہ جو صحابہ اہلِ حل وعقد تھے وہ دور دور بکھرے ہوئے تھے اور بہت تھوڑے حضرات موقع پر موجود تھے۔ بیعت اس وقت منعقد ہوتی ہے، جب اہلِ حل وعقد متفق

ہو جائیں۔ دوسروں کے بیعت کر لینے سے ان کا انعقاد نہیں ہوتا اور نہ تھوڑے سے لوگوں کے متفق ہو جانے سے۔ یعنی اس وقت لوگ بغیر امام کے ہیں اور ان کا پہلا مطالبہ ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیا جائے، پھر وہ کسی امام پر مجتمع ہوں گے۔ یہ موقف جن حضرات کا تھا وہ یہ ہیں: سیدنا معاویہ، سیدنا عمرو بن العاص، ام المومنین حضرت عائشہ، سیدنا زبیر اور ان کے فرزند سیدنا عبداللہ، سیدنا طلحہ اور ان کے فرزند سیدنا محمد، سیدنا سعد، سیدنا سعید، سیدنا نعمان بن بشیر، سیدنا معاویہ بن خدیج اور مدینہ کے وہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ان کے ہمنوا تھے اور انھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

"مگر ان کے بعد کی صدی کے لوگوں نے اس پر اتفاق کر لیا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو گئی تھی اور تمام مسلمانوں پر اس کی پاسداری لازمی تھی اور یہ کہ رائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی کی درست تھی۔ نیز یہ کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا خطا پر تھے۔ خصوصاً سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ، کیوں کہ انھوں نے بقول راویوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے توڑ دی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ مجتہدین کی جو شان ہے اس کے مطابق وہ دونوں فریقوں میں سے گناہ گار کسی کو نہیں کہتے اور اس طرح پہلی صدی کے دو قولوں میں سے ایک پر دوسری صدی سے اجماع چلا آتا ہے، جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔"

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کا یہ تجزیہ بڑی حد تک درست ہے، اگرچہ بالکلیہ نہیں۔ اس میں بعض باتیں محلِ نظر ہیں، مثلاً: سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کا بیعت کر کے توڑنا۔ صحیح یہ ہے کہ انھوں نے بیعت نہیں کی تھی، جیسا کہ صفحاتِ گزشتہ سے ثابت ہو گیا اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ جماعت نے پہلی صدی میں ان پر طعن کیا اور نہ بعد کی کسی صدی میں۔ سبائیہ کی مفتریات سے متاثر ہو کر اگر کسی شخص نے کچھ کہا ہو تو اس کا ذمے دار

وہ خود ہے نہ کہ جماعت۔ خود علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کو بھی اہلِ تلبیس و افترا کی رائے سے اتفاق نہیں، ورنہ جزاً ان کا بیعت کرنا اور توڑنا بیان کرتے۔ انھوں نے اپنی تحقیق بھی یہی بیان کی ہے کہ دونوں نے بیعت نہیں کی تھی۔

دوسری بات ہے عصر ثانی میں کوئی فیصلہ ہونا، عقلاً و نقلاً ایسے فیصلے کی کوئی قیمت نہیں۔ امامت و خلافت حسی اور واقعی چیز ہے۔ تصورات ونظریات سے اس کا کیا علاقہ؟ ہم عصر لوگ اگر ایک شخص کو اپنا حاکم تسلیم کر لیں تو وہ ہے، ورنہ نہیں۔ بعد کے لوگ اپنی خواہشات و رجحانات کے تحت دلائل و براہین کا کتنا ہی انبار کیوں نہ لگا دیں جو واقعہ ہے اس کی نوعیت نہیں بدل جاتی۔ عصرِ ثانی کے مسلمانوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اس لیے تسلیم کی کہ وہ واقعی خلیفہ تھے اور بالفعل ان کی خلافت کو تمام ہم عصر حضرات نے تسلیم کر لیا تھا۔ ان کی مملکت میں جتنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مخلص مسلمان رہتے تھے، انھوں نے صرف آئینی بیعت سے گریز کیا تھا، ورنہ تمام فرائضِ دینیہ وہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ ہی کی امامت میں ادا کرتے تھے۔ کیا کوئی شخص ثابت کر سکتا ہے کہ چار برس تک ان حضرات نے زکات کا روپیہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے گماشتوں کو نہیں دیا یا ان کے مقرر کردہ امیرِ حج کی امامت میں ارکانِ حج ادا نہیں کیے، یا ان کے ولیوں کے انتظامی احکام کی پابندی ضروری نہیں سمجھی؟ جب ایسا نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ غیر مبایعین بالفعل اور عملاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ جانتے تھے، اگرچہ آئینی اور متفق علیہ خلیفہ نہیں سمجھتے ہوں۔

اسی طرح شام و مصر کے مسلمان سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہمنوا ہونے کے باوجود کیا قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے نہیں کرتے تھے اور کیا ان کے گریز کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ خلافتِ مرتضوی پر قاتلانِ عثمان حاوی تھے۔ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حیثیت ان کے نزدیک محض مدعی کی ہوتی تو پھر نہ مطالبہ کا سوال تھا اور نہ شرائطِ بیعت پیش کرنے کا۔ لہٰذا عصرِ ثانی سے جو اجماع چلا آ رہا ہے وہ عصرِ اول کے مسلمانوں کے موقف ہی کی بنیاد پر ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ امت کا ایک قلیل حصہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی امامت کو حق سمجھتا تھا اور اسے آئینی جانتا تھا اور ایک قلیل حصہ ان کی امامت کو تسلیم کرنے کے لیے چند شرائط پیش کرتا تھا اور یہ شرطیں پوری کیے بغیر ان کی خلافت کو حق سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن یہ دونوں طبقے اقلیت میں تھے امت کے سوادِ اعظم نے نہ ایک کے نظریے کی تائید کی اور نہ دوسرے کے، نہ ایک کو حق کہا اور نہ دوسرے کو باطل۔ نہ دونوں کو حق کہا اور نہ دونوں کو باطل۔ بلکہ اپنی رائے محفوظ رکھی۔ اس سوادِ اعظم کے نزدیک دونوں کی بعض باتیں صحیح تھیں اور بعض غلط، لہٰذا وہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ کس موقف کا اعلان کریں۔ صفین کے بعد ثالثوں کا تقرر ہو گیا اور انھوں نے بھی صورتِ حال برقرار رکھ کر آخری فیصلے کا حق اسی سوادِ اعظم کے نمایندوں کو دیا، جس کا موقع نہیں آیا، کیوں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔

ثالث اور تمام غیر جانبدار طبقے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس مطالبے میں ہمنوا تھے کہ قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیا جائے۔ خود امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ بھی اس مطالبے پر متفق تھے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لینے پر تیار تھے، بشرطیکہ قاتلانِ عثمان سے قصاص لینے کی عملی تدبیریں اختیار کرنے پر راضی ہو جائیں اور مسئلے کو التوا میں نہ ڈالیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ مطالبہ کہ اول ان کی بیعت کی جائے، پھر قصاص کا مسئلہ پیش ہو، انھیں منظور نہیں تھا۔

گویا جو نزاع تھا وہ امامِ وقت سے تھا اور اجتہادی تھا۔ امت کی خیر خواہی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کی بیعت لیں، وہی بیعت ان کی خلافت کی خود بخود ہو جاتی، یہی وجہ ہے کہ جماعت کا شروع سے جو موقف چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں فریق حق پر تھے، البتہ اولیٰ بالحق سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ فیصلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اکابر علما وفقہا

کے جو نظریات اس بارے میں بیان کیے ہیں وہ بھی اوپر گزر چکے اور وہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف بھی بیان ہو چکا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بیعت کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ اس سے بالفعل اور آئینی فرق معلوم ہوتا ہے۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ:

امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت قریب قریب اسی طرح ہوئی جس طرح حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی ہوئی تھی۔ نہ عام اجتماع میں انتخاب کی ضرورت تھی اور نہ امت کی نگاہ میں کوئی دوسرا شخص تھا۔ ان کی خلافت طبعی اور قدرتی تھی، البتہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت میں اتنا فرق ہے کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اول محدود ترین حلقے میں بیعت ہوئی اور پھر تمام امت نے اس کی توثیق کر دی۔ لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اول جس شخص نے بیعت کی اس کی خلافت کا اعلان کیا جا چکا تھا، یعنی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ۔ اس اعتبار سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت زیادہ اہم ہے۔ بیعتِ صدیقی سے پہلے سیدنا سعد بن عبادہ کا صرف نام تجویز ہوا تھا اور ان کی بیعت سے پہلے ہی حضرت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضرین کا اجماع ہو گیا، لیکن سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان باقاعدہ کیا جا چکا تھا اور آپ نے تمام امورِ خلافت کی زمام اپنے ہاتھ لی تھی، پھر برضا و رغبت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو گئے اور ان کی بیعت کر لی۔ کسی جنگ میں مغلوب ہو کر نہیں، بلکہ اپنے دیرینہ نظریات کے تحت اور امت کی خیر خواہی میں۔

بعض لوگ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو مستبدانہ تسلط باور کرانا چاہتے ہیں، لیکن یہ وہی لوگ ہیں، جن کا نظریہ نہیں، بلکہ عقیدہ ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بھی بجبر و زور امت پر مسلط ہو گئے تھے۔ اس قسم کے خیالات صرف اس قسم کے ہی لوگ رکھ سکتے ہیں جو حقائق سے آنکھیں بند کر لیں اور بات کرتے وقت یہ نہ سوچیں کہ معاملہ قرنِ اول کے مسلمانوں کا ہے اور اس امت کے اسلافِ کرام کا جو جبر کے سامنے آج بھی نہیں جھکتی۔

ان پانچوں خلفا کے بعد امت نے یہ تجویز کر لیا کہ خلافت بنو عبدِ مناف میں محصور رہے گی اور اسے بنو امیہ سے مختص کر دیا جائے گا۔ لہٰذا اب خلیفہ کا انتخاب یا تو جانے والا کر جاتا تھا، یا اربابِ حل و عقد کسی رکنِ خاندان کو منتخب کر کے اس کی خلافت کا اعلان کر دیا کرتے تھے اور پھر تمام امت بیعت کر لیتی تھی۔

سقوطِ بغداد تک پچاس کے قریب خلیفہ ہوئے ہیں، ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو باپ کی وصیت کے تحت خلیفہ ہوئے ہوں اور بہت کم خلفا ایسے ہیں، جنھوں نے اپنے بعد اپنے بیٹوں کو نامزد کیا۔ اکثر بیٹے وہ ہیں، جنھیں اربابِ حل و عقد نے منتخب کیا، ورنہ عموماً صرف رکنِ خاندان کی اہلیت کے مطابق خلیفہ منتخب کر لیا جاتا تھا۔ یعنی امرِ خلافت میں مسلمانوں نے آخر وقت تک قانونِ وراثت کی پیروی نہیں کی اور نہ استحقاقِ خلافت کے لیے وارثِ حقیقی ہونے کی شرط رکھی۔ چونکہ اجماع صرف خاندان پر تھا، اس لیے شرط بھی رکنِ خاندان ہونے کی تھی۔ فرزندِ صلبی اور حقیقی بھائی، عم زاد بھائی، بلکہ چچا اور بھتیجے کا بھی انتخاب ہوا ہے۔ کبھی جانے والے خلیفہ کی وصیت سے اور کبھی اربابِ حل و عقد کے اپنے مشورے سے۔ یہاں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان سے بحث نہیں، بحث صرف عمل سے ہے۔

آخر عہدِ عثمانی تک اربابِ شوریٰ صرف اہلِ مدینہ تھے۔ خلافتِ مرتضوی میں یہ مقام اہلِ کوفہ ہو گیا۔ اہلِ مدینہ سے قطعاً استصواب نہیں کیا جاتا تھا۔ جب مستقرِ خلافت دمشق ہوا تو اربابِ حل و عقد وہی لوگ ہوئے جو دمشق میں رہتے تھے اور خلیفہ کی معیت انھیں حاصل تھی۔ اس کے بعد جب دار الخلافہ بغداد ہوا تو خلفائے عباسیہ کے امرا و ارکانِ دولت کو حل و عقد کا اختیار مل گیا۔

خلافت کو خاندان میں محصور کر دینے کا مسئلہ دستورِ اساسی میں ایک اہم ترمیم تھی، اس لیے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد کی امت سے بہت بڑے پیمانے پر استصواب کیا تھا۔ ایسے وسیع معیار پر اس سے پہلے کسی مسئلے کے متعلق امت سے رائے نہیں

لی گئی تھی اور چونکہ مصلحتِ ملیہ اسی حصر میں تھی، اس لیے بعد کے مسلمانوں نے بھی اسے اپنا شعار بنا لیا۔ اس تصور کی بنیاد وہ یہ چھے بزرگوار رکھے گئے تھے، جنھیں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد نامزد کیا تھا۔ علامہ خضری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وبذلك صار الأمر في عنق عبد الرحمٰن بن عوف فدار لياليه يلقى أصحاب رسول الله ﷺ ومن وافي المدينة من أمراء الأجناد وأشراف الناس يشاورهم ولا يخلو برجل إلا أمره بعثمان حتى إذا كانت الليلة التي يستكمل في صبيحتها الأجل أتى منزل المسور بن مخرمة وأمره أن يدعو إليه الزبير وسعداً فدعاهما فبدأ بالزبير في مؤخر المسجد في الصفة التي تلي دار مروان فقال له خل ابني عبد المناف وهذ الأمر فقال الزبير نصيبي لعلي وقال للسعد: أنا وأنت كلالته فاجعل نصيبك لي فاختار قال: إن اخترت نفسك فنعم وان اخترت عثمان على أحب إلى أيها الرجل بايع نفسك وأرحنا قال: يا أبا إسحاق إني خلعت نفسي منها على أن أختار ... "[1]

"اس طرح سب ذمے داری سیدنا عبدالرحمان بن عوف کے سر پڑ گئی اور تمام راتیں انھوں نے اصحابِ رسول اللہ ﷺ سے ملاقاتوں میں گزاریں اور ان کمانداروں اور ذی اثر لوگوں سے مشورے کیے، جو اس وقت مدینہ آئے ہوئے تھے۔ جس سے بھی آپ نے بات کی اس نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ہی کا نام لیا، یہاں تک کہ وہ رات آ گئی، جس پر مدت ختم ہونی تھی۔ تب آپ سیدنا مسور بن مخرمہ کے گھر آئے اور انھیں سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ اور سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو بلانے

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلاميه (٢/٢٣،٢٤)

بھیجا۔ جب وہ بلا لائے تو آپ نے پہلے سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ سے اس چبوترے پر بات کی جو مسجد کے آخر میں سیدنا مروان رحمہ اللہ کے گھر سے ملحق تھا اور فرمایا: ''خلافت کے مسئلے کو عبدِ مناف کے ان دونوں فرزندوں کے حق میں چھوڑ دو۔'' سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں علی کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔'' پھر آپ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میری اور آپ کی حالت کلالہ کی سی ہے (یعنی اس یتیم کی سی جس کا قریبی رشتے دار کوئی نہ ہو، یعنی جس کی پشت پر اعوان و انصار کی طاقت نہ ہو)۔ لہٰذا آپ اپنا حق مجھے دے دیجیے کہ میں انتخاب کرسکوں۔'' انھوں نے جواب دیا: ''اگر آپ خود اپنے آپ کو منتخب کریں تو میں تیار ہوں اور اگر عثمان کو اختیار کرنے کا خیال ہو تو پھر علی کو میں زیادہ پسند کرتا ہوں اور بھلے آدمی اپنی بیعت لو اور ہمارا بوجھ اتار دو۔'' انھوں نے کہا: ابو اسحاق! میں تو پہلے دستبردار ہو چکا ہوں اور صرف (دوسرے کو) منتخب کرنے کا ذمے دار ہوں ...۔''

تقریباً یہی مضمون صحیح بخاری کا بھی ہے،[1] اگرچہ اس میں بنو عبدِ مناف کی تخصیص کا ذکر نہیں۔ مگر مآل وہی ہے۔

اگر شخصیتیں اور حقوق دیکھے جائیں یا رشتے داریاں تلاش ہوں تو سوائے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے اور کوئی شخص نہ تھا جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کا خلیفہ ہوتا۔ نہ کسی مرد کو بلاواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت پہنچی تھی اور نہ رشتے کے اعتبار سے کسی کی یہ حیثیت تھی کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر ہو سکے۔ البتہ جگر گوشۂ رسول ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوتے تو وہ حقیقی وارث تھے، لیکن چونکہ خلافت کے لیے وراثت شرط نہیں اس لیے ممکن ہے کہ وہ بھی حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی سے بیعت کرتے، جیسے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کی تھی، یا جیسے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو امام تسلیم کرلیا تھا۔

---

[1] صحيح البخاري (٤/٢٤٦٤٥) كتاب الأحكام، باب كيف يبايع الناس الإمام، طبع مصر.

امت کی سیاست کے بارے میں لوگوں نے بہت سی فضول و لایعنی باتیں کہی ہیں کہ کیا افضل کی موجودگی میں مفضول کی خلافت جائز ہے یا اقرب کے ہوتے ہوئے ابعد کو نامزد کیا جا سکتا ہے؟ ان باتوں کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں۔ افضلیت اور اقربیت شخصیت کی نہیں دیکھی جاتی، بلکہ جو کام سپرد ہوا ہے اس کی صلاحیت وموزونیت پر مدار ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ شخص مفوضہ خدمت کو بخوبی سرانجام دے سکتا ہے یا نہیں اور امت کی تائید حاصل ہو سکے گی یا نہیں؟

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا پایہ علم میں اتنا تھا کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ انھیں "کُنَیْفَةُ الْعِلْم" "علم کی پوٹلی" کہا کرتے تھے۔ تین چوتھائی امت ان کی فقہ پر عمل کرتی ہے۔ "هَدْیاً وَ دَلًّا وَ سَمْتاً" یعنی ذہنی، قولی اور عملی اعتبار سے ان کے احوال ایسے تھے کہ جس نے انھیں دیکھا اس نے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، لیکن خود بقول حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے انھیں ایک گاؤں کا انتظام بھی سپرد نہیں کیا جا سکتا تھا، چہ جائیکہ ایک مملکت کا۔ یہی حال سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کا تھا۔

سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی حکومت دی گئی، نتیجہ سامنے ہے، جو لوگ علمی زندگی بسر کرتے ہیں اور عملی سیاست کا انھیں تجربہ نہیں ہوتا، وہ کیسے ہی اعلیٰ درجے کے معلم، مقرر، مصنف، محقق اور نقاد کیوں نہ ہوں، اگر سیاست میں پڑ جائیں تو ناکام رہتے ہیں۔ پاکستان کا تصور علامہ اقبال رحمہ اللہ نے پیش کیا اور اسی کو مسلمانانِ ہند کا نصب العین بنایا، لیکن ساتھ ہی فرما دیا کہ اگر میں اس تحریک کی عملی رہنمائی کے لیے بڑھوں تو یہ حد سے تجاوز ہو گا۔ آپ چونکہ علمی آدمی تھے اور نظریات پر بحث ہی آپ کا موضوعِ سخن تھا، اس لیے عملی سیاست میں آنے سے گریز کیا۔ اس کے لیے دوسری قسم کے آدمی درکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس بطلِ عظیم کو امت کی عملی سیاست کی قیادت کا ملکہ تھا اس نے علامہ اقبال رحمہ اللہ کے علم ونظر کو عملی اور حسی بنا کر دنیا کو دکھایا۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی امامت پر

اجماع کر لیا۔ حالانکہ علمی اور روحانی عظمت کے اعتبار سے بکثرت حضرات ان سے مرتبہ میں بلند تھے۔ وہ خود بھی اپنا مقام ان بزرگواروں کے مقابلے میں کم ہی سمجھتے تھے، لیکن جو کام ان کے سپرد ہوا تھا اس میں وہ ان سب سے افضل و اقدم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسی ہستیوں نے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنا امام تسلیم کر لیا اور ظاہراً و باطناً ان کے ہر اجتہاد میں ان کی ہمنوائی کی۔

پھر وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خلافت اس وقت صحیح ہوگی، جب اپنے بعد کسی رشتے دار کے سپرد نہ کی جائے۔ یہ وہ بات ہے، جس کی شرعاً کوئی قیمت نہیں، جیسا کہ ثابت ہو چکا۔ کتاب و سنت سے ادنیٰ ترین دلیل بھی اس بارے میں پیش نہیں کی جا سکتی اور نہ کوئی محکم دلیل دی جا سکتی ہے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بالکل صاف ہے: "یابی اللّٰه والمؤمنون إلا أبا بکر" ''اللہ اور اہلِ ایمان سوائے ابوبکر کے اور کسی پر راضی نہیں ہوں گے'' یہی ہے اصل۔ اگر امت اس بات پر راضی ہے کہ باپ کے بعد بیٹا خلیفہ ہو تو یقیناً ہو سکتا ہے۔ دو چار آدمیوں کی رائے اکثریت کے اس فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جب ان مخالفوں سے بھی بڑے لوگ موجود ہوں اور امت ان مخالفوں کی حمایت پر تیار نہ ہو۔

گویا اسلامی نظامِ سیاسی کی بابت کتاب و سنت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی حکومت بنے وہ عند اللہ مقبول ہوگی، بشرطیکہ اس کی بنیاد قوانینِ شرعیہ پر ہو اور اس سے وہ مقاصد پورے ہوتے ہوں، جو اللہ تعالیٰ نے حکومتِ اسلامیہ کے مقرر فرمائے ہیں۔ یعنی مساجد کی تنظیم، زکات کی باقاعدہ تحصیل، اخلاقی اقدار کی حفاظت اور تبلیغِ دینِ مبین۔ پھر ہے مملکت کی حفاظت کی قدرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی طاقت، حکومت کا قالب کسی قسم کا ہو، ایک عصر کے لوگ اسے قبول کر لیں تو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دستور پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ روحِ قرآنی کے مطابق دستور میں مناسب تبدیلی برابر ہوتی رہنی چاہیے، جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔

یہاں ہمارا مقصد صرف اس اصل کا بیان کرنا تھا، ورنہ اس کی بھی گنجایش ہے کہ امت کی تاریخ سے ہم اس پر تبصرہ کرتے کہ مسلمانوں کی سیاست نے قرونِ ماضیہ میں کیا ارتقائی مدارج طے کیے۔ ہمارے نزدیک سیاسیاتِ اسلامیہ میں تنزل نہیں ہوا، بلکہ ارتقا ہوا ہے، اگرچہ بظاہر کبھی کمزوری نظر آئے یا اختلال رونما ہو۔ اگر مسلمان زندہ رہے تو یہ ارتقا بھی جاری رہے گا اور وہ حکومت کے نئے نئے طرز ایجاد کریں گے۔ جیسے آج پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کا تجربہ ہو رہا ہے اور تمام عالم کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ خدا کرے کہ یہ تجربہ کامیاب ہو جائے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ اب سے پہلے لوگ جاہل تھے یا ان میں دینی تقاضے پورے کرنے کا جذبہ نہ تھا۔ یا ''ان کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں تھی'' یا ''گاڑی پٹڑی سے اتر گئی تھی'' اسی طرح ہمارے بعد آنے والے لوگ جب اور کوئی بہتر اور مفید طریقہ ایجاد کریں گے تو وہ اس کے مجاز نہیں ہوں گے کہ موجودہ اربابِ بست و کشاد کو نالائق کہیں یا دشمنِ ملت سمجھیں۔ استثنا صرف ادوارِ فتن کا ہے کہ ان گھڑیوں میں جو مصائب ٹوٹیں وہ قابلِ اعتبار نہیں اور نہ نظائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دنیا کا نہ کوئی دستور کامل بنا ہے اور نہ بن سکتا ہے۔ جب خود انسان کامل نہیں تو اس کی تخلیق کیسے کامل ہو سکتی ہے۔ پھر اس کے احوال بدلتے رہتے ہیں۔ نئے نئے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں، پھر کسی لگی بندھی چیز پر مدار کیسے ہو سکتا ہے؟! ابتدائے آفرینش سے آج تک کوئی سیاسی نظام ایسا مرتب نہیں ہوا، جسے کامل کہا جا سکے اور جس میں کوئی بنیادی خامی نہ ہو۔ البتہ کارکن اچھے ہوں اور اخلاص سے کام کریں تو ہر نظام کے تحت زندگی کی راحتیں میسر آ سکتی ہیں۔

پھر ایک انسانی فطرت ہے نکتہ چینی۔ بعض لوگ قدرت کی طرف سے یہی ذہنیت لے کر آتے ہیں کہ ہر بات میں خامی تلاش کریں، ہر آدمی کے عیب ڈھونڈیں، ہر حکومت کو

بدخواہِ ملت بتائیں اور ہر حکمران پر ناانصافی، جانبداری اور خویش پروری کا الزام لگائیں۔ ایسے لوگوں کا کوئی علاج نہیں۔ آج تک دنیا میں کوئی حاکم ایسا نہیں گزرا، جس پر اعتراضات کی بوچھاڑ نہ ہوئی ہو، حتی کہ سرورِ عالم و عالمیان ﷺ کو بھی نہیں چھوڑا گیا، جو عدلِ مجسم تھے اور آپ ﷺ کے منہ پر بھی یہ کہنے والے لوگ پیدا ہو گئے: ''اِتَّقِ اللّٰهَ يَا مُحَمَّدُ'' ''محمد! اللہ سے ڈرو۔'' صحیحین کی یہ حدیث پیچھے مذکور ہو چکی۔ کوئی دینی حکومت ہو یا لادینی، نبوی ہو یا جاہلی، کسی حکومت اور کسی حاکم پر اطمینان نہ کرنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ بھی ہدفِ ملامت ہیں۔ واقعی قابلِ اعتراض بات نہ ہو تو وضع کر کے چسپاں کر دینا کیا مشکل ہے اور صورتِ حال کو غلط رنگ میں پیش کر دینے سے زیادہ آسان کیا کام ہے۔ اعاذنا اللّٰہ منہما

اسلامی زاویۂ نگاہ سے حکومت کا منہاج ایسا ہونا چاہیے کہ شریعتِ اسلامیہ کی حدود میں رہ کر انسان کو زندگی بسر کرنے کے وسائل پر پوری طرح دسترس ہو اور اس کے ذاتی معاملات میں حکومت کی طرف سے کم مداخلت کی جائے، تاکہ شخصی آزادی کا احساس ہر شخص کا سربلند رکھے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری ہر حکومت میں یہ بات حاصل رہی۔

دوسری ضروری بات ہے کہ عدلیہ پر انتظامیہ کا مطلقاً کوئی دباؤ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ سعادت بھی ہمیں ہمیشہ حاصل رہی۔ حاکمِ علاقہ ہی نہیں امیر المومنین تک کو عدالت میں طلب کرنے اور اس کے خلاف فیصلہ سنا دینے اور پھر شرعی فیصلے کے سامنے ان کی گردنیں جھک جانے کے واقعات اگر ابتدائے اسلام سے لے کر بیسویں صدی مسیحی تک کی یادداشتوں سے جمع کیے جائیں تو ایک مبسوط اور ضخیم کتاب ہو جائے۔

قرآن مجید کے مطابق جمہوریت اور آزادی کا یہی مفہوم ہے، اگرچہ وہ کسی بھی نظام کے تحت میسر آئے۔ فرد کے عمرانی حقوق کا پورا تحفظ اور جماعت کے موقف کا کامل احترام جس حکومت میں ہو اور حدود اللہ وہاں قائم ہوں، وہ حکومت اسلامی زاویۂ نگاہ سے

معیاری ہے، اگرچہ دستورِ حکومت شاہی ہو، آمرانہ ہو، صدارتی ہو، جمہوری ہو، شوروی ہو یا کسی اور قسم کا ہو۔ قرآنِ حکیم نے یہ مضمون پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، گویا دریا کوزے میں بند ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴾ [النساء: ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

یعنی مسلمانوں میں یہ طاقت اور حریت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے حکام سے اختلاف کی جراَت کر سکیں اور عدلیہ کو اتنی آزادی ہونی چاہیے کہ حکومت کے مختلف فیہ اقدام پر وہاں سے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا حکم حاصل کیا جا سکے، جس کے سامنے حکومت اور عوام سب کی گردنیں خم ہوں۔ لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنا یا جماعت سے روگردانی کر کے فرقے بازی میں مبتلا ہونا اور امت کا کلمہ متفرق کرنے کے درپے ہونا کسی درجے میں جائز نہیں۔ ''من فارق الجماعة شبراً فقد خلع ربقة الإسلام من عنقه إلا ان يراجع'' ''جو جماعت سے بالشت برابر بھی باہر ہوا اس نے اسلام کا جُوا اپنی گردن سے اتار پھینکا، تا آنکہ پھر لوٹ آئے۔

''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ فِيمَا أَحَبَّ أَوْ كَرِهَ إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِنْ أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ'' (رواه أحمد)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کیا کہ ہر مسلم شخص پر امیر کی بات سننی اور اطاعت کرنی واجب ہے، حکم اسے پسند ہو یا ناپسند، بشرطیکہ معصیت کا حکم نہ ہو۔ اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنا۔''

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کسی کو کسی امر پر احتجاج کرنا ہو تو اس کا احتجاج آئینی اور قانونی ہونا چاہیے، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم حاصل کرے۔ رائے عامہ کی قوت سے ہر حکم منسوخ کرایا جا سکتا ہے اور کرایا جاتا رہا ہے، لیکن یہ سب کچھ ہونا چاہیے جماعت کے شیرازے میں پراگندی پیدا کیے بغیر۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمین، والصلاة والتسلیمات علیٰ سید المرسلین محمد خاتم النبیین وعلیٰ آله الطیبین الطاهرین وأصحابه الأكرمین وخلفائه أجمعین.



کتابیات

❁ آیاتِ بینات -------------------------- محسن الملک

❁ احیاءعلوم الدین -------------------------- امام غزالی

❁ اختیار المنظوم والمنثور -------------------- ابن طبور

❁ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب --------------- ابن عبدالبر

❁ اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ---------------- ابن الاثیر الجزری

❁ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ------------------- حافظ ابن حجر العسقلانی

❁ اغاثۃ اللہفان فی مکائد الشیطان -------------- علامہ ابن القیم

❁ الف لیلۃ ولیلۃ

❁ امام ابن ماجہ اورعلمِ حدیث ---------------- محمد عبدالرشید نعمانی

❁ الامۃ والسیاسۃ ---------------------------- امام ابن قتیبہ

❁ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

❁ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا

❁ انساب الاشراف -------------------------- البلاذری

❁ البدایۃ والنہایۃ -------------------------- حافظ ابن کثیر

❁ البیان والتبیین -------------------------- الجاحظ

❁ تابعین ------------------------------ شاہ معین الدین ندوی

- تاریخِ اسلام ------------------------------ عبداللہ عمادی
- تاریخ الامت ------------------------------ محمد اسلم جیراجپوری
- تاریخ بغداد ------------------------------ الخطیب البغدادی
- تاریخ الخلفاء------------------------------ علامہ السیوطی
- تاریخ دمشق ------------------------------ امام ابن عساکر
- تاریخ طبری ------------------------------ محمد بن جریر الطبری
- تاریخ مسعودی (مروج الذہب)------------
- تذکرۃ الحفاظ ------------------------------ امام ذہبی
- تفسیر ابن ابی حاتم ------------------------
- تفسیر بیضاوی ------------------------------
- تفسیر جلالین------------------------------
- تفسیر طبری ------------------------------
- تورات ------------------------------
- جامع ترمذی ------------------------------
- جمہوریت ------------------------------ افلاطون
- الجواہر المضیئہ فی طبقات الحنفیہ --------------- عبدالقادر قرشی
- دائرہ معارف اسلامیہ (اردو)---------------
- داستان امیر حمزہ، ابوالفیض فیضی-------------
- الرسالۃ العدویۃ ------------------------------ امام ابن تیمیہ
- الروض الانف ------------------------------ امام السہیلی
- سنن ابن ماجہ ------------------------------

- سنن ابو داود ----------------------------
- سنن بیہقی ----------------------------
- سنن دارمی ----------------------------
- سنن نسائی----------------------------
- السہم المصیب فی الرد علی الخطیب ------------ ابوظفر بن ابی بکر بن ایوب المعظم
- سیرت ابن اسحاق ------------------------
- سیرت ابن ہشام ------------------------
- سیر الصحابہ ---------------------------- معین الدین ندوی
- صحیح بخاری ----------------------------
- صحیح مسلم----------------------------
- طبقات ابن سعد ------------------------
- طبقات الحنابلة ------------------------- ابو یعلیٰ
- طبوریات ---------------------------- سلفی
- عثمان بن عفان ------------------------ عرجون
- عقدالفرید---------------------------- ابن عبدربہ
- العواصم من القواصم ---------------------- ابو بکر بن العربی
- الفاروق ---------------------------- مولانا شبلی نعمانی
- الفتنۃ الکبریٰ ---------------------------- طٰہٰ یٰسین
- فتوح الشام---------------------------- الواقدی
- قرآن کریم
- قواعد عقائد آلِ محمد ﷺ ------------------ محمد بن الحسن دیلمی یمانی

- کافی ---------------------------------- کلینی
- کتاب الآثار---------------------------- محمد بن الحسن الشیبانی
- کتاب الخراج --------------------------- ابو یوسف
- کتاب الزہد----------------------------- امام احمد بن حنبل
- اللآلئ المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ -------- امام السیوطی
- محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ ------------- محمد الخضری
- مروج الذہب --------------------------- المسعودی
- مستدرک حاکم---------------------------
- مسند امام احمد بن حنبل ---------------------
- مصحف فاطمہ ----------------------------
- مصنف ابن ابی شیبہ ----------------------
- المعارف -------------------------------- ابن قتیبۃ
- معجم الادباء ----------------------------- یاقوت الحموی
- مغازی ابن عقبہ -------------------------
- مقالات الاسلامیین ---------------------- ابو الحسن الاشعری
- مقدمہ ابن خلدون------------------------
- مناقب الامام الاعظم --------------------- صدر الائمہ موفق بن احمد
- منتخب الحکایات-------------------------- عوفی
- المنتقی من منہاج الاعتدال ----------------- امام الذہبی
- منہاج السنۃ ----------------------------- امام ابن تیمیہ
- موطا امام مالک -------------------------

- ناسخ التواریخ ---------------------------- سپہر کاشانی
- نہج البلاغہ ------------------------------- الشریف المرتضٰی
- وفیات الاعیان-------------------------- ابن خلکان





حارث پبلی کیشنز

Email: haris.publications@gmail.com